قارئین کی گرما گرم آرا ئیاں اور تنخ ادائیاں
نامہ و پیام، جس میں اعزازیتیں وضاحتیں

جے ڈی پی کے بانی معراج رسول
کی برسی پر کچھ یادیں کچھ باتیں

انتظار کے کٹھن لمحوں سے گزرتے ہوئے سے
بات ہے فراموش واقعات کے احوال

خونِ شہید کبھی رائگاں نہیں جاتا ۔۔۔ یوم
کشمیر کے حوالے سے ایک دل گداز کتھا

قربت کے آخری لمحوں کی لغزش
جس میں خوف کی لکیر نہ تھی

بانی سرپرست

مدیر اعلیٰ

عذرا رسول

مدیر : لبنیٰ خیال

نائب مدیر : نعیم اختر

مارکیٹنگ و
سرکولیشن مینیجر

شمر عباس

0301-2454186

سنسنی خیز واقعات اور انتقام کے جذبات
سے لبریز ایک لہو رنگ داستان

نہایت ہوشیاری سے اپنے دشمن کو
ختم کر دینے والی حکمت عملی

ایک ہی وقت میں زندگی کی
نعمتیں بدل لینے والوں کا فسانۂ آزار

ایک ڈاکٹر کی کامیاب
منصوبہ بندی کا سنسنی خیز انجام

پہاڑوں کے سحر زدہ ماحول میں
پُراسرار خزانے کی تلاش و جستجو کا احوال

چینی نمکہ چینی

مدیحہ علی

عزیزانِ من..... السلام علیکم!

2026ء کا دوسرا شمارہ آپ کی نذر ہے۔ فروری میں اسلامی ہجری کے مطابق ماہِ صیام کا آغاز بھی ہوا چاہتا ہے..... تمام مسلمانوں کو رمضان المبارک کی آمد مبارک ہو۔ اس ماہ کی بابرکت ساعتوں میں اللہ تعالیٰ سب کی دعائیں قبول فرمائیں۔ رمضان المبارک کی آمد جہاں خوشی و انبساط کا باعث ہے، وہیں دل میں ایک کسک سی اٹھتی ہے۔ حالیہ دنوں میں ہونے والے ایک سانحے نے حساس دلوں کو آبدیدہ کر رکھا ہے۔ کراچی کے گل پلازا میں لگنے والی آگ نے جسم و جاں اور مال و دولت کو جلا کر راکھ کر دیا۔ یہ ایسا سانحہ ہے جسے مدتوں بھلایا نہیں جا سکے گا۔ اچانک بھڑکنے والی آگ میں اتنے لوگوں کا زندہ جل کر مر جانا نہایت ہی اندوہناک ہے۔ ہر ایک آنکھ اشکبار ہے۔ اس آگ کو بجھانے میں ہمارا دفاعی نظام بری طرح ناکام رہا ہے۔ گل پلازا کی تباہی و بربادی کے بعد بہت سی باتیں سامنے آ رہی ہیں۔ یہ کیا کوئی سازش ہے یا پھر دہشت گردی جو بھی ہے..... اس نے ہزاروں چاہنے والوں کو اپنے خاندان سے جدا کر دیا ہے۔ جانے والے تو چلے گئے، وہ کبھی لوٹ کر واپس نہیں آئیں گے..... مگر ان کے پیچھے رہ جانے والے تمام عمر ان کی راہ تکتے رہیں گے..... ان کا جسدِ خاکی تلاش کرتے رہیں گے..... اس آگ نے کاروبار کو تباہ کر دیا..... ہنستے مسکراتے لوگوں کو عرش سے فرش تک پہنچا دیا..... ان کے روزگار کا ذریعہ ان سے چھن چکا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ یہ کیوں ہوا اور کیسے ہوا..... آئندہ ان سانحات سے کیسے بچا جا سکتا ہے..... اگر اب بھی سوچا نہ گیا اور اپنے دفاعی نظام کو مضبوط نہ بنایا گیا تو یہ سانحے رونما ہوتے رہیں گے۔ اس ایک واقعے سے سبق لینا نہایت ضروری ہے..... بطور قوم ہمیں اس سے سیکھنا ہے۔ تاکہ آئندہ کوئی عورت..... بچہ اور بوڑھا ایسی دردناک موت سے نہ گزرے۔

پک پک پہ جلائے ہیں مقدر کے چراغ
بھڑک اٹھے ہیں شبِ ہجر کی سحر کے چراغ

سالِ نو کا آغاز ہی بہت افسوسناک انداز میں ہوا ہے۔ دل بوجھل ہے۔ ہر طرف کم و بیش مسلمان مصیبت اور پریشانی میں گرفتار ہیں۔ حالیہ دنوں میں ایران اور امریکا کی بڑھتی کشیدگی بھی کسی سانحے سے کم نہیں۔ خدانخواستہ یہ کشیدگی بڑھی تو ہزاروں جانیں قربان ہو جائیں گی۔ امریکا کی بڑھتی ہوئی دہشت گردی کی لپیٹ میں مسلم ممالک ہی نظر آتے ہیں۔ اس شترِ بے مہار کو روکنا از حد ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلم امہ کو مضبوط اور متحد کر دے۔ تاکہ مسلمان خون کو بہنے سے روکا جا سکے۔ رمضان المبارک کی ہر ساعت ہمارے قول و فعل میں انسانیت..... عبادت اور محبت کو اپنی انتہاؤں تک پہنچا دے۔

پاکیزہ ہو بدن بھی موقب ہو روح بھی
پوری ہوں سب کی سب مری حاجات اے خدا

ملتان سے محمد حسنین کے تیکھے جملے اور جملے" جادوئی ڈائجسٹ کا جنوری کا شمارہ ہاتھ میں آیا تو تھوڑی سی مایوسی ہوئی۔ دراصل دسمبر کے شمارے میں اتنا بہترین کاغذ استعمال کیا گیا تھا کہ دل خوش ہو گیا تھا۔ اچھے کاغذ پر کہانیاں پڑھنے کا لطف دوبالا ہو گیا تھا۔ اس بار دوبارہ پاکاغذ مایوسی کی وجہ بنا۔ خیر ٹائٹل متاثر کن تھا۔ حسینہ کی خوب صورتی بھی بہتر تھی۔ اس بار آرٹسٹ نے اوپر نیچے فائٹ سین پینٹ کر کے کچھ انفرادیت لانے کی کوشش کی لیکن ان کا کارٹونی انداز بہت اچھا نہیں لگا۔ نئے سال کی مبارک آپ نے تو ٹائٹل پر دے دی لیکن میرے لیٹر میں سے اڑا دی۔ کوئی بات نہیں بڑے بڑے ڈائجسٹوں میں ایسی چھوٹی چھوٹی کانٹ چھانٹ تو چلتی ہی رہتی ہے۔ چینی نمکہ چینی میں اس بار میرے علاوہ کسی نے بھی پورا ڈائجسٹ نہیں پڑھا تھا شاید اور سب کے ادھورے تبصرے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ اقبال صاحب کا خلاصہ نامہ پسند آیا۔ باقی سب نے بھی اچھا حصہ ڈالا۔ کہانیوں کا آغاز اپنے پسندیدہ امجد رئیس سے کرنے ہی والا تھا کہ جینک ریچر کا نام دیکھ کر شک ہو گیا کہ کہانی اتنی مختصر نہیں ہو سکتی۔ یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ سر کتے لمبے لکھتے ہوئے اگلے ماہ پر جا رہے ہیں۔ اس کہانی سے اگلے ماہ تک کے لیے معذرت کرتے ہوئے خلیل جبار کی آسان ٹارگٹ کو اپنا نشانہ بنایا۔ کہانی کی روانی اور پلاٹ متاثر کن تھا۔ آج

کل معصوم عوام کو کیسے کیسے ٹارگٹ کیا جارہا ہے کہ ان کا ہمدردی اور مدد کا جذبہ ہی ختم کیا جارہا ہے کہانی کا انجام ذرا جلدی میں ہو گیا۔ بشریٰ امجد کی خطرناک سکہ ایک بہتر ترجمہ تھی لیکن کہانی بس ایک پرانے لطیفے جیسی ہی لگی۔ طاہر جاوید مغل بہترین قلم کار ہیں لیکن سربکف کی اس قسط میں انہوں نے جس بھونڈے انداز میں تابش اور شاہ زیب کو لوپو کے ہیڈ کوارٹر پہنچایا اور واپس نکالا، اسے پڑھ کر سخت دل خراب ہوا۔ وہ تین سواریاں بدل کر وہاں تک پہنچے تھے اور عمران اینڈ کمپنی کا تعاقب انہیں ایک بار بھی محسوس نہیں ہوا۔ اس قسط میں بس یہ بات اچھی لگی کہ ایکشن زبردست تھا اور تنظیم کے ہیڈ کوارٹر کی منظر کشی لاجواب۔ عائشہ نصیر کی سراب کوئی خاص پسند نہیں آئی۔ یہ اچھا ترجمہ کرتی ہیں لیکن اس بار بے ربط انداز پسند نہیں آیا۔ درست آید عکس فاطمہ کی ایک زبردست تحریر تھی۔ کئی سال پہلے کے گڑے مردے اکھاڑنے کے بعد ایک نیا مردہ بھی وجود میں آ گیا۔ کہانی کے آخر میں تھوڑی وضاحت کہانی کو مزید بہتر بنا سکتی تھی کہ قتل آخر کیا کس نے تھا؟ حسام بٹ نے دہر کی اس قسط میں کہانی کو مزید گھسیٹا۔ فائٹ سین اچھا تھا لیکن یہ بات عجیب لگی کہ ایک بندہ جب جاسم پر حملہ کرتا تھا تو باقی سب سو کیوں جاتے تھے۔ ساکورا کا کردار دلچسپ ہے لیکن اس کی اچانک سے ہمدردی اور مدد مشکوک لگ رہی ہے۔ بیشتر کہانی باتوں یا وضاحتوں میں گزر جاتی ہے اس لیے صفحات میں اضافے کی درخواست ہے۔ فاروق انجم کی تلاش کا آغاز بہترین تھا۔ صفحے پلٹتے ہوئے کہانی نے لیکن ایسا پلٹا کھایا کہ دماغ ہی الٹ کر رکھ دیا۔ کہاں سے شروع ہونے والی کہانی ایسے مقام پر ختم ہوئی کہ بس سارا مزہ خراب ہو گیا۔ بلائے ناگہانی بھی اچھی رہی۔ شبِ نجات ایک بہتر شکار کہانی رہی۔ ہلکی پھلکی کہانی میں مگرمچھ شکار کرتے ہوئے مزہ آیا۔ سرورق کی کہانیوں کی بات کریں تو اس بار دونوں خواتین رائٹرز میں کانٹے کا مقابلہ رہا۔ زویا صفوان کی خواہش ناتمام البتہ اتنی شاندار لکھی ہوئی تھی کہ وہ اس مقابلے کی ونر رہیں۔ کرداروں کی بنت، الفاظ کا چناؤ، جذبات کا اتار چڑھاؤ اور کہانی کا سسپنس سب ہی لاجواب تھے۔ زویا صفوان کو اتنی زبردست کہانی لکھنے پر مبارکباد۔ اسما قادری کی کہانیوں کا انتظار رہتا ہے۔ مقتل سے گزر کر پرل گروپ کا نیا کارنامہ بنا کر پیش کی گئی۔ پہلا قتل ہونے سے قبل تک ایسا ہی محسوس ہوا کوئی زنانہ ڈائجسٹ پڑھا جارہا ہے لیکن شکر ہے بعد میں کہانی بہتر ہو گئی۔ کہانی کا کلائمیکس ایسا لگا کہ توجہ سے نہیں لکھا گیا ہے۔ کچھ واقعاتی غلطیاں بھی تھیں جیسے اتنے سرد موسم میں لسی کا استعمال۔ مجموعی طور پر بہرحال اچھی لگی کیونکہ کہانی کا آئیڈیا بہترین تھا۔ پرل گروپ سے ہٹ کر اس کہانی کو پیش کیا جاتا تو زیادہ بہتر تھا۔ یہ تھا اس ماہ کا تبصرہ۔ امید ہے فروری کا شمارہ اس سے بھی زیادہ مزیدار ہوگا۔'' (ہوسکتا ہے۔ اگر آپ کو پسند آجائے تو .....)

کراچی سے محمد اقبال کی توجہ طلب بات ''جنوری 2026ء کا جاسوسی اپنے منفرد انداز میں بک اسٹال پر دیکھ کر فوراً ہی خرید لیا اور سب کام پسِ پشت ڈال کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ منفرد اس لیے لکھا کہ شاید پہلی بار واحد خوب صورت حسینہ کے گرد چھ صنفِ کرخت نظر آرہے ہیں۔ ایک طرف نئے سال کی مبارک باد موجود ہے۔ میری جانب سے بھی تمام لوگوں کو نیا سال مبارک ہو۔ فہرست بھی عمدہ ہے۔ امجد رئیس اور اسما قادری کے نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اور یہ ہمیشہ کی طرح خوب صورت اور پُرامید ہے اور میں بھی پورے یقین سے آمین کہتا ہوں کہ ہمارا رب صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، ہمارا صبر رائگاں نہیں جائے گا، ان شاء اللہ۔ محفل میں محمد حامد مختار کھوکھر کی خوب صورت لفظوں سے مزین باتوں نے انہیں پہلے نمبر کا حق دار بنا دیا مبارکاں جی۔ یونہی سال بھر ترقی کرو۔ محمد حسنین کا مختصر تبصرہ بھی کافی جامع اور بھرپور تھا۔ شاہدہ مختار کی بے اختیاری اچھی لگی۔ کوٹری سے آفاق احمد کی آمد بھی عمدہ تھی۔ مبشر امیر کی پہلی حاضری اچھی لگی، امید ہے آتے رہیں گے۔ رفعت مقصود کی تعریف بھی لاجواب تھی۔ سب سے پہلے طاہر جاوید مغل کی سربکف پڑھی۔ یہ قسط بہت ہی سنسنی خیز رہی۔ بالآخر شاہ زیب کا بھانڈا پھوٹ ہی گیا اور شاہ زیب اور شاہ خانو کے درمیان زبردست ٹاکرے کے بعد شاہ زیب، تابش کی ٹیم کا حصہ بن گیا۔ ماہین کی اطلاع پر تابش اور شاہ زیب نے دشمنوں پر ہلا بول دیا۔ یہاں پر گوہار زینت کا ذکر بھی پڑھنے کو ملا جس کی موت پہلے ہی مشکوک تھی۔ اس نے یہاں بھی اپنی موت کو وقتی طور پر ٹال دیا ہے، انوش اور عمران کی مدد سے تابش اور شاہ زیب واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچ چکے ہیں۔ نسرین خان مختصر تحریر شبِ نجات کے ساتھ موجود ہیں۔ سالِ نو پر ایک خوب صورت تحفہ جس میں حیدر علی کی بہادری دکھائی گئی وہیں اس کا احساس ذمے داری بھی کہ وہ وائلڈ لائف کے ادارے میں ملازم ہے جس کا کام جانوروں کی حفاظت کرنا ہے، جان لینا نہیں۔ عکسِ فاطمہ کی درست آید عمدہ تحریر رہی۔ ہم اس لاش کا کیا کریں گے.....؟ اس جملے نے اسلیفن کے ذہن میں جو کھلبلی مچائی تھی بالآخر اس نے بھاگ دوڑ کر کے اس پھانس کو نکال ہی لیا۔ این نے جو جرم کیا ہی نہیں تھا، ایک لمبے عرصے اس کی سزا کاٹی اور آخر میں مجرم کو این نے ٹھکانے لگا دیا۔ مزہ آیا کہانی میں۔ بشریٰ امجد کی نہایت مختصر تحریر خطرناک سکہ اچھی تھی اور جتنی تحریر مختصر تھی سبق اتنا ہی بڑا تھا۔ چور کو بھی تو اپنے انجام کو پہنچنا تھا۔ آسان ٹارگٹ پروفیسر خلیل جبار کی عمدہ تحریر رہی۔ سفیان جو کہ ایک دل پھینک قسم کا نوجوان

تھا، اسی باعث وہ بینش کے گروہ کے جھانسے میں آ گیا۔ بالآخر اس کے دوست غلام قادر نے اس کا مسئلہ حل کرا دیا اپنے دوست پولیس آفیسر کے ذریعے، حیران نہ ہوں پولیس میں بھی بہت اچھے لوگ ہوتے ہیں۔ حسام بٹ کی دہر کی یہ قسط بھی مناسب رہی۔ کچھ ایکشن جاسم نے دکھایا اور پورنیل حسینہ کی مدد سے دشمنوں کے چھکے چھڑانے کے بعد وہ ایک محفوظ جگہ پر پہنچ گیا۔ دوسری جانب ڈینئل کاری کے اعصاب پر جاسم اس بری طرح سوار ہو گیا ہے کہ ڈینئل کاری اپنے ہی محفوظ ترین گھر میں خود کو غیر محفوظ خیال کر رہا ہے۔ حسنیہ کی حقیقت بھی کاری پر کھل گئی ہے، آگے دیکھتے ہیں حسنیہ کا کیا بنتا ہے۔ ایک جھلک ہی سہی جاسم نے اپنے دوست کامل اور ناجیہ کو بھی خواب میں دیکھ لیا۔ اب آخر میں کہانی پھر سنسنی خیز موڑ پر ختم ہوئی ہے۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ اسما قادری پرل گروپ کے ساتھ حاضر ہوئیں سالِ نو کے شمارے میں۔ امید ہے کہ اس سال اسما قادری قارئین کے لیے اچھی کہانیوں کے ساتھ آتی رہیں گی۔ کہانی کا نام ہی انوکھا سا لگا۔ مقفل سے گزر کے۔ گرینی نے اپنی نواسی کو داماد سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر اس کی تمام تر احتیاط کے باوجود گل مینا اپنے باپ کی جانب متوجہ ہو گئی اور آخر کار اپنے باپ کے ساتھ ہی ماری گئی۔ دردناک انجام ہوا کہانی کا۔ زویا صفوان کی خواہش با تمام مناسب کہانی تھی۔ جس میں سعد اپنے والدین کی بے توجہی کا شکار ہو کر برباد ہو گیا۔ بہر حال ایک سبق ضرور ہے کہانی میں کہ اولاد کے رجحان کو دیکھتے ہوئے انہیں ہینڈل کیا جائے۔"

کراچی سے شاہدہ مختار کی تحسین "ماشاء اللہ جنوری 2026ء کا شمارہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موصول ہوا۔ خوب صورت حسینہ کے چاروں طرف پروانے آپس میں برسرِ پیکار ہیں۔ حسینہ بے نیاز ہے۔ نئے سال کی فہرست میں امجد رئیس کے ساتھ اسما قادری کا نام دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ اداریے کی کیا بات کی جائے بہت اچھے انداز میں لکھا گیا جو بہت پسند آیا۔ محفل میں محمد حامد مختار کھوکھر کو مبارک باد، اچھا تبصرہ تھا۔ باقی سب لوگوں کے تبصرے.... اچھے لگے۔ مبشر امیر کو خوش آمدید۔ سب سے پہلے حسام بٹ کی دہر پڑھی۔ جاسم کی مدد کے لیے یہاں بھی ایک مددگار پورنیل حسینہ موجود ہے جس نے اپنا کردار بخوبی نبھا دیا۔ ڈینئل کاری کے خوف نے کہانی کا مزہ دوبالا کر دیا۔ جاسم کے ہاتھوں اس کی درگت کا انتظار ہے۔ اس کے بعد طاہر جاوید مغل کی سربکف شروع کی۔ کہانی کا ٹیمپو بہت عمدگی سے آگے بڑھ رہا ہے اور نئے نئے کردار سامنے آتے جا رہے ہیں۔ اب یقیناً یہ دونوں ہیرو اپنے دشمنوں کا مل کر مقابلہ کریں گے بلکہ ان کا صفایا بھی کر دیں گے۔ ماہین بھی ایکشن میں ہے۔ عمران کی جملے بازیوں کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ پہلوان حشمت اس کمی کو کہیں کہیں پورا کرتا نظر آتا ہے۔ بہر حال کہانی اچھی چل رہی ہے، اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ پروفیسر خلیل جبار کی آسان ٹارگٹ اچھی لگی۔ پولیس آفیسر کا کردار اچھا لگا۔ نسرین خان کی شب نجات بھی بہت پسند آئی۔ اس میں حیدر علی کا کردار متاثر کن تھا۔ عکس فاطمہ کی مختصر تحریروں کی طرح درست آید بھی اچھی کہانی تھی۔ بشریٰ امجد کی خطرناک سکہ بھی بہت پسند آئی۔ امجد رئیس کی سرکتے لمحے آخر میں پڑھنے کے لیے چھوڑ دی ہے۔ دونوں حصے ایک ساتھ پڑھوں گی۔ مقفل سے گزر کے، اسما قادری نے قارئین کے لیے ایک عمدہ تحریر تخلیق کی۔ پرل گروپ نے اپنی جان پر کھیل کر کہانی میں جاری کھیل کو اس کے انجام تک پہنچایا۔ گل مینا کا انجام برا ہوا مگر سب سے برا گرینی کے ساتھ ہوا۔ اس عمر میں اپنے ہاتھ سے نواسی کو گولی مارنا آسان بات نہیں۔ عمدہ تحریر تھی۔ مرزا عمران بیگ کی تحریر بلائے ناگہانی میں فائزہ اپنے لالچی رشتے داروں کی طرف سے پریشان رہی۔ ڈاکٹر احسن نے اسے ان پریشانیوں سے نکالا۔"

اوستہ محمد سے غوث بخش مہیسر کی ثبت "سب سے پہلے آپ سب کو سال 2026ء اور جاسوسی ڈائجسٹ کی 56ویں سالگرہ بہت، بہت مبارک ہو۔ دعا ہے رب کائنات اس نئے سال کو ہم سب کے لیے پورے پاکستان کے لیے تمام اُمتِ مسلمہ کے لیے اور ساری دنیا کے لیے صحت و تندرستی، خوش حالی، امن و آشتی کا سال ثابت ہو، آمین۔ جنوری 2026ء کا پہلا شمارہ طویل انتظار کے بعد 15 جنوری کو موصول ہوا۔ شمارہ ہاتھ میں آتے ہی اطمینان کی سانس لی۔ کئی سال پہلے تک جاسوسی ڈائجسٹ ہمارے شہر اوستہ محمد میں بھی مل جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کی دستیابی مشکل ہو گئی اور آخر کار وہ ہمارے شہر میں ملنا بند ہو گیا۔ لیکن میرا جاسوسی ڈائجسٹ سے ایسا جاہت بھرا تعلق جڑا ہے کہ اسے پڑھے بغیر میرا گزارہ نہیں ہوتا۔ حالیہ ایک سال سے میں جاسوسی ڈائجسٹ سکھر سے بذریعہ ڈاک منگوا رہا ہوں تو اسی وجہ سے ڈائجسٹ مجھ تک پہنچنے میں کئی دن لگ جاتے ہیں اور پھر انتظار کی تھکن اتر جاتی ہے۔ تبصرے کی طرف آتا ہوں۔ جنوری 2026ء کا سرورق انتہائی خوب صورت اور دیدہ زیب تھا۔ ایک خوب صورت ماہ جبیں سیاہ ریشمی بال کھولے اپنی سرمئی آنکھوں سے سامنے تکنے میں معروف تھی۔ اس کے

عقب میں اوپر ایک آدمی دوسرے آدمی کو منہ پر ہاتھ رکھ کر جکڑے ہوئے تھا۔ دوسرا آدمی غالباً فوجی تھا۔ جبکہ نیچے دو تین لوگ آپس میں گتھم گتھا تھے اور ان میں مُکے بازیاں چل رہی تھیں۔ انہیں لڑتا ہوا چھوڑ کر میں آگے بڑھ گیا اور چینی اور نکتہ چینی کی خوب صورت محفل میں پہنچ گیا۔ جہاں مدیر قارئین کو نئے سال کی مبارک باد دیتی نظر آئیں۔ خیر مبارک ..... سال 2026ء کی پہلی کرسیِ صدارت محترم محمد حامد مختار کھوکھر صاحب سنبھالے نظر آئے۔ آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ اپنے خط میں آپ نے مجھے یاد رکھا۔ بہت شکریہ۔ آپ کا تبصرہ بہترین تھا۔ محترم محمد حسنین مختصر عرصے بعد دوبارہ محفل کی رونق بنے۔ اچھا لگا۔ محمد اقبال کا تفصیلی تبصرہ بھی بہت پسند آیا۔ آپ نے بھی اپنے خط میں مجھے یاد رکھا۔ بہت شکریہ محترم مبشر امیر نے محفل میں پہلی دفعہ شرکت کی ہے۔ خوش آمدید آپ کے خط میں اپنا ذکر پڑھ کر دلی خوشی محسوس ہوئی۔ آپ کا تبصرہ بھی بہترین تھا۔ دل سے دعا ہے کہ اللہ پاک آپ کے لیے آسانیاں پیدا فرمائے اور آپ جلد رہا ہو کر اپنے گھر اپنوں کے پاس پہنچ جائیں۔ آمین۔ محترمہ شاہدہ مختار، محترمہ رفعت مقصود اور محترم آفاق احمد نے بھی اچھے تبصرے کیے۔ یہ دیکھ کر مجھے افسوس ہوا کہ اس ماہ میرا تبصرہ شاملِ محفل نہیں تھا۔ معلوم نہیں میرا خط ڈاک والوں سے راستے میں کہیں لاپتا ہو گیا ہے یا پھر جاسوسی ڈائجسٹ کی انتظامیہ کے پاس دیر سے پہنچا ہو۔ (نہیں ملا) اس وجہ سے محفل میں جگہ نہ بنا سکا۔ یہ تو خدا ہی جانے۔ اس کے بعد کہانیوں میں سب سے پہلے خلیل جبار کی تحریر آسان ٹارگٹ پڑھی۔ سفیان کو اس کی کسی نیکی نے جرائم پیشہ گروہ کے ہتھے چڑھنے سے بچا لیا۔ آج کل اکثر ایسے فراڈ پر مبنی واقعات دیکھنے کو اور سننے کو مل جاتے ہیں۔ بشریٰ امجد کی تحریر خطرناک سکہ پڑھی۔ کارل شیئر نے نہایت چالاکی سے قیمتی سامان ہتھیانے کا پروگرام بنایا تھا۔ وہ اس میں کامیاب بھی ہو جاتا۔ اگر وہ جلد بازی میں کریزی ایڈی کو ڈالر کے بجائے اس کا من پسند کوارٹز تھما دیتا۔ اچھی کہانی تھی۔ پھر عائشہ نصیر کی سراب پڑھی۔ جولین کی زندگی کی ناکام جدوجہد سے متعلق تھی۔ آخر میں وہ بھی ناکام ہو گئی اور موت سے ہمکنار ہو گئی۔ اس کے بعد عکس فاطمہ کی تحریر درست آید پڑھی۔ اسٹیفن اور این کی خوشگوار اور محبت بھری ازدواجی زندگی میں ماضی کے ایک قتل کی بازگشت کا سنائی دینا اور پھر آخر میں این کا کمی گارلینڈ کو ختم کرنا۔ نہایت متاثر کن کہانی تھی۔ مرزا عمران بیگ کی تحریر بلائے ناگہانی پڑھی۔ یتیم فائزہ کو اس کے سگے لالچی رشتے داروں کی طرف سے جان سے مارنے کا خطرہ درپیش تھا۔ پھر خدا نے ڈاکٹر احسن کی صورت میں اس کے لیے مسیحا بھیج دیا۔ یوں وہ زندگی بھر ان خطرات سے محفوظ ہو گئی۔ نہایت بہترین کہانی تھی۔ اس کے بعد نسرین خان کی تحریر شبِ نجات پڑھی۔ گاؤں والوں کی آبی آفت سے نجات کا ذریعہ حیدر علی بنا۔ سسپنس اور تھرل سے بھرپور کہانی تھی۔ مزہ آ گیا۔ باقی ابتدائی ناول قسط وار کہانیاں اور سرورق کے رنگ ابھی تک نہیں پڑھے۔ جلدی، جلدی خط لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ تاکہ میرا خط جاسوسی کی خوب صورت محفل کا حصہ بن سکے۔ اِن شاء اللہ زندگی رہی تو ایک بار پھر جاسوسی کی خوب صورت محفل میں اپنے تبصرے کے ساتھ حاضرِ خدمت ہوں گا۔"

اسلام آباد سے حنا عمران کی نپی تلی باتیں "ایک اور نیا سال شروع ہو گیا۔ اکیسویں صدی نے اپنا ربع سفر طے کر لیا۔ جب سے یہ نیا سال شروع ہوا ہے، دل کو ایک عجیب سی اداسی نے گھیر رکھا ہے۔ ابھی کل کی ہی تو بات لگتی ہے جب نئی صدی کا آغاز ہوا تھا۔ دل میں امنگوں کے ترانے تھے تب ایک ہی نغمہ زبان زدِ عام تھا۔ دیکھو 2000ء زمانہ آ گیا۔ مل کے جینے کا بہانہ آ گیا۔ اللہ اللہ اس بات کو بھی ربع صدی بیت گئی ہے۔ ہم بھی دھیرے دھیرے اپنے زوال اور غروب کی طرف گامزن ہیں۔ اب تو شاید بونس ہی چل رہی ہے عمر۔ (ایسی بات تو نہ کرو .....) ابھی اس لمحہ جب میں یہ سطور لکھ رہی ہوں ٹی وی پر گل پلازا میں آتشزدگی کی خبر بھی چل رہی ہے۔ امید ہے جاسوسی فیملی بخیر و عافیت ہو گی۔ ڈائجسٹ کی بات کریں تو سب سے پہلے چینی نکتہ چینی کا ہی رخ کیا جاتا ہے۔ محمد حامد مختار نے اچھی حاضری دی۔ انہوں نے بالکل درست کہا۔ میری کیفیت واقعی ایسی تھی۔ ایسا لگتا ہے میں ہواؤں میں ہوں آج اتنی خوشی ملی ہے۔ محمد حسنین کی تمنا میری بھی خواہش ہے لیکن زمینی حقائق بھی نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ اسکرین کا نشہ کتابیں نگل گیا ہے۔ محمد اقبال کا شکریہ مبشر امیر نے میرے جذبات کی خوب ترجمانی کی رفعت مقصود نے بھی بہت دلنشین نکتہ اٹھایا۔ کہانیوں میں امجد رئیس کا نام ہی منور لجن کی گارنٹی ہے لیکن سرکتے لمحہ مکمل ہونے پر ہی پڑھوں گی۔ سرکٹ نے تو سخت سردی میں بھی لہو گرما دیا۔ کہانی نے وہی رفتار پکڑ رکھی ہے جو مغل صاحب کے قلم کا خاصہ ہے۔ آسان ٹارگٹ نے جھرجھرا دیا۔ فراڈ اور لوٹ مار کے نت نئے طریقے چل رہے ہیں۔ سراب نے زیادہ متاثر نہیں کیا۔ خطرناک سکہ بہتر تھی۔ تلاش میں فاروق انجم جم کے مالک اور انسپکٹر کی پہلی ملاقات میں تھوڑا اور رنگ بھرتے تو زیادہ مزہ آتا۔ شبِ نجات پڑھتے ہوئے سنسنی محسوس ہوئی۔ بلائے ناگہانی بالکل متاثر نہیں کر پائی۔ خواہش ناتمام میں سعد پر بہت ترس آیا۔ والدین کی ہٹ دھرمی نے اس کے خوابوں کا گلشن اجاڑ دیا۔ اسما قادری حسبِ روایت نئے سال پر

پرل گروپ کو ایکشن میں لے آئیں۔ گل مینا پر میرا شک درست ثابت ہوا۔ آغاز میں تعلیمی اداروں کے لیے تحفظات بجا تھے۔ مزہ آیا کہانی پڑھ کے۔ اگلے ماہ تک کے لیے اجازت۔"

حیدرآباد سے عائشہ کامران کی اطمینان بخش باتیں "نئے سال کا پہلا شمارہ ہاتھوں میں آیا تو دل خوش ہوگیا۔ ٹائٹل کی خوب صورت حسینہ بہت اچھی لگی۔ نئے سال کی مبارک باد بھی نظر آرہی ہے۔ صنفِ کرخت کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ جنوری کا ٹائٹل بھرپور اور اچھا لگ رہا ہے۔ میری اور میرے شہر کی جانب سے تمام پڑھنے والوں کو نیا سال مبارک ہو۔ فہرست بھی نپی تلی بنائی گئی ہے۔ امجد رئیس کی کہانی کا نام سرکتے لمحے سے اندازہ ہو رہا ہے کہ کہانی بہت بہترین ہوگی۔ اداریے میں بہت خوب صورتی سے اللہ پاک سے دعا کی گئی ہے۔ شعر دونوں ہی اچھے لگے۔ محفل میں محمد حامد مختار کھوکھر کو سالِ نو پر کرسیِ صدارت کی مبارک باد۔ دیگر احباب کے تبصرے بھی پسند آئے۔ ماہ دسمبر اور جنوری میں حیدرآباد کی سردیاں کراچی سے قدرے زیادہ ہوتی ہیں۔ یہاں کی سردی کا اپنا ہی مزہ ہے۔ رات میں تمام کاموں سے فارغ ہوکر کہانی پڑھنے کا مزہ آجاتا ہے۔ سب سے پہلے تو حسام بٹ کی دہر پڑھی۔ وہاں جو سردی کا عالم بتایا گیا ہے اس کے آگے حیدرآباد کی سردی کچھ بھی نہیں۔ بہرحال جاسم کی حاضر دماغی اور پورنیمل حسینہ کی مدد سے جاسم دشمنوں کے نرغے سے توفوری طور پر نکل گیا۔ ساکورا، جاسم کو ڈیفنل کارمی تک پہنچانے میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ ڈیفنل کارمی جس کے نام سے دشمنوں میں تھرتھری مچ جاتی ہے، وہ خود جاسم کے خوف میں مبتلا ہے، پڑھ کر اچھا لگا۔ آخر میں ساکورا بھی خوف سے کانپ رہی ہے اور جاسم کی حالت کیا ہوئی اگلی قسط میں معلوم ہوگا۔ اس کے بعد طاہر جاوید مغل کی سرمک شروع کی۔ سرد ترین رات میں کہانی کا پڑھنے کا لطف دوبالا ہوگیا۔ ایکشن اور سنسنی خیز واقعات نے سردی کو دور بھگا دیا۔ شاہ زیب نے شاہ خانو کے چھکے چھڑا دیے اور تابش سے جا ملا۔ اس قسط میں ماہین بھی حرکت میں نظر آئی۔ تابش اور شاہ زیب دشمن کے خلاف حرکت میں آئے اور حرکت میں آنے کی برکت سے بہت سارے معاملات ظاہر ہوگئے جن میں سہراب میرزادہ اور گوہار زینت سرفہرست ہیں۔ انوش، عمران اور پہلوان کی بروقت امداد پہنچنے کے بعد تابش اور شاہ زیب بالآخر اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ عمران بدستور ناراض ہی ہے۔ آسان ٹارگٹ، پروفیسر خلیل جبار کی مناسب تھی۔ شبِ نجات نسرین خان کی اچھی کاوش تھی جس میں حیدر علی نے اپنی ذمے داری کو بخوبی نبھایا اور اپنے ادارے کے نام کی لاج رکھی۔ مس فاطمہ کی درست آید متاثر کن تحریر رہی۔ اسما قادری کی مقتل سے گزر کے ایک عمدہ تحریر رہی۔ گرینی اپنی تمام تر کوشش کے باوجود گل مینا کو اس کے باپ سے دور نہیں کرسکی اور گل مینا بالآخر باپ کی باتوں میں آگئی اور اپنے باپ کا ساتھ دیا۔ آخر میں اپنی نانی گرینی کی گولی کا شکار ہوئی۔ کہانی کی جان پرل گروپ کی چاروں دوستوں نے بھی بہت محنت سے اپنا کردار ادا کیا۔ ویلڈن اسما قادری۔"

سیالکوٹ سے رفعت مقصود "جنوری کا جاسوسی ڈائجسٹ ملا۔ سرورق کی لڑکی نے گرم سوٹ پہنا ہوا تھا۔ مرد نے بھی کوٹ پہنا ہوا تھا۔ سرورق پر قتل و غارت بھی جاری تھی۔ اداریہ اچھا تھا، واقعی سال بہت جلدی گزرتے ہیں۔ محمد حامد مختار، محمد اقبال اور قیدی نمبر میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ اپنا خط دیکھ کر اچھا لگا۔ امجد رئیس کی کہانی سرکتے لمحے کے اگلے حصے کا انتظار ہے۔ خلیل جبار کی آسان ٹارگٹ بہت اچھی کہانی تھی، اختتام بہت جان دار لگا۔ بشریٰ امجد کی کہانی خطرناک سکہ میں اسے کریزی ایڈی کو وارننگ دی دینا چاہیے تھا۔ طاہر جاوید مغل کا ناول سرِ بہ کف کا دسواں حصہ اچھا تھا۔ عائشہ نصیر کی کہانی سراب میں جولین دولت کے لالچ میں قتل کرتے خود بھی قتل ہوگئی۔ مس فاطمہ کی کہانی درست آید میں اسٹیفن اپنی بیوی این سے محبت کرتا اور اس کا بہت ساتھ دیتا ہے۔ حسام بٹ کے ناول دہر کی تینتالیسویں قسط بھی اچھی رہی۔ محمد فاروق انجم کی کہانی تلاش میں ناصر کرن کو تنگ کرتا اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ مرزا عمران بیگ کی بلائے ناگہانی میں لالچی رشتے دار گھر کے لالچ میں جان کے دشمن بن جاتے ہیں اور سیجا محافظ بھی بن جاتا ہے۔ نسرین خان کی کہانی شبِ نجات میں حیدر نے گاؤں کے باسیوں کو مگرمچھ سے نجات دلائی بلکہ اسے جنگلی حیات کے ادارے کے حوالے بھی کردیا۔ سرورق کی پہلی کہانی زویا صفوان کی خواہشِ ناتمام کے اختتام نے دکھی کردیا۔ سرورق کی دوسری کہانی اسما قادری کی مقتل سے گزر کے اچھی تھی۔ شکر ہے کہ وہاں غلط چیزیں ختم ہوئیں۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہوسکے۔
فہیم احمد، حیدرآباد۔ زینب فاطمہ، بھالیہ۔ علی حسن، سکھر۔ رانا گھگھام، گجرات۔ شاہینہ ریاض، کراچی۔ آفتاب احمد، حیدرآباد۔ گلدین خان، پشاور۔ وقار احمد، میرپور خاص۔ شفیع اللہ، پشاور۔

اِک طلسم خوش جمال

22 فروری 2019، بروز جمعۃ المبارک ..... معراج رسول صاحب اس فانی دنیا کو الوداع کہہ کر سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے تھے۔ معراج صاحب سے قربت ..... ان کے شب و روز کے حوالے سے بہت سی باتیں اور بہت سی یادیں ہیں ..... ان کے قصے ہیں ..... اَن کہی داستانیں ہیں ..... بقول شاعر

وہ کہانیاں ادھوری جو نہ ہو سکیں گی پوری ..... انہیں میں بھی کیوں سناؤں انہیں تم بھی کیوں سناؤ

لیکن معراج صاحب کی ہستی میں ایسا طلسم تھا کہ ہر سال یادوں کا ایک خزانہ مل جاتا ہے ..... ہر دفعہ ان کی شخصیت میں چھپی کوئی نہ کوئی نئی بات سامنے آتی ہے اور پڑھنے والوں کو تحیر زدہ کر دیتی ہے ۔

محفلوں اور دوستوں میں گھلے ملے رہنے کی زندگی گزارنے والے معراج صاحب انتہائی سنجیدہ مزاج اور تنہائی پسند تھے ..... مگر اپنے مصنفین اور دوستوں کی انجمن میں وہ کیسے تھے ..... ان کی شخصیت اور عادات و اطوار سے جڑی بہت سی باتیں مصنفین کے قلم سے آپ کی منتظر ہیں .....

ستارے چاہتے ہیں ماہتاب مانگتے ہیں ..... مرے دریچے نئی آب و تاب مانگتے ہیں
وہ خوش خرام جب اس راہ سے گزرتا ہے ..... تو سنگ وحشت بھی اذنِ خطاب مانگتے ہیں

خوشبو

کچھ یادیں پرانے پیڑوں کی طرح ہوتی ہیں۔ جتنی پرانی ہوں اتنی زیادہ خوشبو دیتی ہیں۔ معراج صاحب کی یادیں بھی ایسی ہیں جن کی مہک گزرنے والے ماہ و سال کے ساتھ بڑھتی ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں آج سے 80،70 سال کے بعد شاید ہم موجود لوگوں میں سے کوئی بھی نہ ہو۔ معدودے چند لوگ ہمیں جانتے ہوں، یاد کرتے ہوں۔ مگر معراج صاحب جیسی شخصیات ہر دور میں لاتعداد ذہنوں کے اندر جگمگاتی رہتی ہیں۔ لوگ انہیں ان کے کام، ان کی جدوجہد، استقامت اور اخلاق کے حوالوں سے ذہنوں میں محفوظ رکھتے ہیں۔ مستقبل کے لوگ 1960ء کی دہائی کے اس جواں ہمت کو کیسے بھول پائیں گے جس کا نام معراج رسول تھا۔ جس نے کراچی کے اندر ایک نہایت دشوار موسم اور

سخت زمین میں ہم نے ایک شاخ لگائی۔ اسے اپنے خون پسینے سے سینچا، اس میں الفاظ کے خوب صورت پھول کھلائے۔ اسے شبانہ روز محنت سے ایک تناور درخت بنایا۔ بے شمار لوگ اس درخت کے خوشبودار سائے سے مستفید ہوئے..... ہوتے رہے..... ہوتے رہیں گے۔ اس باغباں کو کبھی بھلایا نہیں جا سکے گا۔ آج نہ کل نہ آئندہ کبھی.....

پاکستان میں عوام الناس کو الفاظ کی خوشبو سے آشنا اور مطالعے کی طرف راغب کرنے کا سہرا جن دو چار شخصیات کے سر بندھتا ہے، ہمارے معراج رسول صاحب کا نام ان میں نمایاں تر ہے۔ ان کی برسی پر تہِ دل سے ان کے لیے مغفرت اور بلند درجات کی دعا..... ایک مشہور شعر یاد آ رہا ہے...

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی..... ایک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا۔

ویرینہ ہدم، طاہر جاوید مغل

کھینچ لائے ماہ و سال کہاں

جہاں تک ڈائجسٹوں کی دنیا کا تعلق رہا ہے..... حسرت گزیدہ کو تین ہستیوں نے بے حد متاثر کیا۔ تینوں اپنے اپنے ادارے کے روحِ رواں تھے۔ تین میں سے دو سے ملاقات ہو گئی تھی۔ نہیں ہوئی تو معراج صاحب سے نہ ہوئی، حسرت ہی رہی۔ قدرے روانی سے جس گروپ کے لیے لکھنا شروع کیا، وہ جے ڈی پی گروپ تھا۔ ایک دہائی بیت گئی جیسے کل کی بات ہو۔ مدیرہ جاسوسی نے چند روز قبل معراج صاحب کی ساتویں برسی کی اطلاع دی..... اُف.....

چشمِ خون بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا

سات برس بیت گئے۔ شکستہ قلم سے کیا لکھوں۔ معراج صاحب اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ عذرا رسول صاحبہ کے کندھوں پر ادارے کو سنبھالنے کی بھاری ذمے داری ہے۔ جسے وہ دل و جان سے نبھا رہی ہیں۔ گویا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام

میں عالمِ تصور میں معراج صاحب کی ہمہ صفت ادارہ ساز شخصیت اور گوناگوں خوبیوں کو پڑھنے کی کوشش کرتا..... آخری برسوں میں ملاقات کا یقین ہو چلا تھا لیکن وہ گھر پر شدید علیل ہونے کے باعث طویل عرصے تک آفس نہ آ سکے۔ حسرت زندہ رہے تو دم رکھتی ہے۔ بالآخر وہ بھی دم توڑ گئی۔ اللہ تعالیٰ اُن کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

حسرت گزیدہ، امجد رئیس

کچھ تو پیکر میں تھا

اتر پردیش کے صدر مقام "لکھنؤ" کے قلب میں، ریلوے اسٹیشن سے محض تین کلومیٹرز کی مسافت پر واقع "امین آباد" کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آج یہ قدیم اور معروف ترین شاپنگ ڈسٹرکٹ کہلاتا ہے اور اسے دہلی کے "چاندنی چوک" کا ہم پلہ بھی سمجھا جاتا ہے مگر ماضی میں امین آباد ایسا گنجان اور ترقی یافتہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ چوراسی برس قبل، پانچ اگست بدھ کی صبح اسی امین آباد سے تعلق رکھنے والے شیخ گھرانے میں ایک بیدار مغز، بخت یار اور اقبال مند بچے نے آنکھ کھولی تو اس کے نام کا معاملہ درپیش ہوا۔ والدہ ماجدہ علاقے کے ایک بلند پایہ، مایۂ ناز اور زود رس معالج کی شخصیت، حسنِ اخلاق اور روشن خیالی سے حد درجہ متاثر تھیں۔ ایک وہی نہیں، وہاں کے لوگ عبادت کے درجے تک ڈاکٹر موصوف کا ادب و احترام کیا کرتے تھے۔ سو، والدہ صاحبہ کی خواہش کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے، ڈاکٹر صاحب کے نام پر اس بچے کا نام معراج رسول رکھ دیا گیا۔

بعد ازاں، وقت نے ثابت کیا کہ بچے کے نام کے حوالے سے والدہ صاحب کا انتخاب صد فیصد درست تھا۔ وہ اس ڈاکٹر کی طرح اپنے بیٹے کو عظمت کی رفعت پر دیکھنے کی تمنائی تھیں۔ ماں نے جو چاہا، بچے نے وہ کر دکھایا۔ بڑے ہو کر اس نے سماجی لباس کا کردار اپنا لیا۔ وہ عام ڈاکٹر کے طور انسانی بدن کا علاج کرنے کے بجائے انسان کے جذبات اور احساسات کی رفوگری میں مصروف ہو گیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک کے بعد ایک..... ان کے قائم کردہ ادارے سے نکلنے والے پانچ میگزین پورے قد کے ساتھ کھڑے ہو کر اپنی معاشرتی ذمے داری نبھانے لگے اور یہ سلسلہ ان کے بعد بھی جاری ہے۔

معراج رسول صاحب کی وجہِ شہرت "ڈائجسٹ" ہے۔ وہ پاکستان میں ڈائجسٹ انڈسٹری کے بے تاج بادشاہ تھے۔ ان کی ذات اور کمالات پر اتنا زیادہ لکھا جا چکا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا، کہاں سے شروع کیا جائے۔ ہر جملہ پہلے سے کہا ہوا اور ہر فقرہ قبل ازیں سنا ہوا محسوس

تا ہے۔ انہیں خراجِ تحسین پیش کرنے والا چکرا کر رہ جاتا ہے ..... !معراج رسول صاحب طبعاً کم سخن تھے۔ انہیں شرمیلے کہنا بھی بے جا نہیں گا مگر محفلِ ہم نفساں میں ان کا بیان دیکھنے اور سننے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایسے مواقع پر ان کے اندر کا ہمہ صفت انسان جلوہ افروز ہو جاتا پھر ان کے سامنے بڑے بڑے گفتار کے غازیوں کا چراغ جلنا ناممکن ہو جاتا۔

یہ تو طے ٹھہرا کہ ہر آنے والے کو ایک دن جانا بھی ہے۔ دستورِ زمن یہی ہے کہ زندگی میں انسان کو اور مرنے کے بعد اس کے کام کو یاد جاتا ہے۔ معراج رسول صاحب ان معدودے چند منفرد، انمول اور یادگار افراد میں سے ایک تھے جن کا نام اور کام وقت کی یادداشت ں محفوظ رہے گا ..... ہمیشہ کے لیے!

نہ گل ہیں، نہ غنچے، نہ بوٹے، نہ پتے ..... ہوئے باغ نذرِ خزاں کیسے کیسے!

قلم کار، حسام بٹ

نئے موسم، نئی کونپلیں

ایک بار پھر فروری کی آمد ..... ایک بار پھر چند زخموں کے منہ کھل جائیں گے۔ اس ستم گر مہینے میں نی الدین نواب، کاشف زبیر اور معراج رسول کو ہم سب سے جدا کر دیا تھا۔ ان کا گمشن اس وقت ایک کٹھن دور سے گزر رہا ہے۔ آج میرے ذہن پر چند سال پہلے کا ایک اقعہ دستک دے رہا ہے۔ ان دنوں ہم نے لاہور میں اپنی رہائش گاہ تبدیل کی تھی۔ شومئی قسمت گھر سے باہر ہی سڑک پر ایک بک شاپ تھی۔ کاندار سے پوچھا کہ آپ ڈائجسٹس وغیرہ رکھتے ہیں کیا؟ اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "باجی ڈائجسٹ کون پڑھتا ہے اب؟" میں اس جوابی سوال پر ساکت رہ گئی۔ اس سے کہا، پڑھتے ہیں اب بھی ..... ہم پڑھتے ہیں۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے موبائل کی طرف اشارہ کیا ور کہنے لگا "اب سب کچھ یہی ہے باجی۔ لوگ اس کے عادی ہیں۔ ڈائجسٹ کوئی نہیں پڑھتا۔ خیر آپ ایڈوانس دے جائیں گی تو لا دیا کروں گا۔" اس کی باتوں نے میرے دل کو سخت ٹھیس پہنچائی۔ معراج رسول کی برسی کے اس مہینے میں آج ان سطور کے توسط میں آپ سب سے ایک سوال کرنا چاہتی ہوں۔ ہم سب معراج رسول صاحب کے معتقد ہیں۔ ان کی محنت اور محنت کو سراہتے ہیں۔ ان کے اس گمشن نے کم از کم مجھے توجینے کا ڈھنگ سکھایا ہے۔ انسانی رویے اور نفسیات پڑھنی سکھائی ہے۔ یقینی طور پر آپ سب نے بھی اس گمشن سے کچھ نہ کچھ تو حاصل کیا ہی ہے۔ اب میرا سوال یہ ہے کہ بدلے میں ہم اس گمشن کے لیے کیا کر پائے ہیں؟ ہم نے اپنی نسلِ نو کو مطالعے کی طرف راغب کیا ہے کیا؟ ہم نے انہیں موبائل فون دے کر ایک گڑھے کے دہانے پر تو کھڑا کر دیا ہے لیکن کیا انہیں کتاب سے محبت سکھائی ہے؟ کیا آپ کے بچے معراج رسول صاحب کی محنت اور ان کے اس گمشن کی خوب صورتی سے واقف ہیں؟ آپ نے معراج صاحب کی محبت کے لیے کیا کیا ہے؟ ذرا ..... نہیں ..... بہت سا سوچیے اور محض افسردہ ہونے کے بجائے اپنی محبت کا ثبوت دیجیے۔

پُرامید، زویا صفوان، برمنگھم

پرانی یادوں سے

قریباً 1998ء سے جب میں نے سسپنس، جاسوسی اور سرگزشت میں مختصر کہانیاں لکھنا شروع کیں تو مجھے بڑا اشتیاق تھا معراج صاحب سے ملنے کا مجبوری میری یہ تھی اس وقت میں جیکب آباد میں تھا، کبھی سرکاری کام سے کراچی آنا ہوتا تو دفتر کا چکر بھی لگتا، فراز صاحب اور لبنیٰ صاحبہ سے ہی زیادہ تر ملاقات ہوتی، ہوئے اتفاق معراج صاحب بیرونِ ملک ہوتے، پھر "خارزار" پر کام کی ابتدا ایک نیم کی شکل میں ہوئی جس میں سید انور فراز اور بعد میں تعلیم علیم صاحب سے ذرا طویل ملاقات رہی اور معراج صاحب سے ملنے کی پوری امید ہوئی لیکن بدقسمتی سے کچھ معاملہ دیر سویر کا ہو گیا اور مجھے بھی کچھ جلدی تھی، جیکب آباد بھی اسی روز لوٹنا تھا، اس کے بعد ایک عرصہ گزرا۔ اس دوری کے سبب ہائی چانس بھی ملنے کا موقع نہ ملا لیکن دیکھیے ملے بھی تو کہاں، بستر علالت پر کہ پہچان بھی نہ پائے ..... وہ ملاقات ایک رائٹر اور ایڈیٹر کی نہیں، ایک معالج اور مریض جیسی تھی۔

اللہ کے کام اللہ ہی جانے بہرکیف ..... آج معراج صاحب کو بچھڑے عرصہ بیت چلا مگر وہ "ملاقات" آج بھی یاد آتی ہے تو دل افسردہ ہو جاتا ہے۔ ٹھیک ہے کہ پہلی اور آخری ملاقات نہیں بھلائی جاتی۔ اللہ معراج صاحب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، بہت قدآور اور نادرِ روزگار شخصیت تھے۔

متمنیِ ملاقات، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قلم سرخرو ہے

معراج رسول ... وہ ایک شخص جس نے ہمیں قاری اور لکھاری دونوں ہی بننا سکھایا۔ ایک ایسا نام، ایک ایسی شخصیت جن کا ذکر جب بھی ہو تو ایک ہی خیال ذہن میں آتا ہے کہ اگر یہ نہ ہوتے تو جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشن بھی نہ ہوتا۔ اور اگر جاسوسی نہ ہوتا تو مجھ سمیت بہت سے رائٹرز بھی منظر عام پر نہ آتے۔ افسوس یہ ہے کہ پاکستان میں پڑھنے لکھنے کا رجحان ہمیشہ زبوں حالی کا شکار رہا ہے۔ بچپن سے اب تک صرف کورس کی کتابیں پڑھ لینے والے طبقے کی جانب سے چند مخصوص سوال کا سامنا ہوتا رہا۔

"تم یہ ڈائجسٹ کیوں پڑھتے ہو؟"

"ان میں تو گندی کہانیاں ہوتی ہیں۔ اخلاق خراب کر دیتی ہیں۔"

"یہ وقت کا زیاں ہے، کچھ اچھا پڑھا کرو۔"

پہلے تو بہت بحث ہو جاتی تھی لیکن اب ایک ہی جواب ان لوگوں کو چپ ہو جانے پر مجبور کر دیتا ہے۔

"میں بھی اسی ڈائجسٹ میں کہانیاں لکھتا ہوں۔"

جس جس کو یہ پتا چلتا ہے، وہ نہ صرف خود کہانیاں پڑھنے پر مصر ہو جاتا ہے بلکہ کسی نئے شخص سے تعارف کرواتے ہوئے ایک اضافی جملہ بھی شامل رکھتا ہے کہ یہ پاکستان کے سب سے بڑے ادارے جے ڈی پی کے لیے کہانیاں بھی لکھتے ہیں۔ لوگوں کی حیرت، استعجاب اور مرعوبیت ہمیشہ ایک خوش کن احساس پیدا کرتی ہے اور اس احساس کو میں ہمیشہ معراج رسول کے نام کرتا ہوں۔ معراج رسول نے انشائیے، ناول، سلسلے وار، تراجم، افسانے اور ہر وہ ادبی صنف جو ایک مخصوص طبقے تک محدود تھی، اسے ڈائجسٹ کے ذریعے عوام تک پہنچایا۔ اس سستی تفریح نے کئی نسلوں کے ذہنوں کی آبیاری کی ہے۔ پاکستان کے بہترین مصنفین کی ٹیم ہمیشہ ہی ڈائجسٹ سے جڑی رہی ہے۔ مدیر رسول صاحبہ نے خوش اسلوبی سے معراج رسول صاحب کے مشن کو آگے بڑھایا ہوا ہے۔ یقیناً ڈائجسٹ کی دنیا میں اگلی پیڑھی ڈیجیٹل میڈیا کی جانب ہوگی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ معراج رسول صاحب کا ویژن آگے بھی کئی سالوں تک پاکستانی عوام کو معیاری تفریح فراہم کرتا رہے۔ آمین

دعا گو، مظہر سلیم ہاشمی

عشق جنوں پیشہ

نوے کی دہائی میں بچوں کے رسائل اور اشتیاق احمد کے جاسوسی ناول پڑھنے کے بعد جب میں نے ادب عالیہ کے ڈائجسٹ پڑھنے شروع کیے تو جاسوسی ڈائجسٹ سے متعارف ہوا۔ زمانہ کالج کے فارغ اوقات جاسوسی اور سسپنس ڈائجسٹ کے سنگ گزرتے تھے جو مجھے ایک نئی دنیا میں لے جاتے تھے۔ یہ ساتھ تقریباً اٹھائیس سال گزرنے کے بعد بھی تا حال جاری ہے۔ بچپن سے ادھیڑ عمر تک کے سفر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشن کے تینوں ڈائجسٹ میرے ہم سفر تھے۔

اگر آپ اردو جاسوسی ادب کے شائق ہیں تو معراج رسول کا نام آپ کے لیے نیا نہیں ہوگا۔ انہوں نے 1971ء میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشن کی بنیاد رکھ کر جاسوسی کے قارئین کو ایک نئی جہت سے روشناس کروایا۔ نہ صرف پاکستانی جاسوسی مصنفین کی ایک بزم بنا کر ان کی تحاریر کو موتیوں کی مالا میں پرویا بلکہ مغربی ممالک کے شہرۂ آفاق مصنفین کی تخلیقات کو اردو زبان کے قالب میں ڈھال اور ہم تک پہنچایا گیا۔ شاید اس سے پہلے انگریزی جاسوسی ناولز کے اردو ترجمے کا اتنا رجحان پاکستان میں نہیں تھا۔ انگریزی جاسوسی ادب کے بہترین ناول نگاروں کی تحاریر کو کئی نامور مترجم سے ترجمہ کروانا اور قارئین کے لیے پیش کرنا بلاشبہ ایک بہترین عمل تھا جو معراج رسول صاحب کے ڈائجسٹوں میں آج تک جاری ہے۔ انہوں نے جاسوسی ادب میں نئے لکھنے والوں کو مشعلِ راہ دکھائی۔ مصنفین کو جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ اور سرگزشت جیسے پلیٹ فارم مہیا کیے جہاں نئے لکھنے والوں نے طبع آزمائی کی، اپنے ہنر کو نکھارا۔ ان میں سے اکثر آج ملک کے نام ور مصنفین میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے لاکھوں اردو قارئین کے دلوں پر راج کیا۔ انہیں تفریح کے ساتھ ساتھ معیاری فکشن فراہم کیا۔ آج ان ڈائجسٹ میں لکھنے والے زیادہ تر مصنفین معراج رسول صاحب کے لگائے ہوئے پودے ہیں جو اب پروان چڑھ چکے ہیں۔

حرفِ آخر میں، میں یہی کہوں گا کہ اردو ادب، خصوصاً اردو جاسوسی ادب معراج رسول مرحوم کے نام کے بغیر ادھورا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔

---

* تحریر: محمد نعمان، شیخ، سعودی عرب

سرکتے لمحے

امجد رئیس

وقت کیسے گزرتا ہے... کچھ خبر نہیں ہوتی کہ وقت گزر رہا ہے یا ہم خود گزر رہے ہیں... لی چائلڈ کا ناول 61 گھنٹے میں بھی وقت سرک رہا تھا... لمحہ بہ لمحہ... گھنٹوں کی حد تک زندگی کی ضمانت تھی... یعنی جو گھڑی گزر جائے... غنیمت ہے... اگلے پل کا کیا اعتبار... رہے نہ رہے... کچھ پتا نہیں تھا کہ چلتے پھرتے... ہنستے کھیلتے... کب کس طرف سے قضا کا تیر آئے اور زندگی ختم... اُس برف پوش وادی میں بھی زندگی اور موت کا لہو رنگ کھیل شروع ہو چکا تھا... انتہائی غیر محسوس انداز میں وقت گزر رہا تھا... پہلی لاش کے بعد لگتا تھا کہ وقت ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے... لمحوں کی گنتی جاری تھی اور لاشوں کی بھی تعداد بڑھنے لگی تھی... لمحے سرک رہے تھے اور قاتل اوجھل تھا... نادیدہ قاتل کون تھا... اس کی کھوج و تلاش میں سرگرداں قانون کے محافظ اپنا جان لیوا کردار ادا کر رہے تھے... سرکتے لمحے جسم و جاں میں مسلسل پُراذیت سنسنی دوڑا رہے تھے...

انتظار کے کٹھن لمحوں سے گزرتے ناول کے ناقابلِ فراموش واقعات کا احوال

ریچر بغیر نشان والی کراؤن وک میں روانہ ہو رہا تھا۔ درجۂ حرارت گرتا جا رہا تھا۔ ہیٹر سترڈگری پر سیٹ تھا۔ وہ ٹاؤن سے نکل گیا۔ برف ہی برف تھی۔ رفتار آہستہ تھی۔ کئی موڑ اور کئی میل کے بعد وہ مطلوبہ سڑک پر آ گیا۔ سڑک کیا... جمی ہوئی برف تھی۔ دھیری اور محتاط ڈرائیونگ... معاً سامنے منظر نامہ تبدیل ہونے لگا۔ سڑک چوڑی اور سیدھی ہوتی چلی گئی۔ آگے یوں لگا جیسے وہ سولہ پٹیوں کا ہائی وے ہے۔ ہر ہائی وے... حیرت انگیز طور پر دو میل تک برف بھی صاف کر دی گئی تھی۔

ریچر نے رفتار قدرے بڑھا دی تھی۔ دور فاصلے پر وہ نقشہ دھندلا نظر آنے لگا تھا۔ جس کے بارے میں ہیٹرن نے بتایا تھا۔ وہ ایک قطار میں چوبی ہٹ تھے۔ وہ جوں جوں آگے جا رہا تھا، نگاہ کی رسائی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

ریچر نے تیس چالیس کے قریب پک اَپ ٹرک دیکھے جن میں برف ہٹانے کے لیے فولادی بلیڈ لگے تھے۔ ان کے عقب میں سیاہ لباس میں کئی افراد بیلچوں کے ساتھ مصروفِ کار تھے۔ پورے کیمپ کی صفائی ہو رہی تھی۔ گویا وی آئی پی بنایا جا رہا تھا۔ بس کے پیچھے ریچر نے سنگی عمارت کی چھت دیکھی۔ کام کرتے افراد سے بیس گز کے فاصلے پر ریچر نے گاڑی روکی مگر انجن بند نہیں کیا۔ کراؤن کا ڈیش بورڈ باہر کا درجۂ حرارت منفی بارہ دکھا رہا تھا۔ کراؤن پر نظر پڑتے ہی وہاں ہر قسم کی حرکت بند ہو

گئی۔ سب کی نظریں کار پر تھیں۔ ریچر نے کوٹ کی زپ پوری اوپر چڑھائی۔ ہاتھوں کو دستانوں میں چھپا کر وہ گاڑی سے باہر آ گیا۔

اب وہاں بھیڑ سی لگ گئی تھی۔ مرد، عورتیں اور بچے بھی۔ ریچر نے تعداد کا اندازہ سو کے قریب لگایا۔ پھر اس نے دس قدم بڑھائے اور رک گیا۔ بھیڑ میں سے ایک آدمی آگے آیا۔ چہرے پر خشونت برس رہی تھی۔

ریچر نے کہا۔ ''کون ہو تم؟''

''دفع ہو جاؤ۔''

ریچر نے دفع ہونے کے بجائے دو قدم اور بڑھائے۔ ''تم بدتہذیب ہو۔''

''کہاں لکھا ہے، مجھے تہذیب یافتہ ہونا چاہیے۔'' وہ بدتمیزی سے بولا۔

''تم لوگ میری پراپرٹی پر پکنک کیوں منا رہے ہو؟'' ریچر نے اس کی بدتمیزی کا کوئی اثر نہیں لیا تھا۔ ''میرا تعلق آرمی سے ہے۔ میں یہاں دو سال بعد انسپکشن کے لیے آتا ہوں۔ مجھے دیکھنا ہے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟''

''میں نے کہا تھا، دفع ہو جاؤ۔''

''بہت خوب، تم آرمی سے اُلجھنا چاہتے ہو؟''

بدزبان نے خاموشی اختیار کی۔ گرانڈیل ریچر اور اس کے اعتماد کا جائزہ لیا۔

''یہاں کیا دیکھنا چاہتے ہو؟' وہ بولا۔

''سنگی عمارت۔'' ریچر نے جواب دیا۔

''عمارت ہماری نہیں ہے۔'' جواب ملا۔

''یہاں کچھ بھی تمہارا نہیں ہے۔'' ریچر نے کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ وہ ہمارے زیر استعمال نہیں ہے۔''

ریچر نے کچھ نہیں کہا۔ ایک طرف ہو کر بھیڑ کی طرف گیا۔ بھیڑ دو اطراف میں چھٹی، ریچر درمیان سے گزرتا چلا گیا۔ وہ سنگی عمارت کے قریب آ گیا۔ داخلی دروازہ فولادی چادر کا تھا جو باہر کی طرف کھلتا تھا۔ ریچر نے ہینڈل پکڑ کے زور لگایا۔ ریچر نے کی ہول کو دیکھا۔ جو اسکریچز سے تقریباً پاک تھا۔ یعنی لاک بہت کم استعمال کیا گیا تھا۔ ریچر وہاں سے ہٹ گیا اور پتھروں سے بنی عمارت کا مکمل چکر کاٹا۔

جائزہ لینے کے بعد وہ قریب ترین ہٹ کی طرف چلا گیا۔ بھیڑ اُس کے پیچھے تھی۔ وہ آدمی بھیڑ سے آگے اور ریچر کے قریب تھا۔ ریچر نے ہٹ کے دروازے پر ہاتھ رکھا۔ ڈور آدھا کھل گیا۔

''یہ جگہ تمہاری نہیں ہے۔'' وہی آدمی بولا تھا۔

''یہ آرمی کی زمین پر بنایا گیا ہے۔'' ریچر نے کہا۔

''میرے لیے یہی کافی ہے۔'' ریچر نے دروازہ پورا کھول کر اندر دیکھا۔

ہٹ کے اندر ٹھنڈ نہیں تھی البتہ نیم تاریکی تھی۔ ایک طرف پیرافن اسٹور روشن تھا۔ کمرے میں بارہ بیڈ نظر آ رہے تھے۔ ایک کونے میں باتھ روم تھا۔ کارڈ بورڈ کارٹن کپڑوں کے لیے تھے۔ چھ بیڈ ایک طرف اور چھ مخالف سمت میں تھے۔ بستروں پر سادے گرے رنگ کے کمبل موجود تھے۔ ایک بستر پر جوان عورت بیٹھی تھی۔ اس کے بال لمبے تھے۔ خود بھی وہ خوش شکل تھی۔ قد عام عورتوں کے مقابلے میں لمبا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے ریچر کو خیال آیا کہ عورت کو اس نے کہیں دیکھا ہے۔ روشنی کم تھی۔ وہ کیتھی پیٹرسن سے مشابہ تھی۔ ریچر نے پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کر دیا۔

''میں دوسرے ہٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اجنبی آدمی کا جارحانہ لہجہ بدل گیا تھا۔ پندرہ میں چودہ ہٹ ایک جیسے تھے۔ پہلے ہٹ کے مانند۔ کوئی میز اور نہ بینچ، نہ کوئی لیب کا سامان۔ وہ سب خالی تھے۔ کیتھی پیٹرسن جیسی عورت صرف پہلے ہٹ میں نظر آئی تھی۔ شاید بیمار تھی۔ اسی لیے باہر نظر نہیں آئی۔

آخری ہٹ کچن کی کمی پوری کر رہا تھا۔ ریچر نے باہر آ کر دو بسوں کے درمیان سے اپنی کار کی طرف دیکھا۔ روڈ برف سے عاری شفاف گلاس کے مانند تھا۔ ریچر نے بغور طویل صاف اور چوڑی سڑک کو تنقیدی نظر سے دیکھا پھر اس کے قدم کار کی جانب اٹھتے چلے گئے۔

صبح کے نو بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ اُنیس گھنٹے رہ گئے تھے۔

☆☆☆

واپسی کے سفر میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بس ایک جگہ حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ وہ ایک غیر معمولی بڑا فیول ٹینکر تھا۔ ٹینکر کا رخ کیمپ کی طرف تھا۔

ریچر پولیس اسٹیشن پہنچا تو پیٹرسن کو اسکواڈ روم میں پایا۔ ریچر کا پہلا سوال تھا۔ ''کیا مسز جینیٹ خیریت سے ہیں؟''

''شی از فائن۔ وہاں کیا دیکھا؟''

''ہائیکرز گیدرنگ روانگی کی تیاری کر رہا ہے۔ اپنا سامان انہوں نے شپنگ باکس میں بھر لیا ہے۔ سڑک صاف کر دی گئی ہے۔ وہاں برف کا ذرہ بھی نہیں۔ فوڈ سپلائی برائے نام چھوڑی گئی ہے۔ وہ جگہ جس کی بھی ملکیت ہے، وہ اسے فروخت کرنے جا رہا ہے۔''

''کیا انہوں نے یقین کرلیا کہ تم آرمی کے آدمی ہو؟''

''نہیں۔ ایک منٹ کے لیے بھی نہیں۔'' ریچر نے جواب دیا۔ انہیں ہدایت دی گئی ہوگی کہ کسی قسم کی الجھن کھڑی نہ ہونے دیں۔ فروخت کنندہ نہیں چاہتا کہ کائنٹ متاثر ہو۔''

''پلانو دی میکسیکن۔'' پیٹرسن نے کہا۔

''جو بھی ہے۔''

پیٹرسن نے سوال کیا۔ ''لیب کا سراغ ملا تھا؟''

''میں وہ ڈرگ دیکھنا چاہوں گا جس کا سودا ٹاؤن کے ریسٹورنٹ میں ہو رہا تھا۔'' ریچر نے فرمائش کی۔

''کیوں؟''

''میرا دماغ اسی طرح کام کرتا ہے۔ میرا اسٹائل ہے۔''

پیٹرسن نے شانے اُچکائے اور ریچر کو ایوی ڈینس روم کی طرف لے گیا۔

''یہاں رکو۔'' وہ اندر گیا۔ کچھ دیر بعد باہر آیا۔ پیٹرسن کے ہاتھ میں پلاسٹک کا ایوی ڈینس بیگ تھا۔ اندر وہ پیکیج تھا جس کے بارے میں جینیٹ نے وضاحت کی تھی۔ سفید پاؤڈر کی اینٹ موی کاغذ میں لپٹی ہوئی تھی۔ کاغذ پر نقش بنانے والے قلم سے مخصوص تصویر بنی تھی۔ تصویر تاج نما تھی۔

ریچر نے استفسار کیا۔ ''تم اپنے ٹیسٹ کر چکے ہو؟''

''یقیناً۔'' وہ بولا۔ ''یہ خالص کوکین ہے۔ ہائی کوالٹی۔''

''تصویر کا کیا مطلب ہے؟''

''آئیڈیا تو نہیں ہے۔'' پیٹرسن نے کہا۔ ''لیکن عموماً لوگو استعمال کیا جاتا ہے۔ مارکیٹ برانڈز کے معاملے میں حساس ہے۔ یہ برانڈ لوگو ہو سکتا ہے۔''

''کیا یہ واقعی موی کاغذ ہے؟''

''نہیں، یہ کسی قسم کا سیلوفین یا گلاسن ہے۔''

(شفاف جھلی نما کاغذ)

''وہاں لیب کے آثار نظر آئے؟''

''نہیں۔''

''۱۰ سے بنی عمارت؟''

''اور پھر وہ [illegible]''

''عمارت میں نے باہر سے [illegible]'' یہ کہہ کر ریچر اسکواڈ روم میں اپنی کونے والی ڈیسک پر آ گیا۔ اس نے ذہن نشین کیا ہوا نمبر ملایا۔

کچھ دیر بعد وہی کھنکتی، سُریلی آواز آئی۔ آواز میں تھکن نمایاں تھی۔

''تمہارے لیے کوئی خبر نہیں ہے۔''

ریچر نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں۔ تمہارے علم کے مطابق سرکاری رقم آرمی ڈپارٹمنٹ تک نہیں پہنچی۔ ہم نے آغاز ہی غلط مفروضے کے تحت کیا تھا۔ مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ وہاں آرمی مصروفِ کار تھی۔ غالباً فوجی اڈا یا کچھ اور۔ میں وہاں گیا تھا۔ ایک عام عمارت اور دو میل طویل سڑک تھی۔ وہ رن وے نہیں بلکہ رن وے ہے۔ مطلب تعلق ائرفورس سے بنتا ہے، آرمی سے نہیں۔''

''نئی تبدیل شدہ اطلاع ہے۔''

''تم ائرفورس میں کسے جانتی ہو؟''

''چند ایک کالز ملانی پڑیں گی۔ لیکن کچھ دیر کے لیے مجھے سونے دو۔''

''وقت ہی نہیں ہے۔ یہ ارجنٹ ہے۔ دو میل پر برف ہٹائی گئی ہے تو رن وے ظاہر ہوا ہے۔ میرے لیے سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ کوئی بھی یہ حرکت محض تفریح کے لیے نہیں کر سکتا۔ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ میں نے فیول ٹینکر بھی دیکھا۔ شاید ریٹرن ٹرپ کے لیے۔ شاید کوئی وہاں سے بھاری مال اٹھانے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔''

امنڈا چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''اور کچھ؟''

ریچر نے فوراً سوال کیا۔ ''کیا تم شادی شدہ ہو؟''

امنڈا نے جوابی سوال داغا۔ ''اور تم؟''

''نہیں۔''

''اسی لیے مجھے حیرت نہیں ہوئی تھی۔'' اس نے فون بند کر دیا۔

صبح کے دس بجنے میں پانچ منٹ تھے۔

اٹھارہ گھنٹے بچے تھے۔

☆☆☆

ڈرگ انفورسمنٹ ایڈمنسٹریشن (DEA) کے آدمی کا کہنا ہے کہ وہاں کوئی لیب نہیں ہے۔'' پیٹرسن نے بتایا۔ ''انہیں سیٹلائٹ اور تھرمل امیجنگ کی سہولت میسر ہے۔ ڈیٹا تجزیے میں حرارت یا تپش کی کوئی علامت نہیں ملی۔ اسی لیے ان کا موقف ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ رئیل اسٹیٹ کی ڈیل ہو سکتی ہے۔ ہاں جب تک کوئی اور بات سامنے نہ آئے۔''

''لیب زیرِ زمین ہے۔''

''DEA کے مطابق ایسا نہیں ہے۔ تھرمل امیج تہ خانے میں جھانک سکتے ہیں۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔''

''وہ غلطی پر ہیں۔'' ریچر نے کہا۔ ''[illegible] کا مطلب لیب لازماً ہونی چاہیے۔''

''ہم نہیں جانتے کچھ کیا ہے۔ یقین سے کہنا مشکل ہے۔''

''ہم جانتے ہیں۔'' ریچر نے کہا۔ ''کوئی بھی دو میل

کارن وے کھیل کود کے لیے نہیں بنائے گا۔ کوئی بھی طیارہ رن وے پر اتر سکتا ہے۔ بومبر ہو یا ٹرانسپورٹ طیارہ۔ نیز کوئی کیوں ایک ایسی عمارت کے قریب طیارہ اتارے گا جو ایک مکان سے بھی چھوٹی ہے۔ صاف عیاں ہے کہ وہاں نیچے کچھ ہے۔ غالباً بہت کچھ اور بہت گہرائی میں۔''

''لیکن آخر کیا ہے؟''

ریچر نے فون کی طرف اشارہ کیا۔ ''مجھے علم ہوگا تو تم بھی جان جاؤ گے۔''

☆☆☆

تیس منٹ بعد پیٹرسن کے پاس کال آئی کہ ہائی وے کو دوبارہ کھول دیا گیا ہے۔ بعد ازاں جے ناکس نے بتایا کہ اس کے لیے متبادل بس کا بندوبست کیا گیا ہے۔ جو تین گھنٹے میں پہنچے گی۔ پیٹرسن نے بس کے مسافروں کی روانگی کے لیے ہدایات جاری کرتے ہوئے ریچر کی طرف دیکھا۔

''تم بھی ساتھ جاؤ گے؟''

''یہ اس پر منحصر ہے کہ دو بجے سے پہلے کیا ہوتا ہے؟''

☆☆☆

ایک سو دس ملٹری پولیس سے خاتون نے ریچر کو کال کی۔ ''میں نے ائرفورس میں کسی سے رابطہ کیا تھا۔'' وہ بولی۔ ''چند اشارے ملے ہیں۔ لگتا ہے یہ خفیہ معاملہ ہے۔ جگہ کو خالی کر کے بھلا دیا گیا تھا۔ کسی کو کچھ بھی یاد نہیں ہے۔''

''یہ بھی یاد نہیں کہ وہ کیا تھا؟''

''کچھ ہے بھی تو محفوظ دستاویزات میں دفن ہے۔ میرا آدمی اب تک صرف ایک رپورٹ تک پہنچا ہے۔ جس کے مطابق اس عمارت کو بنانا بہت دشوار تھا۔ تعمیر کے دوران ڈیزائن کو کئی بار تبدیل کرنا پڑا تھا۔ وجہ زمین کی ساخت تھی۔ شٹ سمجھتے ہو؟''

''سخت ترین چٹان۔'' ریچر نے کہا۔

''مطلب یہ لگتا ہے کہ کام کرنے یا کروانے والے گہرائی میں جانا چاہتے تھے۔''

''درست کہہ رہی ہو۔ کیا نام ہے؟''

''امنڈا۔''

''امنڈا تو میں نے رکھا ہے۔''

''فی الحال یہی سمجھو۔''

''ٹھیک ہے۔ اور کچھ؟'' ریچر نے استفسار کیا۔

''وہ فلوریڈا کوپ جس کا نام لیپلر تھا۔''

''ہاں، کیا خبر ہے؟''

''میامی پولیس ڈپارٹمنٹ کا آدمی ہے۔ چھتیس برس پہلے پیدا ہوا تھا۔ دو سال پہلے وہ اچانک غائب ہو گیا۔ جس کی بظاہر کوئی وجہ نہیں نظر آتی۔''

''گوگل کر لو۔'' ریچر نے مشورہ دیا۔

''نہیں، میں دوسرے ذرائع استعمال کروں گی پھر بتاؤں گی۔''

''شکریہ۔'' ریچر نے کہا۔ ''اور کچھ؟''

وقفے کے بعد سُرپلی آواز آئی۔ ''میرا فورٹ ہڈ والا بندہ زبان کھولنے پر آمادہ نہیں ہے۔''

''وہ کہاں ہے؟''

''سیل میں مقید ہے۔''

''وہ ٹیکساس لاء کا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ یونیفارم کوڈ ہو یا ہومی سائڈ۔ یہ یاد..... اسے زبان کھولنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''تم ہوتے تو کیا کرتے؟''

''تمہارا ہدف کیا ہے؟'' ریچر نے سوال کیا۔

''غیر ریاستی بااثر عناصر۔ جن سے وہ رابطے میں ہے لیکن کیوں اور کیسے؟''

''اس کے والدین زندہ ہیں؟''

''ہاں۔'' امنڈا نے جواب دیا۔

''اور بہن بھائی؟''

''اس کا چھوٹا بھائی نیوی سیل میں تربیت پر ہے۔''

''ویری گڈ۔'' ریچر نے کہا۔ ''یہ کام کی بات ہے۔ اس آدمی کو ڈیل آفر کرو۔ بولو کہ اسے تلنے کی تیاری کی جا رہی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ غداری کے مقدمے سے خوف زدہ نہ ہو۔ کہنا کہ اگر وہ تعاون پر آمادہ ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اوپن ٹرائل ہوگا۔ اوپن کا مطلب والدین کو شرمندگی اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا اور بھائی کو بحریہ چھوڑنی پڑے گی۔''

''کیا کام بن جائے گا؟''

''اس کا ''اتاشہ'' نام ہی ہے۔ وہ فورتھ انفنٹری سے تعلق رکھتا ہے اور وہاں یہ نکتہ اہمیت رکھتا ہے۔''

''او کے، ٹرائی کرتی ہوں۔''

''مجھے مت بھلانا۔''

ریچر نے کہا۔ ''جتنی جلد ہو مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں ائرفورس کے عزائم کیا تھے؟''

''اور کچھ؟''

''تم شادی شدہ ہو؟''

امنڈا نے جواب دیے بغیر فون بند کر دیا۔ چند منٹ بعد ہالینڈ اسکواڈ روم میں داخل ہوا۔ ''ابھی ہائی وے پٹرول کی کال وصول ہوئی ہے۔ بائیکرز نکل رہے ہیں۔ چھتیس

پک اپ ٹرک ہائی وے پر ہیں۔"

دوپہر گزر رہی تھی۔ پندرہ گھنٹے باقی تھے۔

☆☆☆

ریچر، ہالینڈ اور پیٹرسن کے ساتھ آفس میں تھا۔ ہالینڈ ہائیکرز کی روانگی کا احوال بتا رہا تھا۔

ریچر نے ہالینڈ سے سوال کیا۔ "وہ نکل رہے ہیں اور تم خوش ہو؟"

ہالینڈ نے کہا۔ "میں کیا غلط کر رہا ہوں؟"

"وہ ڈرگز فروخت کرتے تھے۔" ریچر نے کہا۔

"یہ ایک چھوٹا ٹاؤن ہے۔ ہمیں ٹاؤن کے حساب سے آپریٹ کرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ جا رہے ہیں تو مسئلہ از خود حل ہو رہا ہے۔"

"فساد کی جڑ کٹ رہی ہے۔" پیٹرسن نے بھی ہالینڈ کی حمایت کی۔

"درحقیقت ایسا نہیں ہے۔" ریچر نے تردید کی۔ "وہ اس لیے جا رہے ہیں کہ جائداد کی ڈیل سر پر ہے۔ جیفیٹ سیلٹر آخری رکاوٹ ہے۔ اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ خطرے میں ہے۔"

"جیفیٹ کی حفاظت کے لیے ہم پہلے ہی بھرپور کوشش کر چکے ہیں۔" ہالینڈ نے کہا۔ "ہمارے اپنے مسائل ہیں۔ ہم امریکن آرمی نہیں ہیں۔ سات آفیسر اب بھی وہاں ہیں۔" یہ کہہ کر ہالینڈ باہر نکل گیا۔

☆☆☆

"کیا تم بس کے مسافروں کے ساتھ نہیں جاؤ گے؟" پیٹرسن نے سوال کیا۔

"میں نے ابھی فیصلہ نہیں کیا ہے۔"

پیٹرسن نے دوسرا سوال کیا۔ "میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟"

"کس معاملے میں؟"

"ڈپارٹمنٹ۔"

"ڈپارٹمنٹ تمہارا نہیں ہے۔" ریچر نے کہا۔

"لیکن اگلا نمبر میرا ہے۔"

"میں سنجیدہ اور سخت ٹریننگ سے آغاز کرتا پھر ڈیل کے لیے جیل میں مذاکرات کرتا۔ کراس پلان فول پروف نہیں تھا۔"

"لیکن گزشتہ رات ہم نے پلان کے مطابق عمل کیا تھا۔ صرف جیفیٹ کے لیے حملہ آور نہیں آیا تھا۔"

دوپہر کے دو بجنے والے تھے۔ چودہ گھنٹے باقی تھے۔

☆☆☆

بس کے ساتھ دوسرا ڈرائیور تھا۔ جے ناکس کھڑکی کے قریب بیٹھا تھا۔ ریچر اور پیٹرسن بس کو روانہ ہوتے دیکھ رہے تھے۔ پیٹرسن نے ریچر کی پشت پر ہاتھ مارا۔

ریچر نے کہا۔ "وہ میرے بغیر جا رہے ہیں۔ زندگی میں پہلی بار میں نے اپنی ایک عادت ترک کی ہے۔"

وہ اسٹیشن میں واپس آئے۔ وہاں لابی میں ہالینڈ سے مڈبھیڑ ہوئی۔ ہالینڈ نے عندیہ دیا۔

"کیمپ خالی پڑا ہے۔ ہمیں وہاں کا جائزہ لینا چاہیے۔ کافی دن باقی ہے۔"

☆☆☆

وہ تینوں ہالینڈ کی کار میں تھے۔ ریچر عقبی نشست پر موجود تھا۔ جب خراب راستے سے گزر کر اس روڈ پر آئے جسے رن وے میں تبدیل کر دیا گیا تھا تو پیٹرسن نے لب کشا کیے۔

"پچاس برس میں پہلی مرتبہ سڑک کو یوں مشینوں کی مدد سے بے عیب کیا گیا ہے۔ صرف برف ہی نہیں مٹی اور گند وغیرہ بھی ہٹا دیا گیا ہے۔"

ہالینڈ نے کار کیمپ کے قریب روک دی۔ وہ اترے اور سیدھے عمارت کی طرف گئے۔ پیٹرسن نے دروازہ کھولنے کی ناکام کوشش کی پھر کی ہول کا جائزہ لیا۔

"یہ استعمال میں رہا ہے۔" وہ بولا۔

ریچر نے کہا۔ "اسے عرصہ قبل، غالباً سال بھر پہلے کھولا گیا تھا اور آج صبح لاک کیا گیا ہے۔"

"چابی کہاں ہے؟"

"وہ ساتھ لے گئے۔" ہالینڈ نے جواب دیا۔

ریچر نے اختلاف کیا۔ "یہ جگہ فروخت کی گئی ہے۔ چابی انہوں نے نئے مالک کے لیے یہیں کہیں چھوڑی ہوگی۔"

"چابی کہاں ہونی چاہیے؟"

تینوں نے اطراف میں نظر دوڑائی۔ "تلاش کرنی پڑے گی۔" پہلے انہوں نے عمارت کا چکر لگایا۔ ریچر کے مشورے پر انہوں نے قریبی ہٹس کا رخ کیا۔ ریچر پہلے اس ہٹ پر گیا جہاں علی الصباح ہٹ میں اس نے لڑکی کو دیکھا تھا۔ ڈور کھلا تھا۔ ریچر کے عقب میں ہالینڈ اور پیٹرسن بھی داخل ہوئے۔

ہٹ تقریباً ویران تھا۔

"میں یہاں ہوں، تم لوگ دیگر ہٹس دیکھو۔" ریچر نے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ تمام ہٹس کھنگالے گئے۔ ہٹس کے تمام میٹرس چیک کیے گئے۔ کچھ ہاتھ نہ آیا۔ تینوں باہر ایک مقام پر کھڑے تھے۔ ٹوائلٹس بھی دیکھے گئے تھے۔

سہ پہر کے تین بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ تیرہ گھنٹے کا وقت

ی تھا۔

آخر میں مکمل چیک کرنے کے بعد انہوں نے ایک
ر پھر عمارت کا رخ کیا۔ وہاں دیواروں میں، درختوں اور
نیاد سے بھی کچھ حاصل نہ ہوا۔ ریچر کچھ سوچ کر پھر اس ہٹ
کی طرف گیا جس میں اس نے لڑکی کو دیکھا تھا۔ ہالینڈ اور
پیٹرسن ساتھ تھے۔

ریچر آخری میٹرس کے پاس رک گیا۔ ''صبح میں آیا تو
وہ لڑکی یہاں بیٹھی تھی۔''

''کیسی لڑکی؟'' ہالینڈ آگے آیا۔

ریچر نے لڑکی کے بارے میں بتایا۔

''کیا وہ بیمار تھی؟''

''مجھے وہ ٹھیک لگ رہی تھی۔''

''کیا اُسے بند کیا ہوا تھا؟'

''نہیں۔ دروازہ کھلا تھا۔'' ریچر نے بتایا۔

''شاید وہ چابی کی حفاظت کر رہی تھی۔ دیکھنے میں کیسی
تھی؟'' ہالینڈ نے سوال کیا۔

''قدرے دراز، چھریرا بدن، بھورے بال۔'' ریچر
نے کہا۔ پھر سوال کیا۔ ''کیا تمہارے پاس سیل فون ہے؟''

''ہاں۔''

''میں استعمال کرنا چاہتا ہوں۔''

ہالینڈ نے فون نکال کر ریچر کو دے دیا۔

ریچر نے امنڈا سے رابطہ قائم کیا۔

''کہاں ہو تم؟ میں ٹرائی کر رہی تھی۔''

''یہاں ائرفورس کی جگہ پر، عمارت میں داخل ہونے کے
لیے چابی کی تلاش ہے۔ بس نام بتاؤ جہاں چابی ہو سکتی ہے۔''

''وی سی آر کا خانہ، گیلن، جوتے، ٹی وی، ہیٹر
کمپارٹمنٹ، ریڈیو۔ اندر سے کھوکھلی کتاب، کار کی نشست
کے اندر، صابن کی ٹکیہ میں، پنیر کے اندر۔''

''یہ صرف نو ہیں اور ان میں سے محض چند اشیا یہاں ہیں۔
''وہاں کیا کیا ہے؟'' امنڈا نے استفسار کیا۔

ریچر نے وضاحت سے بتایا۔

''ٹوائلٹ ٹینک میں دیکھو۔''

''سب کچھ دیکھ چکے ہیں۔'' ریچر نے کہا۔

''کوئی پھٹا ہوا میٹرس؟''

''نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ سب کچھ جلا دو، آگ
میں چابی تلاش کرو۔ چابی محفوظ رہے گی، را
گی۔ ائرفورس کی چابی یورینیم سے بنی ہے۔''

جاسو

پیٹرسن نے کہا۔

''عملاً اس وقت ائرفورس کا بجٹ لامحدود تھا۔'' ریچر نے بتایا۔

''اس کا متبادل ان کو ملا ہوگا۔ اس پر بھی مجھے شک ہے۔''

''ڈیزائن میں کوئی مسئلہ ہوگا۔'' ہالینڈ نے رائے دی۔

''ایسا تھا، پھر بھی میرز سرما کی تربیت کے لیے یہ جگہ استعمال کر سکتے تھے۔''

دن کی روشنی کم ہوتی جارہی تھی۔ وہ تینوں خیال آرائی کرتے ہوئے کار کی طرف چل پڑے۔''

چار بجنے میں پانچ منٹ تھے۔

بارہ گھنٹے رہ گئے تھے۔

☆☆☆

دور مشرق میں ایک جہاز دوسرے ائرپورٹ پر لینڈ کر رہا تھا۔ اینڈریو ائرفورس بیس، میری لینڈ۔ یہ بزنس جیٹ تھا جسے آرمی نے لیز پر لیا تھا۔ جیٹ ملٹری پولیس کے لیے قیدیوں پر نظر رکھنے والی ایک کمپنی کے پاس تھا۔ جیٹ میں پائلٹ، کوپائلٹ، ایک قیدی اور قیدی پر تین آدمی تھے۔ قیدی فورٹ بڈ سے چوتھی انفنٹری کا کیپٹن تھا۔

قیدی کو جہاز سے نکال کر ایپرن تک لایا گیا جہاں ایک کار موجود تھی۔ قیدی کو عقبی نشست پر بٹھایا گیا۔ کار میں ملٹری پولیس کی میجر قیدی کی منتظر تھی۔ اس کا قد اوسط سے اوپر تھا۔ بدن متناسب، لمبے بال پشت پر سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ گہری خاکستری آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ چہرے کے حسن میں رعب اور شرارت کا ملا جلا عجیب امتزاج تھا۔ شخصیت میں وقار اور اختیار کا رنگ جھلک رہا تھا۔ لباس پر سلور اسٹار اور دو پرپل ہارٹ کے ربن کامیاب کیریئر کی کہانی کے عکاس تھے۔

''گڈ آفٹرنون کیپٹن، میرا نام میجر سوزن ٹرنر ہے۔ میں ملٹری پولیس ایک سو دس کو کمانڈ کرتی ہوں اور تمہارا کیس میرے پاس ہے۔ ہم چند منٹ بات کریں گے۔ اس کے بعد تم واپس جہاز پر ہو گے۔ ٹیکساس واپس جاؤ گے یا پھر فورٹ لیون ورتھ، سمجھ گئے؟''

کیپٹن نے جواب دیا۔ ''مجھے وکیل درکار ہے۔''

''ایک نہیں زیادہ وکیل ملیں گے۔ یقین کرو۔''

کیپٹن خاموش رہا۔

''لیکن ایک بُری خبر ہے۔'' سوزن ٹرنر نے کہا۔ ''تم مرنے والے ہو۔ یہی بات تم وکلاء سے سنو گے۔ وہ سب تمہیں سزائے موت کی اطلاع دیں گے۔ درحقیقت تم ایک چلتے پھرتے مردہ شخص ہو۔''

کیپٹن خاموش رہا۔

''میں کار میں ایک مردہ شخص سے باتیں کر رہی ہوں اور وہ سن رہا ہے۔ تمہارے پاس چوائس تو ہے لیکن زندہ رہنے کی نہیں۔ ٹیکساس میں بیوی کو قتل کرنے پر مارے جاؤ گے۔ فورٹ لیون ورتھ گئے تو وطن سے غداری کی وجہ سے جان سے جاؤ گے۔ تمہارے ماں باپ برداشت نہیں کر پائیں گے۔ انہیں گھر بیچ کر جانا پڑے گا۔ امکان ہے کہ وہ گھر فروخت نہ کریں اور تہ خانے میں خود کو پھانسی لگا لیں۔ اپنے چھوٹے بھائی کے بارے میں سوچو۔ وہ تمام عرصہ تمہیں آئیڈیل بنا کر متحرک رہا۔ وہ بھی برباد ہو جائے گا۔ اس کو نیوی چھوڑنی پڑے گی۔ ایک غدار کے بھائی پر کون بھروسا کرے گا۔ شاید وہ بھی خود کو ہلاک کر لے۔''

کیپٹن خاموش رہا۔

سوزن نے کہا۔ ''تمہارے پاس تیسری چوائس ڈیل کی ہے۔ میرے ساتھ، یہاں کار میں۔ میرے تمام سوالات کے جواب دو، ہم غداری کے ایشو کو پرائیویٹ رکھیں گے۔''

کیپٹن خاموش رہا۔

میجر سوزن نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ ''تمہارے پاس تیس سیکنڈ ہیں پھر تم گاڑی سے اتر جاؤ گے۔''

کیپٹن خاموش رہا۔

ٹک ٹک ٹک پانچ، دس، بیس.....

تیس ''تم جا سکتے ہو۔'' سوزن نے تاثر سے عاری لہجے میں کہا۔

وہ خاموش تھا۔

سوزن نے باہر اشارہ کرنے کے لیے اپنی سائڈ کا شیشہ نیچے کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور دفعتاً کیپٹن نے خاموشی کا قفل توڑ دیا۔

''اوکے، میں تم سے بات کروں گا۔''

''کیا بات کرو گے؟''

''جواب دوں گا، میم۔''

☆☆☆

پلاٹو نے فون نیچے رکھ دیا۔ پائلٹ نے بتایا تھا کہ شمال میں چوبیس گھنٹے کے اندر موسم خراب تر ہونے جارہا ہے۔ مزید برف پڑے گی۔ پلاٹو جانتا تھا۔ اسے سیٹلائٹ ٹی وی کی سہولت حاصل تھی۔ اس نے موسمیاتی چینل کو ٹیون کیا۔

☆☆☆

پانچ بجنے میں پانچ منٹ تھے۔
باقی رہ گئے تھے گیارہ گھنٹے۔

☆☆☆

راک کریک میں سوزن ٹرنر اپنے آفس میں تھی۔ دوسری منزل پر تنگ کوریڈور سے گزرتے ہوئے وہ ریچر کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ اپنے آفس میں پہنچی۔ کبھی ریچر وہاں بیٹھتا تھا۔ وہ مشہور ہلکی دھات کی میز بھی وہیں تھی جس پر چھوٹا سا گڑھا جوں کا توں تھا۔ جہاں ریچر نے جنرل کا سر بجایا تھا۔ آفس میں تین فون اور تیس لائنیں تھیں۔ کرسی اور فائل کیبنٹس۔ دو کرسیاں وزیٹرز کے لیے الگ تھیں۔ اس کی میز پر محفوظ اور تیز رفتار کمپیوٹر میں سرکاری انٹرنیٹ کنکشن تھا۔

وہ بیٹھ گئی۔ کوئی پیغام نہیں تھا۔ ریچر کی طرف سے نہ فضائیہ کی جانب سے۔ سوزن نے یو ایس بی حب کے اندر ڈیجیٹل وائس ریکارڈر لگایا۔ قیدیوں کے ساتھ اس کی گفتگو ایک آڈیو فائل میں محفوظ ہو جاتی تھی۔ آواز شناخت کرنے والا سوفٹ ویئر اسے ڈاکومنٹ کی شکل دیتا تھا۔ پھر دونوں فائلیں اپنی مخصوص منزل تک چلی جاتیں۔

میجر سوزن کے لیے برانز میڈل کی سفارشات آخری مراحل میں تھیں۔ جبکہ ریچر ماضی میں مذکورہ میڈل حاصل کر چکا تھا۔ وہ آگاہ تھی، کیونکہ ریچر کی فائل اس کی میز پر رہتی تھی۔ وہ فائل کو کئی مرتبہ کھنگال چکی تھی۔

جیک ..... ریچر ..... درمیان میں کوئی نام نہیں تھا۔ 10 اکتوبر 29 کی پیدائش۔ ملٹری فیملی۔ باپ کا تعلق میرین سے تھا۔ ماں فرانسیسی تھی۔ ریچر نے ویسٹ پوائنٹ سے گریجویشن کیا تھا۔ سروس کا دورانیہ تیرہ سال تھا۔ اس نے آغاز ہی ملٹری پولیس سے کیا تھا۔ باوجود اس کے وہ کیریئر کے دوران اپنے اور دوسروں کے لیے دردِ سر بنا رہا۔ جو کہنا ہوتا وہ کہہ دیتا، لگی لپٹی بغیر۔ وہ کرتا جو اس کے نزدیک درست ہوتا۔ وہ بے دھڑک و بے باک تھا۔ ایک مرتبہ اس کی تنزلی کیپٹن کے عہدے پر کر دی گئی تھی کیونکہ اس نے ایک شہری کی ٹانگ توڑ دی تھی۔ تاہم وہ ڈٹا رہا اور دوبارہ میجر کا عہدہ حاصل کیا۔ بعد ازاں اس نے ایک سو دس ایم پی کو لیڈ کیا۔ ایک سو دس کا وہ پہلا کمانڈنگ آفیسر تھا اور ایک سو دس ایم پی کا فاؤنڈر بھی۔ اس نے سلور اسٹار، سولجر میڈل، پرپل ہارٹ، لیجن آف میرٹ کے علاوہ برانز اسٹار حاصل کیا تھا۔

سلور اسٹار اور پرپل ہارٹ اسے ملک سے باہر کارگردگی پر دیا گیا تھا۔ ایک بار وہ لڑائی میں شدید زخمی ہوا

ت۔ اسپتال میں بھی رہا۔ ٹرانسفر کر کے اسے جرمنی پہنچایا گیا۔ ریچر کی میڈیکل سری فائل میں تھی۔ وہ تندرست اور صحت یاب تھا۔ زخم مندمل ہو چکے تھے۔ وہ غیر معمولی قد کاٹھ کا مالک تھا۔ قد چھ فٹ پانچ انچ۔ جرمنی کی رپورٹ کے مطابق وزن 240 پونڈ تھا۔ فٹنس رپورٹ شاندار تھی۔ وہ تین زبانیں بول سکتا تھا۔ انگریزی، فرنچ اور اسپینش۔ تقریباً ہر قسم کے ہتھیار کے استعمال میں مہارت رکھتا تھا۔ دست بدست لڑائی میں وہ غیر معمولی تھا۔

فائل میں اس کا فوٹو بھی موجود تھا۔ بال چھوٹے اور بکھرے ہوئے تھے۔ نیلی چمک دار آنکھیں۔ چہرے پر دو کٹ تھے۔ ایک بائیں آنکھ کے کونے پر۔ دوسرا بالائی ہونٹ پر۔ شانے چوڑے اور بازو لمبے تھے۔ بڑے بڑے ہاتھ، ہونٹوں پر دھیمی مسکراہٹ میں شک اور شرارت کا امتزاج تھا۔

سوزن نے گہری سانس خارج کی اور فائل بند کر دی۔ ریچر سے دوستی اچھی رہے گی لیکن دشمنی کے بارے میں سوچنا پاگل پن ہوگا۔ سوزن ہو یا کوئی اور.....

سوزن نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ فضائیہ میں اپنے آدمی سے رابطہ کر رہی تھی۔ فون ملنے پر اس نے خبر کے بارے میں سوال کیا۔ کوئی نئی خبر نہیں تھی۔ فضائیہ کے آدمی نے بتایا کہ وہ جلد اطلاع فراہم کرے گا۔

میجر سوزن نے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

میکسیکو میں تین سیاہ رنگ کی رینج روورز پلاٹو کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو رہی تھیں۔ ہر گاڑی میں دو آدمی تھے۔ وہ سب مقامی تھے۔ عمریں تیس کے آس پاس تھیں۔ وہ سیاہ سوٹ میں ملبوس تھے اور بھاری اسلحہ سے لیس تھے۔ وہ سب پہلے بھی پلاٹو کے لیے کام کر چکے تھے۔ لہٰذا کسی حد تک ہراساں تھے۔ گاڑیوں کے تینوں ڈرائیورز جانتے تھے کہ دوربین سے ان کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ گاڑیاں گیٹ پر رکیں اور چھ آدمی باہر اتر کے کھڑے ہو گئے۔ وہ سب جانتے تھے کہ ان کے اچھے رویے کی ضمانت وہ خواتین تھیں جن سے ان کا قریبی رشتہ تھا اور جو سب کی سب پلاٹو کی پہنچ سے باہر نہیں تھیں۔ کچھ دیر بعد گیٹ کھلا اور گاڑیاں اندر چلی گئیں۔

☆☆☆

پیٹرسن، ریچر کو لے کر جینیٹ کے گھر پر پہنچا۔ ہال وے میں پولیس وومین نے استقبال کیا تھا۔ جینیٹ سلیٹر لائبریری میں تھی۔ مطالعہ اور وہی کرسی۔ ایک اور پولیس وومین کھڑکی کے ساتھ مستعد کھڑی تھی۔ خاموشی تھی۔ ماحول نارمل تھا۔

''کیا واقعی بائیکرز جا چکے ہیں؟''

ریچر نے اثبات میں جواب دیا۔

''مطلب میں محفوظ ہوں؟''

''نہیں۔''

شام کے چھ بجنے میں پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ دس گھنٹے بچے تھے۔

☆☆☆

جینیٹ ڈنر کی تیاری کر رہی تھی۔ رات کی نگرانی والے پولیس اہلکار ڈیوٹی سنبھال چکے تھے۔ مکان محفوظ تھا۔ ریچر کھڑکی پر تھا۔ باہر برف اور سناٹا تھا۔

فون کی گھنٹی بجی۔ ریچر ہال وے میں تھا۔ جینیٹ نے کچن سے آواز لگائی۔ پیٹرسن کی کال تھی۔

''یہاں اسٹیشن پر کچھ دکھانا ہے۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔'' پیٹرسن نے کہا۔

''میں یہاں سے نہیں ہٹ سکتا۔'' ریچر نے جواب دیا۔

''میں تمہیں پک کر لوں گا اور واپس چھوڑ دوں گا۔'' پیٹرسن بولا۔

''اگر میں تمہارے پاس ہوا اور سائرن بول اٹھا؟''

''میں فوراً تمہیں واپس پہنچا دوں گا۔ میرا یقین کرو۔''

☆☆☆

پیٹرسن وہاں پہنچا اور جینیٹ کو بتایا کہ وہ ریچر کو لے جا رہا ہے اور زیادہ سے زیادہ نصف گھنٹے میں واپس لے آئے گا۔ پیٹرسن نے وعدہ کیا کہ ریچر کے آنے تک کوئی محافظ یہاں سے نہیں ہلے گا۔ جینیٹ نے بے چینی محسوس کی تاہم اختلاف نہیں کیا..... ریچر نے کوٹ لیا اور پیٹرسن کے ساتھ نکل گیا۔

پیٹرسن اسکواڈ روم میں اپنی ڈیسک پر کمپیوٹر لاگ اِن کر رہا تھا۔ اسکرین کے درمیان سرمئی خانہ ظاہر ہوا۔ خانے کے درمیان میں تیر کا نشان تھا۔ ''سرویلنس وڈیو ہے۔'' پیٹرسن نے کہا۔ یہ ڈیجیٹل ہے اور قیدی کے انٹرویو روم کی ہے۔ وہاں سے ای میل آئی ہے۔ بائیکر اور وکیل۔ آج دوپہر میں ہم نے نگرانی ختم نہیں کی تھی۔''

پیٹرسن نے پلے ایرو کو کلک کیا۔ سرمئی خانہ رنگین انٹرویو روم کی تصویر میں تبدیل ہو گیا۔ کمرے کے [illegible] سوٹ میں ایک آدمی کرسی پر [illegible] جانب جھکا ہوا تھا۔ وہ

ایک وکیل تھا۔ جس کا رخ شیشے کی جانب تھا۔ شیشے کی دوسری جانب قیدی تھا۔ قیدی کے چہرے پر داڑھی تھی۔

"غور سے سنو۔" پیٹرسن نے کہا۔

وکیل کی سرگوشی سنائی دی۔ "تم جانتے ہو کہ قدیم یونانی نے ہمیں بتایا ہے کہ چھ گھنٹے میں تمام مسئلے حل ہو جائیں گے۔ چھ گھنٹے انتظار کرنا ہے۔"

پیٹرسن نے ریکارڈنگ روک دی۔ "قدیم یونانی، مطلب یونانی فلاسفر۔ یا تو قدیم یونانی فلسفی کا نام تھا۔ یہ کون ہے۔"

ریچر نے سر ہلایا۔ "یہ کب کی بات ہے؟"

"دوپہر دو بجے۔ آٹھ بجے چھ گھنٹے ہو جائیں گے۔ اور اس وقت چھ بجے ہیں۔" پیٹرسن نے بتایا۔ "مطلب ان کے پاس دو گھنٹے بچے ہیں۔"

ریچر اسکرین کو تک رہا تھا۔ "دوبارہ پلے کرو۔"

پیٹرسن نے بٹن دبایا۔ سرگوشی نما آواز پھر سنائی دی۔

ریچر نے کہا۔ "میں اس جملے کو دوسری طرح سمجھ رہا ہوں۔ وہ یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ چھ گھنٹے کے اندر سب کچھ حل ہو جائے گا۔ میرے خیال میں اس کا مطلب ہے کہ دو سے آٹھ بجے تک کوئی ایسا خاص کام ہوگا جو تمام مسائل حل کر دے گا۔"

"ایسا کیا ہو سکتا ہے؟"

"سائرن دوبارہ بج سکتا ہے۔ اس کے بغیر وہ سنر سلیٹر تک پہنچنے کی حماقت نہیں کریں گے۔"

"وکیل یہ کیسے کرے گا؟"

"یہ کام وکیل نہیں کرے گا۔" ریچر نے کہا۔ "آٹھ بجے وہاں کھانا شروع ہوگا اور وہ وقت ہنگامہ آرائی کے لیے موزوں ہو سکتا ہے۔"

"ڈنر آٹھ بجے سے پہلے ہو جاتا ہے۔" پیٹرسن نے پریشانی سے کہا۔ "آٹھ بجے وہ گنتی پوری کر کے رات کے لیے ان کو سیلز میں مقید کر دیتے ہیں۔ ساتھ ہی چیکنگ ختم ہو جاتی ہے۔ فرض کرو حملہ آور وہاں سے پہلے ہی نکل چکا ہے اور وہ بے خبر ہیں۔ مطلب آٹھ بج کر ایک منٹ پر سائرن بولنا چاہیے۔ اگر میرا اندازہ درست ہے۔ انہیں آٹھ بجے چلے گا۔"

☆☆☆

وہ سیدھے جیلیٹ کے گھر واپس پہنچے تھے۔ ڈ تھا۔ پیٹرسن، ریچر کو لے کر پارلر میں آ گیا۔

"سائرن بولے گا تو مجھے یہاں ہونا چ

ہدایت کی۔

پیٹرسن نے ارادہ ظاہر کیا۔ ریچر نے...

گھڑی اس کے دماغ میں چل رہی تھی۔ پیٹرسن کے
گلاک اور ریچر کی جیب میں اسمتھ اینڈ ویسن موجود تھا۔
پیٹرسن کھڑکی پر اور ریچر جینیٹ کی کرسی پر بیٹھا تھ
اس کی سوچ کا محور رن وے، سنگی عمارت اور چوبی ہ
تھے۔ بار بار خیال پہلے والے ہٹ کی طرف چلا جاتا۔
''کیا کیتھی کی کوئی بہن ہے؟'' اچانک اس نے
پیٹرسن سے سوال کیا۔
''نہیں۔'' جواب ملا۔ ''وہ لڑکی کیسی تھی جسے تم نے
ہٹ میں دیکھا تھا؟''
ریچر نے حلیہ بتایا۔
''بس میں اس جیسی کوئی ہوگی۔'' پیٹرسن نے خیال
ظاہر کیا۔
''نہیں، وہ عمر رسیدہ تھیں۔''
پارلر میں ایک بار پھر سکوت طاری ہوگیا۔
☆☆☆
ساڑھے سات بجے جینیٹ پارلر میں نظر آئی۔
''کیا ہونے والا ہے؟'' اس نے سوال کیا۔
''کچھ ہونے والا ہے، یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟''
''کیونکہ تم یہاں ہو اور مسٹر پیٹرسن بھی اپنے گھر کے
بجائے یہاں پر موجود ہیں۔ اور یہ مسٹر ریچر خلافِ معمول
خاموش ہیں۔'' جینیٹ نے کہا۔
پیٹرسن نے جواب دیا۔ ''کچھ نہیں ہونے والا۔''
ریچر نے سر اٹھایا۔ ''آٹھ بجے جیل میں قیدیوں کی
گنتی ہوگی۔ ہمارا خیال ہے کہ ایک قیدی کم ہوگا۔ لہٰذا
سائرن کا بٹن دبایا جائے گا۔''
''فرار؟''
''ہمارا خیال ہے کہ فرار پہلے ہی عمل پذیر ہو چکا ہے۔
جب وہ گنتی کریں گے تو علم ہو جائے گا۔'' پیٹرسن نے کہا۔
''اوہ نو.....''
''میں کہیں نہیں جا رہا۔'' پیٹرسن کھڑکی سے ہٹ گیا۔
''فکرمندی کے لیے میں تمہاری ممنون ہوں۔''
جینیٹ نے اظہارِ تشکر کیا۔ ''لیکن میری خواہش ہے کہ تم گھر
جاؤ۔ ٹاؤن کے لیے۔ تم ہمارے اگلے پولیس چیف ہو۔''
☆☆☆
ریچر کے دماغ میں گھڑی نے آٹھ بجا دیے تھے۔
کچھ بھی نہیں ہوا۔ پیٹرسن گھڑی دیکھ کر کھڑکی کی طرف متوجہ
ہوا۔ باہر سناٹا تھا۔

''واقعی؟'' ریچر نے سوال کیا۔ ''تم اس مسئلے میں کب سے اُلجھی ہوئی تھیں؟''

''دو ہفتے۔''

''اوہ، تمہاری آواز سے مجھے لگا تھا کہ تم برسوں سے سر کھپا رہی ہو۔''

''یہ تمہارا انداز ہے تعریف کا؟''

''پارٹی ٹائم ہے۔ برانز میڈل بتاوے گا کہ تمہارا کارنامہ ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔''

''تم نے برانز میڈل کے لیے کیا کیا تھا؟''

''کچھ ٹھیک یاد نہیں۔'' ریچر نے کہا۔

''تمہاری فائل بھی ایک داستان ہے۔''

''اور فائل اب بھی تمہارے سامنے ہے۔''

''ویسے تم ساؤتھ ڈکوٹا میں کیوں اٹکے ہوئے ہو؟'' امنڈا نے سوال کیا۔

ریچر نے بس کے حادثے سے شروع کر کے اختصار کے ساتھ بتا دیا۔ جب اس نے کہا کہ چیف ہالینڈ کو اس کی مدد درکار تھی تو امنڈا نے حیرت کا اظہار کیا۔

''نہیں۔''

''ہاں۔''

خاموشی کا وقفہ آیا۔

''نام تو بتا دو۔'' ریچر نے کہا۔

''سوزن۔''

ریچر نے توقف کے بعد کہا۔ ''اپنے ائرفورس کے آدمی سے ایک اور کوشش کے لیے کہو۔''

''کوشش کروں گی۔''

''کال کرو گی؟''

''ضرور۔''

☆☆☆

ریچر پارلر میں آیا۔ جینیٹ مطالعہ کر رہی تھی۔

''کیسی ہے وہ؟''

''کون؟''

''وہ ورجینیا والی۔''

''وہ ٹھیک ہے۔'' ریچر نے کھڑکی کے قریب جا باہر جھانکا۔

''میرا خیال ہے کہ ہم محفوظ ہیں۔ کم از کم آج را گڑبڑ کا امکان مفقود ہے۔''

''اصولاً تو درست ہے لیکن بہتر کی امید کے بدتر کے لیے تیار رہنا چاہیے۔'' ریچر نے کہا۔

''نو بجنے میں پانچ منٹ تھے۔
سات گھنٹے رہ گئے تھے۔

☆☆☆

ریچر لائن پر تھا۔ پیٹرسن نے کہا۔
''قید خانہ لاک ڈاؤن ہے۔ میرا خیال ہے کہ جو بھی آئے گا۔ وہ سائرن کے بغیر آئے گا۔ اور ایسی صورت میں اسے متعدد افراد کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تین سڑک پر ہوں گے، چار گھر میں۔ صورتِ حال محفوظ ہے۔ تم عارضی طور پر نکل سکتے ہو۔ کیا خیال ہے؟''
ریچر نے چند سیکنڈ بعد جواب دیا۔ ''ٹھیک ہے۔''
''میں دس منٹ میں تمہیں لینے آرہا ہوں۔''
ریچر بات ختم کر کے پارلر میں آگیا اور جینیٹ کو بتایا کہ وہ کہاں جارہا ہے۔ ساتھ ہی اس نے سوال کیا۔ ''اگر کسی وجہ سے پولیس کو گھر سے نکلنا پڑا تو آپ کیا کریں گی؟''
''تہ خانے میں قید ہو جاؤں گی۔ گن میرے پاس ہو گی۔'' وہ بولی۔
''کب؟''
''فوراً۔''
''ہاں فوراً سے پیشتر تہ خانے میں خود کو لاک کر لینا ہے۔ پولیس کی موجودگی میں بھی اگر آپ بے چینی محسوس کریں تو کسی الرٹ کا انتظار کیے بغیر تہ خانے میں چلی جانا۔''
''وعدہ کرتی ہوں۔ میں ایسا ہی کروں گی۔''
ریچر سرہلا کے ہال وے میں آگیا۔ کوٹ ذیب تن کر جیبیں چیک کیں۔ ٹوپی، دستانے اور گن موجود تھیں۔ اس وقت فون کی گھنٹی بجی۔ زینے کے قریب پولیس وومین نے کال وصول کی پھر ریسیور ریچر کو پکڑا دیا۔
''یس؟'' وہ بولا۔ توقع تھی کہ پیٹرسن جواب دے گا لیکن آواز نسوانی تھی۔ ورجینیا سے۔
''یوں ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی قسم کا کارگو تھا۔ بچا ہوا چالیس ٹن جنگی سامان۔ جو بذریعہ ہوائی جہاز برطانیہ کے پرانے ائرفورس بیس سے پہنچایا گیا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دو بمبار طیارے برطانیہ کے مشرقی مقام ''ایسٹ اینگلیا'' سے اڑے تھے۔ پچاس کی دہائی کا وقت تھا۔''
''کس قسم کا فالتو سامان تھا؟'' ریچر نے سوال کیا۔
''یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ پرانی بات ہے۔ غالباً ائرکریو کے استعمال کی اشیا اور مینوفیکچرر کا نام ہے۔ نام کسی کو یاد نہیں۔ البتہ ایک کوڈ ہے۔ کوڈ سمجھ سے بالا ہے۔''
''کوڈ بتاؤ۔''
''NO6BA03۔''
''میں بھی لاعلم ہوں۔'' ریچر نے کہا۔
''کوئی بھی نہیں سمجھ سکا۔'' آواز آئی۔ ''شاید کچھ ایسا ہے جسے ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ فروخت کیا جا سکتا تھا اور نہ نذرِ آتش کیا جا سکتا تھا۔ وجہ سیکیورٹی ہو سکتی ہے۔'' نسوانی آواز میں تبصرہ سنائی دیا۔
''ریکارڈ پر مینوفیکچرر کا نام نہیں ہے؟''
''کراؤن لیب۔''
''لعنت ہے۔ چالیس ٹن، کراؤن لیب..... کیا مذاق ہے۔'' ریچر نے خود کو کوسا۔
''ریچر کیا ہوا؟''
''مجھے جانا ہے۔''

☆☆☆

سڑک پر پیٹرسن کی گاڑی نظر آتے ہی ریچر باہر نکل گیا۔ شدید سردی کی لہر ہتھوڑے کے مانند لگی۔ گاڑی اس کے قریب رکی اور ریچر اندر بیٹھ گیا۔ ہیٹر نیم گرم ہوا پھینکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ریچر نے دستانے چڑھا کے کیپ سر پر رکھ لی۔
سفر شروع ہوا۔ دس میل بعد انہوں نے موڑ کاٹا اور ہائی وے کے متوازی ڈرائیو شروع ہوئی۔ آگے دائیں موڑ کے بعد سامنے پرانا رن وے تھا۔ رن وے پر دو میل گاڑی ٹاپ گیئر میں گئی۔
کسی رکی ہوئی گاڑی کی عقبی بتیوں نے انہیں رکنے پر مجبور کیا۔ وہ فورڈ کراؤن وکٹوریہ تھی۔ ویسے بھی وہ منزل پر تھے۔
''چیف ہالینڈ کی کار ہے۔'' پیٹرسن نے کہا۔ وہ اتر کے آگے بڑھے۔ ہالینڈ پہلے ہٹ کے دروازے پر نظر آیا۔ ان دونوں کو دیکھ کر وہ کچھ ناخوش دکھائی دیا۔
''مجھے اندازوں کی پروا نہیں ہے۔'' ہالینڈ بولا۔ ''تمہیں نہیں آنا چاہیے تھا۔ فرض کرو سائرن بول اٹھا تو کیا ہوگا؟''
''ایسا نہیں ہوگا۔ کوٹھریوں کو لاک کر دیا گیا ہے اور قیدیوں کی گنتی بھی کر لی گئی ہے۔''
''تمہیں طریقہ کار پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ ایسا تو روز ہوتا ہے۔ نائٹ پٹرولنگ سیلز کے باہر ہے۔ وہ دس ہیں۔ ان میں سے بھی کوئی سلپ کر سکتا ہے۔''
''کیا تم سنجیدہ ہو؟ کیا ہمیں واپس جانا چاہیے؟''
''مسز سلیٹر کو اکیلا چھوڑنا ایک جوا ہے۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ واپس جاؤ لیکن آنا نہیں چاہیے تھا۔''
ریچر دخل انداز ہوا۔ ''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''
ہالینڈ نے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیونکہ مجھے چابی

کے بارے میں معلوم ہے۔"

"کہاں ہے؟" پیٹرسن نے سوال کیا۔

☆☆☆

جب انہوں نے وہاں آگ لگائی تھی۔ اس وقت بھڑکتے شعلوں اور بے پناہ حدت کے باعث کچھ تلاش کرنا ممکن نہیں تھا۔ اب سب کچھ سرد ہو چکا تھا۔ چابی پہلے ہٹ کے اسٹو کے اندر تھی۔ پوشیدہ رکھنے کے لیے بہترین جگہ تھی۔ دوجینیا والی کی نسوانی آواز دماغ میں گونج رہی تھی۔ آگ لگا دو پھر راکھ میں تلاش کرو۔ ائرفورس کی چابی غالب امکان ہے کہ مخصوص دھات کی بنی ہوگی۔ آگ اس پر اثر انداز نہیں ہوگی۔ وہ درست کہہ رہی تھی۔ چابی کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔

ریچر نے اسٹو سے چابی نکال کر ہالینڈ کے حوالے کر دی۔ وہ تینوں بلڈنگ ڈور پر گئے اور بہ آسانی دروازہ کھول لیا۔ دروازہ کافی وزنی تھا۔ بینک والٹ کے مانند۔ ریچر اسے دھکیل کے اندر گیا اور اسے مزید کھول دیا۔ اندر تاریکی تھی۔

"فلیش لائٹ۔" ہالینڈ کی آواز آئی۔

ریچر باہر نکل کر گاڑیوں تک گیا اور تین فلیش لائٹس لے کر واپس آ گیا۔ روشنی نے کنکریٹ کا بنکر دکھایا۔ بیس فٹ گہرا، تیس فٹ چوڑا۔ خلا کے درمیان عمودی گھومتا ہوا زینہ نیچے فرش تک جا رہا تھا۔ زینہ فولادی تھا۔ زینے کے قریب دو چوڑے دھاتی پائپ نیچے سے اوپر آ رہے تھے۔ گویا ایک غار تھا جو نیچے تاریکی میں گم ہو گیا تھا۔

ریچر نے فولادی ریلنگ پر جھک کر روشنی نیچے پھینکی۔ سیڑھیوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔

پیٹرسن نے کہا۔ "میں پہلے جاتا ہوں۔"

رات دس بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ کلائمیکس چھ گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔

☆☆☆

پیٹرسن سات فٹ نیچے گیا تو ریچر اس کے پیچھے حرکت میں آیا۔ جگہ تنگ تھی لیکن بل کھاتے زینے پر ریچر کو اس کی لمبی ٹانگیں پریشان کر رہی تھیں۔

گھومتا ہوا سفر نیچے کی طرف جاری تھا۔ وہ نیچے ہی نیچے جا رہے تھے۔ پچاس فٹ ..... سو فٹ ..... تھی ہوئی ہوا خشک تھی ..... دو سو فٹ۔ وہ دو منزل نیچے اتر گئے تھے۔ پیٹرسن کی آواز آئی۔ "میں پہنچ گیا ہوں۔" زینے کی گھومتی ہٹ زیرِ زمین چیمبر کے فرش پر ختم ہو گئی۔ چیمبر بھی دائرہ نما تھا۔

ریچر آگے گیا اور آخری قدمچے سے پہلے والی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ آگے زیرِ زمین کنکریٹ کا چیمبر تھا۔ بڑے لیونگ روم کے مانند۔ چیمبر میں آٹھ کوریڈورز یوں بنے ہوئے تھے جیسے سائیکل کے پہیے میں تیلیاں ہوتی ہیں۔ ہر کوریڈور میں آٹھ دروازے تھے۔ جگہ مضبوط تھی۔ فرش، چھت اور دیواریں چکنی تھیں۔ اعلیٰ تعمیرات کا نمونہ۔ بچوں کو محفوظ رکھنے کے لیے مناسب لیکن ایک عجیب، فضول اور غیر ضروری چیز چھت تھی۔ جس کی بلندی صرف پانچ فٹ اور چھ انچ تھی۔ لہٰذا گول چیمبر چھت کی وجہ سے بالغ افراد کے لیے بیکار تھا۔ کسی بھی قسم کی ملٹری سرگرمی یا تربیت یہاں ممکن نہیں تھی۔ پیٹرسن تکلیف دہ انداز میں گھٹنوں کے بل دس قدم آگے گیا۔ نیچی چھت میں سے گزر کے دو گول شافٹ نکل کے نیچے تک آئی ہوئی تھیں۔ ریچر گھٹنوں اور کہنیوں کے بل کھسک کر حرکت کر رہا تھا۔ پیٹرسن کا بھی تقریباً یہی حال تھا۔ وہاں سے کیروسین کی ہلکی سی بو بھی کسی جانب سے پہنچ رہی تھی۔ پیٹرسن نے اپنی فلیش لائٹ اطراف میں آٹھ دروازوں پر گھمائی۔

"لیب کس طرف ہے؟"

"لیب کہیں نہیں ہے۔" ریچر نے کہا۔

"یہ تھیم ہے تو لیب بھی ہونی چاہیے؟" پیٹرسن نے کہا۔

"لیب بھی ہوا کرتی تھی۔" ریچر نے جواب دیا۔ "لیکن یہاں نہیں۔ لیب نیو جرسی میں ایک بڑی جگہ پر تھی۔"

"کیا مطلب ہے؟"

ریچر نے فلیش لائٹ کی روشنی میں بغور فرش پر نگاہ دوڑائی اور بولا۔

"میرے پیچھے آؤ۔" اس نے ایک دروازے میں روشنی پھینکی۔

"آگے سرنگ ہے۔" اس نے کہا۔

سرنگ کی چھت بلند تھی۔ وہاں بہ آسانی کھڑے ہو کر چلا جا سکتا تھا۔ وہ سرنگ میں داخل ہوئے۔ دائیں جانب کم اونچائی والی سونے کے لیے برتھ تھی۔ جس کی لمبائی سوفٹ تھی۔ لیکن وہ جگہ آرام کرنے کے لیے نہیں تھی۔ اس پر جو کچھ رکھا تھا وہ زمانۂ جنگ کا بچا ہوا یا اضافی سامان تھا..... وہ کیا تھا۔ وہ سیکڑوں ہزاروں چھوٹی چھوٹی سفید پاؤڈر کی اینٹیں تھیں۔ جو شفاف مخصوص کاغذ میں ملفوف تھیں۔ کاغذ اینٹوں کو محفوظ رکھنے کے لیے تھا۔ کاغذ پر ساج کا مخصوص ٹریڈ مارک تھا۔ وہ کراؤن لیب کا نشان تھا۔ کراؤن لیب قانونی تھی اور سرکار کے ساتھ معاہدے کے تحت کام کرتی تھی۔ دورانِ جنگ بہت کچھ بدل جاتا ہے۔

''مجھے یقین نہیں آتا۔'' پیٹرسن نے تبصرہ کیا۔

اینٹیں دس دس کی تعداد میں رکھی تھیں پھر ہر ایک پر دس دس اور پر رکھی گئی تھیں۔ اسی طرح گروپس کی شکل میں یہ آگے تک پورے شیلف پر نظر آ رہی تھیں۔ آخری کونے پر کسی قدر رقت تھی۔ ریچر نے آگے بڑھ کے پورے اسٹاک پر روشنی گھمائی اور دماغ میں تخمینہ لگایا۔ کم از کم پندرہ ہزار اینٹیں تھیں۔

ہالینڈ نے سوال کیا۔ ''کیا یہ چالیس ٹن ہیں؟''

''نہیں۔'' ریچر نے جواب دیا۔ ''یہ چالیس ٹن کا نصف بھی نہیں ہے۔ یہ صرف ایک تہائی ہے۔ ایسے دو اسٹاک اور ہونے چاہئیں۔''

''یہ پاگل پن ہے۔'' پیٹرسن نے کہا۔ ''یہاں ان کی موجودگی کس لیے؟''

''دوسری جنگِ عظیم اور ائر کریو۔'' ریچر نے جواب دیا۔ ''بمبار عموماً بارہ گھنٹے پرواز کرتے تھے۔ برلن کی طرف پھر وہاں سے واپسی۔ تقریباً ہر روز۔ ہر چکر پُرہول اور اعصاب شکن مرحلہ تھا۔ ہر ایک منٹ خطرے میں گزرتا تھا۔ یہ کوئی مشق نہیں بلکہ پریکٹیکل تھا۔ خطرات سے بھرا ہوا وہ ایک نیا تجربہ تھا۔ ہلاکتوں کی تعداد نے اسے ایک بھیانک خواب میں تبدیل کر دیا تھا۔ ان کو یہ کام کرنا پڑتا تھا اور تھکاوٹ نے سوچنے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔ ان کو فضا میں رکھنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ ان کو خاص قسم کی نشہ آور چیز استعمال کرائی جائے۔''

''لیکن۔''

''یہ میڈیکل آفیسر پر منحصر تھا کہ وہ اس کی گولیاں بنواتے یا پانی میں حل کر کے استعمال کرواتے۔ بعض کی سفارشات کے مطابق اس کا دھواں سانس کے ذریعے اندر کھینچا جائے۔ یہ ایک عمومی امر بن گیا جیسے کھانے پینے کی اشیا یا اسلحہ۔'' ریچر نے مزید تجزیہ پیش کیا۔

''لیکن اتنی بڑی تعداد میں یہاں موجودگی کا مقصد میری سمجھ سے بالاتر ہے۔'' پیٹرسن نے سر کھجایا۔

''اسے فروخت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ٹھکانے کہاں لگاتے اور نذرِ آتش کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ جلانے کی صورت میں آلودہ بادل دور تک فضا میں چھا جاتا۔''

کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ وہ ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ بالآخر ہالینڈ کی آواز آئی۔

''باقی حصہ کہاں ہے؟ تلاش کرتے ہیں۔''

''جیٹ فیول؟'' پیٹرسن نے استفسار کیا۔
''اس کی بُو تو کیروسین جیسی ہے۔''
''جیٹ فیول بنیادی طور پر کیروسین ہی ہوتا ہے۔ وہ رن وے صاف کر کے چلے گئے ہیں۔ اس کا مطلب جہاز کی آمد متوقع ہے جسے ری فیول کیا جائے گا۔''
''یہ کیسے ہوگا؟''
''ہوز پائپ اور شافٹ کے ذریعے۔''
☆☆☆
واپسی پر ریچر نے قدم گنے تھے۔ دو سو اسی سیڑھیاں تھیں۔ اوپر پہنچ کر ریچر نے کوٹ کی زپ چڑھائی۔ ہیٹ سر پر رکھا اور ہاتھوں کو دستانوں میں چھپا لیا۔
''تمہیں جینیٹ کو کال کرنی چاہیے۔'' ریچر نے ہالینڈ سے کہا۔
''ضروری ہے؟''
''ہاں، جب ہم زیرِ زمین تھے تو سائرن چیخا ہوگا۔ امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔''
''اگر ایسا ہوا تھا پھر بھی بہت دیر ہو گئی ہے۔'' ہالینڈ نے کہا اور سیل فون پر نمبر ملا کے بات کی پھر مسکرا کے بولا۔
''سب ٹھیک ہے اور یہ کہ آج جو کچھ ہوا، اس کا کریڈٹ میں پیٹرسن کو دیتا ہوں۔ اگلا چیف وہی ہوگا۔''
ریچر کچھ نہیں بولا۔
''کیا خیال ہے؟'' ہالینڈ نے سوال کیا۔
''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''
ہالینڈ کار کا دروازہ کھول کے اندر گیا اور ڈیش بورڈ سے اپنا ریڈیو مائیک اٹھایا اور بوسٹن میں اعلان کیا۔ لیڈیز اینڈ جنٹلمین ... اس نے بہت بڑی ڈرگ سٹنگ کے بارے میں بتایا اور سہرا پیٹرسن کے سر باندھا۔ مبارک باد دی اور کہا بوسٹن بہت مشہور ہونے والا ہے۔
☆☆☆
سترہ سو میل جنوب میں پلانو کی تین گاڑیاں سویلین ائرفیلڈ کے گیٹ پر حالتِ انتظار میں تھیں۔ اندر ایپرن پارکنگ پر چار طیارے تھے۔ ان میں ایک بوئنگ 737 تھا۔ جو اپنی جسامت اور چمک دمک کے باعث نمایاں تھا۔ بوئنگ تین بار فروخت ہوا تھا اور اب پلانو کی ملکیت تھا۔
ایک پک اَپ ٹرک گیٹ کے قریب آیا۔ ایک آدمی نے اتر کر گیٹ کھولا۔ تینوں گاڑیاں اندر چلی گئیں۔ تینوں آگے پیچھے ایک قطار میں چکر کاٹ کر بوئنگ کے قریب ٹھہر گئیں۔ بوئنگ کے گیٹ کی سیڑھیاں پہلے ہی باہر اتر چکی تھیں۔ پلانو کے مختصر قافلے کے تین آدمی سیڑھی کے ذریعے اوپر بوئنگ میں چلے گئے۔ ایک منٹ بعد تینوں میں سے ایک کا سر دکھائی دیا۔ اس نے سب ٹھیک ہے کا اشارہ دیا۔
پلانو گاڑی سے نکل کر بوئنگ میں چلا گیا۔ اس کی نشست بائیں جانب سامنے کی طرف تھی۔ جہاز ایک سو اسی مسافروں کے لیے تھا۔ عملے کے ساتھ ایک مسافر کا اوسط وزن دو سو پاؤنڈ سمجھا جائے تو کل وزن چھتیس ہزار پاؤنڈز بنتا ہے۔ یعنی جہاز بہ آسانی اتنا وزن لے جانے کے قابل تھا۔
پلانو کے آدمی سامان کا جائزہ لے رہے تھے۔ سرد علاقے کے لیے گرم کپڑے، المونیم کی سیڑھیاں، آٹو مینک ہتھیار، کھانے پینے کا سامان اور سات بیگز۔ جن میں اضافی میگزین اور فلیش لائٹس۔ سیڑھیوں کی تعداد چار تھی۔
پائلٹس نے پری فلائٹ چیکنگ کے بعد انجن اسٹارٹ کیے۔ جہاز ٹیکسی کر کے رفتار بڑھاتا گیا اور شاندار انداز میں اندھیری فضا میں بلند ہو گیا۔
☆☆☆
ریچر کی گاڑی جب ٹاؤن میں داخل ہوئی تو ہالینڈ اپنی کار میں پیچھے آ رہا تھا۔ ریچر، جینیٹ سلیٹر کے گھر والی سڑک کے کونے پر اتر گیا۔ وہاں سے وہ پیدل گھر تک گیا۔ جینیٹ نے خوش آمدید کہا۔
''کامیابی؟'' جینیٹ نے سوال کیا۔
''فی الحال سب ٹھیک ہے۔'' ریچر نے جواب دیا۔
''تو پھر وہ جینیا والی لڑکی کو کال کرو۔ تم کافی پریشان رہے ہو۔'' جینیٹ نے ذومعنی انداز میں کہا۔
ریچر نے غور سے جینیٹ کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ ریچر نے کوٹ اتار کر اسٹینڈ پر لٹکایا اور ہال وے میں فون کے قریب چلا گیا۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے نمبر ملایا اور امنڈا کے بارے میں استفسار کیا۔ دوسری جانب اسی کی آواز تھی۔
''N06BA03 میتھم (میتھم فیٹامین) (methamphetamine) کا فارماسیوٹیکل کوڈ ہے۔ وہ بولی۔'' چالیس ٹن؟''
''تقریباً اور قابلِ استعمال حالت میں۔'' ریچر نے جواب دیا۔
''اوہ میرے خدا۔ اب تم کیا کرنے والے ہو؟''
''کچھ نہیں۔ میتھامی پولیس کا مسئلہ ہے۔'' اس نے کہا۔
''چالیس ٹن میتھم، سسٹم سے کیسے غائب ہو گیا؟'' نسوانی آواز نے سوال کیا۔
''کیا کہہ سکتا ہوں۔ اقدار اچانک بدل جاتی ہیں۔

سوال، جواب

☆ ''فنون لطیفہ کسے کہتے ہیں؟''
''وہ فنون جن میں لطیفے ایجاد کیے جاتے ہوں!''

☆ ''دو آدمی ایک کمرا دس دن میں بناتے ہیں تو دس آدمی اس کمرے کو کتنے دن میں بنائیں گے؟''
''بنانے کی ضرورت ہی نہیں۔ دو آدمی پہلے ہی وہ کمرا بنا چکے ہیں۔''

☆ ''مرزا غالب کون تھے؟''
''ایک اسٹیج ڈرامے کے ہیرو..... ان کا اصل نام معلوم نہیں!''

☆ ''میرے پاس سو روپے تھے، دس خرچ ہو گئے۔ بتاؤ اب میرے پاس کتنی رقم بچی ہے۔''
''معلوم نہیں..... میرے پاس کیلکولیٹر نہیں ہے۔''

☆ تاریخ پڑھاتے ہوئے استاد نے جماعت سے پوچھا۔ ''نور جہاں کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟''
''بہترین گلوکارہ۔'' جواب ملا۔ ''میرے نغمے تمہارے لیے ہیں..... ان کا بہترین گانا ہے۔''

کراچی سے محمد عفان آزاد کی معلومات

ہالینڈ کے تازہ احکامات کے تحت ڈپارٹمنٹ ہائی الرٹ تھا۔ موبائل پٹرولنگ چوکس اور متحرک تھی۔

پٹرولنگ کا ایک یونٹ نووارد مونٹگومری کے ماتحت تھا۔ انہیں ٹاؤن کے مرکز میں شمال مشرقی سمت ا[illegible] پارکنگ لاٹ میں پیٹرسن کا [illegible] ملا تھا۔

[illegible] سڑک [illegible] ۔ کار بظاہر خالی تھی۔ [illegible] یونٹ سائڈ پر کھڑکی کا شیشہ نیچے تھا۔ قریب سے جائزہ لینے پر مونٹگومری نے دیکھا کہ گاڑی خالی نہیں تھی۔ پیٹرسن بے ڈھنگے انداز میں نشست پر پڑا تھا مردہ حالت میں۔ سر پر گولی کا زخم تھا۔

ریپر پارکر کی کھڑکی پر گیا۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ پولیس کا عملہ فکرمند آوازوں میں شکوک کا اظہار کر رہا تھا۔ وہ پُرامید تھے کہ اطلاع غلط بھی ہو سکتی ہے۔ بعض زخم کے نشانات گمراہ کر دیتے ہیں۔ بے ہوشی یا کوما کو موت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن سو میں ننانوے مرتبہ اس قسم کا حسن ظن وقت کا زیاں ثابت ہوتا ہے۔ ریپر امید کا دامن چھوڑنے کے خلاف تھا۔ تاہم وہ احمق بھی نہیں تھا۔ حقائق کی نوعیت کو سمجھتا تھا۔

اور وہ بُری خبر پانچ منٹ بعد درست ثابت ہو گئی۔

جب چیف ہالینڈ بذاتِ خود وہاں پہنچا۔ اس کے پاس تین نکات تھے۔ پہلا یہ کہ وہ خود سب کے لیے خبر کی تصدیق کر دے۔ دوسرا نکتہ سب حقیقت کو قبول کر کے کام پر توجہ مرکوز کریں۔ بطور چیف آفیسر وہ جس سرگرمی کا مظاہرہ کر رہا تھا، یہ ایک اچھی علامت تھی لیکن ریچر نے بدتر حالات میں ایسے آفیسرز کو اتنا فعال پہلے نہیں دیکھا تھا۔ تیسرا نکتہ اس کے ایجنڈے پر ریچر کے لیے تھا۔ وہ چاہتا کہ ریچر بھی کرائم سین کا وزٹ کرے۔

شور شرابے سے جینیٹ بیدار ہو گئی تھی۔ اس نے خود کو کچن میں محدود رکھا تھا۔ ریچر کو جینیٹ کچن میں ہی ملی۔ گن اس کی جیب میں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ریچر کیا کہنے والا تھا۔ اس نے ہاتھ لہرایا۔ ''میں آگاہ ہوں، کیا کرنا ہے۔ تہ خانہ اور گن۔''

''کب؟'' ریچر نے سوال کیا۔

''فوراً..... فوراً..... سے پہلے۔'' وہ بولی۔

''گڈ..... وہ جو بھی ہے۔ ٹاؤن میں پہنچ گیا ہے اور وہ زیادہ دور نہیں ہے۔''

☆☆☆

ریچر، ہالینڈ کی سیڈان میں کرائم سین پر پہنچا۔ رات کے وقت پارکنگ خالی تھی۔ دو پولیس کی گاڑیاں پہرے پر تھیں۔ پیٹرسن کی گاڑی بائیں کونے پر تھی۔ کھڑکی کا شیشہ کھلا تھا۔ دونوں گاڑی سے نکل کر پارکنگ میں آگے گئے۔ برف پتھر کے مانند سخت تھی۔ قدموں کے نشان یا دوسری گاڑی کے پہیوں کے نشانات دیکھنا ممکن نہ تھا۔ دونوں گاڑی کے عقب سے ہو کر ڈرائیونگ ڈور پر گئے۔ کھلی کھڑکی سے نزدیک سے اسنوں — گولی کے ہولسٹر میں موجود تقریباً کروٹ کے مڈ برھا۔ ن ن ن تھی۔ گردن مڑی ہوئی تھی۔ ریچر گھوم کر آگے پسنجر ڈور پر گیا۔ اسے کھولا اور جھک کر قریب سے جائزہ لیا۔ پیٹرسن کی بے روح آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ تیسری سرخ آنکھ اس کی پیشانی پر تھی۔ بلاشبہ نو ایم ایم کا فائر تھا۔ صورتِ حال ویسی ہی تھی جیسے وکیل کا مرڈر ہوا تھا۔ کار نیوٹرل گیئر میں تھی۔ ہیٹر آن تھا۔ ریڈیو وائیم کم کیا ہوا تھا۔

''رائٹ۔'' ریچر دروازہ بند کر کے سیدھا ہو گیا۔

''کیا ہوا تھا؟'' ہالینڈ نے سوال کیا۔

''نہیں معلوم۔''

''وہ سیدھا گھر کیوں نہیں گیا؟''

''نہیں معلوم۔''

''یہاں کا کوئی آئیڈیا؟'' ہالینڈ نے کہا۔

''پیٹرسن نے یہاں کسی کو دیکھا تھا۔ پیدل نہیں گاڑی پر۔'' ریچر نے کہا۔ ''سردی کی وجہ سے وہ پیدل نہیں ہو سکتا۔ دونوں گاڑیاں پہلو بہ پہلو رکی ہوں گی۔ قریب قریب۔ پیٹرسن نے ریڈیو کی آواز کم کی اور بات کرنے کے لیے شیشہ نیچے کیا۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ فائر ہوا اور پیٹرسن گر گیا۔''

''مطلب وہی انداز، جیسے وکیل کے ساتھ ہوا تھا؟''

''وہی سیٹ اپ۔'' ریچر نے اثبات میں سر ہلایا۔

دونوں کچھ لمحہ موسم میں ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔

ہالینڈ نے کہا۔ ''کیا گولی کا خول تلاش کرنا چاہیے؟''

ریچر نے نفی میں گردن کو جنبش دی۔ ''وکیل کی طرح کا معاملہ ہے۔ فائر کرنے والے کی گولی کا خول اسی کی گاڑی میں گرا ہے۔''

ہالینڈ نے کچھ نہیں کہا۔ ریچر نے اس کے چہرے پر سوال پڑھ لیا۔ ''شوٹر کون ہے؟''

پیچیدہ سوال تھا۔ جواب بھی مشکل اور شاید کڑوا بھی۔

ریچر نے کہا۔ ''اب سمجھا کہ تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو۔ تم چاہتے ہو کہ تمہارے بجائے میں نتیجہ اخذ کروں۔ مطلب ایک خود مختار اور باہر کا آدمی بتائے۔''

ہالینڈ نے خاموشی برقرار رکھی۔

☆☆☆

وہ واپس اسٹیشن پر آ گئے۔ اسکواڈ روم میں۔ ڈیسک وہ تھی جو پیٹرسن استعمال کرتا تھا۔

ہالینڈ نے کہا۔ ''تم اس کے وائس اور ای میلز چیک کرو۔ ممکن ہے کوئی اشارہ ملے۔''

''تمہارا ڈپارٹمنٹ ہے۔ تم کر سکتے ہو۔ میں ایک سویلین ہوں۔''

''میں اس معاملے میں [illegible] ہوں۔ ٹیکنالوجی سے دور، نہ کبھی سیکھنے کی کوشش کی۔ میرا وقت پرانے وقت کا انداز ہے۔ سب جانتے ہیں۔'' ہالینڈ نے کہا۔

ریچر کندھے اچکا کر ٹیلی فون کونسول اور کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہوا۔ پاس ورڈ کی ضرورت نہیں تھی۔ ای میل سے پہلے اس نے وائس میل میسج دیکھے۔ صرف ایک وائس میسج تھا۔ کیتھی پیٹرسن کا۔ پیغام شام چھ بجے آیا تھا۔ کیتھی پیٹرسن نے شوہر سے سوال کیا تھا کہ وہ گھر کب آئے گا۔

ای میل میں ہائی وے پٹرول کا ایک عمومی پیغام تھا۔

''کچھ نہیں ہے۔'' ریچر نے اعلان کیا۔

''پیٹرسن کے گھر جانا پڑے گا۔'' ہالینڈ نے کہا۔

''تین اہم سوالات ہیں۔'' ریچر نے کہا۔ ''وکیل سڑک پر پورے اعتماد کے ساتھ رکا تھا۔ کیوں؟ پیٹرسن پارکنگ میں کیوں رکا تھا۔ اس کا بھی وہی انداز تھا۔ آخری سوال تمام راتوں کے بعد اسے آج رات کیوں نشانہ بنایا گیا؟''

''تمہارے ذہن میں کیا جوابات آتے ہیں؟''

''جواب یہ ہے کہ وکیل اس لیے رکا کیونکہ وہ اپنی دانست میں محفوظ تھا۔'' ریچر نے کہا۔ ''پیٹرسن گھر جانے کے بجائے وہاں کیوں رکا۔ اس کی گن بھی ہولسٹر میں تھی۔ وہ بھی خود کو محفوظ خیال کر رہا تھا۔ تیسرا نکتہ یہ ہے کہ تم نے وہیں پولیس ریڈیو پر تھم کے ذخیرے کی دریافت کا اعلان کر دیا تھا۔''

''کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔'' ہالینڈ نے سر ہلایا۔

''درست سمجھ رہے ہو۔'' ریچر مسکرایا۔ ''شوٹر ہم میں سے کوئی ہے۔ وہ پولیس کوپ ہے۔''

رات کے بارہ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ خونی ڈرامے کا انجام چار گھنٹے بعد تھا اور سب ہی بے خبر تھے۔

☆☆☆

ریچر اور ہالینڈ اس نظریے پر متفق تھے کہ ایک غدار پولیس مین پہلے سے ہی ٹاؤن میں موجود رہا ہے۔ کوئی ابہام اور شک نہیں رہا تھا۔ آخر کیوں اب تک ہر قسم کی نگرانی خصوصاً ٹاؤن میں نئے آنے والوں کی جانچ سے کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ غدار پولیس اہلکار اپنی گاڑی میں سرگرم تھا۔ وہ گاڑی کی روشنیوں سے اشارہ کرتا تھا یا پھر شیشہ نیچے کر کے دستانے والا ہاتھ باہر لہراتا تھا اور ایک محتاط وکیل خالی سڑک پر اطمینان سے گاڑی روک لیتا تھا۔ پولیس سے وکیل کیوں خطرہ محسوس کرتا۔ غدار پولیس مین نے ہالینڈ کا فاتحانہ جذباتی پیغام رات کو پہلے ہی سن لیا تھا۔ سب نے سنا تھا کہ اگلے روز پیٹرسن، ڈرگ انفورسمنٹ ایڈمنسٹریشن سے واشنگٹن میں فوری طور پر رابطہ کرے گا۔ اسی لیے اس نے رات کو پیٹرسن کو ختم کرنا ضروری سمجھا۔ اور وہ کیوں سائرن اور قید خانے میں فساد کے باوجود جینیٹ کو ختم نہیں کر سکا۔ کیونکہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی خود بھی جینیٹ کو بچانے والے کرائسس پلان کا حصہ تھا۔ پیٹرسن بہ آسانی اس لیے مارا گیا کہ اس کا سامنا اپنے ہی ساتھی سے ہوا تھا۔

ہالینڈ نے کہا۔ ''غلطی میری ہے۔ جو کچھ میں نے ریڈیو پر کہا وہی اعلان پیٹرسن کی جان لے گیا۔''

''اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو شاید ایسا ہی کرتا۔ خود کو الزام نہ دو۔'' ریچر نے کہا۔

''کیوں نہ دوں۔ میں سمجھتا آیا ہوں کہ میکسیکن ہی تمام گڑبڑ کے پیچھے ہیں۔''

''پلاٹو؟'' ریچر نے سوال کیا۔

''ہمارا آدمی غدار کیوں ہوا اور پیٹرسن کو فوری طور پر ختم کرنا کیوں ضروری سمجھا۔ اس کی وجہ پیسا ہے۔'' ہالینڈ نے خیال آرائی کی۔

''ہاں دولت یا رشوت سے بہت کچھ خریدا جا سکتا ہے۔'' ریچر نے تائید کی۔ ''لیکن انسدادِ منشیات کے ادارے تک اطلاع تو جائے گی۔ کیا وہ پورے ڈپارٹمنٹ کو مارے گا۔ یہ ممکن نہیں۔''

''ابھی تو یہ سوچنا ہے کہ وہ ہے کون؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں؟'' ریچر نے کہا۔

''تمہیں نئی صورتِ حال میں کس پر شک ہے؟''

''میرا خیال ہے، کوئی نیا بندہ ہے لیکن یہ بھی میری کمزوری ہے۔ بھیڑ سی لگ گئی ہے۔ میں سب کو اچھی طرح نہیں جانتا۔'' ہالینڈ نے اعتراف کیا۔

''مجھے کیپلر کے بارے میں بتاؤ۔'' ریچر نے کہا۔

''میامی میں اس کے ساتھ کچھ مسئلے تھے لیکن اس کے خلاف کچھ ثابت نہ کیا جا سکا۔ بہرحال افواہیں منشیات کی فروخت سے حاصل شدہ رقوم ہی کی تھیں۔''

''خوب، تمہیں نظر رکھنی چاہیے۔ لوول اور مونٹگومری کو بھی دیکھتے رہو۔ جو کوئی تنہا کسی واردات کا انکشاف کرتا ہے، بیشتر اوقات ذمے دار بھی وہی ہوتا ہے۔''

''کیا میں ان کو بلاؤں؟'' ہالینڈ نے سوالیہ نظر ڈالی۔

''صرف ان کو بلانے سے شاید کام نہ چلے۔ بہتر ہوگا کہ زیادہ افراد کی فہرست تیار کی جائے۔ جس میں نو وارد اہلکار اور مشکوک دونوں شامل ہوں گے۔ جینیٹ سلیٹر کے گھر میں جو افراد تعینات ہیں، ان کے بارے میں کیا رائے ہے؟''

''وہ شک کے دائرے سے باہر ہیں۔'' ہالینڈ نے جواب دیا۔ ''واردات کے وقت وہ گھر میں تھے۔ اتنا ہی کافی ہے۔ ویسے بھی میں ان کو بخوبی جانتا ہوں۔''

''لیکن تمہیں چاہیے کہ ان کو خبردار کر دو۔ کیونکہ اگر ہمارے مطلوبہ شخص کو علم ہوا کہ اس کے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے تو وہ ایک آخری کوشش کے لیے راستہ ڈھونڈے گا۔'' ریچر نے مشورہ دیا۔

☆☆☆

''کیا میں کال کروں؟'' ہالینڈ نے سوال کیا۔

''ہاں، پہلے گھر میں موجود افراد سے بات کرو۔ بعد ازاں سب کو چھوڑ کے آفیسرز کو بلاؤ۔''

☆☆☆

ریچر، پیٹرسن کے گھر کے سامنے اترا۔ اُسے لانے والا واپس چلا گیا۔ ہر شے برف کی دبیز چادر کے نیچے تھی۔ ماحول یخ بستہ.....

آدھی رات کے بعد پولیس کی طرف سے آیا ہوا آدمی کسی گھر کے دروازے پر دستک دے تو یہ واضح طور پر بُری علامت ہوتی ہے۔

کیتھی پیٹرسن نے بھی سمجھنے میں دیر نہیں لگائی۔ دروازہ کھولنے میں بھی اس نے عجلت کا مظاہرہ کیا تھا۔ شوہر کے بجائے ریچر کو دیکھ کر اس کا گلابی چہرہ سفید پڑ گیا۔ منہ کھلا اور بند ہو گیا۔ وہ غش کھا کے دروازے میں ہی ڈھیر ہو گئی۔

☆☆☆

کارٹر نے لائٹ بی اور کمرے سے نکل گیا۔ یہ آخری راؤنڈ تھا۔ پچھلے راؤنڈز بوگس تھے۔ کسی نے راؤنڈ نہیں لگایا تھا۔ کاؤنٹی لاک اَپ میں زیادہ تر مقامی تھے جن کی ضمانت نہیں ہوئی تھی۔ کل ساٹھ سیل دو منزلوں پر تھے۔

کیتھی پیٹرسن ہوش و حواس سے بیگانہ تھی۔ ریچر نے جھک کر اسے بچوں کی طرح گود میں اٹھا لیا۔ قدم بڑھا کے اندر گیا اور ایک پیر سے عقب میں ٹھوکر لگا کر دروازہ بند کر دیا۔ مزید اندر آ کے اس نے کیتھی کو صوفے پر لٹا دیا۔ ریچر کے لیے یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ آرمی میں اس نے ہر قسم کی تربیت حاصل کی تھی..... بہت سیکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بے ہوشی کس قسم کی ہے اور اسے کیا کرنا ہے۔ کیتھی کی حرکتِ قلب ممکنہ طور پر گری ہو گی اور خون کی روانی دماغ کی طرف کم ہونی چاہیے تھی۔ وہ مخصوص شاک کی حالت میں تھی۔ ریچر کو چار کام کرنے تھے۔ پہلے دو کام وہ کر چکا تھا۔ یعنی شاک میں جانے والے کو پکڑنا یا اٹھانا۔ دوسرا کام ایسے فرد کو اس طرح لٹانا تھا کہ سر کے نیچے تکیہ نہ ہو اور ٹانگیں قدرے بلند رہیں۔ لہٰذا خون کا بہاؤ سر کی جانب نسبتاً زیادہ رہے گا۔ تیسرا کام نبض کی جانچ کرنا تھا۔ ریچر نے دستانے اتار کے نبض پر انگلیاں رکھیں۔ نبض تقریباً اطمینان بخش حالت میں تھی۔ ٹریٹمنٹ کا چوتھا نکتہ صدمے سے متاثرہ فرد کے جسم میں تحریک پیدا کرنا تھا۔ اس کے لیے شور مچاؤ یا ہلکے تھپڑ مارو۔ اسے اچھا نہیں لگا۔ بجائے اس کے ریچر نے اس کے کان میں بولنا شروع کیا اور ہاتھ کو آہستہ آہستہ تھپتھپانے لگا۔

کچھ دیر بعد کیتھی پیٹرسن نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے ریچر کو دیکھا۔

''کیا تمہیں میری شکل یاد ہے؟'' ریچر نے سوال کیا۔

وقفے کے بعد جواب آیا۔ ''ہاں۔''

''افسوس ہے کہ میرے پاس اچھی خبر نہیں ہے۔''

''پیٹرسن زندہ نہیں ہے؟'' کیتھی نے کھوکھلی آواز میں کہا۔

''پیٹرسن کو گولی ماری گئی ہے۔ سب کچھ آناً فاناً ہوا تھا۔'' ریچر نے رواں دھیمی آواز میں کہا۔ وہ جان گیا تھا کہ کیتھی پولیس افسر کی بیوی تھی۔ اس نے رات کے اس پہر دروازے پر ریچر کو دیکھا اور سمجھ گئی..... وہ کیوں آیا تھا اور خبر کیا ہوسکتی ہے۔ لہٰذا ریچر نے تمہید یا گول مول الفاظ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ خبر دینے سے پہلے ذہن بنانے کا وہاں موقع نہ تھا۔

''گولی چلانے والا کون ہے؟''

''ہماری رائے میں قاتل وہی ہے جسے پولیس پہلے ہی تلاش کرتی رہی ہے۔''

''تم جانتے ہو کہ پیٹرسن کتنا اچھا آدمی تھا۔''

''ہاں، میں جانتا ہوں۔''

''میرے دو بیٹے ہیں۔ میں کیا کروں گی؟''

''تم قدم بقدم چلو گی۔ ایک دن میں ایک وقت۔ ایک گھنٹے میں ایک وقت۔ ایک منٹ میں چند سیکنڈ اور ایک سیکنڈ میں ایک لمحہ۔''

''اوکے۔''

''ابھی شروع کرتے ہیں۔ پہلا کام یہاں تمہارے ساتھ کسی کو ہونا چاہیے۔ تنہائی ٹھیک نہیں۔ بتاؤ میں کس کو کال کرسکتا ہوں؟''

''چیف ہالینڈ کیوں نہیں آیا؟''

''وہ چاہتا تھا لیکن اس کے لیے اچانک کام بہت بڑھ گیا ہے۔'' ریچر نے کہا۔

''میں یقین نہیں کرتی کہ وہ آنا چاہتا تھا۔''

''وہ خود کو موردِ الزام ٹھہرا رہا ہے۔ ایک اچھے چیف کی طرح۔ بتاؤ میں کسے بلا سکتا ہوں؟''

''میری پڑوسن ایلس۔''

ریچر نے نمبر معلوم کرکے پڑوسن سے رابطہ کیا۔ تاخیر سے فون اٹھایا گیا اور ایک خوابیدہ نسوانی آواز آئی۔

''کیا تم ایلس ہو؟''

''ہاں، کون بات کررہا ہے؟''

''میں تمہارے پڑوس میں کیتھی پیٹرسن کے گھر میں ہوں۔ اسے فوری طور پر تمہاری ضرورت ہے۔ اس کے خاوند کو آج رات گولی ماری گئی.....''

دوسری طرف خاموشی رہی پھر ایلس کی آواز آئی۔

لیکن ریچر نہیں سمجھ سکا اس نے کیا کہا۔ کیونکہ دفعتاً ایک چیخ بلند ہوئی تھی جس نے ایلس کی آواز کو دبا لیا تھا۔ باہر کریہہ چیخ آہنگ بدل بدل کر کم زیادہ ہورہی تھی۔ بلند ہوکے گرتی پھر بلند ہوجاتی۔

قید خانے کا سائرن بول اٹھا تھا۔

ایک بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ تین گھنٹے ابھی باقی تھے۔

☆☆☆

ریچر نے تصور کی آنکھ سے ایک بدرنگ اور بدنما نقشہ دیکھا۔ افراتفری اور شدید بدنظمی اور ہلچل اور کھلبلی۔ ہالینڈ کی کال پر پولیس افسران اسٹیشن کی طرف بھاگتے ہوئے سائرن کی خطرناک وارننگ سن کر فوراً رخ بدلنے پر مجبور ہوگئے۔ سات جینیٹ سلیٹر کے گھر سے نکل کر تاریکی میں گم ہوگئے۔ سب کا رخ قید خانے کی طرف تھا۔ جینیٹ گھر میں اکیلی، تنہا، بے آسرا اور آسان ٹارگٹ۔ قاتل کے لیے آخری بہترین موقع..... جینیٹ نے کہا تھا۔

''میں سمجھ گئی مجھے کیا کرنا ہے۔''

ریچر نے فون رکھ دیا۔ وہ نرمی سے بولا۔

''مجھے جانا ہوگا۔ ایلس یہاں آجائے گی۔''

وہ دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔ باہر سائرن کی آواز گویا کانوں میں گھس رہی تھی۔ پھر وہ کم ہوکر دوبارہ بلند ہوئی۔

سردی شدید تھی۔ سڑک تک پہنچنے کے لیے سوفٹ۔ پھر ٹاؤن تک پہنچنے کے لیے ایک میل۔ وہاں سلیٹر ہاؤس مزید ایک میل۔ کوئی گاڑی نہیں تھی۔ وہ پیدل تھا۔

ریچر نے گودام کا رخ کیا۔ وہاں ایک پرانی فورڈ پک اَپ کھڑی تھی۔ اگنیشن میں چابی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ بلا تامل وہ واپس پلٹا اور داخلی دروازہ دھڑدھڑایا۔ ایک بار پھر کیتھی کا چہرہ دکھائی دیا۔ شاک کے اثرات خفیف تھے۔ تاہم وہ نڈھال تھی اور روتی رہی تھی۔

''مجھے افسوس ہے۔'' ریچر نے کہا۔ ''مجھے پک اَپ کی چابی کی ضرورت ہے۔''

''چابی اینڈریو کی جیب میں کی رِنگ کے ساتھ ہوتی ہے۔'' کیتھی نے تھوڑی دیر بعد جواب دیا تھا۔

''چابی کی نقل ہوگی؟''

''نہیں۔'' وہ لڑکھڑاتی ہوئی سہارا لے کر پیچھے ہٹی۔

''خیال رکھو، ایلس آنے والی ہے۔'' ریچر نے دروازہ بند کردیا۔ اس کے اعصاب میں ہلکا سا تناؤ تھا۔ صورتِ حال خراب تھی۔ وہ ایلس کا انتظار کرنے لگا۔ ساؤتھ ڈکوٹا کا رقبہ بڑا لیکن علاقہ زیادہ تر غیر آباد تھا۔

مکانات قریب قریب نہیں تھے۔ ایلس کو کار پر آنا پڑے گا اور اس کو ایلس کی کار استعمال کرنی پڑے گی۔ وہ منتظر تھا۔ اعصاب شکن حالات میں انتظار زخمی کر دیتا ہے

چاند کی روشنی میں سو گز دور اس نے ہیولا دیکھا۔ وہ قد آور عورت تھی۔ وہ جلدی میں گرم کپڑے لپیٹ کر نکلی تھی۔ ریچر کے دماغ نے گھنٹی بجائی۔ وہ قریب پہنچی۔

''تمہاری گاڑی کہاں ہے؟''

ایلس نے جواب دیا۔ ''اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ کیتھی کا کیا حال ہے؟''

''بُرا حال ہے۔''

ایلس نے دوسرا سوال پیٹرسن کے بارے میں کیا۔ ریچر نے مختصر جواب دیا۔۔۔

''تم اندر جاؤ۔ آج کی رات بہت لمبی ہے۔ کیتھی کے ڈیڈی کو کال کرنا۔ کیتھی نے پہلے بتایا تھا کہ وہ کبھی کبھی چکر لگاتے ہیں۔''

''میں کروں گی۔'' ایلس ڈور پر گئی اور ریچر نے سڑک کا رخ کیا۔ اسے بدتر حالات کا سامنا تھا۔ موسم جارحانہ، فاصلہ زیادہ، گاڑی ندارد اور قاتل سر پر۔ تیس منٹ کا کٹھن مرحلہ۔ کوئی اور ہوتا تو ہاتھ پیر چھوڑ دیتا۔ یہ ریچر کا اسٹائل نہیں تھا۔ اس نے بھاگنا شروع کیا۔ ٹھنڈ مزاج پوچھ رہی تھی۔ سائرن خاموش تھا اور ہوا تیز۔ آوازیں دو تھیں ریچر کے قدموں کی اور ہوا کی سرگوشیاں۔ سڑکوں پر سناٹا تھا۔ وہ بھاگتا، چلنے لگتا اور بھاگتا۔ برفانی ہوا سانس کے ذریعے پھیپھڑوں کو جمانے کی کوشش کر رہی تھی۔ سانس پھول گئی تھی۔ ایک ہی دُھن سوار تھی کہ منزل پر پہنچنا ہے اور اسے یقین تھا کہ وہ پہنچ جائے گا۔ مایوسی کے عنصر کو اس نے دور ہی رکھا تھا۔ البتہ صورتِ حال کی نزاکت کا اسے بخوبی احساس تھا۔ گاڑی ہوتی تو بات کسی حد تک امید افزا ہوتی۔

کیا جینیٹ نے ریچر کی ہدایت پر بروقت عمل کیا ہو گا؟ وہ جنوب کی طرف مڑا اور پولیس اسٹیشن تک پہنچ گیا۔ وہاں ٹھہرنا بے معنی تھا۔ وہ ہانپتا ہوا آگے نکل گیا۔ ایک میل اور جانا تھا۔ وہ ریسٹورنٹ تک پہنچا جو بند پڑا تھا۔ چار سو گز کے فاصلے پر جینیٹ کا مکان تھا۔ اچھے جینیٹ کے لیے یہ فاصلہ چالیس سیکنڈ کے برابر تھا۔ جبکہ ریچر نے دو منٹ لیے۔ گھر میں روشنی تھی۔ کوئی آواز نہیں تھی۔ نہ ہی کسی قسم کی حرکت نظر آ رہی تھی۔ ریچر کی سانس دھونکنی کے مانند چل رہی تھی۔ وہ سر سے پیر تک برف میں ڈھل گیا تھا۔ سینہ پھول پچک رہا تھا۔ وہ جھکا ہوا تھا دونوں ہاتھ گھٹنوں پر تھے۔ وہ دو سیکنڈ رکا تھا۔

وہ گھر کی طرف بڑھا اور پورچ میں آ گیا۔ دروازہ لاک تھا۔ اس نے بیل بٹن پر انگلی رکھی۔ کوئی ردِعمل نہیں آیا۔ اچھی علامت تھی۔ وہ تہ خانے میں گھنٹی کی آواز نہیں سن سکتی تھی۔ ریچر نے شیشے میں سے ہال دے کا جائزہ لیا۔ کرسی، فون ٹیبل، سیڑھیاں، قالین، پینٹنگز۔۔۔ سب کچھ جگہ پر تھا۔ کوئی حرکت نہ آواز۔ وہ پیچھے ہٹ گیا۔ چکر کاٹ کے عقب میں پہنچا۔ کچن ڈور کی اندرونی کنڈی کی حالت سے وہ واقف تھا۔ کنڈی ریچر کی ایک لات کی مار تھی۔ اس نے جائزہ لے کر مناسب جگہ پر ٹول کے لات ماری۔ دروازہ سلامت رہا۔ کنڈی اندر سے اُکھڑی اور دروازہ کھل گیا۔ ریچر نے کچن میں قدم رکھا اور اس کا دروازہ بظاہر بند کر دیا۔ ریچر ہال دے میں چلا گیا۔ سیڑھیوں کے نیچے ڈور بند تھا۔

''جینیٹ۔'' اس نے بلند آواز سے پکارا۔ ''میں ہوں، ریچر۔''

کوئی جواب نہیں آیا۔

ریچر نے تہ خانے کے دروازے کو پیٹا۔ ''جینیٹ؟''

کوئی جواب نہیں آیا۔

اس نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور دروازہ کھلتا چلا گیا۔ ریچر نے دستانہ اتار دیا اور جیب سے گن نکالی۔ بعد ازاں تاریک تہ خانے میں قدم رکھا۔ بائیں ہاتھ دیوار پر پھیر کے لائٹ کا سوئچ نیچے کیا۔ روشنی ہوئی، تہ خانہ خالی پڑا تھا۔ حرکت نہ آواز۔ ''جینیٹ؟''

کوئی جواب نہیں آیا۔ اچھی علامت نہیں تھی۔ وہ واپس ہال میں آیا اور اسے تلاش کرتا ہوا لائبریری میں چلا گیا۔

جینیٹ اپنی پسندیدہ کرسی پر بیٹھی تھی۔ گود میں کتاب رکھی تھی۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ گولی کا نشان پیشانی پر تھا۔ جیسے تیسری آنکھ۔ بلاشبہ نو ایم ایم۔

☆☆☆

ریچر کا دماغ کورے کاغذ کی طرح خالی ہو گیا۔ بہت عرصے بعد ایسا ہوا تھا۔ یوں لگا گولی اس کو کسی نے ماری ہے۔ تمام جسم جل اٹھا۔ کان یوں تپ رہے تھے جیسے کسی نے دونوں کانوں کے نیچے دیے جلا دیے ہوں۔ پھر ناک کا وہی حال ہوا، پھر ہونٹ، پھر ٹھوڑی، پھر ہاتھ۔۔۔ اس نے خود کو راکنگ چیئر میں گرا دیا اور جھولنے لگا۔ شدید اذیت نے اسے تڑپا دیا تھا۔

''مجھے پڑھنے کے لیے بہت وقت ملے گا۔'' جینیٹ نے کہا تھا۔ ''یہ ہنگامہ ختم ہونے کے بعد۔''

دیس پردیس

دلوں میں امنگ، آنکھوں میں سہانے خواب سجائے پردیس میں قسمت آزمانے والوں کی داستان، **ناہید سلطانہ اختر** کے قلم سے

ظالم مظلوم

ماضی کا آئینہ، بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات **زویا صفوان** کے قلم کی روانی

رمز شناس

خوف میں لپٹی پوشیدہ رازوں کی کڑیاں ملانے والے ایک رمز شناس کی دلچسپ داستان .. **نازیہ کامران کاشف** کی اچھوتی تحریر

جنگ باز

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان **ڈاکٹر عبدالرب بھٹی** کے قلم کی جادوگری

مزید

محمد فاروق انجم، ماہ وش طالب، عمران قریشی، آصفہ ضیا احمد، عائشہ نصیر، اے آر راجپوت، ... عاطر شاہین و دیگر کی خوب صورت تحریریں

اندازنہیں ہے۔ میں یہاں بیٹھا ہوں جب تک میرا سر از خود نہ پھٹ جائے۔"

"مجھے افسوس ہے۔" سوزن نے کہا۔ "لیکن میں اسے کھیل نہیں کہوں گی۔"

"برداشت کرنے کا واحد طریقہ ہے کہ میں اسے کھیل بنادوں۔"

"اوکے، یہ کھیل ہے۔ اب مجھے تفصیل بتاؤ۔ سمجھو ہم ساتھ کام کررہے ہیں۔"

ریچر خاموش تھا۔

وہ بولی۔ "ریچر شروع سے بتاؤ۔"

ریچر نے گہری سانس لی اور آہستہ آہستہ کہانی شروع کی پھر تیز بولنا شروع کیا۔ بس کے بارے میں بتایا۔ کیسے بس ٹاؤن میں آئی۔ پیٹرسن اور تھم۔ ٹرائل اور پولیس ڈپارٹمنٹ۔ کرائسس پلان اور وکیل۔ گواہ کی حفاظت اور قید خانے کا ہنگامہ۔ پلاٹو اور زیرِزمین تھم کا ذخیرہ۔ دوبارہ پیٹرسن اور پھر جینیٹ سلیٹر!"

سوزن کا ردِعمل آیا۔ "اپنی گن جیب سے نکالو۔"

"اوکے، اور؟"

"صرف اوکے نہیں۔ یہ لازم ہے۔ قید خانے میں ہنگامے کے بعد جینیٹ کا قاتل اس وقت اس لیے نہیں پہنچا کہ اس نے تمہیں جینیٹ کے گھر میں دیکھ لیا تھا۔ اس کے پاس کئی گھنٹے تھے۔"

"وہ نہیں آیا تھا۔ قید خانے سے نکلا ہی نہیں۔" ریچر نے کہا۔

"یہ مفروضہ ہے۔ سائرن ہنگامے پر بجا تھا۔ وہ موقع پاکر نکلا۔ ٹارگٹ پر آیا اور تمہیں وہاں دیکھ کر واپس وہیں چلا گیا۔"

"اوکے، لیکن میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔"

"اسے نہیں پتا ہوگا کہ تم نہیں دیکھ سکے۔ لیکن وکیل کو ختم کیا تو جیل میں کوئی بلوا نہیں ہوا تھا۔ پیٹرسن اور جینیٹ کو ایک رات میں قتل کیا۔ پیٹرسن کے وقت کوئی سائرن نہیں بولا اور تمہاری کہانی کے مطابق تم اور چیف متفق ہو کہ قاتل پولیس کے اندر ہے۔ ایسا ہے تو جینیٹ کے قتل کے وقت سائرن کیوں بولا؟ وہ تین گولیاں خرچ کرچکا ہے اور چوتھی تمہارے لیے رکھی ہے اور وہ آزاد ہے۔ تم ریپڈ سٹی واپس آؤ۔ کہیں رکو اور ایف بی آئی سے رابطہ قائم کرو۔"

ریچر کچھ نہیں بولا۔

"تم ان کی موت کے ذمے دار نہیں ہو۔ تم وہاں نہ ہوتے تب بھی یہ ہونا تھا۔ یہ ملین میں سے ایک چانس تھا کہ تم نے درمیان میں بس پکڑی۔ بس کے ساتھ حادثہ ہوا اور بس کے ساتھ تم بھی ساؤتھ ڈکوٹا جا پہنچے۔" سوزن نے منطق پیش کی۔

"پیٹرسن ایک اچھا آدمی اور اچھا پولیس مین تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور مسز سلیٹر۔ اولڈ لیڈی ــــ شریف اور قابل۔"

"تمہیں وہاں سے نکلنا ہوگا۔ تم اکیلے رہ گئے ہو۔ پلاٹو خطرناک ہے۔ وہ تنہا نہیں آئے گا۔"

"اس کے لیے میں نے قسم کھا رکھی ہے۔ دشمن باہر کا ہو یا اندر کا، ایک جیسے ہوتے ہیں۔ میں دونوں کے لیے تیار ہوں۔ پلاٹو اور غدار پولیس اہلکار۔"

"اپنی قسم کو ختم سمجھو۔" وہ بولی۔ "ریپڈ سٹی۔ تمہاری کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔"

"یہ بات ہے تو میری فائل پر ایک اور ٹیگ لگا دو قانون شکنی کا۔"

"تم سیدھا نہیں سوچ سکتے۔ تم خود کو سزا دے رہے ہو۔ تم سب کو نہیں ہرا سکتے۔ سب کو ہرانا تمہاری مجبوری بھی نہیں ہے۔"

"ایک انتہائی شریف النفس، ضعیف خاتون کی آنکھیں مجھ سے شکوہ کررہی ہیں۔ اس کی پیشانی میں گولی کا سوراخ ہے۔"

"اوہ گاڈ، اس طرف نہیں دیکھو۔"

ریچر نے نیچے کی طرف دیکھا۔

سوزن نے کہا۔ "تم ماضی کو تبدیل نہیں کرسکتے اور ضرورت بھی نہیں۔ ہر چیز کا ٹھیکا کیوں لیتے ہو؟ ایف بی آئی نمٹ لے گی۔ قاتل کی سزا یہ ہے کہ اسے کوما میں ڈالا جائے اور ہمیشہ کے لیے۔"

"تو۔"

"اوکے پھر ورجینیا آجاؤ۔ ہم دیکھیں گے کہ مل کر کیا کرسکتے ہیں۔"

ریچر نے کچھ نہیں کہا۔

"تم ورجینیا آنا نہیں چاہتے؟"

"کیوں نہیں۔" وہ بولا۔

"تو پھر آجاؤ۔ تم بار بار ایک سوال پوچھتے تھے۔ تم نے پوچھنا بند کردیا؟"

"کون سا سوال؟" ریچر نے سوال کیا۔

"یہی کہ میں شادی شدہ ہوں یا نہیں۔"

"کیا تم ہو؟"

"نہیں۔"

ریچر نے نظر اٹھائی۔ جینیٹ اسے تک رہی تھی۔ وہ بولا۔ "ٹھیک ہے کل ملوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

رات/صبح کے دو بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ خونی ڈرامے کا انجام قریب تر تھا۔ دو گھنٹے کے فاصلے پر۔

☆☆☆

پلاٹو اپنے جہاز میں فضا میں تھا۔ اس کے لیے کام کرنے والا زمین پر۔ پلاٹو کو سیل فون پر اطلاع ملی کہ ایک پولیس آفیسر کو ٹھکانے لگا دیا گیا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ زیادہ جان گیا تھا۔ پلاٹو کیوں پروا کرتا۔ اس کے اپنے الگ اصول تھے۔ ایک سابقہ ملٹری کوپ (Cop) بھی سوگھتا پھر رہا تھا۔ اسے بھی ختم کرنا ضروری تھا۔ اس کی بھی پلاٹو کو کوئی پروا نہیں تھی۔

لیکن بڑی خبر کچھ اور تھی۔ جو بالآخر پلاٹو کو فضا میں ہی ملی۔ گواہ کو مار دیا گیا تھا۔ پلاٹو مسکرایا اور رابطہ منقطع کر دیا پھر اس نے خود کال ملائی۔ کال بروکلین، نیویارک میں کی گئی تھی۔ اس نے خبر سنائی کہ آخری رکاوٹ بھی دور کر دی گئی ہے اور ساؤتھ ڈکوٹا میں اب کوئی مسئلہ باقی نہیں بچا ہے۔ روسی رقم منتقل کرنے کے لیے رضامند ہو گئے۔ پلاٹو پھر مسکرایا اور فون بند کر دیا۔ ڈیل ہو گئی تھی۔ اس نے جہاز کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ نیچے امریکا کی سرزمین تھی۔ بعدازاں اس نے کلائی کی گھڑی پر وقت دیکھا۔

☆☆☆

ریچر سیڑھیوں کے ذریعے اوپر باتھ روم میں گیا اور وہاں سے اعشاریہ اڑتیس کی گولیوں کا باکس برآمد کیا۔ جس میں اٹھاسی راؤنڈز باقی تھے۔ ریچر نے باکس کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ نیچے واپس لائبریری میں آیا۔ نرمی سے جینیٹ کا سرد ہاتھ چھوا اور اس کی جیب سے بھری ہوئی گن نکال لی۔ ایک بار اس نے بغور پورے گھر کا جائزہ لیا۔ پانچ دس منٹ سوچتا رہا۔ سوزن کی باتیں بھی دماغ میں گھوم رہی تھیں۔ جینیٹ کس کے لیے تہ خانے سے باہر آئی تھی۔ ریچر نے کہا تھا۔

"صرف میری آواز پر باہر آنا۔"

وہ کون ایسا معتبر آدمی تھا جس نے جینیٹ کو باہر نکالا۔ وہی غدار پولیس کا آدمی — ریچر نے کوٹ کی زپ اوپر کی۔ سر اور کان ٹوپی میں ڈھانپے اور سامنے کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ رخ پولیس اسٹیشن کی طرف تھا۔ وہ انتہائی چوکس حالت میں چل رہا تھا۔ کسی بھی مخالفانہ مڈبھیڑ کی صورت میں وہ سوگنا زیادہ رفتار سے فائر کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس کے اندر ایک خاموش جنون برپا تھا۔

☆☆☆

اسٹیشن خالی تھا۔ کاؤنٹر پر ایک آدمی موجود تھا۔ ریچر نے خبر کے بارے میں سوال کیا۔

"سارجنٹ اس لیے بولا تھا کہ بائیکر والا سیل خالی پڑا تھا۔"

"نگرانی کے لیے وہاں کون تھا؟"

"ہائے وے پر چار آدمیوں کی ٹیم ہے۔" جواب ملا۔ "لیکن پہلے بھی کوئی فرار نہیں ہوا۔"

"آج رات بھی کوئی فرار نہیں ہوا۔ سیل خالی ہو گا لیکن بائیکر جیل میں ہی کہیں چھپا ہے۔" ریچر نے کہا۔

"تمہارا خیال ہے۔"

"ہاں، میرا خیال ہے۔ ان چاروں کے نام بتاؤ اور کیا چاروں حاضر تھے؟"

"ہاں وہ موجود تھے۔" اس نے چاروں کے نام بھی بتا دیے۔ ریچر کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔

"چیف ہالینڈ کو کال کرو کہ میں یہاں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس کو بتاؤ کہ مسز سلیٹر کو مار دیا گیا ہے۔"

☆☆☆

اسٹیشن میں سناٹا تھا۔ ریچر اسکواڈ روم ہوتا ہوا ہالینڈ کے آفس میں آ گیا۔ دیواروں پر مختلف وارداتوں سے متعلق تصاویر چسپاں تھیں۔ اس نے وکیل کی تصویر کو دیکھا۔ وکیل کے بارے میں وہ زیادہ نہیں جانتا تھا۔ لیکن اسے علم تھا کہ بنیادی طور پر وکیل اور جینیٹ کا خاتمہ یکساں انداز میں ہوا تھا۔ فرق یہ تھا کہ وہ مرد تھا اور لائبریری کے بجائے برفیلی سڑک پر تھا۔ دونوں ایک جیسے ٹریپ میں آرام دہ انداز میں پھنسے اور مارے گئے۔ ٹریپ کی بنیاد غیر معمولی اعتماد اور بھروسا تھا۔ وہ بھروسا ایک دھوکا تھا۔ فریب تھا۔ وکیل نے اطمینان سے گاڑی روکی اور شیشہ نیچے کیا۔ جینیٹ بھی آرام سے کتاب لیے لائبریری میں بیٹھی تھی۔ دونوں کو مکمل بھروسا تھا۔ پیٹرن تو فعال آفیسر تھا۔ وہ بھی اسی انداز میں ٹریپ ہوا۔ ایسا بھروسا کسی عام پولیس اہلکار پر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اندر کا آدمی تھا جو خاص حیثیت رکھتا تھا۔ قدموں کی چاپ سنائی دی اور کاؤنٹر والے آدمی کی شکل نظر آئی۔

"چیف ہالینڈ آ رہے ہیں۔ راستے میں ہیں۔ وہ اپنی پوسٹ چھوڑ رہے ہیں۔ ان کو ایسا نہیں کرنا چاہیے لیکن کیا کہہ سکتے ہیں۔" آنے والے نے اطلاع دی۔

ریچر نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ بولا کچھ نہیں۔

☆☆☆

ریچر نے باہر گاڑی کے انجن کی آواز سنی۔ گاڑی رکی۔ خاموشی ہوئی پھر گاڑی کا دروازہ کھل کے بند ہوا پھر اندر لابی کا دروازہ کھلا۔ کوریڈور میں ہالینڈ کے قدموں کی آواز ابھری اور وہ آفس کے دروازے میں دکھائی دیا۔ کمر جھکی، انداز شکست خوردہ.....

''کیا تمہیں یقین ہے۔'' ہالینڈ نے سوال کیا۔

ریچر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''شک کی گنجائش ہی نہیں ہے۔''

''کیسے؟''

''نو ملی میٹر (9mm) دونوں آنکھوں کے درمیان۔ باہر وکیل اور پیٹرسن کے مانند۔''

''کوئی اشارہ ملا؟''

''نہیں، کچھ نہیں۔''

''مطلب ہم ابھی تک اندھیرے میں ہیں۔ نہیں معلوم قاتل کون ہے۔'' ہالینڈ نے کہا۔

''لیکن میں جانتا ہوں کہ غدار پولیس افسر کو کہاں اور کیسے پکڑا جا سکتا ہے۔'' ریچر نے کہا۔ ''دوبارہ برف باری شروع ہو گئی تو رن وے پھر سے برف کے نیچے ہو گا اور اسے دوبارہ صاف کرنے کے لیے بائیکرز موجود نہیں ہیں۔ لہٰذا پلاٹو روانہ ہو چکا ہے۔ اسے ڈیل مکمل ہونے سے پہلے اپنے زیورات و جواہر وغیرہ وہاں سے نکالنے ہیں ممکن ہے کہ وہ روسیوں کو ڈبل کراس کرے اور کچھ حصہ ہم کا بھی لے جائے۔ میرا اندازہ ہے کہ پولیس کے اندر جو آدمی اس کے لیے کام کر رہا ہے، پلاٹو کو اس کی ضرورت پڑے گی اور وہ شاید پلاٹو کا آخری کام کرنے کے لیے وہاں جائے گا۔ ہمیں اتنا کرنا ہے کہ ہم پہلے پہنچ جائیں۔ وہ سیدھا ہماری جھولی میں آ کے گرے گا۔''

''پتا نہیں کتنا انتظار کرنا پڑے گا۔'' ہالینڈ نے نکتہ اٹھایا۔

''میں نہیں سمجھتا کہ بہت انتظار کرنا پڑے گا۔ پلاٹو کے پاس رکنے کا وقت نہیں ہے۔ وہ آئے گا اور چلا جائے گا۔ وہ طوفان میں پھنسنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔''

''بے پناہ سردی میں ہم کہاں سر چھپائیں گے۔''

''سردی؟'' ریچر نے کہا۔ ''اصل مسئلہ ٹھنڈ سے بڑا ہے۔''

ہالینڈ سوچ میں پڑ گیا۔ ریچر اسے دیکھ رہا تھا۔ ہالینڈ خاموش تھا۔ آنکھیں دائیں بائیں گھوم رہی تھیں پھر وہ قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ بولا۔

''ٹھیک ہے۔ شروع کرتے ہیں۔''

صبح کے تین بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ صرف ایک گھنٹا بچا تھا۔

☆☆☆

ہالینڈ گاڑی چلا رہا تھا۔ کار اندر سے گرم تھی۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ ریچر پسنجر کی نشست پر تھا۔ اس نے بیلٹ نہیں لگائی تھی۔ کوٹ کھلا ہوا تھا۔ دستانے بھی اترے ہوئے تھے۔ دونوں ہاتھ جیبوں میں تھے۔ چاند آسمان پر بلندی سے روشنی دے رہا تھا۔

رن وے پر پہنچ کر ہالینڈ رکا نہیں۔ دو سو گز جانے کے بعد وہ بولا۔ ''کار کہاں لے جاؤں؟''

''کہیں نہیں۔ یہیں ٹھیک ہے۔''

ہالینڈ نے رفتار کم کر دی۔ تیس گز مزید آگے جانے کے بعد کار روک دی۔ ''کار کو چھپانا چاہیے۔ اگر وہ آیا تو ہمیں دیکھ لے گا۔''

''وہ آ چکا ہے۔'' ریچر نے کہا۔

''کیا مطلب؟ تمہیں کب پتا چلا؟''

ریچر نے جواب دیا۔ ''معمولی شک کے ساتھ تیس منٹ قبل اور بھرپور یقین کے ساتھ تین منٹ پہلے۔''

''میں نے کچھ کہا تھا؟''

''تم نے کچھ نہیں کیا۔ تم نے کچھ نہیں کہا۔''

''یہ کیا بات ہے؟''

ریچر نے بولنا شروع کیا۔ ''چند گھنٹے پہلے رات کے وقت ہم نے سنگی عمارت میں زیرِ زمین ایک گھنٹا گزارا تھا۔ ہم واپس باہر آئے تو پہلا کام جو تمہیں کرنا تھا، وہ جیفیٹ کے گھر میں کال تھی۔ تم نے کال نہیں کی۔ مجھے تمہیں یاد کرانا پڑا اور تم نے کال کر کے بتایا کہ سب ٹھیک ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ تم نے کال کہاں کی تھی۔ کال تم اس لیے نہیں کر رہے تھے کہ تمہیں پہلے ہی پتا تھا۔ کیونکہ تم ہی وہ آدمی ہو جس کی شروع سے سب کو تلاش ہے۔ تمہاری پوزیشن ایسی ہے کہ تم بہ آسانی کسی کو بھی دھوکا دے سکتے ہو؟''

ہالینڈ نے کچھ نہیں کہا۔

ریچر نے مزید بتایا۔ ''میری پیٹرسن سے رات بات ہوئی تھی۔ وہ آٹھ بجے آیا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ وہاں قید خانے میں گنتی کے دوران کوئی ایک غائب ہو گا۔ ہم پریشان تھے۔ اس نے مجھ سے معلوم کیا تھا، کیا میں مسلح ہوں۔ میں نے اقرار کیا۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ جیفیٹ بھی مسلح ہے۔ تم نے یہ دونوں سوالات نہیں کیے تھے جبکہ تمہیں یہ سوالات کرنے چاہیے تھے۔''

"ممکن ہے میں نے فرض کرلیا ہو۔ میرے علم میں تھا کہ مسز سلیٹر کے گھر میں ہتھیار ہیں۔ مسز نے مجھ سے ایمونیشن کے بارے میں مشورہ کیا تھا۔"

"اور تم نے اچھا مشورہ دیا تھا۔"

ہالینڈ اب بھی کچھ نہیں بولا۔

"ماضی کی طرف جاتے ہیں۔" ریچر نے کہا۔ "جب میں نے اور پیٹرسن نے سڑک پر تمہیں بائیکرز کے سامنے بے بس پایا تھا۔ وہ ٹاکرا نہیں تھا۔ تم ان سے ہدایات وصول کرنے گئے تھے۔ پلاٹو نے ویکل اور جینیٹ کو ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ بائیکرز نے تمہیں یہی پیغام دینے کے لیے وہاں بلایا تھا۔ اس وقت تم نے پیٹرسن کی کار کی آواز سنی اور ڈرامار چانے کے لیے اپنی گن نیچے گرادی اور جھڑپ کا منظر بنانے کے لیے تم ان کے خلاف ہو گئے۔ فائٹ شروع ہوئی اور مجھے کودنا پڑا۔"

ہالینڈ نے کچھ نہیں کہا۔

ریچر نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "اور رات میں جب پیٹرسن اور میں سنگی عمارت کی چابی لینے کے لیے پہنچے تو تم پہلے ہی نکل پڑے تھے۔ چابی کدتیر تھی تم جان گئے تھے بقول تمہارے۔ جبکہ یہ جھوٹ تھا۔ تمہیں بتایا گیا تھا۔ ہم تینوں وہاں گہرائی میں ساتھ اترے تھے۔ کیونکہ تم ہمیں واپس نہیں بھیج سکتے تھے۔ پیٹرسن کافی کچھ جان گیا تھا۔ واپسی پر اس نے ردِعمل دینا ہی تھا۔ لہٰذا تم نے دوسری چال چلی اور وہیں سے خبر اُڑادی۔ فائدہ یہ ہوا کہ تم نے جب اسے ہلاک کیا..... تو تقریباً ساٹھ افراد مشکوک ٹھہرے۔"

ہالینڈ نے کہا۔ "مجھے مارنا ہوتا تو میں اسے یہیں پہلے مار دیتا۔"

"سچ ہے لیکن تمہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ وہاں نازل ہو جائے گا۔ دوسرے تمہارے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کرتے۔ تم مجھ سے خوف زدہ تھے۔ میرے بارے میں کچھ پیٹرسن نے بتادیا تھا اور تم میرا آرمی کا ریکارڈ بھی جان گئے تھے۔ ان تینوں کے مقابلے میں میرا معاملہ قطعی مختلف تھا۔ تم پولیس چیف..... لہٰذا وہ بہ آسانی نشانہ بن گئے۔ جینیٹ تمہیں دیکھ کر جذباتی اور خوش ہوئی ہو گی۔ لیکن جب تم نے اس پر گن اٹھائی ہو گی....." ریچر خاموش ہو گیا۔

ہالینڈ کچھ نہیں بولا۔

"گولیوں کے تین میں سے دو خول تمہاری گاڑی میں اور ایک جینیٹ کی لائبریری میں۔ چوتھا راؤنڈ چیمبر میں ہے۔ میرے لیے۔ لیکن وہ چوتھا راؤنڈ چیمبر میں ہی رہے گا۔ تم مجھے سمجھ گئے تھے اور بہت محتاط تھے۔ موزوں وقت کی تلاش میں تھے۔ تم مجھے اسٹیشن میں رکھنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ تم رضامند ہوئے تو اس لیے کہ اسٹیشن میں ہی تمہیں موقع مل جائے لیکن موقع نہیں ملا۔ نہ ملے گا۔ تم اسمارٹ ہو اور شوٹر بھی اچھے ہو۔ تاہم تمہارا واسطہ غلط آدمی سے پڑ گیا۔ تمہارا ہاتھ ہلنے سے پہلے میں تمہیں گولی مار دوں گا۔ موقع اب ہے۔ کوشش کرو۔"

ہالینڈ نے کچھ نہیں کہا۔

"مجھے اکتیس گھنٹے قبل ہی جان جانا چاہیے تھا۔ جب قید خانے کا سائرن پہلی بار بولا تھا۔ میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ ممکنہ قاتل مجھے دیکھ کر چلا گیا تھا تو میں اسے کیوں نہ دیکھ سکا۔ میں آگاہ تھا کہ موسم کے پیشِ نظر وہ کار میں آئے گا، سامنے سے۔ اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ سب قید خانے کی طرف بھاگ گئے تھے اور تم کار میں سامنے سے آئے۔ جینیٹ کو ختم کرنے کے لیے۔ تم نے گاڑی بند نہیں کی تھی۔ کیونکہ جینیٹ کو ختم کر کے تمہیں الٹے پاؤں واپس چلے جانا تھا۔ لیکن گھر میں، میں بھی تھا۔ مجھے دیکھ کر تم نے اپنی حیرت کو چھپایا۔ تم سوچ رہے تھے۔ میں سمجھا کہ تم وہاں ہنگامے میں جانے سے گریز کر رہے ہو۔ لیکن تم فیصلے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ کیا جینیٹ کی دوسری گن میرے پاس تھی اور اگر تھی تو تم میرے مقابلے میں کتنی تیزی دکھا سکتے ہو۔ تم نے فیصلہ کیا کہ گن میرے پاس ہوئی تو تمہاری کامیابی کا امکان صفر ہے۔ لہٰذا تم واپس چلے گئے۔ مجھے یقین ہے کہ پلاٹو برہم ہوا ہو گا لیکن بہرحال آخر میں تم نے اُس کے کام کردیے۔"

ہالینڈ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "یعنی تم جان چکے ہو، کیوں؟"

"ہاں بالآخر میں نے یہ معما حل کرلیا۔ میں نے تمہارے آفس میں وہ فوٹو بھی دیکھا تھا۔ وہ اپنی ماں کی طرح لگتی ہے۔"

"یہ بھی سمجھ گئے؟"

"وہ وہاں قیدی نہیں تھی۔ بائیکرز گینگ نے اسے چھپانے کی خاص کوشش نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ لڑکی کو وہ اندازِ زندگی بہتر لگتا ہے۔" ریچر نے کہا۔

"اگر ایسا ہے تو بھی وہ خطرے میں ہے۔"

"خطرے سے نمٹنے کے اور بھی طریقے تھے لیکن پولیس چیف ہوتے ہوئے بھی تم نے بدترین طریقہ اپنایا۔"

"آئی ایم سوری۔" ہالینڈ نے کہا۔

''بہت خوب! تین افراد کی جان گئی اور تم اظہارِ افسوس کر رہے ہو۔''

ہالینڈ نے جواب دینے کے بجائے ایکسلریٹر دبا دیا۔ کار اچھل کر آگے بڑھی۔

ریچر نے گن نکال کر اس کے کان پر رکھ دی اور لات اس کے گھٹنے پر ماری۔ ہالینڈ کا پیر ایکسلریٹر سے ہٹ گیا۔ گاڑی کی رفتار کم ہوئی۔

''اندر مرو گے تو چانس نہیں ہے۔ گاڑی سے باہر ایک موقع ملے گا۔'' ریچر نے ونڈ بریک کھینچ کر گاڑی نیوٹرل میں ڈال دی۔

دونوں باہر نکلے۔ ہالینڈ مستقل نشانے پر تھا۔ ریچر گھوم کر اس کے سامنے آیا۔ درمیان چھ فٹ کا فاصلہ تھا۔ ریچر نے گن جیب میں واپس رکھ لی۔ ''صرف ایک موقع۔'' وہ بولا۔

''چند باتیں پھر دونوں فائر کریں گے۔''

ہالینڈ نے کچھ نہیں کہا۔ اس کی آنکھوں میں غیر یقینی تھی۔

''پلاٹو کے بارے میں بتاؤ۔''

''میں اُسے کبھی نہیں ملا۔ رابطہ فون پر ہوتا تھا یا پھر بائیکرز کے ذریعے۔''

''آج رات کیا ہونا ہے؟''

''وہ اپنے جواہرات وغیرہ نکالے گا اور کچھ حصہ میتھم کا بھی لے جائے گا۔''

''جواہر اور پینٹنگز وغیرہ وہاں کیوں پہنچائی گئیں؟''

''نہیں معلوم۔'' ہالینڈ نے کہا۔

''کیسے پہنچائی گئیں؟''

''بائیکرز گینگ۔'' ہالینڈ نے مختصر جواب دیا۔

''آج تمہیں کیا کرنا ہے اُس کے لیے؟''

''عمارت کی چابی اور رن وے پر اشارہ دینا ہے۔''

''اوکے۔ چلو گن نکالو۔''

ہالینڈ نے مخمصے کے عالم میں ریچر کے ہاتھوں کو دیکھا اور خاموش کھڑا رہا۔

''گولی کہاں مارتے ہو؟ پیشانی پر؟'' ریچر نے سرد لہجے میں کہا اور معاً ہالینڈ کے ہاتھ نے حرکت کی۔ بس وہ اتنا ہی کر سکا۔

ریچر نے برق رفتاری سے گن نکالی اور فائر کر دیا۔ گولی اس مرتبہ بھی دونوں آنکھوں کے درمیان بیٹھی تھی لیکن پیشانی ہالینڈ کی تھی۔ وہ لہرا کے گرا اور زمین بوس ہو گیا۔ چہرہ چاند کی طرف تھا۔

چیف تھامس ہالینڈ فکرِ حال و فردا سے بے غم ہو کے مکمل آرام کی حالت میں تھا۔ عین اسی وقت اس کا سیٹل فون بولنے لگا۔ ریچر نے تیسری گھنٹی کے بعد فون اٹھایا۔ کان سے لگایا۔ ''یس؟''

''ہالینڈ؟'' چیختی ہوئی آواز آئی۔ سگنل خراب تھے۔ پس منظر میں شور تھا۔ لہجہ اسپینش تھا۔ ''پلاٹو۔'' ریچر نے سوچا کہا کچھ نہیں۔

''ہالینڈ؟''

ریچر نے کہا۔ ''یس۔''

''ہمارے پاس پندرہ منٹ ہیں۔ لینڈ کرنے کے لیے روشنیاں دکھاؤ۔'' رابطہ ختم کر دیا گیا۔

پندرہ منٹ۔

ریچر نے سیل فون جیب میں رکھا اور ہالینڈ کی تلاشی لی۔ ایک گلاک ہولسٹر میں تھا اور ایک جیب میں۔ سنگی عمارت کی چابی بھی مل گئی۔ چابی اور ہالینڈ کی دونوں گنز اس نے جیبوں میں منتقل کیں۔ دستانے چڑھائے اور ہالینڈ کو گھسیٹ کر کار کے قریب کر دیا۔ پھر وہ پھرتی سے کار کے عقب میں آیا۔ ہالینڈ کے کپڑوں سمیت ہر چیز اتار لی۔ پھر گٹھڑی بنا کے رن وے سے فاصلے پر برفیلے ڈھیر میں دبا کے واپس آ گیا۔

اس نے گاڑی کا ٹرنک کھول کے نظریں گھمائیں۔ مختلف اشیا نظر آئیں۔ چند غیر ضروری معلوم ہوئیں۔ لیکن سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ مطلب کا سامان دو کونوں پر تھا۔ آٹھ عدد سرخ روڈ فلیئرز (flares) دوسرے کونے میں چار مخصوص چمک دار ٹریفک کونز (cones) رکھی ہوئی تھیں۔ باقی سامان نظر انداز کر کے ریچر نے فلیئرز اور کونز نکال کے باہر رکھیں اور ہالینڈ کی باڈی کو اٹھا کے اندر رکھا اور ٹرنک بند کر دیا۔

وہ باخبر تھا کہ پائلٹ کے پاس جی پی ایس کی رہنمائی ہو گی۔ لیکن ایسے دھند زدہ ماحول میں زمینی اشارے بھی ناگزیر تھے۔ اس کے خیال میں فلیئرز ناکافی تھے اور کونز بیکار تھیں۔ روڈ ٹریفک نہیں تھا کہ وہ مخروطی کونز استعمال کرتا۔ سوچنے میں چند سیکنڈ ضائع کیے۔ کونز اٹھا کے عقبی نشست پر پھینکی اور فلیئرز آگے پسنجر سیٹ پر رکھ کے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔

گاڑی گھما کے وہ پیچھے لے گیا۔ ایک ہزار تین سو فٹ واپس جا کر اس نے گاڑی روکی۔ دو فلیئر اٹھا کے باہر نکلا۔ رن وے کے دونوں جانب ایک ایک نصب کیا۔ خودکار

نظام کے تحت وہ روشن ہوگئیں۔ واپس کار میں بیٹھ کے وہ مزید پیچھے گیا اور دو ہزار فٹ جا کر پھر دو روشنیاں لگا کیں۔ پھر تین ہزار اور تین ہزار فٹ پر اس نے یہی کام کیا۔ وہ تقریباً دو میل پیچھے آ گیا تھا۔ گردن گھما کے تیز روشنیوں کو دیکھا۔ آسمان پر نگاہ دوڑائی۔ اب وہ کار میں بیٹھا اور ایک بار پھر رن وے کے اختتام کی طرف رفتار پکڑی۔ ابھی وہ ایک میل واپس گیا تھا کہ انجن کھانس کے بند ہوگیا۔ پندرہ منٹ ختم ہونے کے قریب تھے۔ دو مرتبہ کوشش کرنے کے بعد وہ باہر نکلا۔ گاڑی کو دھکیل کے ایک طرف کیا۔ سخت سردی میں ایک میل چلنا پڑتا۔ کچھ سوچ کر وہ وہیں گاڑی سے ٹیک لگا کے کھڑا ہوگیا۔

نظریں آسمان پر اُس طرف تھیں جہاں سے رن وے شروع ہوتا تھا۔ جہاز کے کوئی آثار نہ تھے۔ ایک منٹ بعد دور اُفق پر معمولی روشنیاں ٹمٹمائیں۔ روشنیاں ناچتی ہوئی اپنا حجم بڑھا رہی تھیں۔ ریچر نے نگاہ مرکوز کی۔ دفعتاً اُفق سے نیچے اس نے کمزور روشنیاں ٹمٹماتے دیکھیں۔ ان کی رفتار کم تھی۔ وہ اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔ اس نے پھر آسمان پر دیکھا اور اندازہ لگایا کہ اوپر جہاز کے لینڈنگ گیئر کی روشنیاں تھیں۔ نیچے والی روشنی ہیڈ لائٹس کی تھی۔ کوئی گاڑی تھی۔ ایک نہیں دو گاڑیاں تھیں۔ آگے پیچھے۔ ظاہر ہے جہاز نے پہلے پہنچنا تھا۔ وہ پرندے کی طرح خاموشی سے نمودار ہوا۔ پھر پرندے کا قد بڑھتا گیا اور انجن کا سماعت شکن شور سنائی دینے لگا۔ بڑا جہاز تھا۔ رواں انداز میں اترا اور لمحوں میں ریچر کے قریب سے گزر کے آگے نکل گیا۔ ریچر نے پلٹ کے گاڑیوں کی طرف دیکھا جو دور تھیں۔ لیکن ان کی شناخت واضح ہو رہی تھی۔ آگے ایک عجیب سا ٹرک تھا۔ جس کا عقبی حصہ بڑا اور کھلا ہوا تھا۔ آگے ڈرائیونگ کیبن تھا..... گاڑیاں قریب ہوتی گئیں۔ ٹرک کے پچھلے حصے میں بھاری لچک دار پائپ کا بڑا سا کوائل تھا۔ جو ایک ڈرم پر لپٹا ہوا تھا۔ ساتھ میں ایک اور ڈرم تھا۔ دوسرے ڈرم پر بھی پہلے کی طرح پائپ لپٹا ہوا تھا۔

پیچھے دوسرا ٹرک بھی ویسا ہی تھا۔ اس کے عقبی حصے میں ایک سفید بڑا سا ٹینک اور جوڑ دار بازو تھا۔ پہلے ٹرک پر تیل آئل کمپنی کا رنگ اور گرل کے ساتھ اسوزو (isuzu) کا لفظ تھا۔

ریچر نے خبر آتے ہوئے ہالینڈ کے ریڈیو پر سنی تھی۔ اسوزو این سیریز پمپ ٹرک اور برف پگھلانے والا ٹرک مشرق میں ریڈسٹی کی کمرشل ائرفیلڈ سے چرائے گئے ہیں۔ تلاش جاری ہے۔ چور ائرفیلڈ کے دو ملازمین ہیں اور دونوں مفرور ہیں۔ ریچر کو یقین تھا کہ یہ حرکت پلاٹو کے حکم پر کی گئی تھی اور زیرِ زمین ٹینک سے جہاز میں ری فیولنگ کی جائے گی۔ واپسی کے لیے۔

ریچر اپنی جگہ پر انتظار کرتا رہا۔ بالآخر ٹرک کی ہیڈ لائٹ اس پر پڑی اور ڈرائیور نے رفتار کم کرلی۔ پھر ٹرک ریچر کے قریب رک گیا۔ ریڈسٹی کے ملازمین کو پہلے ہی غدار پولیس والے کے بارے میں بتایا گیا ہوگا کہ وہ راستے میں ملے گا۔ ریچر نے ملے جلے انداز میں ہاتھ بلند کیا۔ ایک انداز پولیس مین کا تھا، گویا رکنے کا اشارہ۔ دوسرا انداز خوش آمدید کا تھا۔ اگلے منٹ میں وہ ٹرک کی ڈرائیونگ کیبن میں بیٹھا تھا۔ ٹرک رن وے کے اختتامی سرے کی طرف دوڑ رہا تھا۔ دوسرا ٹرک عقب میں تھا۔

☆☆☆

بوئنگ ٹیکسی کر کے مڑا اور رک گیا۔ المونیم کی سیڑھی باہر لٹکائی گئی۔ چھ آدمی اور ایک بچہ سیڑھی کے ذریعے باہر رن وے پر اترے۔ وہ بچہ نہیں لڑکا تھا۔ بلاشبہ وہ پلاٹو تھا۔ اس کی جسامت قدرے موٹی اور مردوں جیسی مضبوط تھی۔ قد چھوٹا..... چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ عمر چالیس اور پچاس کے درمیان ہوگی۔ اس نے سیاہ جیکٹ، سیاہ اونی ٹوپی اور سیاہ دستانے پہنے ہوئے تھے۔ دیگر چھ ہسپانیوں کا حال حلیہ بھی ویسا ہی تھا۔ پمپ ٹرک بوئنگ کے گرد گھوم کر دیو ہیکل بازو کے نیچے رک گیا۔ دوسرا اس کے پیچھے ٹھہر گیا۔ دونوں ڈرائیور نیچے اترے۔ دونوں درمیانے قد کے سفید فام تھے۔ ریچر اندر ہی بیٹھا رہا۔

پلاٹو کے آدمیوں نے نیم دائرہ بنایا ہوا تھا۔ پلاٹو دائرے میں تھا۔ وہ سب مسلح تھے۔ اور ساتوں میکسیکن سردی سے متاثر دکھائی دے رہے تھے۔ پلاٹو دائرے میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا رہا تھا پھر وہ رک گیا۔ ریچر نے اس کے چہرے پر ہلکا سا تناؤ دیکھا جبکہ ریڈسٹی والے اس کا چہرہ نہ پڑھ سکے۔ پمپ ٹرک والے نے قدم بڑھا کے ہاتھ پھیلائے۔ مسکرایا اور بولا۔

''ہم آگئے ہیں۔''

پلاٹو نے بے تاثر آنکھوں سے دیکھا اور کہا۔ ''اور؟''

''ہم..... اور زیادہ رقم چاہیے۔'' یقیناً وہ پہلے سے مطالبہ کے لیے تیار تھے۔

پلاٹو نے سوال کیا، انگریزی میں۔ ''اور کتنی؟''

پمپ ڈرائیور نے کہا۔ ''دگنی۔''

پلاٹو نے اپنے ایک آدمی کو دیکھا اور ہسپانوی میں سوال کیا۔ ''تم جانتے ہو یہ لوگ جو سامان لائے ہیں، اسے کیسے استعمال کرتے ہیں؟''

''میں پہلے کئی بار یہ کام کر چکا ہوں۔ دوسرے ٹرک پر برف پگھلانے کا سامان ہے۔ وہ کام بھی زیادہ مشکل نہیں ہے۔''

''ہاں یا نہ میں جواب دو۔'' پلاٹو نے کہا۔

''یس۔'' اس کے آدمی نے جواب دیا۔

پلاٹو کا ہاتھ اپنے سینے سے لٹکی مشین گن پر گیا، وہ آہستہ سے گھوما۔ مشین گن سے دو برسٹ نکلے۔ نو دس گولیاں ایک اور نو دس دوسرے سینے میں ڈوب گئیں۔ وہ دونوں خون اُگلتے سوراخوں کے ساتھ گرے۔ وہ گرنے سے پہلے دم توڑ چکے تھے۔

پلاٹو کے ماہرانہ انداز نے ریچر کو متاثر کیا۔ وہ ہتھیاروں کا استعمال بخوبی جانتا تھا اور یقیناً پہلے بھی خون بہاتا رہا تھا اور وہ ریچر کی موجودگی سے بے خبر بھی نہیں تھا۔ اس نے ریچر کی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اشارہ کرتا، ریچر خود ٹرک سے اتر گیا۔ وہ پلاٹو کے قریب پہنچا۔ اس کے بالمقابل پلاٹو بونا نظر آ رہا تھا۔ تاہم منظر نامہ پر پلاٹو کی گرفت مضبوط تھی۔

''تم یقیناً چیف ہالینڈ ہو۔'' پلاٹو نے ریچر سے کہا۔

''یس۔'' ریچر نے اقرار کیا۔

''دروازہ ابھی تک بند ہے؟ اور آلات کہاں ہیں؟''

ریچر نے جواب نہیں دیا۔ وہ آلات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

پلاٹو نے کہا۔ ''یاد رکھو تمہاری بیٹی ابھی تک میرے قبضے میں ہے۔''

''میری کار وہاں خراب ہو گئی تھی۔'' ریچر نے اشارے سے بتایا۔ ''آلات گاڑی کے ٹرنک میں ہیں۔''

ریچر کو وہ سامان یاد آیا جسے اس نے نظر انداز کر دیا تھا اور ٹرنک سے فلیئرز کے ساتھ کوٹ نکالی تھیں۔

پلاٹو نے اپنے آدمی کو ہدایت دی کہ وہ ٹرک لے جائے اور ہالینڈ کی گاڑی سے سامان نکال کے لے آئے۔ پھر اس نے ہتھیلی پھیلائی۔ ریچر نے کار کی چابی اس کے ہاتھ پر رکھی۔ پلاٹو کا آدمی چابی اور ٹرک لے کر روانہ ہو گیا۔ ریچر، ہالینڈ کی لاش کے بارے میں سوچ رہا تھا اور بے فکر تھا۔ اس کی دور اندیشی رنگ دکھانے والی تھی۔ لاش پر وردی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

''ٹرنک میں میرا ابھی کچھ سامان ہے اسے وہیں چھوڑ دینا۔'' ریچر نے ٹرک کی طرف جاتے ہوئے آدمی سے بلند آواز میں کہا۔

آدمی نے پلاٹو کو دیکھا۔ پلاٹو نے کہا۔ ''سب لے آنا۔''

''ہاں، ہاں لے آنا۔'' ریچر نے دل ہی دل میں کہا۔

''عمارت کی چابی؟'' پلاٹو نے پھر ہاتھ بڑھایا۔

ریچر نے جیب سے چابی نکالی۔ دو ممکنہ اقدامات تھے۔ پہلا یہ کہ وہ چابی پلاٹو کی آنکھ میں پیوست کر دے۔ یا پھر چابی نیچے گرا کر پلاٹو کی ٹھوڑی پر طوفانی گھونسا رسید کرے اور گردن توڑ دے۔ ریچر نے کچھ بھی نہیں کیا۔ پلاٹو کے پانچ آدمیوں کے پاس MP5 سب مشین گنز تھیں۔ سیکنڈ سے پہلے وہ ریچر کو بھون کے رکھ دیتے۔

پلاٹو قریب آیا۔ اس کا سر ریچر کے سینے کے قریب تھا۔ اس نے چابی لی اور بولا۔

''کوٹ اتارو۔''

''کیوں؟''

''مجھ سے بحث کر رہے ہو؟''

''یہ صرف ایک سوال ہے۔'' ریچر نے کہا۔

''تم میرے ساتھ زیرِ زمین جا رہے ہو۔''

''میں کیوں؟''

''کیونکہ تم پہلے بھی جا چکے ہو۔ ہم میں سے کوئی نہیں گیا۔''

''میں کوٹ کے ساتھ بھی جا سکتا ہوں۔''

''درست۔ سردی کی وجہ سے تمہارا کوٹ بند ہے۔ جیبوں میں گنز ہوں گی۔ میں نہیں چاہوں گا کہ اجنبی ماحول میں اپنے مسلح حریف کے ساتھ جاؤں۔''

''میں تمہارا حریف ہوں؟''

''میرے اپنے اصول ہیں۔'' پلاٹو نے کہا۔ ''بہترین مفروضہ یہ ہے کہ میں ہر کسی کو اپنا حریف خیال کروں۔''

ریچر نے کوٹ اتار دیا۔ تمام ہتھیار سیع ایمونیشن اور سیل فون بھی گیا۔ وہ سویٹر میں رہ گیا اور ان سب کے مقابلے میں زیادہ ٹھٹھرنے لگا۔

پلاٹو ساکت کھڑا تھا۔ کچھ دیر میں ٹرک بھی واپس آ گیا۔ پلاٹو نے سامان کا جائزہ لیا اور عریاں لاش کو دیکھا۔ جس کی رنگت نیلگوں ہو چکی تھی۔

''یہ تمہارا سامان ہے؟'' اس نے استفسار کیا۔

''ہاں۔'' ریچر نے کہا۔

''کون ہے؟''

''ملٹری پولیس۔''

''اوہ۔''

''اس کے کپڑے؟''

''مارنے سے میری تسلی نہیں ہوئی تھی۔ ابھی میں نے اس کے ٹکڑے بھی کرنے تھے۔ بہت تنگ کیا تھا اِس نے۔ آخر وقت میں بہت مشکل سے قابو آیا تھا۔'' ریچر نے نفرت کا اظہار کیا۔

''میری پوری تسلی تمہاری گردن توڑ کر ہوگی۔ جینیٹ اور پیٹرسن کے لیے۔'' یہ فقرہ ریچر نے دل میں کہا تھا۔

''چلو اچھا ہوا۔'' پلاٹو نے اطمینان سے کہا۔ ''آؤ چلتے ہیں۔''

صبح کے چار بجنے میں ستائیس منٹ باقی تھے۔ اکسٹھ گھنٹے پورے ہونے میں بائیس منٹ رہتے تھے۔

☆☆☆

وہ ایک قطار میں عمارت کی طرف جا رہے تھے۔ پلاٹو آگے تھا۔ چار فٹ گیارہ انچ۔ اس کے پیچھے ریچر۔ چھ فٹ پانچ انچ۔ اس کے عقب میں پلاٹو کے پانچ آدمی۔ چھٹا ٹرک کے پاس تھا۔ پلاٹو نے چابی کے ذریعے سنگی عمارت کا بھاری دروازہ کھولا۔ پلاٹو نے رک کر اپنے آدمی سے فلیش لائٹ طلب کی، اسے روشن کر کے اس نے ریچر کی طرف اشارہ کیا۔ دوسرے آدمی نے اپنے بیک پیک سے دوسری لائٹ نکال کے ریچر کے حوالے کی۔

''مسٹر ہالینڈ۔'' پلاٹو نے ریچر کو آگے رہنے کا اشارہ کیا۔ ریچر نے آگے بڑھ کر چیمبر میں لائٹ گھمائی۔ وہی مقام تھا جہاں تین آدمی ساڑھے چار گھنٹے پہلے آئے تھے۔ دو اب اس دنیا میں نہیں تھے۔ تیسرا ریچر تھا۔ گھومتی ہوئی سیڑھیاں گہرے کنوئیں کے مانند نیچے جا رہی تھیں۔ اس کے ساتھ دو پائپ نیچے سے اوپر آئے ہوئے تھے۔ ریچر نے سیڑھیوں سے اترنا شروع کیا۔ عقب میں پلاٹو ہسپانوی زبان میں اپنے آدمیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد ریچر نے اوپر اس کے قدموں کی آہٹ سنی۔ ریچر مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ قد و قامت کی وجہ سے ریچر کے لیے سیڑھیوں کا سفر پلاٹو کے مقابلے میں مشکل تھا۔ جبکہ چھوٹے قد کا پلاٹو سہولت اور تیزی سے حرکت پذیر تھا۔ دو سو اسّی سیڑھیاں تھیں۔ ریچر نے کوشش کی تھی کہ وہ نیچے پلاٹو سے پہلے پہنچے لیکن دونوں کے درمیان زیادہ فاصلہ پیدا نہیں ہو رہا تھا۔ ریچر نے توانائی محفوظ رکھنے کے لیے رفتار کم کر دی۔

☆☆☆

وہ آدمی جو بوئنگ کی نشست 4A پر تھا ٹرک کے پاس دوسرے آدمی کے ساتھ کھڑا تھا۔ دوسرا آدمی جہاز میں 4B پر بیٹھا رہا تھا۔ 4A والے نے روسی کو ٹیکسٹ روانہ کیا۔ پولیس والے کی کار خراب ہے۔ فرار کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔

روسی کا جواب آیا۔ ''معاوضہ دگنا ملے گا۔'' دگنے کا مطلب قسمت بدلنے والی تھی۔ لیکن پلاٹو کے بغیر۔ 4B نے ٹرک والے 4A کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ 4B نے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ 4A نے مختصر ٹیکسٹ روانہ کیا۔ او کے!

دونوں ٹرک سنگی عمارت کے قریب لے گئے۔ ایک نے پائپ کندھے پر رکھا اور دوسرے نے برقی موٹر اسٹارٹ کی جو پائپ والے ڈرم کو آپریٹ کرتی تھی۔ دونوں زیرِ زمین ٹینک سے تیل کھینچنے کے انتظام میں مشغول دکھائی دے رہے تھے۔

☆☆☆

ریچر آخری سیڑھی پر پہنچا اور بیٹھ گیا۔ نیچے چیمبر کی زمین پر وہ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ پلاٹو اس کی پشت پر تھا۔ وہ بولا۔

''آگے بڑھو۔''

ریچر گھٹنوں کے بل زیرِ زمین چیمبر میں گیا پھر بیٹھ گیا۔ پلاٹو آخری سیڑھی سے اتر کے آیا۔ وہ چیمبر میں سیدھا حرکت کر رہا تھا۔ اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ چھت اب بھی اس کے سر سے چار انچ اوپر تھی۔ ریچر کو زندگی میں ایسے حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ دراز قد، طاقتور، سیدھا چلنے اور چھا جانے والا تھا۔ آن گنت معرکے سر کیے تھے۔ ملٹری پولیس میں اور وہاں سے نکلنے کے بعد بھی۔ لیکن اس ماحول میں چھوٹے سے پلاٹو کے سامنے صورتِ حال مختلف تھی۔ وہ کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

''میرا مال کہاں؟'' پلاٹو نے سوال کیا۔ اس کا ایک ہاتھ مستقل سینے سے لٹکتی گن پر تھا۔ ریچر اشارہ کرنے والا تھا کہ اسے نامانوس آواز سنائی دی۔ آواز دوبارہ آئی۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ ایک نکاسی والے بڑے پائپ سے تین گاربیج بیگ نمودار ہوئے جو رسّی کے ساتھ بندھے تھے۔ دونوں اشیا ریچر نے ہالینڈ کی کار کے ٹرنک میں دیکھی تھیں۔ کچھ اور سامان بھی تھا۔ جس کی موجودگی اس وقت ریچر کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

پلاٹو نے کہا۔ ''ہم مال بیگز میں منتقل کریں گے اور رسّی کے ساتھ میرے آدمی اوپر کھینچ لیں گے۔ پھر جہاز میں ایندھن بھرنے کا بندوبست کیا جائے گا۔''

''یہ بیگ کتنا سامان لے جائیں گے؟'' ریچر نے

سوال کیا۔
''جہاز سولہ ٹن لے جاسکتا ہے۔''
''تم یہاں ہفتہ بھر رہے تھے شاید؟'' ریچر نے ہالینڈ کی حیثیت سے اندھیرے میں تیر چلایا۔
''نہیں، صرف دس گھنٹے۔''
''کب اور کیوں؟''
''میرا انٹرویو کرو گے؟'' پلاٹو نے کہا۔ ''بتاؤ مال کس طرف ہے؟''
''تم کہہ رہے ہو کہ تم خود آئے تھے۔''
''جو پوچھا ہے، اس کا جواب دو۔''
ریچر اشارہ کرنے والا تھا کہ آواز سن کے پھر رک گیا۔ شافٹ سے ہوز پائپ نیچے نمودار ہوا تھا۔ پھر سیڑھیوں پر قدموں کی آواز آئی۔ کوئی نیچے آرہا تھا۔
''مال کہاں رکھا ہے؟''
''جواہرات کہاں رکھے ہیں؟'' پلاٹو نے دوبارہ سوال کیا۔
ریچر نے جواب نہیں دیا۔ ریچر ذہن میں تخمینہ لگا رہا تھا۔ دو سو اسی قدچے۔ ری فیول کرنے والا دو سے تین منٹ میں نیچے ظاہر ہوا تھا جبکہ بہت عرصے سے ریچر کی کسی فائٹ نے دو تین منٹ کے دورانیہ سے تجاوز نہیں کیا تھا۔ اسے موقع ملنے والا تھا۔
''میرا مال کہاں ہے؟'' پلاٹو کا لہجہ سخت ہوگیا۔
ریچر نے جواب دیا۔ ''خود تلاش کرلو۔''
پلاٹو مسکرایا اور بہت تیزی سے بڑھ کے ریچر کے پہلو میں لات ماری۔ ریچر گھٹنوں کے بل آیا۔ اس کا سر چھت سے ٹکرایا۔ اس نے جوابی وار کرنے کا ارادہ ملتوی کردیا۔ پلاٹو کی طرف سے وہی سوال کیا گیا۔ ریچر نے فلیش لائٹ استعمال کی اور ایک کوریڈور کی طرف اشارہ کیا۔ پلاٹو کوریڈور کی سمت لپکا اور آواز لگائی۔
''بیگ لے کر آؤ۔''
ریچر گویا اس کا ملازم تھا۔ وہ بھی اپاہج۔ انوکھے ماحول نے ریچر کو مدد کردیا تھا جبکہ بہت نیچی چھت کے باوجود پستہ قد پلاٹو آزادانہ نقل و حرکت کرسکتا تھا۔ ریچر کھسکتا ہوا گیا اور بیگ اٹھا کے پلاٹو کے پیچھے آیا۔
پلاٹو فلیش لائٹ کی روشنی میں سونا، چاندی، پلاٹینم، ہیرے، زمرد، یاقوت اور گراں قدر پینٹنگز کا جائزہ لے رہا تھا۔
''تم یہ سب بیگز میں بھر لو لیکن پہلے مجھے ''پاؤار'' (میتھم) دکھاؤ۔''
ریچر اس کو تین میں سے ایک سرنگ میں لے گیا۔ میتھم کا ڈھیر سیمنٹ سے چنا گیا تھا۔ جیسے چھوٹی اینٹوں کی ایک دیوار ہو۔ سیڑھیوں کی طرف سے پھر آواز آئی۔ ایندھن پائپ کے ذریعے اوپر جہاز تک پہنچانے والے کی آمد تھی۔
''جب تک جہاز کا ٹینک بھرے گا۔ ہم یہاں سے کافی ڈرگ نکال چکے ہوں گے۔'' پلاٹو نے کہا۔
''میں نے سوچا تھا کہ'' ''تم'' ''تم روسی کو فروخت کر چکے ہو۔'' ریچر نے کہا۔ ''اگر تم اس کا کچھ حصہ نکالو گے تو تم ڈبل کراس کرو گے۔''
پلاٹو نے قہقہہ لگایا۔
''تم نے میرے لیے تین افراد کو ہلاک کیا اور اب میں تھوڑی بہت میتھم چرا رہا ہوں تو پریشان ہو رہے ہو۔ احمق روسی کے لیے جس سے تم کبھی نہیں ملے۔''
''میں نے تین نہیں چار افراد کو ہلاک کیا ہے۔'' ریچر ابھی تک ہالینڈ بنا ہوا تھا۔ ''اور ڈبل کراس نہ کرنے کی بات اس لیے کی کہ تم اپنی زبان پر قائم رہو۔''
''وہ کیوں؟''
''کیونکہ میری بیٹی تمہارے قبضے میں ہے۔''
قدموں کی آواز آئی۔ اس کا آدمی منہ بنا کر فولادی سیڑھیوں سے نیچے آیا تو اسے کُبڑوں کے مانند جھکنا پڑا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لائٹ اور دوسرے میں فیول لائن تھی۔ اس نے ہسپانوی زبان میں فیول ٹینک کے بارے میں سوال کیا۔ ریچر انجان بنا ہوا تھا۔ پلاٹو نے اس کے لیے ترجمہ کیا۔ ریچر نے فلیش لائٹ کے ذریعے کوریڈور کی طرف اشارہ کیا۔ پلاٹو کا کُبڑا آدمی ہوز پائپ کے ساتھ کوریڈور میں غائب ہوگیا۔
''مال بیگ میں بھر دو۔'' پلاٹو نے ریچر سے دوبارہ کہا اور سیل فون پر باتیں کرنے لگا۔ ریچر وہاں سے ہٹ گیا۔ پلاٹو کا آدمی زیرِ زمین ٹینک کے ساتھ مصروف تھا۔ اس نے پائپ والا پیتل کا سیٹ اپ، ٹینک کے پیتل کے سرے سے منسلک کیا۔ پھر اس نے ٹینک کا لیور کھول دیا۔ فیول ٹینک سے پائپ میں جانے لگا۔ وہ آدمی کُبڑا بنا ہوا واپس ہوا، سیڑھی پر گیا اور اوپر کی طرف روانہ ہوگیا۔ ریچر اس کوریڈور میں غائب ہوگیا جو میتھم اور جواہرات والی جگہ سے دور تھا۔

☆☆☆

جب وہ فضا میں تھے تو 4A اور 4B کو لیکٹ نے اشارہ کیا تھا۔ Do it ڈوائٹ۔ اور امیر نہیں دولت مند بن

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

بیرون ممالک کے لیے زرسالانہ 50,000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین
یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

مرزا ثمر عباس

0301-2454188

C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

پلاٹو نے قہقہہ لگایا۔ ''آؤ سامنے آؤ۔'' وہ جانتا تھا کہ ملٹری پولیس والا نہتا ہے اور چیمبر میں سیدھا بھی کھڑا نہیں ہوسکتا۔

''میں تمہارے عقب میں ہوں۔'' ریچر نے کہا۔

پلاٹو نے حرکت کی اور ریچر نے جگہ بدل لی۔ یہ کھیل آنکھ مچولی جیسا تھا۔ ریچر چاہتا تھا کہ پلاٹو چیمبر سے نکل کر کسی سرنگ میں چلا جائے۔ لیکن ایسا امکان کم ہی تھا۔ پلاٹو کسی بھی کوریڈور سے اندر جاتا تو سرنگ میں ہوتا۔ جہاں چھت بلند تھی۔ وہ چیمبر میں ہی گھوم رہا تھا۔

☆☆☆

جہاز میں 4A کی نشست والا دوسرا ہوز پائپ کندھے پر لے کر سنگی عمارت میں گیا۔ پہلا ہوز پائپ وینٹی لیشن شافٹ کے اندر تھا۔ 4A نے دوسرا بھی شافٹ میں گرایا۔ نوزل شافٹ میں رکھ کے پائپ کو ایک ایک گز نیچے کرتا گیا..... کام ختم کر کے باہر اپنے دوست سے جاملا۔

''کیا تم یہاں سے پہریدار کو نشانہ بنا سکتے ہو؟''

4B نے سر جھکا کے ہیکلر اینڈ کوش کو دیکھا۔ زبردست ہتھیار تھا۔ لیکن یہاں ہینڈ گن زیادہ کارگر ثابت ہوتی۔ اور وہ ٹھنڈ سے پہلے ہی لرزا ہوا تھا۔

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے اس پر نگاہ رکھنا۔ اگر وہ تمہیں دیکھ لے تو کہنا کہ تم وہاں اس کی مدد کے لیے ہو۔ میں جہاز والوں کو نشانہ بناؤں گا۔ تم جب میری فائرنگ کی آواز سنو تو اس کو ختم کر دینا۔

4B نے سر ہلایا اور جنوب کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

دونوں ایک دوسرے کی تاک میں تھے۔ فلیش لائٹس کی روشنیاں حرکت میں تھیں۔ دونوں بار بار جگہ بدل رہے تھے۔

اچانک بلندی سے عجیب نامانوس مدھم آوازیں نیچے سنائی دیں۔ پلاٹو کے آدمی اوپر تھے۔ شاید پمپ ٹرک کے موٹر کی آواز تھی۔ یا برف پگھلانے والا ٹرک۔ لیکن اگر ریچر بدترین اندیشے کی طرف توجہ دیتا تو یہی کہنا تھا کہ آواز سب مشین گن کے تین برسٹ کی تھی۔ مطلب عمارت کے باہر کیا کھیل ہو رہا ہے۔

پلاٹو نے بھی آواز سنی۔ وہ سمجھا یا نہیں لیکن اس کی فلیش لائٹ بند ہوگئی۔ کچھ دیر بعد لائٹ پھر روشن ہوئی۔ ریچر بیس فٹ کے فاصلے پر عقب سے پلاٹو کو دیکھ رہا تھا۔ پلاٹو حرکت میں تھا۔ دونوں کچھ دیر سے خاموش تھے اور پلاٹو بے خبر تھا کہ ریچر کون سی سرنگ میں ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اسی طرف آرہا تھا جدھر ریچر اس کی تاک میں تھا۔

معاً زیرِزمین ٹینک سے جڑے پائپ میں تھرتھراہٹ ہوئی۔ اوپر پمپ اسٹارٹ ہوا تھا۔ جس نے ہوا کھینچ کر ویکیوم بنایا اور فیول پائپ میں جانے لگا۔

پلاٹو، ریچر سے محض ایک گز دور تھا۔ ریچر کی فلیش لائٹ بند تھی۔ ریچر تیار تھا۔ پلاٹو مسخ ہونے کے باوجود ریچر کے لیے مسئلہ نہیں تھا۔ دردِسر چیمبر کی چھت تھی۔

ریچر نے پھرتی سے قدم آگے کیا اور لائٹ کی بھرپور ضرب پلاٹو کے سر پر لگائی اور پھسلتے ہوئے لات اس کی ٹانگوں پر ماری۔ پلاٹو کے قدموں سے زمین نکل گئی۔ وہ گرا۔ ریچر کو کنکریٹ چیمبر میں آنا پڑا۔ اٹھنے کے بجائے وہ کروٹ لے کر پلاٹو کے اوپر آیا۔ یہاں وہ اپنے لمبے قد کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ریچر کی ترجیح تھی کہ وہ جلد از جلد پلاٹو کو ناکارہ کردے۔ قبل اس کے کہ حریف کا چھوٹا ہونا ایک خطرناک سبقت بن کے سامنے آئے۔ پلاٹو پستہ قد ہونے کے باوجود خاصا جاندار تھا۔ دونوں لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ پلاٹو کی توجہ اپنے ہتھیاروں کی طرف زیادہ تھی۔ وہ کھڑا ہونے میں کامیاب بھی ہوگیا اور ریچر گھٹنوں کے بل پر تھا۔ پلاٹو کو موقع دینے کا سوال نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ریچر کا بایاں ہاتھ اس کی مشین گن پر تھا۔ دایاں ہاتھ پلاٹو کے چہرے پر تباہ کن گھونسے برسا رہا تھا۔ پلاٹو کا ہاتھ بھی گن پر تھا۔ گویا گن کے لیے دونوں کے درمیان رسّاکشی جیسی کیفیت تھی۔ اچانک پلاٹو نے سر کو بچانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ایک ہاتھ سے گلاک نکالنے کی کوشش کی۔ ریچر نے سر کی بھرپور ٹکر اس کے چہرے پر رسید کی۔ وہ پھر گرا۔ چہرے پر خون نظر آیا۔

پھر اچانک چھوٹی آبشار گرنے جیسی آواز آئی۔ کیروسین کی تیز بُو بھی پھیل گئی تھی۔ ریچر کا ایک ہاتھ مشین گن پر تھا دوسرے ہاتھ سے اس نے پلاٹو کی فلیش لائٹ اٹھائی اور کہنی اس کے حلق پر بے رحمی سے جمائی۔ وہ تڑپا۔ سر کی ضرب سے اس کی ناک ٹوٹ گئی تھی۔ دم خم بھی کمزور پڑ گیا تھا۔ حلق سے عجیب آوازیں خارج ہوئیں۔ ریچر نے کلائی گھما کر روشنی میں دیکھا۔

بدبودار سیال وینٹی لیشن پائپ سے بے تحاشا اُبل کر زمین پر پھیلتا جا رہا تھا۔ ہوا ایندھن کے بخارات سے بھر گئی تھی۔ جیٹ فیول۔

پلاٹو، ریچر کی کہنی کے نیچے بلبلا رہا تھا۔ اس کے حلق سے خرخراتی ہوئی آواز نکلی۔

''کیا ہو رہا ہے؟ ٹھیک ہے؟''

''یہ ٹھیک نہیں ہے۔'' ریچر نے بغور جائزہ لیا۔ تیل بغیر رکاوٹ کے طاقتور بہاؤ کے ساتھ آ رہا تھا۔ شافٹ میں دو ہوز پائپ تھے۔ ایک اوپر جا رہا تھا۔ دوسرا نیچے آ رہا تھا۔ ایک پائپ زیرِ زمین ٹینک کو خالی کر رہا تھا اور دوسرا پائپ اسی تیل کو واپس نیچے بھیج رہا تھا۔

''لیک نہیں ہے تو کیا ہے؟''

''یہ ٹرپل کراس ہے۔'' ریچر نے کہا۔ بخارات دماغ پر اثر انداز ہونے لگے تھے۔

''روسی نے تمہارے کم از کم دو تین آدمیوں کو خرید رکھا ہے۔ وہ احمق نہیں بلکہ بے وقوف تم ہو۔''

''کیا وہ مجھے ڈبونا چاہتے ہیں؟''

''نہیں ڈبونے میں مزہ نہیں آئے گا۔'' ریچر نے کہا۔ ''پانچ ہزار گیلن چند منٹ میں چیمبر کو دو انچ تک تو بھر دے گا۔ ان کا ارادہ ہے کہ تمہیں زندہ جلایا جائے۔''

پلاٹو کے چہرے پر اشتعال نظر آیا جو فوراً ہی خوف میں بدل گیا۔

''آگ کیسے لگے گی؟''

''ایک دیا سلائی یا کچھ اور شافٹ میں گرانا کافی ہے۔'' ریچر نے کہا۔

''دونوں ساتھ جل کے مریں گے اگر تمہاری بات درست ہے۔'' پلاٹو نے کہا۔

ریچر نے کچھ نہیں کہا۔

☆☆☆

ریچر کی پتلون گیلی ہو گئی تھی۔ جیٹ فیول کا دھارا چیمبر میں پھیل رہا تھا۔ بخارات کی وجہ سے سانس لینا مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ گھٹنوں پر آ گیا۔

پلاٹو نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''کیا کرنا چاہیے؟'' اس کی توجہ ہتھیاروں پر نہیں تھی۔ ریچر کو یقین تھا کہ وہ ایسی غلطی نہیں کرے گا۔ ہتھیاروں کا استعمال ناممکن ہو گیا تھا۔ معمولی چنگاری خوفناک آگ بھڑکا دیتی۔

''تم سیڑھیوں پر کتنا تیز جا سکتے ہو؟'' ریچر نے سوال کیا۔

''تم سے زیادہ تیز۔'' پلاٹو نے خون تھوکا۔

''میرا نہیں خیال کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' ریچر نے کہا۔ پلاٹو کھڑا تھا اور ریچر گھٹنوں پر تھا۔ پھر بھی دونوں کا چہرہ آمنے سامنے تھا۔

ریچر نے نیچے سے شدید اپر کٹ مارا۔ ضرب کے پیچھے بھرپور طاقت تھی۔ پلاٹو کے جبڑے کو جھٹکا لگا۔ سر عقب میں گیا۔ وہ آواز نکالے بغیر گرا۔ گردن ٹوٹ گئی تھی۔ وہ تیل میں ڈوبی زمین پر گرنے سے پہلے مر چکا تھا۔ پلاٹو کی دہشت تمام افسانوں سمیت نابود ہو چکی تھی۔

''یقیناً ہر کوئی موت سے ڈرتا ہے۔'' جیفٹ سلیٹر نے ایک مرتبہ کہا تھا۔

''یہ اس پر منحصر ہے کہ موت کس شکل میں آتی ہے۔'' ریچر نے جواب دیا تھا۔

ریچر آلودہ زمین پر چھپا چھپ گھٹنوں کے بل بھاگا۔ وقت کم تھا۔ مقابلہ سخت۔ سیڑھیوں پر پہنچ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ اب اس نے دوڑ لگائی۔ سیڑھیاں تنگ اور چکردار تھیں۔ بخارات کی وجہ سے پھیپھڑے پہلے ہی متاثر تھے۔ مستزاد اس کا قد و کاٹھ۔ تاہم ریچر کی تمام تر توانائی اور توجہ وہاں سے بروقت نکلنے پر تھی۔ کسی بھی وقت ہولناک آتش فشاں پھٹ جانا تھا۔ دو، دو، تین تین سیڑھیاں..... چار چار..... وہ بے تحاشا اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ پھیپھڑوں میں آگ لگی۔ اوپر اور اوپر، گھومتا چکراتا اژدہا جا رہا تھا۔

☆☆☆

ٹرک آگے جا کر رن وے پر روشن فلیئر کے قریب رکا۔ 4A باہر نکلا اور بھاگ کر ایک فلیئر حاصل کی۔ واپس ٹرک میں آیا اور ٹرک سنگی عمارت کی طرف مڑا۔ سنگی عمارت کے قریب رکا۔ 4A اترا دروازہ کھول کے عمارت کے بالائی چیمبر میں گیا۔ ہاتھ لہرا کے فلیئر شافٹ میں پھینکی اور باہر نکل کے ٹرک کی طرف بھاگا۔

صبح کے چار بجنے میں پانچ منٹ تھے۔

اکسٹھ گھنٹے ختم ہو چکے تھے۔

☆☆☆

سائٹ کے ٹھنڈا ہونے میں چار دن لگے تھے۔ لہٰذا وہاں کا جائزہ لینے کے لیے چار دن انتظار کرنا پڑا۔ اس دوران ایجنسیوں کی قطار لگ چکی تھی۔ ہوم لینڈ سیکیورٹی، ائرفورس، ایف بی آئی۔ ہائی وے پٹرول..... خوفناک آتشزدگی کی خبر طوفانی انداز میں پھیلی تھی۔ نارتھ امریکن ائر ڈیفنس کمانڈ نے سب سے پہلے نوٹس لیا تھا۔ ان کے مصنوعی سیاروں نے ناقابلِ یقین تپش کو ریکارڈ کیا تھا اور کمپیوٹرز نے اسے میزائل حملہ سے تعبیر کیا تھا۔ روسیوں نے بھی یہی اندازہ لگایا تھا۔ سیکنڈوں میں وہائٹ ہاؤس کے فون بجنے لگے۔ کچھ دیر بعد تصدیق ہو گئی کہ کوئی روسی میزائل امریکا پر

نہیں چلایا گیا تھا۔

تفتیش کار زکو وہاں دائرہ بنانے کے لیے روانہ کیا گیا۔ ایک کے بعد دوسری ایجنسی کی آمد جاری تھی۔ انہوں نے اپنے اپنے کیمپ پانچ پانچ میل کے فاصلے پر قائم کیے تھے۔ پٹرولنگ آگے روانہ کی گئی تھی جتنا کہ وہ آگے جاسکتے تھے۔ پھر وہاں کے قریبی ٹاؤن بوسٹن سے خبر آئی کہ ناقابلِ فہم کیمیائی آلودگی کا بادل ٹاؤن پر ہے۔ خطرناک مواد سے متعلق احکامات جاری کیے گئے اور پٹرولنگ کو واپس بلا کے ڈاکٹرز کو روانہ کیا گیا۔ انہوں نے تعین کیا کہ آبادی پر ڈرگ کا اثر تھا جو عارضی جوش اور ہیجان کا اثر رکھتی ہے۔ فضا کو ٹیسٹ کیا گیا تھا۔ تاہم مخصوص ڈرگ کے نام کا تعین نہ ہوسکا۔

پٹرول کارز کو ایک بار پھر آگے روانہ کیا گیا۔ انہوں نے آتشزدگی کے مرکز کے جنوب میں چار میل کے فاصلے پر ایک ٹرک دریافت کیا۔ وہ ٹرک ریپڈسٹی کے ائرفیلڈ سے چرایا گیا تھا۔ وہ ٹرک جس رخ پر محوِ سفر تھا، وہ راستہ برفانی تھا اور ڈرائیونگ کے لیے خطرناک۔ یوں معلوم ہوا کہ ٹرک پھسل کے بے قابو ہوا اور الٹ گیا۔ ٹرک سے ذرا دور دو جسم دریافت ہوئے۔ موت کے زخم اور تپش کے اثرات تھے۔ مکمل شناخت نہ ہوسکی۔ تاہم دونوں میکسیکن تھے۔ دونوں کے پاس آٹومیٹک غیر قانونی ہتھیار موجود تھے۔ دو ہتھیاروں سے فائر کیے گئے تھے۔ ایک سے تین برسٹ مارے گئے تھے۔ اس خبر کے بعد دو اور ایجنسیاں ساؤتھ ڈکوٹا کے ٹاؤن بوسٹن جا دھمکیں۔ ایک کا تعلق فائر آرمز سے تھا اور دوسری بیورو آف الکوحل اینڈ ٹوبیکو..... پیٹرول کارز مزید چھان بین کے لیے اطراف میں پھیل گئیں۔ چرایا گیا دوسرا ٹرک بھی دریافت ہوگیا۔ وہ پچھلے الٹے ہوئے ٹرک سے کافی فاصلے پر تھا۔ اور تقریباً ٹھیک حالت میں کھڑا تھا۔ ٹرک میں کوئی نہیں تھا اور ٹرک سے دور نزدیک بھی کوئی باڈی یا زندہ انسان کے آثار مفقود تھے۔

تیسری چیز جو سامنے آئی وہ پرانے رن وے پر ایک خراب پولیس کار تھی۔ تفتیش کے بعد علم ہوا کہ وہ کار بوسٹن پولیس ڈپارٹمنٹ کے چیف ہالینڈ کے زیرِ استعمال تھی۔ جس رات آگ لگی، ہالینڈ غائب ہوگیا تھا۔ بعدازاں جلے ہوئے جہاز کی باقیات بھی دیکھ لی گئیں۔ جس کے بعد نیشنل ٹرانسپورٹیشن سیفٹی بورڈ بھی دیگر ایجنسیوں کے ساتھ آن ملا۔

چند اور لاشیں بھی دریافت ہوئیں۔ لیکن ان کی حالت اتنی ناگفتہ تھی کہ بہ حیثیت لاش کے ان کی شناخت اتفاق جیسی تھی۔ کجا پوسٹ مارٹم کرنا.....

سنگی عمارت کا ڈھانچا اپنی جگہ پر تھا۔ تاہم اس کی اصل ہیئت برباد ہوچکی تھی۔ ائرفورس نے عمارت کی ملکیت کی تصدیق کردی تھی۔ پھر بھی اصل منصوبہ اندھیرے میں تھا۔ البتہ اطلاع یہ تھی کہ عمارت کو پچاس برس قبل تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ بھی پتا چل گیا کہ آگ عمارت میں زیرِزمین شروع ہوئی۔ فولادی سیڑھیوں کے ساتھ فولادی شافٹس کا رشتہ چرائے گئے دونوں ٹرکس کے ساتھ جوڑا گیا۔ اندازہ لگایا گیا کہ زیرِزمین فیول ٹینک تھا جہاں سے فیول اوپر چڑھا کے جہاز کا ٹینک بھرتا تھا۔

بہترین اندازوں کے مطابق ایندھن بھرنے کا عمل آغاز سے قبل ہی حادثے کا شکار ہوا اور آگ بھڑک اٹھی۔ ابتدائی آتشزدگی ایک گھنٹے سے زیادہ رہی۔ جس کی شدت بھی بہت زیادہ نہیں تھی۔ وجہ تیل کے بہاؤ میں انجانی رکاوٹ کو بتایا گیا۔ اس کے بعد جو آگ کا گولا بلند ہوا، وہ ایسا ہی خوفناک تھا جیسے میزائل کا حملہ.....

میجر سوزن ہر شام ٹیلی ویژن پر خبریں دیکھتی اور سنتی۔ اس کے علاوہ سارا دن وہ آن لائن خود کو باخبر رکھتی۔ وہ اپنے آفس راک کریک میں ہی تھی۔ وہ کال کی منتظر تھی۔ چار دن گزر گئے اور کال نہیں آئی۔ اس کے لیے یہ تصور کرنا محال تھا کہ ریچر بھی اس بھیانک حادثے کا شکار ہوگیا۔ اس کے دماغ میں دوسرا خالی ٹرک کھٹک رہا تھا۔

البتہ میجر سوزن مذکورہ دونوں امور کے بارے میں درست اطلاع ریچر کے ذریعے جان چکی تھی۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ پلاٹو سمیت بھی مارے جاچکے ہیں۔ جن میں ہالینڈ بھی شامل تھا۔

پینٹاگون سے جو فون کالز وصول ہورہی تھیں، ان کے مطابق ہومی سائڈ انویسٹی گیشن کا آغاز ہی نہیں ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ دو میکسیکن کے علاوہ کوئی بھی جاندار قابلِ شناخت تو کیا پوسٹ مارٹم کے قابل بھی نہیں تھا۔ میجر سوزن مایوس ہوچلی تھی۔

☆☆☆

''آتش فشاں'' پھٹنے کے بعد نواں دن تھا جب راک کریک آفس میں شام کے وقت فون کی گھنٹی بجی۔ سوزن نے اسے نظرانداز کیا۔ وہ آفس سے نکلنے والی تھی۔ گھنٹی دوسری بار پھر تیسری بار بجی..... وہ ٹھہر گئی اور اکتائے ہوئے انداز میں ریسیور اٹھایا۔

''کیا تم شادی شدہ ہو؟'' دوسری جانب سے اچانک سوال کیا گیا۔

سوال کرنے والے کی آواز سنتے ہی اس کے جسم میں سرشاری کی لہر دوڑ گئی۔ اب اس کے لبوں پر دلنشیں مسکراہٹ تھی۔

❖❖❖

ایمان فروش

اسما نوشین

جذبہ اگر خالص ہو تو گولی کی رفتار سے تیز ہوتا ہے... اس نے بھی ہمت... جرأت اور آزادی کے جذبات کے زیرِ سایہ پرورش پائی تھی... اب اپنے مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا وقت آچکا تھا... وہ دشمن کے سامنے ناقابلِ تسخیر تھا مگر محبت اور عورت کی عداوت اس کی راہ میں حائل ہو چکی تھی...

خونِ شہید کبھی رائگاں نہیں جاتا..... یومِ کشمیر کے حوالے سے ایک دل گداز کتھا

آفس کی فضا میں ہلکی سی خاموشی تھی۔ نقشی اور خالد بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اُن کے چہروں سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ دونوں کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا۔ ساغر آخر ہے کون؟ جب سے ساغر سے ملاقات ہوئی تھی، ان کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

دروازہ کھلا۔ شاہ زین اندر آیا۔ جیسے ہی اس نے قدم رکھا، دونوں کی نظریں اس پر جا ٹکیں۔ وہ مسکراتا ہوا بولا۔

''السلام علیکم!''

"وعلیکم السلام سر، کہاں تھے آپ؟ کل آئے ہی نہیں؟" خالد نے فوراً پوچھا۔

"میں ایک میٹنگ میں مصروف تھا۔" شاہ زین نے پرسکون لہجے میں کہا۔

خالد نے فوراً ٹوکا۔ "لیکن سر، کل تو کوئی میٹنگ نہیں تھی؟"

"آئی جی صاحب نے اچانک بُلا لیا تھا، صرف میرے ساتھ میٹنگ تھی۔" شاہ زین نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

نقشی غور سے شاہ زین کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات جیسے کچھ چھپا رہے ہوں۔

شاہ زین نے جب اس کی نظریں محسوس کیں تو نگاہ پھیر لی مگر نقشی جان چکی تھی کہ بات کچھ تو ہے۔

"یہ ایک کیس ہے، تم دونوں کو دیکھنا ہے۔" شاہ زین نے بات بدلی۔

"ایک عورت سکینہ نے اپنے شوہر کے قتل کی رپورٹ درج کرائی ہے۔ تم لوگ فوراً انویسٹی گیشن شروع کرو۔ میں اسلام آباد جا رہا ہوں، ایک اہم کیس کے سلسلے میں۔ پتا نہیں واپسی میں کتنا وقت لگے۔"

"پتا نہیں؟ کیا مطلب سر؟" خالد کے لہجے میں حیرت تھی۔

"بس حکم آیا ہے۔" شاہ زین نے نظریں جھکا لیں۔

نقشی نے دھیرے سے کہا۔ "کیا آپ ہمیں نہیں بتائیں گے کہ اصل بات کیا ہے؟"

"نہیں، نقشی۔ تم لوگ صرف اپنا کام کرو، رپورٹ فیکس کر دینا۔"

خالد ایک ضروری کال سننے باہر گیا۔ کمرے میں اب صرف شاہ زین اور نقشی رہ گئے۔

نقشی نے آہستہ سے کہا۔ "آپ ہی ساغر ہیں نا؟"

شاہ زین چونک گیا۔

نقشی نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "ساغر آپ ہی کی شخصیت کا دوسرا رخ ہے، ہے نا؟"

شاہ زین نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ہاں میں سر ہلا دیا پھر انگلی ہونٹوں پر رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

نقشی نے بھی ہاں میں سر ہلا دیا۔

سمجھ گئی تھی کہ اس بات کو راز رکھنا ہے۔

☆☆☆

اسلام آباد کی ٹھنڈی ہوا نے جیسے ہی اس کے چہرے کو چھوا، ایک خوشگوار احساس نے دل کی دھڑکنوں کو چھو لیا۔

شاہ زین پُراعتماد اور مطمئن قدموں کے ساتھ ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک سکون سا چھا گیا۔

آج رات ٹھیک آٹھ بجے اہم میٹنگ تھی۔

گرے رنگ کے سوٹ میں ملبوس، مضبوط قد و قامت اور سنجیدہ چہرہ — شاہ زین کی شخصیت میں ایک خاص رعب اور وقار تھا۔

اس نے آئینے میں ایک نظر خود پر ڈالی، ٹائی درست کی اور جیسے ہی سانس بھری، موبائل کی بیل بجی۔

نوٹیفکیشن واٹس ایپ تھا۔ "گاڑی پہنچ چکی ہے۔"

شاہ زین نے فائل اٹھائی اور پُرسکون انداز میں دروازے کی طرف بڑھا۔

ڈنر ایک بڑے ہوٹل کے کانفرنس ہال میں تھا۔ وہاں قانون کے اہم لوگ، چند مشہور سیاست داں اور خفیہ اداروں کے نمائندے موجود تھے۔

ماحول سنجیدہ مگر پُراعتماد تھا۔

شاہ زین کو اندازہ ہو چکا تھا کہ اسے یہاں کسی عام میٹنگ کے لیے نہیں بُلایا گیا۔

یہ یقیناً کوئی ناممکن مشن تھا۔ ایسا کام جو صرف ان چند افراد کے حصے میں آتا ہے جو ناممکن کو ممکن بنا دیتے ہیں۔ اور شاہ زین انہی میں سے ایک تھا۔ اس میٹنگ میں ملک کے معروف وکیل اور دو اعلیٰ افسر بھی شامل تھے، جو ایک نئی خفیہ ٹیم کا حصہ بننے جا رہے تھے۔

جب کیس کے ہیڈ کا نام شاہ زین بتایا گیا، تو لمحہ بھر کے لیے اس نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔

پندرہ سالہ پولیس سروس میں یہ شاید پہلا موقع تھا جب اسے لگا کہ اب اسے واقعی وہ ذمے داری ملی ہے جس کا اسے برسوں سے انتظار تھا۔

شاہ زین نے اگلی صبح کے لیے اپنی ٹیم کو آفس آنے کا پیغام دے دیا تھا۔

رات گئے جب وہ ہوٹل واپس آیا تو نیند جیسے اس سے روٹھ گئی تھی۔ وہ کافی دیر تک جاگتا رہا۔

سوچتا، منصوبہ بناتا، ہر زاویہ اپنے ذہن میں ترتیب دیتا رہا۔

یہ مشن معمولی نہیں تھا۔ ہر قدم سوچی سمجھی حکمتِ عملی کے تحت اٹھانا تھا۔ کسی سے مشورہ لینا گویا خود سے راز کا پردہ فاش کرنے کے برابر تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا

کہ اس مشن کی کامیابی مکمل رازداری کے ساتھ حکمتِ عملی میں ہے۔

یہاں تک کہ اپنی ٹیم میں بھی وہ کسی ایک فرد پر مکمل بھروسا کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔

پچھلے دو دنوں کی کیس اسٹڈی نے اسے یہ سکھایا تھا کہ ''فی الحال خود کے سائے پر بھی اعتبار کرنا خطرے سے خالی نہیں۔'' گھنٹوں سوچنے کے بعد آخرکار وہ ایک نتیجے پر پہنچا۔

پلان تیار تھا۔

اب صرف کل کی میٹنگ باقی تھی اور پھر اس منصوبے پر عمل درآمد شروع ہونا تھا۔ وہ پُرسکون سانس لے کر بستر پر لیٹا، الارم سیٹ کیا۔ اور دیر تک جاگنے کے بعد بالآخر آنکھیں موند لیں۔ باہر ہوٹل کی عمارت پر لگی روشنیوں میں رات جیسے کسی نئے راز کی پیش گوئی کر رہی تھی۔

صبح کے وقت کانفرنس روم میں شاہ زین اپنی ٹیم کے ساتھ موجود تھا۔ ہال میں سنجیدگی اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شاہ زین نے ایک نظر سب پر ڈالی اور پھر پُرسکون مگر گہری آواز میں بولا۔

''اس مشن میں سب سے اہم چیز وفاداری اور رازداری ہے۔ اگر کسی نے بھی کسی قسم کی مخبری کی کوشش کی تو انجام کا ذمے دار وہ خود ہوگا۔''

یہ میٹنگ محض ہدایات دینے کے لیے نہیں تھی۔ درحقیقت شاہ زین اس کے ذریعے جانچنا چاہتا تھا کہ کہیں ٹیم میں کوئی کمزور کڑی تو موجود نہیں۔ چہرے پڑھنا، لوگوں کے انداز سے ان کے باطن کا اندازہ لگانا۔ شاہ زین ان سب میں ماہر تھا۔ وہ دورانِ گفتگو ہر شخص کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

کسی کے ماتھے کی شکن، کسی کے لبوں کا لرزنا، کسی کی نظریں چُرانا۔ لیکن سب ٹھیک لگے۔ کوئی جھوٹ یا گھبراہٹ نہیں تھی۔ اس نے اطمینان سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولا۔

''اب تم لوگ یہ نوٹس یاد کرلو۔ کل سے عملی کام شروع ہوگا۔''

میٹنگ ختم ہوئی تو وہ سب باہر چلے گئے مگر شاہ زین وہیں بیٹھا رہا۔ اس کے ذہن میں اگلے دو دن کا مکمل خاکہ بن چکا تھا۔

اس مشن کا اہم ہدف لال پاسپورٹ تھا۔ دو دن میں اسے بھارت پہنچنا تھا۔ یہ ایک ایسا کام تھا جس میں ہر قدم احتیاط کا متقاضی تھا۔ حکومتِ پاکستان کی اجازت، بھارت سے خفیہ ویزا اور مبین ملک سے ملاقات کا وقت یہ سب ایک نازک جال کی طرح ترتیب دیا جا رہا تھا۔ سب کچھ ہائی سیکیورٹی اور مکمل رازداری کے ساتھ چل رہا تھا۔ لیکن وہ وہاں انسپکٹر شاہ زین کے طور پر نہیں جا رہا تھا۔ اس بار اسے سرحد پار ایک عام رپورٹر ''ساغر'' بن کر داخل ہونا تھا۔ اپنی شناخت چھپانا تو ضروری تھا ہی مگر مذہبی پہچان چھپانا اس سے بھی زیادہ نازک مرحلہ تھا۔ یہ کام آسان نہیں تھا مگر شاہ زین جانتا تھا جب راستے اوپر تک ہوں تو مشکلیں راستہ خود بنا لیتی ہیں۔ اب صرف انتظار تھا اگلے دو دن کا۔ وہ جانتا تھا یہ مشن خطرناک بھی ہے اور فیصلہ کن بھی۔ شاید اس میں اس کی جان چلی جائے، مگر وہ ایک بے گناہ کی جان بچا لے، تو یہی قربانی اس کی وردی، اس کے کندھوں کے ستاروں اور اس کے ایمان کا سچا ثبوت ہوگی۔

☆☆☆

کمرے کی فضا میں بوسیدہ لکڑی، خون اور ادھ جلے کپڑوں کی ملی جلی بُو رچی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں زنگ آلود زنجیریں پڑی تھیں اور ان کے درمیان، ایک ٹوٹے ہوئے تخت پر مبین ملک نیم بے ہوش لیٹا تھا۔

اس کا جسم زخموں سے چُور، نیلوں سے بھرا اور پسینے سے تر تھا۔ تن پر بس ایک پرانا تہبند باقی تھا، جس کے نیچے اس کی ہڈیوں تک کی کمزوری صاف جھلک رہی تھی۔

ساغر (یعنی شاہ زین) نے جیسے ہی وہ منظر دیکھا، اس کے قدم ساکت رہ گئے۔ اس کے حلق میں کوئی سخت سا گولا اٹک گیا۔ اس کی روح تک لرز گئی۔ یوں لگا جیسے کسی نے دل پر بوجھ رکھ دیا ہو۔ آنکھوں میں ضبط کیے ہوئے آنسو بے اختیار چھلک گئے۔

''یا اللہ.....'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ''یہ کیسا انصاف ہے؟ یہ کیسی انسانیت؟''

سامنے ایک ایسا شخص تھا، جو کبھی وادیِ کشمیر کا فخر، لاکھوں مسلمانوں کی اُمید، اور آزادی کی تحریک کا سب سے روشن چراغ کہلاتا تھا۔ آج وہ چراغ بجھنے کے قریب تھا۔

وہ مبین ملک..... جو اپنی ماں، جنت نظیر وادی کی آزادی کے لیے سب کچھ قربان کر چکا تھا جو ہندوستانی ظلم، گولیوں اور خفیہ ایجنسیوں کی سازشوں کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بن گیا تھا۔ آج اسی کے جسم پر ان ظالموں کے ہاتھوں کے نشان تھے۔ ساغر نے آہستہ سے اس کے قریب بیٹھ کر کپڑے سے اس کا پسینہ پونچھا۔ مبین کے ہونٹوں پر خفیف سی جنبش ہوئی، جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو مگر زخموں کا درد الفاظ بننے نہیں دے رہا تھا۔

ساغر کے دل میں فوراً یہ خیال آیا۔ ''اگر یہ چراغ بجھ گیا تو ہزاروں اُمیدیں اندھیروں میں گم ہو جائیں گی۔''

اس نے دھیرے سے کہا۔ ''میرا نام ساغر ہے..... میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔''

مبین نے ہلکی سی کروٹ لی۔ زخموں کی جلن سے اس کے چہرے کے خدوخال مٹنے لگے۔ پھر جیسے کوئی بجھی ہوئی چنگاری لمحہ بھر کو سُلگی ہو، اس کی آواز آئی۔

''سوال..... ؟ زندگی میں تو اب صرف سوال ہی رہ گئے ہیں ساغر بابو! ہر شخص جواب نہیں، اپنی مرضی کا سچ چاہتا ہے۔ سچ کہو تو دشمن بن جاتا ہے، جھوٹ بولو تو ہیرو۔ اور تم؟ تم کیا جاننا چاہتے ہو؟ وہ سچ..... جسے سننے کا حوصلہ کسی میں نہیں؟''

شاہ زین کے دل میں جیسے کسی نے کانٹے بُو دیے ہوں۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''میں وہ سچ جاننا چاہتا ہوں..... جو تمہارے لہو نے لکھا ہے۔''

مبین کے لبوں پر ایک کمزور سی مسکراہٹ آئی۔ وہی مسکراہٹ جو کبھی جلوسوں میں، نعروں کے بیچ، وادی کے نوجوانوں کے دلوں میں حوصلہ بُن کر ابھرتی تھی۔

اس نے کہا۔ ''یہ سچ آسان نہیں ساغر بابو..... یہ سچ زخموں میں پلتا ہے، اذیتوں میں سانس لیتا ہے۔ ہم روز مرتے ہیں، تاکہ کل کوئی اور جیت سکے۔ وہ ہمیں مارتے ہیں..... پھر زندہ کر دیتے ہیں۔ بس اس لیے کہ ہماری چیخیں، ان کے مردہ دلوں کی دیواروں کے ساز ہیں۔ ہماری سانسوں کو وہ سزا بنا چکے ہیں..... اور..... اور..... ہماری موت کو تماشا۔''

شاہ زین کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ سامنے ایک ٹوٹا ہوا جسم نہیں، ایک پوری قوم کی لُٹی ہوئی غیرت پڑی تھی۔ ایک مرد، جو کبھی آزادی کا استعارہ تھا، آج قید کے اندھیروں میں اُمید کی آخری کرن بن گیا تھا۔

شاہ زین نے دھیرے سے مبین کے زخموں پر نظر ڈالی، پھر کہا۔ ''میں سچ کے لیے آیا ہوں مبین..... اور شاید یہ سچ ہی تمہارے لیے اُمید کی ایک نئی کرن ہو۔''

مبین کی آنکھوں میں ایک لمحے کو روشنی لوٹی، جیسے بجھے چراغ میں دوبارہ آگ بھڑک اٹھی ہو۔ اس نے کہا۔ ''تو پھر سنو ساغر..... یہ جنگ زمین کی نہیں، ضمیر کی ہے۔ یہ آزادی کی نہیں، ایمان کی لڑائی ہے۔ لیکن وعدہ کرو، اگر میں نہ رہا..... تو یہ داستان تمہارے لفظوں میں زندہ رہنی چاہیے۔''

کمرے میں خاموشی پھیل گئی۔

بس دور کسی جلتے بلب کی زرد روشنی میں، دونوں چہروں پر آزادی کا خواب لرز رہا تھا۔

ایک زخمی بدن کی سانسوں میں اور دوسرے کی آنکھوں کے یقین میں۔

پھر مبین ملک کی کمزور آواز بھولی بسری یادوں کو کریدنے لگی۔

☆☆☆

اندھیری رات کی ہوا میں ایک عجب سا سکوت تھا۔ پہاڑوں کے سائے گہرے ہو چکے تھے، اور وادی کی خاموشی میں کہیں دور اذان کی ہلکی سی صدا گھل رہی تھی۔ یہ آواز تھی مبین ملک کی۔

''متین ملک کا بیٹا، اس مجاہد کا، جس نے آزادی کے لیے اپنی دونوں ٹانگیں قربان کر کے بھی مسکراہٹ نہیں کھوئی تھی۔ متین ملک تو اس وقت دنیا سے رخصت ہو گیا تھا جب مبین محض سات سال کا تھا۔ اس کے بعد چچا، دادی اور زرمینہ..... تینوں نے مل کر مبین کی پرورش کو اپنا مشن بنا لیا۔ زرمینہ نے اسے دینی و دنیاوی علوم کے ساتھ وہ سبق بھی دیا جو کتابوں میں نہیں ملتا۔ ''کشمیر کی آزادی ایمان کا ایک حصہ ہے۔''

وقت گزرتا گیا، اور مبین کی آنکھوں میں وہی چمک اترتی گئی جو اس کے باپ کی آنکھوں میں تھی۔ وہ خاموش تھا مگر اس کی خاموشی میں طوفان چھپا تھا۔ جب اس نے پہلی بار آزادی کی تحریک میں قدم رکھا، پورے محلے میں مٹھائیاں تقسیم ہوئیں۔ لوگ کہتے تھے۔ ''متین ملک کا بیٹا میدان میں اُتر آیا ہے! اب وہ دن دور نہیں جب اس وادی میں آزادی کا سورج چمکے گا۔''

کچھ ہی عرصے میں مبین کشمیری مجاہدین کا ایک سرگرم رکن بن گیا تھا۔ آزادی کے متوالوں میں ایک اور نام شامل ہو گیا تھا جو جاگتی آنکھوں میں اس جنت نظیر کو پُرامن دیکھنا چاہتا تھا۔

وہ رات عام راتوں جیسی نہیں تھی۔ وادی کے اوپر بادل نیچے اُتر آئے تھے، چاند جیسے کسی نے دھند میں چھپا دیا ہو۔ پہاڑوں کے سائے میں چلتے دو وجودوں کے قدموں کی چاپ برف میں مدھم سی سرسراہٹ پیدا کر رہی تھی۔

مبین ملک نے کندھے پر بندوق کا پٹا مضبوط کیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی سنجیدگی تھی۔ وہ سنجیدگی جو کسی سپاہی کے چہرے پر دکھائی دیتی ہے۔

''یہ تمہارا پہلا مشن ہے، مبین۔ یاد رکھنا، دشمن کو صرف بندوق سے نہیں، دماغ سے بھی شکست دینی ہوتی ہے۔'' ساتھ چلنے والے بزرگ محمد مجاہد نے دھیرے سے کہا۔

مبین نے سر ہلایا۔ ''ابا جان نے یہی سمجھایا تھا..... کہ جذبہ اگر خالص ہو تو گولی کی رفتار سے تیز ہوتا ہے۔''

وادی کے دوسری سمت بھارتی چوکی کے قریب مشعلیں جل رہی تھیں۔ مبین کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا نقشہ تھا، جو خفیہ ایجنسی کے ایک ساتھی نے بڑی احتیاط سے اسے دیا تھا۔ مقصد تھا۔ دشمن کے کمیونیکیشن ٹاور کا نیٹ ورک بند کرنا، تاکہ مجاہدین کی نقل و حرکت خفیہ رہے۔

''تمہیں صرف پانچ منٹ ملیں گے، اس کے بعد گشت بدل جائے گا۔'' ساتھی نے سرگوشی کی۔

مبین نے زیرِ لب مسکرا کر کہا۔ ''پانچ منٹ کافی ہیں۔ ایمان والوں کی رگوں میں وقت نہیں، نیت دوڑتی ہے۔''

چند لمحوں بعد دھماکے کی مدھم آواز وادی میں گونجی۔ دشمن کی مشعلیں بجھ گئیں اور برف سے ڈھکی وادی میں آزادی کے نعروں کی بازگشت پھیل گئی۔

اسی رات مجاہدین کے کیمپ میں جب خبر پہنچی، دادی نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ زرمینہ کے چہرے پر آنسو بھی تھے، فخر بھی۔

سب نے کہا۔ ''متین ملک کا بیٹا، اپنے باپ کا وعدہ پورا کر گیا۔''

مبین ملک کی مقبولیت عوام میں روز بروز بڑھتی جا رہی تھی مگر دشمن کے سینے پر سانپ لوٹ رہے تھے اور پھر وہی ہوا کہ کسی مخبر نے بھارتی خفیہ ایجنسی کی توجہ مبین ملک کی طرف کروائی۔ بس وہ دن مبین ملک کی زندگی میں پے در پے مشکلات کا نہ ختم ہونے والے سلسلے کا آغاز ہو چکا تھا جس کے بعد آنے والا ہر دن امتحان اور سازشوں سے پُر تھا۔

بھارتی پولیس نے مبین ملک کو حراست میں لے لیا۔ پورے شہر میں شور مچ گیا مگر حقیقت یہ تھی کہ تین ماہ کی سخت تفتیش کے بعد بھی وہ لوگ مبین کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت سامنے نہ لا سکے۔ کشمیری عوام کی مسلسل آواز، احتجاج اور دباؤ نے بالآخر اثر دکھایا اور مبین کو رہائی ملی۔

رہائی کے بعد پہلی بار جب اس نے آزاد فضا میں سانس بھری تو اس کے چہرے پر وہی پُرعزم سکوت تھا جو کبھی اس کے باپ کی آنکھوں میں دیکھا جاتا تھا۔ مگر اب حالات بدل چکے تھے۔ حکومت نے اسے ذاتی تحفظ اور سخت سیکیورٹی فراہم کی تاکہ اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جا سکے۔

مگر یہ محافظت مبین کی روح کو ساکت نہ کر سکی۔ ایک حقیقی مجاہد اپنے بھائیوں اور اپنی عورتوں کی عزت بچانے میں پوری طاقت صرف کر دیتا ہے۔ مبین نے دوبارہ میدان میں قدم رکھ دیا۔ نہ صرف سیاسی سطح پر آواز اٹھانے کے لیے بلکہ لوگوں کی حفاظت اور عزت کی پاسداری کے لیے بھی۔

چند ہی ماہ میں وہ ہر دلعزیز شخصیت بن گیا۔ اس کی باتیں، اس کی تصویریں، اس کا نام پورے کشمیر میں گونجنے لگا۔ ایک ایسا ستارہ جو دن میں بھی پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتا تھا۔ لوگ اسے امید کا نشان ماننے لگے۔ اس نے دنیا بھر میں کشمیریوں کا موقف پہنچایا۔

مگر دشمن کی سازش بھی گہری تھی۔ منصوبہ یہ تھا کہ مبین کو تنہا کر دیا جائے، عوامی حمایت توڑ دی جائے اور اسے ایسے جرائم میں پھنسایا جائے جس سے اس کی ساکھ تباہ ہو جائے۔ کچھ ہی عرصے بعد مبین ملک کو بھارت نے ''موسٹ وانٹڈ'' قرار دے کر اس کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیے۔ وادی میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔

سزا

''یار امجد اس لڑکی کا کیا حال ہے جس سے تمہاری بڑی ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں؟''

''کیا بتاؤں یار! ایک دن میں نے یونہی کہہ دیا، مجھے تم سے کوئی محبت نہیں ہے۔ میں تو بس دل لگی کی خاطر تم سے ملتا ہوں۔ اس لڑکی نے غصے میں کہا، میں تمہیں ایسا مزا چکھاؤں گی کہ ساری عمر آنسو بہاؤ گے۔''

''تو کیا وہ لڑکی تمہیں سزا دینے میں کامیاب ہو گئی؟''

امجد۔ ''ہاں، کیونکہ وہی لڑکی اب میری بیوی ہے۔''

کراچی سے امتیاز احمد کی مظلومیت

سستی

مریض۔ ''ڈاکٹر صاحب! ایسی چیز کی ضرورت ہے جس سے میری سستی ختم ہو جائے، میں چاق چوبند ہو جاؤں۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ میں لڑنے مرنے کو تیار ہو جاؤں۔ کیا آپ نے میرے نسخے میں کوئی ایسی چیز شامل کر دی ہے؟''

ڈاکٹر۔ ''وہ چیز نسخے میں نہیں بل میں شامل کر دوں گا۔''

جیکب آباد سے ارسلان بھٹی کی خواہش

مبین کا موقف، بس میں کشمیر سے ... عوامی خود ارادیت کا جنون شامل تھا، قطرہ بہ قطرہ بین الاقوامی سیاسی منظرنامے کو بھی ہلا رہا تھا۔ اس کی باتوں اور حرکتوں نے دونوں ممالک کی سیاسی طاقتوں کے لیے پیچیدہ صورتِ حال پیدا کر دی تھی۔ وہ ڈر گئے کہ یہ تو حقیقی تحریک ہے، اور کچھ طاقتیں اس کو اپنے سیاسی مفادات کے لیے استعمال کرنا چاہتی تھیں۔

کچھ سیاسی دھڑے ایسے بھی تھے جنہوں نے مبین کی ذاتی زندگی میں گھل کر سازشیں کیں۔ اس کے رستے میں رکاوٹیں کھڑی کیں، اور پھر کشمالہ کو ایک مہرہ بنا کر مبین تک پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ کشمالہ کے ذریعے دشمن نے مبین کے دائرۂ اعتماد میں دراڑ ڈالنے کی کوششیں تیز کر دیں۔ کشمالہ سے دو ماہ پہلے مبین کی شادی بھی اسی چال کا حصہ تھی۔

اب مبین کے لیے ہر قدم احتیاط کا تقاضا کرتا تھا۔ دشمن نے اس کا نام کالعدم قرار دینے، اس کی ساکھ کو مجروح کرنے اور اس کے پیچھے ایسے حالات پیدا کرنے کی ٹھان لی تھی جن سے نکلنا آسان نہ تھا۔ مگر وادی کے لوگ اب بھی پُرامید تھے اور مبین، اُن امیدوں کا محافظ بن کر اُبھرا۔

کشمالہ سے مبین کی محبت کی شادی تھی۔ اکثر رات میں وہ چھت پر کشمالہ کے ساتھ اس جنت کی آزادی کے خواب بُنتا۔

اسے کشمالہ کی آنکھوں میں سکون دکھتا، مگر اس سکون کے پیچھے طوفان چھپا تھا۔ وہ مبین کے قریب تھی۔ اتنی قریب کہ اب مبین کا ہر راز، ہر سوچ، اور ہر جذبہ کشمالہ کے سینے میں دفن ہونے لگا۔ لیکن کشمالہ کے چہرے کی وہ خاموشی، وہ نرمی..... دراصل ایک خوب صورت جال تھی۔

یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی چال تھی۔ ایک ایسا منصوبہ جو کشمیر کی تحریک کو اندر سے توڑنے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ بھارت کی خفیہ ایجنسی نے مبین ملک کے قریب پہنچنے کا واحد راستہ ''اعتماد'' کو سمجھا تھا، اور وہ جانتے تھے کہ ایک سچا مجاہد صرف اسی پر بھروسا کرتا ہے جو اس کے دل کو چھو لے۔

کشمالہ، جو دہلی کی یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ اور ذہین خاتون تھی، ایک خاص مشن کے ساتھ کشمیر بھیجی گئی۔ اس کا مقصد تھا، مبین ملک کے قریب جانا، اس کے منصوبوں کی معلومات حاصل کرنا اور اگر ممکن ہو تو اسے گمراہ کر دینا۔ مگر قسمت کے کھیل اور انسان کے دل کا حساب کسی منصوبے کا محتاج نہیں۔

ایک رات، جب مبین ملک نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ خفیہ میٹنگ رکھی تو کسی طرح اس کی خبر باہر پہنچ گئی۔

اگلی صبح، بھارتی فوج نے چھاپا مارا۔ تین جوان شہید ہوئے، دو گرفتار۔ کیونکہ وہ لوگ بھارتی فوج کے اس حملے کی لیے تیار نہ تھے۔

مبین بچ گیا مگر فوراً ہی دماغ میں یہ سوال اُبھرا۔ ''یہ اطلاع باہر کیسے پہنچی؟'' اسے کشمالہ پر شک ہوا۔ اس رات کشمالہ کو دیکھ کر پہلی بار مبین کو دکھ ہوا۔ اس نے کچھ نہ کہا، مگر اس کی خاموش نگاہیں کشمالہ کے اردگرد خطرے کا الارم بجانے لگیں۔ اس رات وہ دیر تک بارش میں کھڑا رہا اور خود سے کہتا رہا۔ ''شاید محبت اور مقصد ایک ساتھ نہیں جی سکتے۔ ایک کا مرنا ہی دوسرے کے لیے جینے کی اُمید ہے۔''

کشمالہ بھی اندر سے ٹوٹ رہی تھی۔ وہ اپنے ضمیر سے جنگ لڑ رہی تھی۔ اگلے دن پھر سے دو مجاہد شہید ہوئے تھے۔ خون کی بو اب بھی ہوا میں باقی تھی۔ پہاڑوں کی چپ، دریا کے شور کے پیچھے کسی راز کو چھپا رہی تھی۔ مبین نے اپنے خیمے میں بیٹھے بیٹھے سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور گہری نظر نقشے پر ڈالی۔ کچھ تھا جو بات بننے نہیں دے رہا تھا۔ دو شہادتیں، ایک ہی وقت، ایک ہی مقام اور اطلاع دشمن تک کیسے پہنچی؟ اس کے دماغ نے جیسے مسئلے کا حل ڈھونڈ لیا۔ نقشے، فائلیں، وائس ایپ ریکارڈ، سب اس کے سامنے تھے۔ اور ہر راستہ جا کر ایک ہی نام پر رک رہا تھا، کشمالہ۔ مبین کے لبوں سے بس ایک جملہ نکلا۔ ''یہ اتفاق نہیں..... غداری ہے۔'' وہ پوری رات نہیں سویا۔

دوسری صبح سورج کی کرنیں جب پہاڑوں کے پیچھے سے ابھریں، مبین کی آنکھوں کے نیچے سیاہ دائرے گواہی دے رہے تھے کہ اس نے نیند سے نہیں، یقین سے جنگ لڑی تھی۔

☆☆☆

کشمالہ اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔

کھڑکی سے وادی کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ برف کے نیچے چھپی سرسبز امیدیں۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، اور دل میں ایک جنگ برپا تھی۔ مبین کی تصویر سامنے رکھی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''میں نے سوچا تھا یہ ایک مشن ہوگا..... مگر یہ محبت بن جائے گی، یہ نہیں سوچا تھا۔''

کشمالہ جو اصل میں پوجا شرما، انڈین انٹیلی جنس کی افسر تھی۔ اپنے ضمیر سے ہارنے لگی تھی۔ اسلام، جسے وہ کبھی کمزوروں کا مذہب سمجھتی تھی، اب اسے طاقت، سچائی، اور

امن کا روپ لگنے لگا تھا۔ زرمینہ کی ممتا بھری محبت، اور مبین کی آنکھوں میں چھپی خلوص کی روشنی..... یہ سب اس کے اندر کے اندھیرے کو ٹکڑوں میں توڑ رہے تھے۔

مبین نے کشمالہ پر گہری نظر رکھنی شروع کر دی تھی۔ ہر حرکت، ہر فون کال، ہر خاموشی اسے شک کے دائرے میں لا رہی تھی۔ مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ اصل وار ابھی ہونا باقی ہے۔

رات کے پچھلے پہر، وادی کے سب سے اونچے مورچے پر دھماکا ہوا۔ مبین دوڑا، اور جب وہ پہنچا تو زمین جیسے اس کے نیچے سے نکل گئی۔ دشمن کا نشانہ، بالکل ان کے ہتھیاروں کے خیمے کے اندر۔ کسی نے راستہ بتایا تھا..... اس کا دل دھڑکا اور پہلی بار، اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

"یا اللہ، کیا اس سلسلے کی کڑی وہیں جڑتی ہے جہاں میں سوچ رہا ہوں..... نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا....." وہ جلدی سے اپنے گھر کی طرف لوٹا، لیکن گھر کے پچھلے حصے کی طرف مبین کی نظروں سے درختوں کے جھنڈ میں غیر معمولی حرکت چھپ نہ پائی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ درخت کے پیچھے سے کسی کے بولنے کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ اس نے سانس روکی..... اور اگلے ہی لمحے ہاتھ میں موجود ٹارچ کی روشنی اس وجود پر ڈالی۔ روشنی میں کشمالہ بیٹھی تھی، ہاتھ میں ایک ریڈیو ٹرانسمیٹر۔ مبین کی آنکھیں شعلوں میں بدل گئیں۔

"یہ کیا کر رہی ہو، کشمالہ؟"

کشمالہ نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ ریڈیو ہاتھ سے گر گیا۔ چہرے پر خوف، دل میں طوفان..... اور لبوں پر کوئی وضاحت نہ تھی۔

"مبین! میں..... میں بس....."

"بکواس بند!" مبین ایک قدم آگے بڑھا۔ اس کی آنکھیں خنجر کی طرح چبھ رہی تھیں۔

"تم ہی تھیں، نا؟ وہ معلومات تم ہی نے دی تھیں؟ جن مجاہدین کی لاشوں پر آج تک وادی رو رہی ہے..... ان کی موت کا پروانہ تم ہی نے دشمن کو دیا تھا نا بولو! ہاں یا نہ؟"

کشمالہ کے ہونٹ کپکپائے۔ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ "ہاں..... میں ہی تھی مگر....."

"خاموش!" مبین نے چیخ کر کہا مگر آواز پھٹ گئی۔

"جانتی ہو تم نے کیا کیا؟ یہ زمین، یہ پہاڑ، یہ دریا..... سب گواہ ہیں کہ تم نے ایمان کے نام پر غداری کی ہے!"

کشمالہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ "میں نے غداری نہیں کی مبین..... میں نے صرف حکم مانا تھا، میں نے سوچا تھا یہ سب ایک مشن کا حصہ ہے۔ مگر..... تم نے میرے یقین کو بدل دیا۔ تم نے دکھایا کہ ایمان کیا ہوتا ہے۔"

مبین نے ہاتھ اٹھایا مگر مار نہ سکا۔ اس کے سامنے وہ عورت نہیں، ایک ٹوٹا ہوا ضمیر تھا۔ آنسو، پشیمانی، اور ایمان کی روشنی ایک ساتھ اس کے چہرے پر لرز رہے تھے۔

"میں تو تم سے نفرت بھی نہیں کر سکتا..... کشمالہ....."

مبین ایک دم چونکا، کیا نام ہے تمہارا سچ سچ بتاؤ.....؟"

"پوجا!....." کشمالہ کو اپنی ہی آواز دور سے آتی سنائی دی۔

"ہونہہ۔ جانتا تھا کہ یہ کام ایک... مسلم ہرگز نہیں کر سکتا۔"

"کچھ نہیں جانتے تم..... مبین ملک! اس کام میں وہ غدار بھی شامل ہیں جنہیں اپنا سیاسی اور مالی فائدے بے گناہ مظلوم کشمیریوں کے بہتے خون سے زیادہ عزیز ہیں، اور خود کو نام نہاد مسلمان کہلاتے ہیں۔" پوجا کے انکشافات حیران کرنے کے لیے کافی تھے۔

"اس رات تمہیں پوجا نے گرفتار کروایا تھا؟"

ساغر کی آواز نے مبین ملک کو ماضی سے حال میں پہنچا دیا۔ کچھ لمحے کے لیے مبین سمجھ نہ پایا کہ وہ حال میں ہے یا ماضی میں۔ کمرے میں بس ان کے سانسوں کی آواز گونج رہی تھی۔ دیوار کے کونے سے آتی مدھم روشنی مبین ملک کے زخموں سے ٹکرا کر جیسے کوئی کہانی لکھ رہی تھی۔

"تمہارا..... تمہارا پورا خاندان؟" ساغر نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

مبین ملک کے ہونٹ سوکھے ہوئے تھے۔ اس نے آہستگی سے زبان پھیر کر انہیں تر کیا پھر نظریں نیچی کیے بولا۔ "پوجا..... کافی معلومات دے چکی تھی۔ ہمیں اپنی پوری پلاننگ بدلنی پڑی۔ میں نے اسی رات اسے ایک طلاق دے کر دو دن بعد اس کے مکان پر جو اس نے طلاق دینے کے بعد دیا تھا وہاں طلاق کا نوٹس بھجوا دیا۔ مگر دل..... دل اس کی بے وفائی برداشت نہیں کر پایا۔" وہ لمحہ بھر کو رکا، جیسے دل کے اندر سے لفظوں کو کھینچ رہا ہو۔

"اور وہ..... وہ مسلسل کوشش میں تھی، رابطے بحال کرنے کی، تعلقات کو پھر سے جوڑنے کی۔ کیونکہ میں نے صرف ایک طلاق دی تھی اور آخرکار، وہ کامیاب ہو گئی۔ میرے دل میں محبت کے بیج دوبارہ اُگنے لگے۔ میں سمجھا شاید وہ بدل گئی ہے۔ اس نے اسلام قبول کر لیا تھا، سری نگر کی..... مسجد کے امام سے ہدایت کی روشنی پائی۔ میں نے یقین کر لیا..... کیونکہ دھوکا میری فطرت میں نہ تھا۔" اس کے

لہجے میں ایک عجیب سکوت تھا۔

''زندگی پھر سے ایک ڈگر پر آنے لگی تھی۔ ہم ساتھ نماز پڑھتے، قرآن سنتے۔ پوجا اب کشمالہ نہیں بلکہ ایمان کی خوشبو بن چکی تھی۔ لیکن قسمت شاید ایک بار پھر ہمارا امتحان لینے کو تیار تھی۔'' مبین نے گہری سانس لی۔ آنکھوں کے کناروں سے آنسوؤں کے قطرے زخموں کی راکھ پر گرنے لگے۔

''دو، تین بار اس پر قاتلانہ حملے ہوئے..... میں نے سمجھا دشمن اسے ختم کرنا چاہتا ہے لیکن..... ہر بار وہ بچ جاتی۔ اور ایک صبح..... جب وادی کے پہاڑوں پر دھند چھٹی تھی، اور نرم سورج کی کرنیں برف کے ٹکڑوں پر جھلملا رہی تھیں..... کسی نے پھر اپنی آنکھوں پر لالچ، دھوکے اور طاقت کی پٹی باندھ لی۔ کسی نے پھر محبت کو بیچ دیا، پیسے کے ترازو میں محبت بہت ہلکی نکلی اور سونا، چاندی انمول ہو گئے۔'' ساغر کے ہاتھوں کی رگیں تن گئیں۔ اس نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

''کیا؟..... پھر سے دشمن کے پاس چلی گئی؟''

مبین کے لبوں پر ایک کڑوی مسکراہٹ آئی۔

''نہیں، دوست..... وہ دشمن کے پاس نہیں گئی۔ دشمن اس کے اندر جاگ اٹھا تھا۔ پوجا نے صرف میرے راز نہیں، میرا ایمان، میری ماں، اور میرے پورے خاندان کو مٹا دیا۔''

کمرے میں ایک سناٹا پھیل گیا۔

شاہ زین کی آنکھوں میں لرزتی نمی ٹھہر گئی، اور مبین ملک نے سر جھکاتے ہوئے آہستہ کہا۔

''اس دن میں مر گیا تھا ساغر، بس سانسیں زندہ رہ گئیں۔''

''لیکن تم کہاں تھے اس وقت؟'' وہ بے چین ہوا۔

''مجھے رات گرم دودھ میں نیند کی دوا خاصی مقدار میں دے دی گئی اور میں بے ہوش ہو گیا۔ آنکھ کھلی تو جسم کو رسیوں سے بندھا ہوا پایا اور خود کو بے بس اور لاچار۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک ایک کر کے میرے گھر والوں کو موت کی نیند سلایا گیا، مگر میں کچھ نہ کر سکا۔ نیم غنودگی اور رسیوں سے بندھا جسم پھڑ پھڑاتا رہا۔ رحم کی بھیک مانگتا رہا مگر اسے اور اس کے ساتھیوں کو ترس نہ آیا۔ اس کے بعد وہ مجھے مختلف کال کوٹھڑیوں سے گزار کر یہاں لے آئے ہر قسم کی تفتیش اور جسمانی ریمانڈ کے بعد اس جیل کو میری آخری آماج گاہ بنا دیا۔''

''اور پوجا سے ذرا احساسِ ندامت نہ ہوا؟'' شاہ زین نے پوچھا۔

''میں بھی اسی دن مر گیا تھا جان چکا تھا کہ اس وادی کی قسمت کا فیصلہ جب ایمان فروشوں کے ہاتھ میں رہے گا تب تک یہاں آزادی کا سورج طلوع نہیں ہو سکے گا۔'' مبین نے ڈوبتی آواز سے کہا۔

''آگے کی کہانی پوری دنیا جانتی ہے مجھے دو بار عمر قید کی سزا دی گئی ہے۔''

''اتنا بڑا دھوکا!'' پوری کہانی سن کر شاہ زین کا اندر تک ہل گیا تھا۔

کوئی کیسے کسی کی زندگی اور جذبات کے ساتھ کھلواڑ کر کے جی سکتا ہے۔ کشمالہ کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا، وہ باہر کشمالہ تھی مگر ایمان میں شاید پوجا تھی، دل و دماغ پر پوجا حاوی تھی۔

شاہ زین بوجھل دل و دماغ کے ساتھ مبین ملک کو آزادی کی نوید دے کر وہاں سے چلا گیا، مگر یہ مقدمہ اور مشن ناممکن حد تک نہ حل ہونے والے تھے کیونکہ بھارت اپنی پاکستان دشمنی اور تعصب کو جنگی جنون میں بدل چکا تھا۔ افواج پاکستان سے پے در پے محاذ آرائیوں اور جھڑپوں میں ناکامی اسے کشمیریوں اور مسلمان قیدیوں، مجاہدین پر مزید ظلم پر اکساتی۔ شاہ زین نے ہر ممکن حد تک کوشش کی۔ لیکن سال بعد ہی مبین ملک کو بھارت کی طرف سے پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔ آزادی کے متوالے کی آواز ظلم و تشدد سے دبا دی گئی۔ جیل کی سلاخوں کے پیچھے، بھارتی پولیس کے دیے ہوئے زخموں سے وہ مردِ مجاہد آخر کار آزادی کی سولی پر چڑھ کر امر ہو گیا۔

کشمیریوں کے حق میں اٹھائی گئی ہر آواز کو بھیانک طریقے سے کیفرِ انجام تک پہنچایا گیا۔

جب مبین ملک کی لاش کشمیر پہنچی، تو لاکھوں کشمیریوں کی آہوں اور سسکیوں سے وادی گونج اٹھی۔ ہر پہاڑ اور ہر درخت نے غم کی چادر اوڑھ لی۔

مظلوم کشمیریوں کو مبین ملک کی لاش کی صورت میں یہ واضح پیغام دیا گیا کہ ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والوں کا انجام ہمیشہ قربانی کی صورت میں ہوتا ہے۔

مگر تاریخ گواہ ہے۔ خونِ شہید رائگاں نہیں جاتا۔ وہی خون کبھی نہ کبھی آزادی کا گہرا رنگ لیے پوری وادی پر اسلام کے جھنڈے کے ساتھ لہرائے گا اور پورا جموں و کشمیر آزاد، پُرامن اور پُرسکون رہے گا۔

کشمیر ہو گا آزاد ایک دن انشاء اللہ.....

❖❖❖

خونی اضطراب

مظہر سلیم ہاشمی

آشنا کر مجھے اظہار کی تاثیر سے یوں
میں بھی اِک عشق کا قصّہ سرِقرطاس لکھوں

کہتے ہیں کہ محبت کبھی مرتی نہیں... چاہے وہ دسترس میں ہو یا دسترس سے باہر... محبت، محبت ہوتی ہے... جو دید کے ظاہری اسباب کے بِنا بھی قائم رہتی ہے... ایسی ہی ایک جاگتی محبت کا خونی قصّہ...

قربت کے آخری لمحوں کی لغزش جس میں خوف کی لکیر نہ تھی.....

قتل کے آلات تو بہت سے ہوتے ہیں لیکن جس چیز سے فلپ ایشر کا سر کچلا گیا تھا... وہ میرے پولیس کی دو دہائیوں سے زائد کی ملازمت میں دیکھی گئی اب تک کی سب سے بھیانک چیز تھی۔

وہ ایک کھوپڑی تھی..... ایک انسانی کھوپڑی۔

ایک انسان کو کھوپڑی کے وار کر کے ختم کر دیا گیا تھا..... اور وہ بھی اس کی کھوپڑی توڑ کر۔

ایڈورڈ کرین عرف ایڈ اور میں اس خون بھرے لوتھڑے

شے کو گھور رہے تھے۔ کھوپڑی کا یہ حصہ اب ریزہ ریزہ ہو چکا
اور مقتول کی لاش کے ایک طرف خون میں لت پت پڑا تھا۔
ظاہر ایسا لگتا تھا کہ وہ کھوپڑی پہلی یا دوسری ضرب پر ہی انڈے
کے چھلکے کی طرح چٹخ گئی تھی لیکن اتنا ہی کافی تھا کیونکہ اس ضرب
نے ایشر کی اپنی کھوپڑی بھی چکنا چور کر دی تھی۔ زخم کی گہرائی بتا
رہی تھی کہ وار بھرپور قوت سے کیا گیا تھا۔

میں نے اپنی نظریں وہاں سے ہٹائیں اور کمرے کا
جائزہ لینے لگا۔

یہ ایک کشادہ اور مردانہ وجود کی بُو لیے ہوئے، خوب
صورت مطالعہ گاہ تھی۔ اس خوب صورت مطالعہ گاہ کی دو
دیواریں چمڑے کی جلد والی کتابوں سے بھری ہوئی تھیں اور
تیسری دیوار پر قدیم میکسیکن اور وسطی امریکی فن پارے سجے
ہوئے تھے۔ مٹی کے برتن، مجسمے، لکڑی کی کندہ کاری اور ہتھیار
ان کے مالک کے ذوق کے عکاس تھے۔

وہاں ساگوان کی لکڑی کی دو میزیں اس طرح رکھی گئی
تھیں کہ ان کا رخ ایک دوسرے کی جانب تھا۔ ایک بڑی اور
لکھنے کی تھی جبکہ دوسری چھوٹی اور کام کے لیے تھی۔ ساتھ ہی
ساگوان کی لکڑی اور چمڑے سے بنا کچھ فرنیچر بھی موجود تھا۔

اصولی طور پر اسے ایک آرام دہ کمرا ہونا چاہیے تھا لیکن
میرے لیے ایسا نہیں تھا..... کتابوں اور آرٹ کے باوجود
وہاں ایک عجیب سی سرد مہری اور بیگانگی تھی جو کہ میرے جیسے
انسان کے وجود میں بھی پھریریاں لینے کا سبب بن رہی تھی۔

''میں اپنی آنکھوں سے یہ سب نہ دیکھتا، تو شاید مجھے
یقین نہ آتا۔'' کرین نے کہا۔

''ہاں.....'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس نے اپنے سر کے گنجے حصے پر ہاتھ پھیرا۔ ''خیر، اگر
تم فارغ ہو چکے ہو تو چلیں، میرا یہاں جی بھر گیا ہے۔''

''میرا بھی..... کب سے انتظار کر رہا تھا کہ تم یہاں سے
نکلنے کے بارے میں کہو۔'' میں نے اتفاق کیا۔

ہم وہاں سے چلتے ہوئے دوہرے دروازوں سے گزر
کر باہر راہداری میں آ گئے۔ اس کے دوسرے سرے پر ایک
ڈائیونگ روم تھا جہاں مزید ساگوان کا فرنیچر اور قدیم فن
پارے موجود تھے۔

وہاں گشت کرنے والے دو سپاہیوں میں سے ایک
دروازے کے پاس خاموش کھڑا تھا۔ دوسرا..... لیب کے عملے
کے کورونر کے انتظار میں باہر کھڑا تھا۔ وہ منتظر تھا کہ کب کورونر
اپنا کام ختم کرتا ہے۔

صوفے کے عین درمیان ڈگلس فالکنر اکڑا ہوا بیٹھا تھا۔
اس کے ہاتھ گھٹنوں پر سیدھے رکھے ہوئے تھے جبکہ
موٹے شیشوں کے پیچھے جھپکتی ہوئی کمزور نظر والی آنکھیں
صاف نظر آ رہی تھیں۔

وہ تقریباً چالیس سال کا ہوگا، دُبلا پتلا چہرہ جس میں
ٹھوڑی نہ ہونے کے برابر تھی اور سر پر مٹیالی رنگت کے بال
بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے سیاہ پتلون اور گہرے نیلے
رنگ کی قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ دیکھنے میں ڈرپوک اور بے ضرر
لگتا تھا لیکن آدھے گھنٹے پہلے اسی نے ہیڈ کوارٹر فون کر کے
فلپ ایشر کے قتل کا اعتراف کیا تھا۔ اس کی قمیص کی دائیں
آستین اور دائیں ہاتھ کی پشت پر جمے ہوئے خون کے دھبے
اس کے جرم کی گواہی دے رہے تھے۔

فالکنر اور ایشر کے بارے میں ہم صرف اتنا جانتے
تھے کہ مقتول اس گھر کا مالک تھا جبکہ فالکنر اس کا سیکریٹری تھا۔

یہ شہر کے ایک پوش علاقے میں واقع ہسپانوی طرز کا
ایک مہنگا والا تھا جس کی قیمت عام انسان کی سوچ سے بھی کئی گنا
اونچی تھی۔ قتل امیر لوگوں کے ہوں تو پولیس بھی بہت تیزی سے
حرکت میں آتی ہے اور اب بھی کچھ ایسے ہی حالات تھے۔

قتل کے وقت گھر میں کوئی اور موجود نہیں تھا۔

فالکنر کے الفاظ میں یہ جرم ''غصے کے ایک اندھے
لمحے'' میں سرزد ہوا تھا۔ ہمیں مقصد کا کوئی اندازہ نہیں تھا اور ہم
قتل کے لیے استعمال ہونے والے آلے کی نوعیت کے
بارے میں تو ذہنی طور پر بالکل تیار نہیں تھے۔

جب کرین اور میں اس کے پاس جا کر رکے تو فالکنر
مسلسل پلکیں جھپکا رہا تھا..... جیسے سب کچھ سامنے ہوتے
ہوئے بھی وہ کچھ نہ دیکھ پا رہا ہو۔ اس کی آنکھیں کمرے میں
کسی چیز کو دیکھتی ہوئی محسوس نہیں ہو رہی تھیں۔ وہ شاید جسمانی
طور پر ہی وہاں موجود تھا جبکہ اس کا دماغ کسی اور ہی دنیا کا مسافر
بنا ہوا تھا۔

''فالکنر.....'' میں نے آہستگی سے پکارا۔

مجھے لگا شاید وہ صدمے کی کیفیت میں ہے لیکن جب
میں نے اس کا نام پکارا تو اس کا سر جھٹکے سے اوپر اٹھا اور نظریں
مجھ پر جم گئیں۔

میں نے کہا..... ''کیا آپ ہمیں اس بارے میں بتانا
پسند کریں گے، فالکنر؟''

ہم اُسے اس کے قانونی حقوق سے پہلے ہی آگاہ کر
چکے تھے اور اس نے تفتیش کے دوران وکیل کی موجودگی کا حق
استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جو بھی بات
چیت ہو وہ بغیر کسی مددگار کے ہو سکے۔

''میں نے ایشر کو قتل کیا ہے۔'' اس نے کہا۔

میں نے کرین کی جانب دیکھا لیکن وہ فالکنر کو گہری نگاہوں کے ساتھ تول رہا تھا۔

''میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں.....'' فالکنر نے تیزی سے کہا۔ ''پہلے میں نے سوچا تھا کہ اس بات کو چھپالوں اور ایسا ظاہر کروں کہ یہ کسی چور کا کام ہے جس نے چوری کے دوران مزاحمت پر ایشر کا خاتمہ کر دیا..... لیکن میں جھوٹ بولنے کا ماہر نہیں ہوں..... حالانکہ میں نے اس کی بہت مشق کی ہے۔ اس کے علاوہ..... مم..... میں.....''

وہ ایک لمحے کے لیے ہچکچایا۔ ''مجھے اب اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ میرے ساتھ کیا ہوتا ہے۔''

''تم نے اسے کیوں مارا؟'' کرین نے پوچھا۔

فالکنر نے تیزی سے نفی میں سر ہلایا۔

یہ جواب دینے سے انکار نہیں تھا بلکہ شاید وجہ بیان کرنے میں ہچکچاہٹ یا ناکامی تھی۔ ہمیں دیر سویر اس سے اگلوا ہی لینا تھا، اس لیے زبردستی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا چنانچہ فی الحال اس سوال کو موقوف کر دیا۔

میں نے پوچھا..... ''وہ کھوپڑی ہی کیوں، مسٹر فالکنر؟ تمہیں ایسی چیز ملی کہاں سے؟''

اس نے اپنی آنکھیں بند کیں اور کچھ دیر تک ایسے تاثرات کے ساتھ بیٹھا رہا جیسے جواب سوچ رہا ہو۔

پھر اچانک آنکھیں کھولتا ہوا بولا۔ ''ایشر اسے اپنی میز کے پیچھے شیلف پر رکھتا تھا۔ وہ میز پر ہی بیٹھا تھا جب میں نے..... جب میں نے یہ سب کیا۔''

''وہ اپنے اسٹڈی روم میں سب کے سامنے ایک انسانی کھوپڑی رکھتا تھا؟'' کرین کا لہجہ بے یقینی سے بھرا تھا۔ ''آخر کس لیے؟''

''اس کی حسِ مزاح بہت بھیانک تھی..... وہ دعویٰ کرتا تھا کہ اسے دیکھنے والوں کے ردِعمل سے لطف آتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ یہ اس کی ''میمنٹو موری'' (Memento Mori) ہے۔'' فالکنر نے جواب دیا۔

''اس کا کیا.....؟''

''موت کی یادگار موت کی نشانی.....'' فالکنر نے وضاحت کی اور میمنٹو موری کا مطلب بتایا۔

''یہ تو مجھے کافی مریضانہ ذہنیت لگتی ہے۔'' کرین کہے بغیر نہ رہ سکا۔

''فلپ ایشر ایک نڈر اور سنگدل انسان تھا۔ موت اسے ذرا بھی پریشان نہیں کرتی تھی۔ ایک لحاظ سے، یہی اس کی زندگی تھی..... اس نے اپنی زندگی مُردوں کے لیے وقف کر رکھی تھی۔''

کرین اور میں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ''بہتر ہوگا کہ تم اس کی وضاحت کرو۔'' میں نے کہا۔

''وہ ایک ماہر بشریات تھا..... اور کوئی معمولی نہیں بلکہ کافی مشہور قسم کا ماہر تھا.....'' فالکنر نے بتایا اور پھر خاموش ہو گیا۔

''ہم سن رہے ہیں۔'' میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

''اس نے مایا تہذیب اور ایزٹیک نسلوں پر کئی کتابیں لکھی تھیں..... اور کولمبس کی امریکا آمد سے پہلے کے حالات اور واقعات کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ ان معاملات میں مہارت رکھنے والے مختلف یونیورسٹی کے شعبوں میں بطور لیکچرر اور کنسلٹنٹ اس کی بہت مانگ تھی۔ اکثر تو وہ ان پر مقالات لکھنے میں مصروف رہا کرتا تھا۔

''تم اس کے کل وقتی سیکریٹری تھے، کیا یہ درست ہے؟''

''ہاں۔ میں تحقیق میں اس کی مدد کرتا تھا.....'' فالکنر نے تفصیل بتائی۔ ''میں یوکاٹن، میکسیکو اس کے ساتھ گیا تھا اور اس کے بعد وسطی امریکا کے دیگر حصوں میں اس کے ساتھ مہمات پر جاتا رہا تھا..... میں اس کے نوٹس ترتیب دیتا تھا..... اس کی کتابوں کے مسودے اور کاروباری خط و کتابت کو ٹائپ کرتا تھا۔''

''تم کب سے اس کے لیے کام کر رہے تھے؟''

''پچھلے آٹھ سال سے۔''

''کیا تم یہیں رہتے رہے ہو؟''

''ہاں، اسی مکان کے جنوبی حصے میں میرے لیے ایک کمرا مختص ہے۔''

''کیا اس گھر میں کوئی اور بھی رہتا ہے؟''

''نہیں..... کئی سال پہلے جب اس کی بیوی اسے چھوڑ کر گئی تو ایشر نے دوسری شادی نہیں کی۔''

''کیا اس کا کوئی قریبی رشتے دار نہیں تھا۔''

''نہیں.....''

کرین نے پوچھا۔ ''کیا تم نے اس کے قتل کا پہلے سے منصوبہ بنایا تھا؟''

''میرا آج اسے مارنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا.....''

''کیا مطلب؟''

اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں نے کوئی پلاننگ کی تھی تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔''

''تو پھر کیا تم دونوں کے درمیان کوئی جھگڑا ہوا تھا؟''

''نہیں، کوئی جھگڑا بھی نہیں ہوا.....''

"تو پھر کس چیز نے تمہارے اندر یہ خونی غصہ بھڑکایا؟" میں نے سوال کیا۔

اس نے جواب دینے کے بجائے سر ہلانا شروع کر دیا۔۔۔ ایک عجیب سی بے تابی اس کی حرکات و سکنات میں ظاہر ہونے لگی تھی اور آنکھیں یکلخت ہی ویران ہو گئی تھیں۔ کچھ دیر تک تو وہ ایسے جذب کے عالم میں جھولتا رہا اور پھر بے جان ہو کر پیچھے کی جانب گر گیا۔

اس کی آنکھیں دوبارہ کسی ایسی چیز کو دیکھ رہی تھیں جو کمرے میں موجود ہی نہیں تھی۔

یہ کیفیت تھوڑی دیر برقرار رہی اور جب اس کے حواس قدرے بہتر ہوئے تو وہ بولا۔ "یہ ایک۔۔۔ اعتراف تھا۔"

"اعتراف؟"

ایک سرد آہ اُس کے منہ سے خارج ہوئی۔ میں نے اس کی گفتگو میں دخل اندازی کرنے کے بجائے کچھ دیر انتظار کرنا مناسب سمجھا۔

"مجھے کل ایک دوسرے ماہرِ بشریات کا خط ملا جسے میں ایشر کے ذریعے ملا تھا۔"

اس نے چند لمحوں کے توقف کے بعد پھر سے اپنی بات کا آغاز کیا۔ "اس نے مجھے کافی زیادہ تنخواہ پر اپنا ذاتی سیکریٹری بننے کی پیشکش کی۔ میں نے اس کی پیشکش پر سنجیدگی سے غور کیا، اور آج صبح ہی فیصلہ کیا کہ میں اسے ٹھکرا نہیں سکتا۔ لیکن جب میں نے ایشر سے اس بارے میں بات کی، تو اس نے میرا استعفیٰ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔۔۔ اس نے کہا کہ اگر میں اس کی ملازمت یا اس کے گھر میں نہیں رہوں گا تو وہ میری مسلسل خاموشی اور وفاداری کے حوالے سے پُر یقین نہیں رہ سکتا۔۔۔ اس نے مجھے یہیں رہنے اور رکنے کا حکم دیا۔ اس نے کہا کہ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو وہ میرے خلاف سخت اقدامات کرے گا۔۔۔"

"ایک منٹ رکو۔" میں نے ٹوکا۔ "کس چیز کے بارے میں تمہاری مسلسل خاموشی؟"

"ایک واقعہ جو چھ سال پہلے پیش آیا تھا۔۔۔"

"کون سا واقعہ؟"

وہ کئی سیکنڈ تک کچھ نہیں بولا۔۔۔ کمرے میں ایک تکلیف دہ قسم کا سکوت پھیل گیا۔

پھر اس نے تھوک نگلا اور کہا۔ "پونٹرین جھیل پر ایشر کے سرکاٹیج میں اس کی بیوی اور اس کی بیوی کے آشنا کی موت۔"

ہم دونوں اُسے گھورنے لگے۔

کرین نے کہا۔ "تم نے ہمیں کچھ منٹ پہلے بتایا تھا کہ اس کی بیوی اسے چھوڑ کر گئی تھی۔۔۔ یہ نہیں کہ وہ مر چکی ہے۔"

"کیا میں نے ایسا کہا تھا؟" فالکنر نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ "ہاں، شاید میں نے کہا ہو۔۔۔ میں نے یہی جھوٹ، بالکل اسی انداز میں اتنی بار بولا ہے کہ یہ ایک خودکار عمل بن گیا ہے۔ ملڈرڈ اور اس کا عاشق جھیل پونٹرین پر مر گئے تھے۔۔۔ یہی سچ ہے۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ کیسے مرے؟" کرین نے سوال کیا۔ اس کے لہجے میں نرمی ہی نرمی تھی۔

"دم گھٹنے سے۔۔۔" اس نے بتایا۔

کرین اور میں نے اسے موقع دیا کہ وہ عجلت کا شکار ہوئے بغیر ہمیں اس واقعے کی مکمل تفصیل بتا سکے۔

"یہ چھ سال قبل کی بات ہے۔۔۔ ستمبر کا مہینہ تھا اور ہفتے کا روز تھا۔۔۔ اس صبح ایشر نے اچانک اپنے گرمائی کاٹیج میں کچھ دن گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ جو کتاب لکھ رہا تھا، اس میں رکاوٹ آ رہی تھی۔ وہ اُلجھن کا شکار ہو گیا تھا اور اسے لگا کہ ماحول کی تبدیلی اس حوالے سے مددگار ثابت ہوگی۔ وہ آٹھ بجے اکیلا وہاں گیا۔۔۔ مجھے کچھ کام نمٹانے تھے اس لیے میں اپنی گاڑی میں کوئی ایک گھنٹے بعد اس کے پیچھے گیا۔ جب میں کاٹیج پہنچا تو میں نے ایشر کو لاشوں کے ساتھ پایا۔۔۔ وہ دونوں بستر میں لاشوں کی صورت میں موجود تھے۔۔۔ ملڈرڈ، جسے لاس اینجلس میں اپنی کسی دوست کے ہاں ہونا چاہیے تھا مردہ حالت میں تھی۔۔۔ اور وہ آدمی۔۔۔ اسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، بعد میں پتا چلا کہ وہ ایک آوارہ مزاج گلوکار تھا۔"

فالکنر نے اپنی بات کے درمیان میں ایک وقفہ لیا اور پھر تھوک نگلتے ہوئے گویا ہوا۔ "وہ دونوں برہنہ تھے۔"

"جب تم اندر گئے تو ایشر نے کیا کہا؟" میں نے سوال کیا۔

"یہی کہا کہ اس نے انہیں ایسی ہی حالت میں پایا تھا۔ ایشر نے مجھے بتایا کہ جب وہ وہاں پہنچا تو کاٹیج گیس سے بھرا ہوا تھا۔۔۔ اس نے کھڑکیاں کھول کر ہوا کا انتظام کیا۔ بیڈروم میں ایک خراب گیس ہیٹر کی وجہ سے یہ المناک حادثہ پیش آیا تھا۔"

"کیا تم نے اس بات پر یقین کر لیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ میں شک میں تھا۔" فالکنر نے اعتراف کیا۔

''میں ہمیشہ یہی سمجھتا تھا کہ ملڈرڈ جیسی خاتون بے وفائی جیسی گھٹیا چیز سے بہت بلند ہے۔ وہ خوب صورت تھی..... دلکش و دل آویز..... لیکن ہمیشہ اتنی ہی خاموش، اتنی ہی باوقار بھی.....''

اس کے انداز میں ایک عجب سی عقیدت تھی۔

''اس جیسا کوئی بھی نہیں تھا۔ ملڈرڈ کے انگ انگ سے کسی دیوی کا نور پھوٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا.....'' وہ کسی دیوانے کے انداز میں بات کر رہا تھا جیسے ملڈرڈ کوئی عام عورت نہیں تھی بلکہ پوجنے کے قابل شخصیت تھی۔

''کیا ایشر بھی سکتے میں تھا؟'' میں نے اسے ٹوکنا مناسب سمجھا کیوں کہ وہ اصل بات سے ہٹ رہا تھا۔

''وہ بھی صدمے میں لگ رہا تھا.....'' فالکنر نے کہا۔ ''لیکن وہ کافی پُرسکون تھا۔ جب میں نے حکام سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا تو وہ اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔''

فالکنر کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''ایشر نے مجھ سے کہا..... اسکینڈل کے بارے میں سوچو..... اس کی ساکھ اور کیریئر کو ہونے والے ممکنہ نقصان کے بارے میں بھی کچھ خیال کرو۔''

''میں نے ایشر سے پوچھا کہ ہم اور کیا کر سکتے ہیں؟''

''اس کا جواب کیا تھا؟'' کرین نے پوچھا۔

''اس نے اپنے اسی سرد، حسابی انداز میں مشورہ دیا کہ ہم لاشوں کو ٹھکانے لگا دیں، انہیں جھیل پر کہیں دفن کر دیں۔ پھر ہم ملڈرڈ کی گمشدگی کی وضاحت کے لیے کوئی کہانی گھڑ لیں گے، کہہ دیں گے کہ وہ گھر چھوڑ کر بوسٹن واپس چلی گئی ہے، جہاں وہ پیدا ہوئی تھی۔ اس کا اصرار تھا کہ کوئی اس وضاحت پر سوال نہیں اٹھائے گا، کیونکہ اس کی اپنی ساکھ کی وجہ سے اس کے اور ملڈرڈ کے بہت کم قریبی دوست تھے اور..... سامنے کی بات تھی جو کچھ ہوا تھا، وہ صحیح تھا۔ قدرت نے خود ہی ملڈرڈ کو اس کی بے وفائی کی سزا دے دی تھی۔''

''تو تم نے اس جرم کی پردہ پوشی میں اس کا ساتھ دیا؟''

''مجھے یہ جرم لگا ہی نہیں..... اور دوسری بات..... میرے پاس کیا کوئی اختیار تھا؟''

میں اور کرین اسے خاموشی سے دیکھتے رہے تاکہ وہ اپنی بات کی وضاحت کر سکے۔

''میں کوئی طاقتور آدمی نہیں ہوں..... اور اُس وقت میں ایشر اور اس کے فیصلے کا احترام کرتا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا، میں سکتے میں تھا۔ ہاں، میں نے اس کا ساتھ دیا۔ میں نے لاشوں کو ایک میل دور ایک پہاڑی ٹیلے تک منتقل کرنے میں ایشر کی مدد کی، جہاں ہم نے انہیں پتھروں کے ڈھیر کے نیچے دفن کر دیا۔''

''تو چھ سال تک تم نے اس راز کو سینے میں چھپائے رکھا آج تک.....'' کرین نے کہا۔ ''جب تک کہ آج صبح کچھ ہو نہیں گیا۔''

''ہاں.....''

''تمہارا منہ بند رکھنے کے لیے ایشر نے تمہیں دھمکایا تھا۔'' کرین نے سوال کیا تو فالکنر کا سر اثبات میں ہلنے لگا۔

''کیا وہ کہتا تھا کہ اگر تم نے ملازمت چھوڑنے کی کوشش کی..... تو وہ تمہاری جان لے لے گا؟''

فالکنر اب بھی کچھ نہیں بولا لیکن اس کی آنکھوں میں اقرار واضح دکھائی دے رہا تھا۔

''کیا وہ جسمانی نقصان کی دھمکیاں تھیں؟'' اب کی بار میں نے پوچھا تو فالکنر نے پھر سے اثبات میں سر ہلایا۔

''اس نے کہا کہ وہ مجھے مار ڈالے گا۔''

''کیا چھ سال پرانی دو حادثاتی اموات کے بارے میں تمہاری خاموشی یقینی بنانے کے لیے یہ بہت سخت ردِعمل نہیں ہے؟''

''ہاں.....'' میں نے بھی اس سے یہی کہا۔

''اور کچھ.....؟''

''اس نے مجھے سچ بتا دیا۔'' فالکنر نے کہا۔

''کیسا سچ؟''

''یہی کہ اس کی بیوی اور اس کا عاشق حادثاتی طور پر نہیں مرے تھے؟''

''پھر.....؟''

''پھر یہی کہ اُس نے انہیں قتل کیا تھا؟''

''تو ایشر نے تمہارے سامنے قتل کا اعتراف کر لیا؟''

''بالکل.....'' فالکنر نے بتانا شروع کیا۔ ''اس نے انہیں بستر میں ایک ساتھ پایا..... بالکل زندہ۔ وہ سب کرتے ہوئے جو وہ اپنی بیوی سے چاہتا تھا لیکن وہ اس کی خواہشات کا احترام نہیں کرتی تھی۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''ایشر کی بھاری انا مجروح ہوئی تھی..... یہ گناہ ناقابلِ معافی تھا اور اس کی سزا ملنی چاہیے تھی۔ فلپ ایشر ایسا ہی تھا..... اس نے اپنے حکموں سے ان دونوں کو بے ہوش کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں لاشوں کو غور سے دیکھتا تو مجھے ان کے چہروں اور جسم پر چوٹ یا نشانات نظر آ جاتے، لیکن اپنی پریشانی کے عالم میں، میں نے کچھ نوٹس نہیں کیا۔ پھر اس نے ایک تکیے

سے اُن کا دم گھونٹ دیا۔"

"یہ سب بھی ایشر نے تمہیں بتایا تھا؟"

"ہاں..... لیکن اس سے پہلے کہ وہ لاشوں کو اکیلے ٹھکانے لگاتا، میں وہاں پہنچ گیا..... اس کے پاس کوئی چارہ نہ رہا تو اس نے خراب گیس ہیٹر والی کہانی گھڑ لی۔ اگر میں اس کی بات پر یقین نہ کرتا..... اور میں اس کی مدد نہ کرتا..... تو وہ مجھے بھی وہیں اسی وقت مار ڈالتا۔"

"کیا اس نے تمہیں یہ بھی بتایا تھا؟"

"ہاں....." اس کی آواز میں افسردگی نمایاں تھی۔

"تو جب تمہیں پتا چلا کہ تم گزشتہ چھ سال سے ایک قاتل کے لیے کام کر رہے ہو کہ اس نے تمہیں دھوکے میں رکھ کر تمہارا استعمال کیا ہے تو تمہیں غصہ آ گیا۔" کرین اب کیس کو ختم کرنے کے لیے فالکنر کو ایک ڈھب پر لا رہا تھا۔

"اس نے تمہیں فریب میں رکھا کہ تم نے ایک سفاکانہ دوہرے قتل پر پردہ ڈالنے میں مدد کی ہے، تو تم اپنا کنٹرول کھو بیٹھے اور وہ کھوپڑی اٹھا کر اس کا سر کچل دیا؟" میں نے بھی کرین کی مدد کا فیصلہ کرتے ہوئے کچھ الفاظ فالکنر کے منہ میں ڈالنے کی کوشش کی۔

"نہیں....." فالکنر نے کہا۔

"کیا مطلب..... نہیں؟" میں اور کرین ایک ساتھ بولے۔

"نہیں، بالکل ایسا نہیں ہوا تھا۔ مجھے اس کے اعتراف اور اس پورے گھناؤنے معاملے میں اپنے کردار سے گھن آ رہی تھی..... مجھے اس سے نفرت ہو گئی تھی اور میں اس پر پلٹ کر وار کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں کوئی متشدد آدمی نہیں ہوں۔"

"تو پھر یہ سب کیوں؟"

"یہ اس کا دوسرا اعتراف تھا جس نے مجھے وہ سب کرنے پر مجبور کیا جو میں نے کیا۔"

"اور یہ دوسرا اعتراف کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ایک اور کام جو اس نے قتل کے ایک سال بعد کیا تھا....."

"کیا کام؟" کرین بھی میری طرح اب بے چین ہو رہا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ اُس نے مجھے اس کے بارے میں کیوں بتایا؟" فالکنر کے لہجے سے بے بسی اور اداسی بیک وقت عیاں ہو رہی تھی۔

اب کی بار میں نے اور کرین نے اسے ٹوکنے کی کوشش نہیں کی۔

"وہ پاگل تھا..... سوائے اس بات کے کہ وہ بالکل پاگل تھا وہ کیسے مجھے یہ سب بتا سکتا تھا؟" فالکنر نے ایک بے رونق ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "ایک لعنتی اور پاگل مُردہ خور شخص تھا وہ۔"

"پاگل مُردہ خور.....؟" میں اچھل کر رہ گیا۔

"یہ بات کتنی مضحکہ خیز لگتی ہے، ہے نا؟" فالکنر نے ہم دونوں کے چہرے پر چھائی دہشت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "کسی پرانی بیلا لوگوسی فلم کی طرح۔ لیکن ایشر ایسا ہی تھا..... ہمیشہ مُردوں کے درمیان گھسا رہتا۔"

"مسٹر فالکنر....." کرین نے ایک لرزتی سانس لی لیکن اس سے زیادہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

"ایشر کی وہ "میمینٹو موری" یعنی موت کی نشانی میکسیکو سے نہیں آئی تھی..... جیسا کہ میں ہمیشہ یقین کرتا رہا....." فالکنر کا لہجہ مزید بوجھل ہو گیا تھا۔ "وہ پونٹرین جھیل کے اسی پہاڑی ٹیلے سے آئی تھی....."

کمرے میں اب بس فالکنر کی آواز ہی گونج رہی تھی..... ہم دونوں کو جیسے ان انکشافات پر سانپ سونگھ گیا تھا۔

"میں نے اُسے مار ڈالا....." فالکنر کا لہجہ اب ہذیانی سا ہو گیا تھا۔ "اس کی تباہی کے لیے سب سے موزوں ہتھیار استعمال کرتے ہوئے..... میں نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا..... جب اُس نے مجھے بتایا کہ میں ان تمام سالوں میں اس کے اسٹڈی روم میں کام کرتا رہا..... اُس کی بیوی کی کھوپڑی ہمارے درمیان موجود رہی تھی۔ ان تمام سالوں میں..... واحد عورت..... جس سے میں نے کبھی محبت کی تھی..... اس کی کھوپڑی کے ساتھ....."

"تو.....؟" کرین نے بمشکل سوال کیا۔

"بے وفائی پر غصہ کرتے ہوئے وہ جذبات پر قابو نہ پاتے ہوئے سلڈرڈ کو مار چکا تھا، یہ بات میں قبول کر بھی لیتا لیکن یہ کیسے قبول کر سکتا تھا کہ وہ اس کی لاش کی اس طرح بے حرمتی کرے؟"

"صحیح..... پھر.....؟"

"پھر میں نے ایشر کو مار ڈالا..... اسی کھوپڑی کے ذریعے اور وہ..... وہ اس کے کاندھے کے پیچھے سے مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی..... میں نے اس کا انتقام لے لیا تھا اور وہ مجھے اس بات پر سراہ رہی تھی..... میری پرستش کو میری دیوی نے قبول کر لیا تھا۔"

کرین اور میں گہری سانس لے کر رہ گئے.....

❖❖❖

سحر طراز

عائشہ نصیر

انجان لوگوں کی مدد کے لیے بہت کم لوگ تیار ہوتے ہیں... فی زمانہ کم حیثیت افراد کی مدد کے لیے مختلف ادارے وجود میں آچکے ہیں... جو احسن طریقے سے اپنا کردار ادا کر رہے ہیں... ان جگہوں پر مثبت اندازِ فکر رکھنے والوں کے ساتھ ساتھ کچھ بدنیت افراد بھی ہیں جو جائز حق دار سے اس کا حق چھین رہے ہیں...

ایک سحر طراز کی پُراسرار آمد و رفت..... خواب زدہ حقیقت کا اظہار.....

نینا نے ایک کونے والی میز چُنی تھی۔ ہال کی چمکتی دمکتی روشنیوں سے خاصی دور..... جہاں لوگوں سے ٹکرا کر نکلتی کرنیں آنکھوں میں نہ چبھتیں۔ اسی اثنا میں اس کا نیم لیڈر، آری، چلا آیا۔

''میرے پلّے ہی نہیں پڑ رہا کہ وہ بندہ شیشے کی پوری چادر کے بیچ سے کیسے گزر گیا۔'' آری نے ساتھ والی کرسی پر دھم سے بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ جو سارا دن ویگاس کے کھلے آسمان تلے لاؤنج چیئر پر پڑے رہنے کا نتیجہ تھا۔

نینا نے کوک کا ایک گھونٹ لیا اور تبصرہ کرنے سے احتراز کیا۔

''مجھے تو وہ والا بندہ اچھا لگا جو خالی گتے کی نلیوں کے نیچے سے شراب کی بوتلیں نکالتا جا رہا تھا۔''

''بوتلیں نکالنے کی بات آئی ہے تو.....'' آری نے ویٹریس کی تلاش میں نظر دوڑائی، اس کی موٹی گردن پر بڑا سا سر ایسے گھوم رہا تھا جیسے ریڈار لگا ہو۔ اتنے میں سیاہ لباس

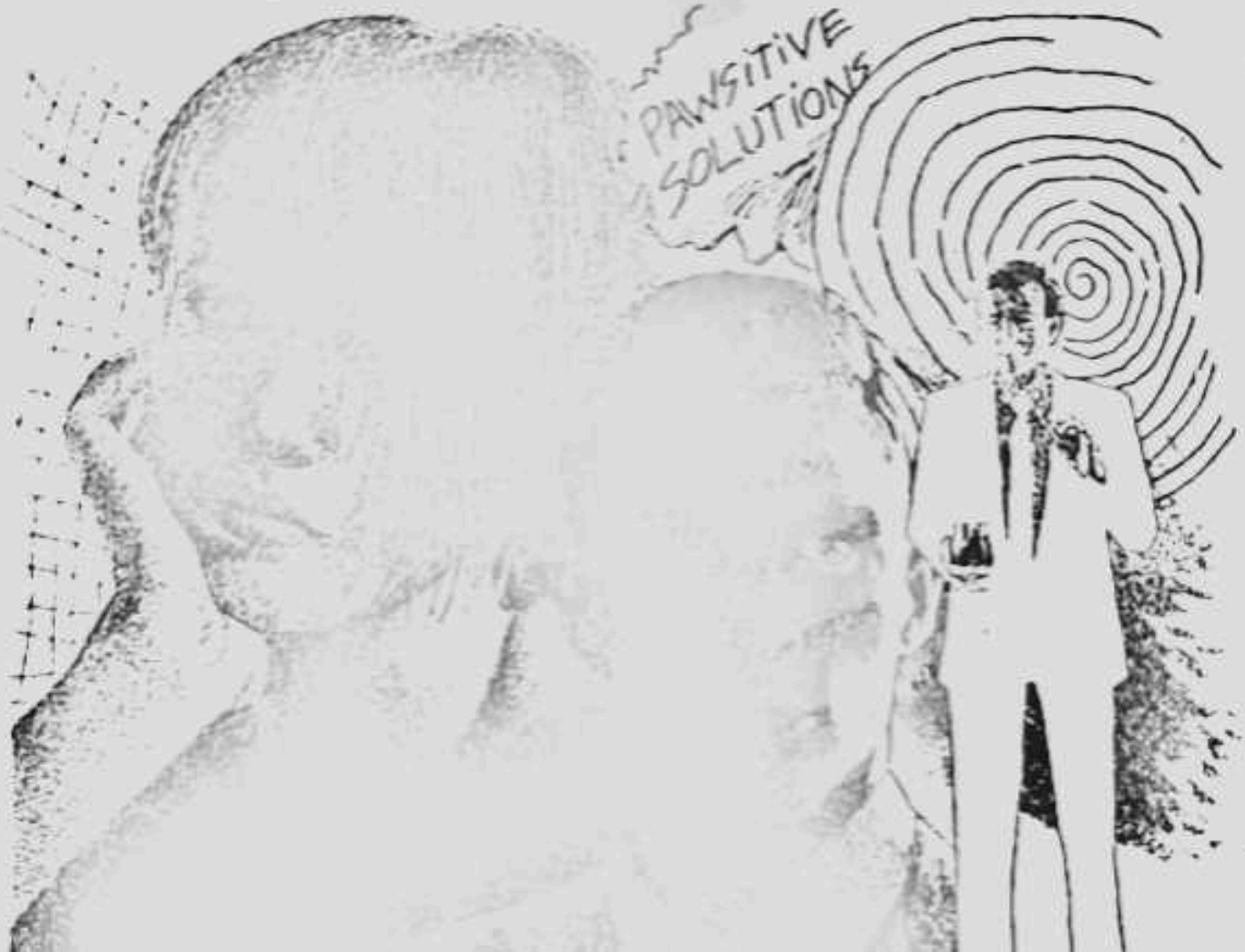

میں ملبوس ایک نوجوان لڑکی قریب آئی، آری نے فوراً اسے آرڈر دے دیا۔

نوجوانی میں آری نے جرم کو ہی اپنا کیریئر بنانے کی ٹھانی تھی۔ ایڈرال بیچتا رہا، جعلی چیک چلائے، گاڑیاں اڑائیں۔ اٹھارہ کا ہوا تو آخرکار پکڑا گیا۔ جج نے اسے دو ٹوک آپشن دیا۔ جیل یا فوج۔ اس نے فوج جوائن کر لی، جہاں میڈک کی تربیت حاصل کی۔ کچھ عرصے بعد بے عزتی کے ساتھ ڈسچارج ہوا تو میڈیکل کنسلٹنگ کی دنیا میں آنکلا اور پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

نیتا اپنے خاندان کی وہ پہلی لڑکی تھی جس نے یونیورسٹی کا دروازہ عبور کیا تھا۔ پہلے بیچلرز، پھر میڈیکل اسکول۔ اور اس کے ساتھ ہی قرضوں کا ایسا انبار، جو سانس لینا دشوار کر دے۔

اسی بوجھ کے خوف نے اسے مجبور کیا کہ بچوں کے شعبے میں ریزیڈنسی کچھ عرصے کے لیے ملتوی کر دے اور چند برس پورا وقت کام میں جھونک دے۔

جلد ہی اس پر ایک اور کڑوا سچ منکشف ہوا۔ میڈیکل اسکول سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ اپنے نام کے ساتھ ''ڈاکٹر'' ضرور لگا سکتی تھی مگر عملی طب کے دروازے اس پر بند تھے۔ انتخاب چند گنے چنے راستوں تک محدود تھا اور وہ انہی کے حصار میں قید ہو گئی۔

آخرکار وہ ایک نجی انشورنس کمپنی میں آ بیٹھی۔ یہاں نیتا کا کام شفا کی اُمید بن کر آنے والی درخواستوں پر مہر لگانا تھا۔ کبھی منظوری کی، کبھی انکار کی۔ یہ درخواستیں اُن مریضوں کی ہوتیں جو مہنگے علاج یا نئی دوا کے لیے آخری سہارا ڈھونڈتے تھے۔ مگر اس دفتر میں فیصلے انسان نہیں کرتے تھے، اُصول کرتے تھے۔ اگر علاج مہنگا ہوا، نیا ہوا، یا کمپنی کے بنائے ہوئے سانچوں میں نہ سما سکا، تو فائل بند۔

ہر کیس کے لیے وقت مٹھی بھر لمحوں جتنا تھا۔ زندگیوں کی کہانیاں چند سطروں میں سمٹ جاتیں۔ نہ ٹھہراؤ، نہ مشورہ، نہ دل کی نرمی۔ رفتہ رفتہ انکار ایک عادت بن چکا تھا۔ ایسی عادت جس میں انسانیت کہیں پیچھے رہ جاتی تھی۔

شروع کے چند مہینے نیتا نے اعتراض کرنے کی کوشش کی تھی مگر آری نے کہا: ''یہ کوئی فلاحی ادارہ نہیں ہے۔ یہاں سب کچھ منافع کے گرد گھومتا ہے۔'' اور منافع خوب ہو رہا تھا۔ حصص رکھنے والے خوش تھے، ملازمین کی تنخواہیں اور مراعات دل کھول کر دی جاتی تھیں۔

نیتا نے اس کے بعد کچھ نہیں کہا۔ وہ جانتی تھی کہ قرض اتارنے کے لیے اس کے پاس اس وقت کوئی اور راستہ نہیں۔ سچ تو یہ تھا کہ یہ ادارہ باقی سب سے مختلف بھی نہیں تھا۔ وہ کیا کرتی؟ نظام کے خلاف کھڑی ہو جاتی؟

اس کے بجائے اس نے سامنے بیٹھی درکر سے پوچھا کہ وہ روز آنے والی درخواستوں کے اس سیلاب سے کیسے نمٹتی ہے۔ روبی بے رحم مہارت کے ساتھ اپنا کام نمٹا لیتی، دوپہر تک سب ختم کر کے اپنی شامیں ورزش، خریداری اور خود پر خرچ کرنے کے لیے بچا لیتی۔ ''ہدف پورا کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ پہلے ہی مان لو ہر درخواست رد ہونی ہے۔ پھر کاغذات پر ایک سرسری نظر ڈال لو، شاید کوئی چیز رائے بدل دے۔'' روبی نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

نیتا کبھی تیز پڑھنے والوں میں شامل نہیں رہی تھی۔ اس کے لیے یہ طریقہ بھی قیمتی لمحے نگل جاتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی ایک اور عادت بنا لی۔ وہ ہر فائل میں صرف غیر معمولی چیز ڈھونڈتی۔ اگر پہلے ایک منٹ میں اسے معمول سے ہٹ کر کچھ نہ ملتا، تو وہ بنا رُکے اگلے صفحے پر بڑھ جاتی۔ الفاظ ایک جیسے لگتے، دعوے ایک جیسے، اور انجام بھی۔

چھ مہینے گزرے تو اسے غیر متوقع انعام ملا۔ کچھ عرصے بعد زندگی نے کروٹ بدلی۔ وہ چھوٹا سا اور گندہ اپارٹمنٹ پیچھے رہ گیا۔ اب سمندر کی سمت کھلتی کھڑکیاں تھیں، دروازے پر باوردی دربان، اور ایک ایسی زندگی جو کبھی اس نے خوابوں میں بھی نہیں سوچی تھی۔

پانچ برس بعد وہ ان لوگوں میں شمار ہونے لگی جنہیں مثال بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اس کی زندگی میں ہفتہ وار آرام، بے فکری، اور سفر شامل ہو چکے تھے ایسے سفر جن کے لیے سرحد پار کرنا پڑتی ہے۔ قرض ایک پرانا لفظ بن چکا تھا اور بچوں کے شعبے میں واپس جانے کا خیال بھی دھند میں کھو گیا تھا۔ واپس جا کر کیا ملتا؟ پھر سے بوجھ، پھر سے رکاوٹیں؟ نہیں۔ اس کی کشتی کو موافق ہوا مل چکی تھی اور وہ رخ بدلنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

کبھی کبھار ضمیر کی لہریں ضرور اٹھتیں مگر اس کے ہاتھ کی گرفت مضبوط رہتی۔

ایک بار ایک ڈاکٹر نے غصے میں آفس فون کیا۔ اس کی آواز میں ایسی سرد مہری تھی جو اس کی ریڑھ کی ہڈی میں اُتر گئی۔ وہ اس کا اصل نام پوچھ رہا تھا۔ یہ کہہ کر کہ جب اس کا کم عمر مریض مرے گا تو وہ گھر والوں کو ذمے دار کا نام بتانا چاہتا ہے۔ نام چھپانا معمول تھا، مگر نیتا کے منہ سے اس لمحے سچ نکل گیا۔ فون رکھنے کے بعد اس نے اس ڈاکٹر کا نام خاص نشان کے ساتھ یادداشت میں ڈال دیا۔ اب اس کی

ہر بات مزید کڑی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

ایک اور دن اسے کسی موت کی تعزیتی خبر نظر آئی۔ ایک عورت، جس کا کیس کچھ وقت پہلے اس کے سامنے آچکا تھا اور نینا نے اس پر بھی انکار کی مہر ثبت کی تھی۔ وہ عورت محض کوئی مریض نہیں تھی وہ ایک نام تھی، ایک پہچان، بچوں کے لیے مفت علاج کا خواب دیکھنے والی۔ نینا کو یہ تب معلوم ہوا جب سب ختم ہو چکا تھا۔ اس نے خود کو سمجھایا کہ تاخیر اس کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی، اس کی درخواست نینا کی جگہ کسی اور کے پاس گئی ہوتی تو وہ بھی یہی کرتا۔ اور پھر اس نے یہ خیال بھی فائلوں کے ساتھ بند کر دیا۔

''لو، کچھ بلو پیو!'' آری نے گلاس بھرتے ہوئے میز پر سرکایا۔

سالانہ تقریب اس ادارے کا پسندیدہ تحفہ تھی۔ عالیشان کمرے، لذیذ کھانے، آرام اور تفریح کے اس میلے میں حقیقت کہیں پیچھے رہ جاتی تھی۔ جادو کے کرتب ہر طرف تھے۔ چیزیں غائب ہو رہی تھیں، حیرت آنکھوں میں جم جاتی تھی۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں نینا نے نہ صرف چیزیں، بلکہ شاید خود کو بھی کہیں غائب ہوتے محسوس کیا تھا۔

آری نے اپنا گلاس دوبارہ بھرا۔ ''میں نے بتایا تھا اگلے مہینے پیف جا رہا ہوں۔''

نینا آدھی توجہ سے آری کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ پہاڑوں پر چڑھنے کے قصے سنا رہا تھا۔ اس نے جو ناچوز منگوائے تھے، تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ نینا نے پلیٹ پر بکھرے چپس کے ذروں پر انگلی رکھی اور اسے زبان سے لگا لیا۔ بھوک ابھی باقی تھی۔

''اور پھر ہمیں اندھیرے میں ہی نیچے اترنا پڑا۔''

آری خاموش ہوا تو نینا کو احساس ہوا کہ اب اسے کچھ کہنا چاہیے۔

''یہ تو بہت خطرناک ہے، ہے نا؟'' اس نے کہا۔

آری نے کندھے اچکائے۔ ''ہر سال چند لوگ مر ہی جاتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں سکون تھا۔

نینا نے منہ بنایا۔ ''اتنا خطرہ کوئی کیوں مول لے؟''

آری نے پھر کندھے اچکائے۔ ''مجھے اسی سے اپنے زندہ ہونے کا احساس ہوتا ہے۔''

''خود کو زندہ محسوس کرنے کے اور بھی طریقے ہوتے ہیں۔'' یہ آواز ان کے پہلو سے آئی۔

نینا نے مڑ کر دیکھا۔

حسن پرست آنکھوں کے لیے وہ شخص کسی نایاب ذائقے کی طرح تھا۔ سیاہ بال، ان سے بھی گہری آنکھیں، اور دلکش چہرہ۔ سیاہ لباس، وہ محض ایک وجود نہ تھا، ایک تاثر تھا۔ خاموش، باوقار، اور نگاہوں کو ٹھہرنے پر مجبور کر دینے والا۔

نینا کے دل میں ایک لمحے کو خیال آیا۔ کیا کبھی کسی نے اس سے پوچھا بھی ہوگا کہ اتنا حسین ہونا کیسا لگتا ہے۔

اس کی لمبی انگلیاں میز پر رکھے ایک گلاس کے کنارے کو چھو رہی تھیں، جس میں مینہری رنگ کا مشروب اور ایک برف کا ٹکڑا تیر رہا تھا۔ نینا کی نظر اس کی انگلیوں سے ہوتی ہوئی اس کے ہاتھ پر گئی۔ شادی کی انگوٹھی۔ دل میں ایک مانوس سی کسک ابھری۔ کام میں اس کی کامیابی، ذاتی زندگی کی ناکامی۔ غلط انتخاب، مختصر تعلقات جو پھر بھی حد سے زیادہ طویل محسوس ہوتے تھے۔

یہی وہ بات تھی جس کے بارے میں وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

نینا خوش نہیں تھی ایسی زندگی سے۔

اس نے دیکھا، وہ آدمی گلاس کو ہلکا سا جھٹکا دے کر برف کے گرد گھما تا رہا۔

ایک چکر۔ دوسرا۔ تیسرا۔

نینا مسحور کن انداز میں اسے دیکھتی رہ گئی، پھر چونک کر پلکیں جھپکیں۔ وہ گھور رہی تھی۔

ادھر آری نیم نشے کی حالت میں آنکھیں سکیڑ کر اس آدمی کو دیکھ رہا تھا، جیسے طے کر رہا ہو کہ توہین ہوئی ہے یا نہیں۔

''یہ ٹکسڈو کس خوشی میں؟ تم جادوگر ہو کیا؟'' پھر وہ زور سے ہنسا۔ ''میرے بل اور قرضے غائب کر سکتے ہو؟''

آدمی نے سر ہلایا۔ اس کی انگلیاں اب گلاس کے کنارے پر پھسل رہی تھیں۔ نینا نظریں نہ ہٹا سکی۔

''میں جادوگر نہیں ہوں۔ بس ایک شو میں کام کرتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

پھر اس کی نگاہ نینا پر ٹک گئی۔ کچھ تھا جو نینا کا دل بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ ''تم کیا کرتی ہو؟''

اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ نینا نے بمشکل سنی۔

''کچھ نہیں۔'' وہ فوراً بولی، پھر خود کو روکا۔ ''میرا مطلب ہے..... کچھ خاص نہیں۔ ایک انشورنس کمپنی میں کام کرتی ہوں۔''

آری نے ڈکار لی۔ وہسکی اور پودینے کی بُو پھیل گئی۔

''مجھے باتھ روم جانا ہے۔'' اس نے اعلان کیا اور کرسی پیچھے سرکا دی۔

آری کے جاتے ہی، آدمی نے خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''کیا میں.....؟''

''ہاں۔ میرا مطلب ہے جی۔ جی ہاں، بالکل۔'' نیتا الفاظ میں الجھ گئی۔

وہ اپنا گلاس اٹھائے کرسی پر آ بیٹھا، اور نیتا کو کمرے کی باقی دنیا دھندلاتی ہوئی لگی۔ اس کی نگاہوں میں ایسی تپش تھی کہ نیتا کو محسوس ہوا، اس کی جلد جلنے لگی ہو۔

''میں سمجھتا ہوں تم کیا کہنا چاہتی ہو..... یہ احساس کہ آدمی واقعی کوئی اہم کام نہیں کر رہا۔'' وہ بولا۔

اس کی انگلیاں اب بھی گلاس کے کنارے کا طواف کر رہی تھیں، اور اس کی مدھم، ٹھہری ہوئی آواز نیتا کے ذہن میں یوں گھلتی چلی گئی جیسے برف آہستہ آہستہ پانی بن رہا ہو۔

''ہاں، یہی..... بالکل یہی۔'' نیتا کہنا چاہتی تھی مگر الفاظ اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ سر چکرانے لگا، جیسے وہ کسی رولر کوسٹر میں بیٹھی ہو۔ اسے اتنی شیمپین نہیں پینی چاہیے تھی۔

آدمی نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ گلاس پکڑے رہنے کی وجہ سے اس کی گرفت ٹھنڈی تھی۔ ایک کرنٹ سا اس کی انگلیوں سے نیتا کو اپنے وجود میں اترتا محسوس ہوا۔

''کیا تم جانتی ہو میں نے اپنی زندگی کو معنی کیسے دیے؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

نیتا آگے جھک آئی۔ ''بتاؤ۔'' وہ ہانپتی سانسوں کے درمیان بولی۔ وہ اسے چومنا چاہتی تھی۔

''نیکی کر کے۔'' اس کا انگوٹھا نیتا کی ہتھیلی پر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

نیتا اور قریب آ گئی۔ ''نیکی؟'' اس نے سرگوشی کی۔

اسے شادی کی انگوٹھی کی پروا نہیں رہی، نہ اس بات کی کہ آری دیکھ لے گا۔

''خیرات۔'' وہ بولا۔

نیتا ٹھٹک گئی۔ ''کیا؟''

''میں نے اپنی ساری تنخواہ میں ہونے والے اضافے اور بونس خیرات کر دیے۔'' وہ ذرا سا کندھے جھٹک کر بولا۔ ''ایسا بوجھ اترا کہ میں خود کو روئی کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔''

نیتا نے ہاتھ کھینچ لیا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی، الجھن میں۔ ''اوہ..... اچھا ہے۔''

''تم بھی آزما کر دیکھو۔'' وہ مسکرایا۔ ایسی مسکراہٹ جو سامنے والے کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دے۔ ''محض ایک مشورہ ہے۔''

نیتا کے اندر جذبات کا ریلا سا ابھر آیا۔ یہ اب تک کی سب سے عجیب چھیڑ چھاڑ تھی اور حیرت انگیز طور پر، کارگر بھی۔

آدمی نے جیب سے فون نکالا اور اسکرین پر نظر ڈالی۔ ''معاف کرنا، اسی کال کا انتظار تھا۔''

اس نے قلم نکالا، نیتا کے نیپکن پر کچھ لکھا، اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اگر تمہیں دلچسپی ہو۔''

فون کان سے لگائے وہ چلا گیا۔ نیتا اسے جاتے دیکھتی رہی، سلے ہوئے کوٹ کے نیچے اس کے کندھوں کی چوڑائی کو سراہتے ہوئے۔ عجیب بات تھی، اس کے چہرے کی تفصیل تو پہلے ہی دھندلا رہی تھی۔ آنکھیں بھوری تھیں یا سیاہ؟ یاد نہیں رہا۔ جو چیز رہ گئی تھی، وہ اس کی آواز تھی۔

نیتا نے نیپکن اٹھایا۔ فون نمبر کے بجائے وہاں ایک ویب لنک لکھا تھا۔

اس نے فون نکالا اور لنک کھولا۔ اسکرین پر کتوں اور بلیوں کی تصویریں ابھر آئیں۔ ضرورت مند پالتو جانوروں کے لیے ہمیشہ کے گھر!

پوزیشن سلوشن اوپر بڑے حروف میں لکھا تھا اور نیچے: چھوڑ دیے گئے جانوروں کو نئی فیملیز دلانے میں مدد کریں۔

وہ آدمی اسے اپنا سوشل میڈیا نہیں دے گیا تھا۔ یہ تو ایک خیراتی ادارے کی ویب سائٹ تھی۔

نیتا کے منہ سے ایک ایسی ہنسی نکلی جو رونے سے زیادہ مشابہ تھی، عین اسی وقت آری واپس آیا۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

نیتا نے کھانستے ہوئے کہا۔ ''مشروب غلط نالی میں چلا گیا۔''

آری نے جیکٹ اٹھائی اور کندھے پر ڈال لی۔ ''مجھے نکلنا ہے۔ لگ رہا ہے فون ای میلز کے وزن سے بھاری ہو رہا ہے۔''

نیتا نے اپنے فون کی اسکرین دیکھی۔ نوٹیفکیشن بیل میں 49،37 بن چکا تھا۔ ''مجھے بھی۔''

اس نے نیپکن موڑا مگر اس سے پہلے آری کی نظر اس پر پڑ چکی تھی۔

''ای میلز کا جواب دو گی؟'' وہ ہنسا۔ ''یہ تو ہیر، ہو سکتا۔ تم نے اس بندے کا نمبر لے لیا ہے۔''

''نہیں میں نے..... نہیں لیا۔'' اس نے کہنا چاہا۔ مگر آری کی مسکراہٹ معنی خیز تھی۔ ''نیپکن پر نمبر.....

...پرانا مگر کلاسک طریقہ۔ ٹکسڈو کے ساتھ خوب جچتا ہے۔"

نینا نے کچھ نہ کہا۔ بس نیپکن کو مٹھی میں دبالیا۔

"اس نے مجھے اپنا نمبر نہیں دیا۔" نینا نے نیپکن اٹھا کر خالی... پلیٹ پر پھینک دیا۔

ہوٹل کے سوئٹ میں آکر نینا نے لیپ ٹاپ کھولا اور ای میل لاگ اِن کی۔ اَن ریڈ میلو اسکرین پر قطار میں تھیں، مگر اس نے ایک بھی نہیں کھولی۔ اس کے بجائے اس نے فون اٹھایا۔ جانوروں کی خیراتی ویب سائٹ اب بھی براؤزر میں کھلی تھی۔ اس نے وہی لنک لیپ ٹاپ میں ٹائپ کیا۔ پازیٹو سلوشن۔

"چھوڑ دیے گئے پالتو جانوروں کو نئے گھر دلانے والا ادارہ۔"

نینا تصویروں میں کھو گئی۔ کُتّے، بلیاں۔

وہ ایک تصویر پر ٹھہر گئی۔ سفید، روئی کے گولے جیسا ننھا سا کتا، بٹن جیسی چمکتی آنکھیں۔ تفصیل میں لکھا تھا: پشون اور پوڈل کا ملاپ۔ وہ بالکل ویسے ہی لگ رہا تھا جیسے اس کی تیسری جماعت کے زمانے میں اس کی سہیلی کے گھر کے پلّے تھے۔ اس وقت اس کے والد نے وعدہ کیا تھا کہ جب پلّے بڑے ہو جائیں گے تو ایک اس کا ہوگا۔ دو ہفتے بعد وہ گھر چھوڑ گیا تھا۔ نینا اور اس کی ماں کو ایسے فلیٹ میں منتقل ہونا پڑا جہاں پالتو جانوروں کی اجازت نہیں تھی۔ پھر نہ کتے کا ذکر ہوا، نہ باپ کا۔

کلک ہیئر ٹو اڈاپٹ۔

یہ ممکن نہیں تھا۔ نینا بہت زیادہ کام کرتی تھی، اور پھر اس کے کونڈو میں سفید قالین اور کریم رنگ کا فرنیچر تھا۔

اس نے کلک ہیئر ٹو ڈونیٹ پر کلک کیا۔

ایک نئی اسکرین کھلی۔ خانوں کی قطار، ہر خانے میں ایک رقم۔ یہاں پانچ سو سے ہزاروں ڈالر تک کی رقم ڈونیٹ کی جاسکتی تھی۔

نینا نے ذرا بھی توقف نہ کیا۔ فیصلہ غیر معمولی یقین کے ساتھ آیا۔

اس نے دس ہزار لکھا، کارڈ کی تفصیل خود بخود بھر گئی، اور کنفرم دبا دیا۔ اس نے کریڈٹ کارڈ کے بجائے ڈیبٹ کارڈ استعمال کیا تھا۔ یہ زیادہ حقیقی محسوس ہو رہا تھا، جیسے وہ واقعی نوٹوں کی گڈی کسی کے ہاتھ میں رکھ رہی ہو۔

اسکرین بدلی۔ "تھینک یُو فار یور ڈونیشن۔"

حروف کے گرد ستاروں کا ایک متحرک دائرہ گھوم رہا تھا۔ نینا کو بے اختیار اس آدمی کی انگلیاں یاد آگئیں جو گلاس کے کنارے کا چکر لگا رہی تھیں۔ اس نے آہستہ سے سانس خارج کی۔ کندھوں سے تناؤ اُتر رہا تھا۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ واقعی خود کو ہلکا محسوس کر رہی تھی۔

صفحے کے نیچے، ستاروں کے ایک اور دائرے میں گھرا ہوا بٹن تھا۔ "ڈونیٹ اگین۔"

نینا نے دوبارہ کلک کیا۔ خانے پھر ظاہر ہو گئے۔

اس بار اس نے بیس ہزار ٹائپ کیا۔ شکریے کا پیغام آیا تو اس کے دل میں ایک لہری اٹھی۔

کیا یہ خوشی ہے؟

اس نے ایک بار پھر ڈونیٹ اگین دبایا اور چالیس ہزار لکھ دیا۔ نمبرز ڈالتے ہوئے اس کے اندر صرف خوشی نہیں، سرشاری دوڑ گئی۔ اسے اس طرح خوش ہوئے جانے کتنا وقت ہو گیا تھا۔ شکریے کا پیغام ابھی پوری طرح اُبھرا بھی نہ تھا کہ اس نے پھر بٹن دبا دیا۔ اس کی انگلیاں کِی بورڈ

متحدہ عرب امارات میں مقیم

اردو قارئین کے لیے خوشخبری

جاسوسی ڈائجسٹ پبلیکیشنز کراچی (پاکستان)

کے چاروں رسائل

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،

ماہنامہ پاکیزہ اور ماہنامہ سرگزشت

آپ کال کریں، مطلوبہ رسالہ آپ کو گھر بیٹھے مل جائے گا۔

اردو بک ورلڈ ایف زیڈ سی۔ بزنس سینٹر، شارجہ پبلشنگ سٹی

فری زون، الزاہیہ، شیخ محمد بن زاید آر ڈی، ای 311 شارجہ

URDU BOOKS WORLD FZC.
BUSINESS CENTRE
SHARJAH PUBLISHING CITY
FREE ZONE, AL ZAHIA,
SHEIKH MOHAMMED BIN ZAYED RD,
E311, SHARJAH, UNITED ARAB EMIRATES

پر اُڑنے لگیں۔ اتنی ہزار۔
جوش رگوں میں دوڑ گیا۔ اس نے ہنسی دبانے کی کوشش کی۔ اس بار اس نے ایک لاکھ لکھ دیے تھے۔
ہنسی اب قہقہے میں بدل رہی تھی۔ سرشاری سے لبریز، اس نے پھر بٹن دبایا۔ اور پھر۔ اور پھر۔

☆☆☆

ایک سال بعد

آری نے پس منظر میں بجتے گانے کے ساتھ گنگنانا چھوڑا۔ وہ ایسے سُر لگا رہا تھا جنہیں سن کر خود گلوکار بھی شرما جائے۔
''اور شیمپین؟'' اس نے سامنے بیٹھی لڑکی سے پوچھا۔
فرح نے ایک ہاتھ سے اپنے ماتھے پر بکھرے بال پیچھے کیے اور دوسرے ہاتھ سے گلاس اٹھایا۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھے وہ ذرا پیچھے کو ٹکی۔ ''کیوں نہیں۔''
فرح ان کی ٹیم کی نئی رکن تھی اور یہ اس کی ویگاس کی پہلی ٹرپ تھی۔ روشنیوں، شور اور آزادی کا ایک ایسا ذائقہ جو فوراً سر چڑھ جاتا ہے۔
آری نے کمرے کے پار ویٹر کو اشارہ کیا مگر ہاتھ ابھی ہوا ہی میں تھا کہ اس کی نظر ٹھٹک گئی۔ اگلی میز پر بیٹھا ایک آدمی اکیلا تھا۔ ٹکسڈو جیکٹ کھلی، بو ٹائی گردن میں ڈھنکی ہوئی، نظریں اپنے گلاس پر جمی ہوئی، وہ محفل میں موجود ہو کر بھی موجود نہیں لگتا تھا۔
''ارے، میں تمہیں جانتا ہوں!'' آری کے الفاظ لڑکھڑاتے ہوئے تھے مگر انداز صاف تھا۔
آدمی نے سر اٹھایا۔ ''سوری، مجھے ایسا نہیں لگتا۔''
''نہیں یار، میں چہرے نہیں بھولتا۔'' پُریقین لہجے میں کہتے ہوئے آری نے ایک منٹ تک اسے گھورا، پھر انگلی اس کی طرف اٹھائی۔
''ہاں، تم انہی جادوگروں میں سے ایک ہو۔ پچھلے سال ملے تھے ہم۔ میں اور نینا ——— یہیں۔''
آدمی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ ''میں جادوگر نہیں ہوں۔''
فرح جو پہلے ایک نرس ہوا کرتی تھی اور اس زمانے میں سارا کہلاتی تھی، اس نے پچھلی نوکری میں ہونے والی ایک 'غلط فہمی' کے بعد نیا نام اپنا لیا تھا، تیوری چڑھا کر بولی۔
''نینا کون ہے؟''
''ہماری ٹیم میں تھی۔'' آری نے کہا۔ ''یعنی ——— اپنے پاگل ہونے سے پہلے۔ پچھلے سال ویگاس ٹرپ کے بعد اس نے اپنا سارا پیسہ اور سامان چیریٹی میں دے دیا۔ گاڑی، کونڈو، سب کچھ۔''
فرح کے منہ سے بے اختیار ایک اوہ نکلی، اس کے دانت کسی ڈینٹل اشتہار کی طرح چمک اٹھے۔ ''سچ؟''
آری نے ہاتھ جھٹکا۔ ''ہاں میں نے بتایا نا، اس کا دماغ گھوم گیا تھا ورنہ ہوش میں ایسی حرکت کون کر سکتا ہے؟''
وہ بولتا رہا مگر فرح اب سُن نہیں رہی تھی۔ اس کی توجہ اس آدمی پر جا ٹھہری تھی۔ گہری آنکھیں، ہلکی سی داڑھی، نفیس انگلیاں جن میں وہ مشروب تھامے ہوئے تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ آدمی ویگاس کا ہی حصہ ہو، مگر پچاس کی دہائی کا۔ جب عورتیں ایوننگ گاؤن پہنتی تھیں اور مرد شہر میں نکلتے وقت بلیک ٹائی میں ہوتے تھے۔ کارگو شارٹس، بیس بال کیپس اور ٹاپس سے بہت پہلے کا زمانہ۔
وہ آدمی گلاس کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے برف کے واحد ٹکڑے کے گرد دست دائرے بنا رہا تھا۔
کتنی عجیب سی عادت، فرح نے سوچا۔
مگر اس کی نظریں پھر بھی اس آدمی اور اس کی اس حرکت کا جائزہ لیتی رہیں۔ حیرت انگیز طور پر، یہ منظر اسے سکون دے رہا تھا۔
آری نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے شیمپین ختم کی اور گلاس میز پر رکھ دیا۔ فرح کی محویت ٹوٹ گئی۔
''تو جب نینا نے آفس میں زبردست تماشا کھڑا کیا، میں نے اسے فارغ کر دیا۔'' وہ بولا۔
فرح چونک کر اس کی طرف مڑی۔ ''رکو..... کیا؟''
آری نے شکایت آمیز بھری نظر سے اسے دیکھا۔ ''سن نہیں رہی تھیں کیا؟ جب نینا نے سارا پیسہ دے دیا تو غالباً اس کا دل بدل گیا۔ جب اسے پتا چلا کہ وہ واپس نہیں مل سکتا، تو وہ بالکل بپھر گئی۔''
''اوہ خدایا۔'' فرح نے آفس میں کمپنی کے کسی ورکر کے پاگل ہو جانے کی سرگوشی سنی تھی، مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اسی ٹیم سے تھی۔
''اس نے سب کچھ دیا ہی کیوں تھا؟ کیا وہ ڈپریسڈ تھی؟'' فرح نے سوال کیا۔
آری نے کندھے اچکائے۔ ''کیا خبر؟''
''پھر اس کا کیا ہوا؟'' فرح کو جانے کیوں اس انجانی لڑکی کے لیے ہمدردی محسوس ہوئی۔
''پتا نہیں۔'' آری نے بے نیازی سے کہا۔
اس نے فرح کو یہ نہیں بتایا کہ اس نے ایک بار نینا کو اسٹار بکس کے باہر دیکھا تھا، کاغذی کپ ہاتھ میں لیے۔ اس

وجہ سے آری نے وہاں جانا چھوڑ دیا۔

وہ دوبارہ ساتھ والی میز کی طرف مڑا۔ ''ویسے..... وہ تم ہی تھے نا؟''

مگر وہاں اب وہ شخص موجود نہیں تھا۔ بس ایک گلاس رہ گیا تھا اور برف کا ٹکڑا جو تقریباً پگھل چکا تھا۔

☆☆☆

وہ آدمی گاڑی چلاتے ہوئے شہر کے اس مرکزی حصے سے دور نکل آیا تھا۔ روشن اور پُرشور سڑک کے پیچھے رہ جانے کے بعد مکانوں کی قطاریں شروع ہو گئی تھیں۔ ایک جیسے گھر، ایک جیسے لان، جیسے کسی نے ایک ہی سانچے سے سب کو بنایا ہو۔

اس نے اسٹیئرنگ پر انگلیوں سے اپنی شادی کی انگوٹھی بجائی۔ دو برس گزرنے کو تھے مگر وہ اب تک اسے اتارنے پر خود کو آمادہ نہیں کر سکا تھا۔

ایک چھوٹے سے گھر کے سامنے اس نے گاڑی روک دی۔ ایسا گھر جو اردگرد کے گھروں سے ذرا بھی الگ نہیں لگتا تھا۔ سامنے قطار میں کھڑے سب مکان ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ گاڑی کا انجن بند ہونے سے پہلے ہلکی سی کراہ نکالتا ہوا خاموش ہو گیا۔

اس نے فون نکالا، بینکنگ ایپ کھولی۔

پازیٹو سلوشن کا بینفٹس اسکرین پر روشن ہوا تھا۔ رقم اتنی تھی کہ عام آدمی گن بھی نہ سکے۔ مگر حسبِ معمول، اس رقم نے اس کے دل کے بوجھ میں کوئی کمی نہیں کی۔

اس نے کبھی دولت یا شہرت کا پیچھا نہیں کیا تھا۔ ہائی اسکول میں جین سے ملنے کے بعد اس کی خواہش بس اتنی تھی کہ وہ دونوں ایک ساتھ زندگی گزاریں۔ مریضوں کے لیے ڈاکٹر جین، اور اس کے لیے وہی جین، جس کے بغیر اس کی دنیا ادھوری تھی۔ صحرا میں ایک چھوٹا سا گھر، وہ ہفتے میں چھ راتیں کیسینو اسٹیج پر پندرہ منٹ اپنے فن کا مظاہرہ دکھاتا، اور وہ بچوں کے کینسر کلینک میں ننھے مریضوں کا علاج کرتی۔

تقریباً بیس برس انہیں یہ زندگی ملی تھی۔ مگر وہ بہت کم تھی۔ بہت ہی کم۔

''ارے، ویسلے!'' پڑوس سے آواز آئی۔

وہ بوڑھی عورت اپنے برآمدے میں بیٹھی تھی، ایک دوسری عورت کے ساتھ، دونوں پلاسٹک کی جالی دار کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔

''جی، مسز بینسن۔''

مسز بینسن ایک بوڑھی بیوہ عورت تھیں ویسلے اکثر ان کی مدد کے لیے حاضر رہتا۔ سودا سلف، چھوٹی موٹی مرمت۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ مسز بینسن نے جین کی زندگی کے آخری چھ مہینوں میں جین کا بہت خیال رکھا تھا۔ جب کینسر سے لڑتے لڑتے جین میں ہلنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی اور درد ناقابلِ برداشت ہو چکا تھا۔

وہ درد..... جو کم ہو سکتا تھا، اگر اس کمپنی نے علاج کی منظوری دی ہوتی۔ فیصلے کے خلاف اپیل جیتنا ایک تلخ فتح تھی مگر یہ فیصلہ جین کی موت کے دو ماہ بعد آیا اور تب تک وہ شدید اذیت میں دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ ریاستی بورڈ ایک سطر کا فیصلہ سناتا کہ

مدعی کی درخواست غلط طور پر مسترد کی گئی۔

بس۔ نہ کوئی تو جداری کارروائی، نہ ہرجانہ۔

کمپنی نے جرمانہ تک ادا نہیں کیا۔ ویسے بھی رقم کا حصول اس کا مقصد نہ رہا تھا۔

البتہ اپیل کے دوران حاصل ہونے والی دستاویزات نے ایک دروازہ ضرور کھولا تھا۔ ان فرضی ناموں کا، جن کے پیچھے اصل چہرے چھپے تھے۔ ویگاس کے بہترین پرائیویٹ انویسٹی گیٹر کو پانچ ہزار دے کر اسے اصل نام مل گئے۔

نینا سیبیلیا گو

آری گیلر

بیوی کے جنازے کے چھ ماہ بعد اور پچھلے سال اس انشورنس کمپنی کی سالانہ ویگاس تقریب سے ذرا پہلے ویسلے نے پازیٹو سلوشن کی ویب سائٹ بنائی تھی۔

آج رات اسے امید تھی کہ آری لاؤنج میں اکیلا مل جائے گا۔ کم از کم تقریب پورا ویک اینڈ چلے گی۔

کل صبح دوبارہ جائے گا شاید ناشتے کے وقت۔

مسز بینسن اپنی ساتھی کی طرف جھکیں۔ ''ویسلے اسٹیج پر جادو کے ایک شو میں ہوتا ہے۔''

دوسری عورت نے موٹی عینک کے پیچھے سے اسے دیکھا۔

''آپ جادوگر ہیں؟''

ویسلے کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ در آئی۔ ''نہیں، میں بس شو کا آغاز کرنے والا ہوں۔''

عورت کے چہرے پر مایوسی آ گئی۔ ''تو پھر آپ کرتے کیا ہیں؟''

ویسلے اپنے دروازے کی طرف بڑھا۔ ''میں پینٹ ہوں۔ لوگوں کو ہپناٹائز کرتا ہوں۔''

❖❖❖

گیارہواں حصہ

سر بہ کف

طاہر جاوید مغل

دکھ کی کہانی بڑی دردناک ہوتی ہے... جسے سنانا آسان نہیں ہوتا... بعض اوقات سنانے والے کے پاس اس کا اپنا ذہن ساتھ نہیں دیتا... مضبوط شانیں ڈھلک چکے ہوتے ہیں... اب تجھے کیسے بتائیں کہ ہمیں دکھ کیا ہے... شدید ترین مسافت کی تھکن کے باوجود حالات کا بوجھ کندھوں پر اٹھائے چپ چاپ چلتا چلا جاتا ہے... کبھی خود سے کبھی راستوں سے الجھتا ہے... مگر کسی آواز پر رکتا نہیں... اسے تلاشنا تھا... اپنا پرانا پیراہن... دل گرفتہ تھا... طلسمات غم ہستی سے سانسیں رکتی تھیں مگر اس کی تلاش... شناخت کا رقص جنوں اسی طرح تازہ تھا... ہر بجھتی ساعت سے اسے گلے ملنا تھا... ظلم کی ڈور کہاں اور کیسے ٹوٹی تھی، ابھی معلوم نہ تھا... ایک دھن تھی جو سناتی نہیں دیتی تھی پھر بھی اس کی لے پر آگے بڑھنے کا سلسلہ جاری تھا...

سنسنی خیز واقعات اور انتقام کے جذبات سے لبریز ایک لبورنگ داستان

اسی دوران میں ماہین بھی چلی آئی۔ موبائل فون اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ کافی پُرجوش نظر آرہی تھی۔ اس نے موبائل میری طرف بڑھایا۔ ”یہ دیکھیں انکل تابش! ہماری اس وڈیو نے تہلکہ مچا دیا ہے۔ دو تین گھنٹوں میں دیوز تین ملین تک پہنچ گئے ہیں۔“

یہ پیش رفت واقعی حیران کن تھی۔ یہ وڈیو، شاہ زیب کی ذہانت اور موقع شناسی کا ثبوت تھی۔ جب ہم گارڈز کے بھیس میں شانے مینشن کے پُراسرار در و دیوار میں داخل ہوئے تھے، شاہ زیب گاہے بگاہے اپنا موبائل ان وڈیو کلپس کے لیے استعمال کرتا رہا تھا۔ کئی جگہ کم روشنی یا فاصلے کا مسئلہ ہوا تھا مگر اکثر کلپس واضح تھے اور اس خوفناک صورتِ حال کی عکاسی کرتے تھے جو وہاں ہم حیرت میں غلطاں دیکھتے رہے تھے۔ دھات کے وہ چار مکعب قفس کے باکس جن میں کچھ بدنصیب ایک ناقابلِ بیان عذاب جھیل رہے تھے۔ کوئی چند ہفتوں سے کوئی چند مہینوں سے اور شاید دو چار ایسے بھی تھے جو اس سے بھی زیادہ طویل عرصے سے یہاں بند تھے۔ ان میں سے کچھ ہڈیوں کے ڈھانچے بن چکے تھے، ان کے چہرے اور سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ رکوع کے بل جھکے ہوئے ان لوگوں کو صرف ایک ہی چیز اس مسلسل عذاب سے نجات دلا سکتی تھی موت ہاں موت جو کسی کو جلدی آجاتا

تھی اور کسی کو دیر سے.....

بڑے سے ہال میں جہاں عالی جاہ نے دو خوبرو لڑکیوں کو عجیب الخلقت چوہوں سے زندہ نچوایا تھا، روشنی کے زاویے کچھ عجیب تھے۔ ویسے بھی وہ خونی پنجرہ ہم سے کافی دور رکھا ہوا تھا لہٰذا کیمرا اسے ٹھیک سے ''کیپچر'' نہیں کر سکا تھا البتہ ایک پشیمان لڑکی نے خود کو ہی طمانچے مار، مار کر جو سزا دی تھی، وہ منظر بالکل واضح ریکارڈ ہوا تھا۔

اسی اثنا میں شاہ زیب بھی لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ ماہین ممنون لہجے میں بولی۔ ''دیکھیں شاہ زیب بھائی! آپ کی وڈیو نے کیا دھوم مچائی ہے۔''

''مگر ماہین اس میں تمہارے چینل کا بھی تو بڑا کردار ہے۔ تمہارے چینل کی وجہ سے بڑے بڑے گروپس نے اس وڈیو کو شیئر کیا اور یہ وائرل ہوگئی۔ اب یقینی بات ہے کہ عالی جاہ کے ہاتھ کتنے بھی لمبے ہوں مگر حکومت کو شانے مینشن پر بھرپور کارروائی کرنا پڑے گی۔''

عمران نے اندر آتے ہوئے بھاری لہجے میں کہا۔ ''کارروائی ہوگی نہیں..... ہوگئی ہے..... بلکہ ہو کر ختم بھی ہو چکی ہے اور جس طرح ختم ہوئی ہے، میرا نہیں خیال کہ ہمیں خوشی سے شادیانے بجانے کی ضرورت ہے۔''

''کیا مطلب عمران؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے کہا۔ ''یہاں ماہین کے چینل پر وڈیو تو رات دس بجے لوڈ ہوئی، وہاں کارروائی ساڑھے نو بجے ہی شروع ہوگئی تھی۔ ابھی مین اسٹریم میڈیا پر خبر آرہی ہے کہ پولیس کی بھاری نفری نے شانے مینشن میں داخل ہو کر آپریشن کلین اَپ کر دیا ہے۔ بہت سے افراد فرار ہو گئے تھے مگر چند گرفتار بھی ہوئے ہیں۔ کچھ مارے گئے ہیں۔''

''فرار کیسے ہو گئے؟'' ماہین نے کہا۔ ''شام آٹھ بجے تک تو یہی خبر آرہی تھی کہ عمارت کو پوری طرح گھیر لیا گیا ہے۔''

''گھیرنے والے ہی تو فرار کرانے والے ہیں۔'' عمران نے کہا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں ٹی وی آن تھا۔

ہم بھی وہاں پہنچے۔ ایک بھاری بھرکم پولیس والا جس کے کندھے کے نشان بتا رہے تھے کہ وہ ڈی ایس پی ہے، سینہ تانے کھڑا تھا۔ اس کے جسم پر بلٹ پروف جیکٹ تھی جو نہ جانے کس سائز کی تھی جو اسے پوری آگئی تھی۔ اس کے عقب میں کوئی درجن بھر پولیس اہلکار ہیلمٹس وغیرہ پہنے کھڑے تھے۔ وہ نیوز چینلز کے رپورٹرز کو بتا رہا تھا کہ ہم پولیس کمانڈوز کے ساتھ کس طرح جان ہتھیلی پر رکھ کر عمارت میں گھسے۔ پولیس پر اندھا دھند فائرنگ کرنے والوں میں سے چار کو ہلاک اور پانچ کو زخمی حالت میں گرفتار کیا گیا۔

ایک رپورٹر نے چلا کر پوچھا۔ ''سوشل میڈیا پر سنسنی خیز کلپس چل رہے ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ یہ شانے مینشن ایک بڑی تنظیم کے ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال ہو رہا تھا اور وہاں مخالفین کو انسانیت سوز سزائیں دی جا رہی تھیں۔ ایسے پنجروں کا ذکر ہے جن میں قیدی گھٹ گھٹ کر جان دیتے ہیں۔''

بھاری بھرکم پولیس افسر نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''آپ جانتے ہی ہیں سوشل میڈیا پر خبروں کو بہت مرچ مسالا لگا دیا جاتا ہے۔ کم از کم اب تک ہمیں کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا جس کی بنا پر کہا جا سکے کہ یہاں کوئی تنظیم یا کرمنل آرگنائزیشن کام کر رہی تھی۔ بس یہ ایک جرائم پیشہ گروہ تھا اور کچھ نہیں۔ ہاں یہ تنگ پنجروں والی بات بالکل درست ہے۔ لیکن یہ پنجرے نہیں باکس تھے۔ وہاں یہ لوگ اپنے مخالفین کو رکھتے تھے لیکن اب ہمیں وہ باکس خالی ہی ملے ہیں۔''

میں موٹے پولیس افسر کے اس بیان پر دانت پیس کر رہ گیا یقیناً شاہ زیب کی بھی یہی کیفیت رہی ہوگی۔

کسی چینل کے فیلڈ رپورٹر نے پوچھا۔ ''سر! سوشل میڈیا پر جو وڈیو وائرل ہوئی ہے، اس میں کمبینیشن پاؤڈ چند نسل کے چوہوں کی بات بھی کی گئی ہے۔ کہا گیا ہے کہ ان جسیم گوشت خور چوہوں کے ذریعے یہ لوگ اپنے مخالفین کو.....''

''وٹ اے ربش۔'' آفیسر نے اس کی بات کاٹی۔ ''آپ کو بتایا ہے نا کہ آج کے یوٹیوبر بات کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں اور جس لڑکی کے یوٹیوب چینل سے یہ فیک وڈیو وائرل ہوئی ہے، اس کے رویے اور کریکٹر پر کئی سوالات ہیں۔ کہا یہی جا رہا ہے کہ وہ گھر سے بھاگی ہوئی ایک باغی لڑکی ہے اور قاتل شخص، سابقہ ڈی ایس پی تابش کو اپنا انکل بتاتی ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ اب بھی وہ ماہین نامی لڑکی اسی قاتل ٹولے کے ساتھ گھوم رہی ہے۔''

ایک لیڈی رپورٹر نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ کوئی آرگنائزیشن وغیرہ نہیں ہے، بس جرائم پیشہ لوگوں کا ایک گینگ ہے جو اسمگلنگ جیسے جرائم میں ملوث ہے مگر وائرل وڈیوز میں کہا جا رہا ہے کہ یہ نہایت خطرناک تنظیم ہے۔ اس کے ڈانڈے پاکستان سے باہر تک جاتے ہیں۔ کچھ دن پہلے گوٹھ نوشیر کے علاقے کے جس اسکول میں دھماکے ہوئے تھے اور کئی بچوں کی جانیں گئی تھیں، وہ بھی اسی تنظیم کا کام ہے۔''

فربہ اندام آفیسر بولا۔ ''اس قسم کی گفتگو قبل از وقت

ہے اور بے معنی ہے۔ آپ تسلی رکھیں۔ اس معاملے کی پوری تحقیق ہوگی۔ آپ افواہوں پر کان نہ دھریں۔"

ماہین سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ وہ اور اشفاق کچھ دیر پہلے اپنی وائرل وڈیو پر بہت پر جوش نظر آتے تھے مگر وڈیو جن لوگوں کے خلاف تھی، وہ کہیں زیادہ چوکس اور ہوشیار نکلے تھے۔

شاہ زیب نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ "وہ لوگ سمجھ گئے تھے کہ جہاں اتنی زیادہ ہلاکتیں ہوگئی ہیں وہاں بڑے پیمانے پر اعلیٰ سطح کی انکوائری اور کارروائی ضرور ہوگی۔ انہوں نے اس سے پہلے خود ہی کارروائی کر دی۔ سیدھی بات یہی ہے کہ انہوں نے مجرموں کو تحفظ دیا ہے۔"

"اور دوسری سیدھی بات یہ ہے کہ ہم نے وڈیو آپ لوڈ کرنے میں تھوڑی سستی دکھائی۔" عمران نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر آپ آتے ساتھ ہی وڈیو ماہین وغیرہ کو دے دیتے تو بہتر ہوتا۔"

اسی اثنا میں ہمارے ہاتھوں زخمی ہونے والا بہروزا بازو گلے میں لٹکائے پہلوان حشمت کا سہارا لیتا ہوا کمرے میں آن کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ٹی وی پر فرید انڈم پولیس آفیسر کو دیکھ لیا تھا جو اس ساری کارروائی کا کریڈٹ لے رہا تھا۔

نیوز ختم ہوئی تو بہروزا مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اس کا نام عاقب ڈوگرے ہے۔ ایک نمبر کا کرپٹ افسر ہے۔ کہنے کو ڈی ایس پی ہے مگر اس کی پاور اس سے کہیں زیادہ ہے۔"

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"ایک بہت دھڑلے دار سیاسی عورت ہے اس علاقے میں۔ رانی جان کہا جاتا ہے اُسے۔ اس کا داماد ہے یہ ڈوگرے۔"

اسی دوران میں لائٹ چلی گئی، ٹی وی بند ہو گیا اور ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا۔ یہ ہتھنی کا بچہ اہلکار جس طرح سینہ چوڑا کر کے اس سارے واقعے کا کریڈٹ لے رہا تھا اور واقعات کو توڑ موڑ کر بیان کر رہا تھا، بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ ماہین اور راشدہ نے لالٹینیں روشن کر دیں۔

☆☆☆

رات کا وقت تھا۔ شانے مینشن والے تہلکہ خیز واقعے کو 36 گھنٹے سے زائد وقت گزر چکا تھا۔ میں اور شاہ زیب گرم چادریں اوڑھے برآمدے میں بیٹھے تھے۔ میں نے عمران کو بھی بلا لیا تھا تاکہ وہ بھی اپنی رائے دے سکے۔ یہ بات تو اب ثابت تھی کہ مینشن والوں نے ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے ایک پالتو پولیس افسر سے خود ہی کارروائی کرائی اور اپنا بہر معاملہ سیدھا کر لیا۔ جو کچھ دو دن پہلے تک شانے مینشن میں ہو رہا تھا وہ اب کسی اور جگہ منتقل کیا جا چکا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" شاہ زیب نے مجھ سے پوچھا۔

"ذہن میں بار بار وہ منظر آتا ہے جب گوہار زینت موت کے دہانے پر پہنچ کر واپس آئی تھی۔ آخر وہ کیا بات تھی اور کتنی اہم ہوگی جس کی وجہ سے گوہار زینت کی سزا معطل ہوئی ہے۔"

"تابش صاحب! جہاں تک میں جان پایا ہوں وہ ہمارے اندازے سے زیادہ تیز اور شاطر عورت ہے۔ کوئی ایسی گیدڑ سنگھی تھی اس کے پاس کہ عالی جاہ جیسا شخص بھی اس کی سزا رد کرنے پر آمادہ ہو گیا۔"

"فی الوقت کرنے والی بات یہ ہے کہ ہمارے پاس آگے بڑھنے کا راستہ کیا ہو سکتا ہے۔" عمران نے کہا۔

"ابھی تو ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "ڈی ایس پی ڈوگرے۔"

"چاچو! آپ کا مطلب ہے کسی طرح اس پر ہاتھ ڈالا جائے لیکن یہ آسان نہیں ہوگا۔ ہر طرف ہمیں ڈھونڈا جا رہا ہے، اور وہ عورت بھی خطرناک بتائی جاتی ہے جس کا وہ داماد ہے۔"

"اس کے بارے میں بہروزا سے مزید معلومات حاصل کرنی چاہئیں۔" شاہ زیب نے رائے دی۔

میں نے ماہین کے کیمرامین اشفاق کو آواز دی کہ وہ بہروزا کو بلائے۔ مگر اشفاق کے جواب دینے سے پہلے ہی پہلوان حشمت کی آواز آ گئی۔ "وہ نا ہیں آ سکتا۔ آپ نے جو بات کرنی ہے مجھ کو کرنا۔"

"چاچا حشمت ضروری بات ہے۔" شاہ زیب نے کہا۔ "زیادہ مسئلہ ہے تو ہم چلے جاتے ہیں اُس کے پاس۔"

پہلوان چوکھٹ میں آن کھڑا ہوا۔ "دیکھو جی، میں اس کے ٹوٹے پھوٹے بازو کا علاج کر رہا ہوں، اور میرا رب ہی جانتا ہے کہ کتنی مشکل سے کر رہا ہوں۔ کوئی سرجن بھی ہوتا تو اس کو چھٹی کے دودھ میں دانتوں کا پسینا یاد آ جاتا۔"

وہ یوں بول رہا تھا جیسے واقعی کوئی بڑا سرجن ہو اور اپنے مریض کو پولیس والوں کی پوچھ گچھ سے بچا کر پورا آرام دینا چاہ رہا ہو۔

ہماری گفتگو کچھ دیر مزید جاری رہی لیکن بے نتیجہ ہی رہی۔ پہلوان بات کو کہیں سے کہیں لے گیا۔ اس نے بتایا کہ پرسوں شانے مینشن میں کھڑی گاڑیوں پر جو پیٹرول بم پھینکا گیا، وہ خود اس نے بنایا تھا ---- وہ اس سے کافی بڑا بم

بھی بنا سکتا ہے بلکہ ایسے چھوٹے چھوٹے بم بھی بنا سکتا ہے جو تنکیں کے ذریعے دور تک پھینکے جا سکیں۔ پہلوان سے گفتگو بے نتیجہ ہی رہی کہ وہ اپنے مریض بہروز اسے بات کرانے کو تیار نہیں تھا۔ بہر حال چند گھنٹوں بعد ایک مختلف نوعیت کا نتیجہ خیز واقعہ رونما ہونے والا تھا۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے کڑی ورزش اور جفاکشی میری زندگی کا حصہ بن چکی تھی۔ میں سردی گرمی اور بھوک وغیرہ کو اتنی آسانی سے جھیلتا تھا کہ میرے اردگرد کے لوگ حیران ہوتے تھے۔ میں نے ایک ٹرینر کی حیثیت سے پولیس کا محکمہ جوائن تو کیا تھا مگر میں اس محکمے کو راس نہیں تھا اور نہ ہی یہ محکمہ مجھے راس آیا تھا۔ میرے ہم خیال کم تھے اور مخالف بہت زیادہ۔ یہی وجہ تھی کہ مجھ پر قتل کا الزام لگنے کے بعد بہت سے اعلیٰ افسر ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے تھے۔ میرے مربی و ہمنوا ایس ایس پی جمشید صاحب کا بھی ابھی تک مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔

میں بات کر رہا تھا اپنی روزانہ کی ورزش اور مشقوں کی۔ میں رات کے آخری پہر جاگ گیا۔ کافی سردی تھی لیکن کمبل یا لحاف کو دور اچھال کر برفیلی سردیوں کا سامنا میں اتنی مرتبہ کر چکا تھا کہ اب یہ معمول کی بات لگتی تھی۔ شاید ویسے ہی جیسے بار و ندا جیکی کے لیے درد ایک راحت بن چکا تھا۔ اس نے قوتِ برداشت کی انتہا کو چھو لیا تھا۔ ایم ایم اے کی فائٹ میں اسے مارنے والے تھک جاتے تھے لیکن وہ مار کھاتے ہوئے نہیں تھکتا تھا۔ اس کے حریف کو آدھی شکست تو اس کی قوتِ برداشت دیکھ کر ہی ہو جاتی تھی۔

میں چارپائی سے اترا تو ڈیرے کے نیم گرم کمروں میں سب سو رہے تھے۔ میں عموماً چھ بجے کے قریب اٹھتا تھا مگر آج ٹھیک سے سو ہی نہیں پایا تھا اس لیے ساڑھے چار بجے ہی اٹھ گیا۔ ابھی کمرے سے نکل کر سامنے والے خالی کمرے میں پہنچا تھا کہ کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکا یا اور جھانکا۔ یہ ماہین تھی۔ ٹراؤزر اور لمبی قمیص پر اس نے سفید جرسی پہن رکھی تھی۔ ریشمی بال شانوں پر بکھرے تھے۔ وہ برآمدے کی طرف آئی۔ یہاں ایک دیہاتی طرز کی رنگین پایوں والی چارپائی پر عمران خاموش بیٹھا تھا۔

"کیا بات ہے، نیند نہیں آ رہی؟" ماہین کی مدھم آواز سنائی دی۔

"ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔" عمران نے کہا۔

وہ قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ "مجھ سے ناراض تو نہیں ہو؟"

"نہیں ماہین! بس قسمت سے ناراض ہوں۔"

"اپنی قسمت کو بُرا کہتے ہو تو لگتا ہے عمران..... کہ مجھے بُرا کہہ رہے ہو۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں، کیا یہ بُری قسمت ہے؟"

"ساتھ ساتھ ہونے کے باوجود دور ہیں..... اور کسی وقت تو لگتا ہے ماہین کہ ایسا "ساتھ" زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔"

"میں نے اس کے لیے تم سے معافی مانگی تھی عمران اور میری مجبوری جان کر تم نے معاف بھی کر دیا تھا۔"

"مگر میں اپنے دل کا کیا کروں ماہی..... وہ تمہارے سوا کچھ سوچتا ہی نہیں..... میں اتنا کمزور کبھی نہیں تھا جتنا تمہارے حوالے سے ہو جاتا ہوں۔"

اس نے عمران کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور بڑی ادا سے اپنا سر اس کے کندھے پر ٹکا دیا۔ "عمران! تمہاری یہ ناراض خاموشی مجھے ایک کڑی سزا کی طرح لگتی ہے۔ پلیز مجھ پر رحم کرو..... بس تھوڑی سی مہلت دو مجھے۔ میرا دل کہتا ہے، کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔"

وہ اسی طرح اس کے کندھے سے لگے لگے اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔ اچانک اندر سے راشدہ کی آواز آئی۔ "ماہین..... ماہین کہاں ہو؟"

وہ دونوں ساتھ ساتھ ہی سوتی تھیں۔ ماہین کو قریب نہ پا کر وہ اسے پکارنے لگی تھی۔ ماہین جلدی سے عمران کا رخسار چوم کر کمرے میں چلی گئی۔ عمران اسی طرح بیٹھا رہا۔ دائیں بائیں دیکھ کر اس نے سگریٹ نکالا اور سلگا لیا۔

چند منٹ کا وقفہ دے کر میں باہر نکل آیا۔ مجھے دیکھ کر وہ تھوڑا سا چونکا اور سگریٹ بجھا دی۔ میں اس کے قریب جا بیٹھا۔ "ورزش کے لیے اٹھے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں..... لیکن کچھ جلدی اٹھ گیا۔ اور تم؟"

"بس ویسے ہی نیند نہیں آ رہی تھی۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "عمران..... ایک بات کہوں تم سے؟"

"جی..... حکم کریں۔"

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

وہ چونکا اور پھر اُلجھے ہوئے انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔ "دیکھو عمران! ماہین نے اپنی سخت گیر فیملی سے بغاوت کی ہے اور اس بغاوت کی بڑی وجہ تمہارا پیار ہی ہے۔ وہ اب لاہور میں نہیں بلکہ یہاں تمہارے ساتھ ہے تو کیوں؟ وہ تمہارا ساتھ چاہتی ہے۔ تم دونوں عاقل بالغ ہو۔ اگر چاہو تو باقاعدہ ایجاب و قبول کر کے ایک ہو سکتے ہو۔ جو خوشی مل رہی ہو، اسے حاصل کرنے میں زیادہ دیر اچھی نہیں ہوتی۔"

وہ ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کیا سمجھتے ہیں میرے لیے ماہین کو حاصل کرنا اتنا ہی آسان ہے؟''

''تو کیا رکاوٹ ہے۔ وہ اپنے مگیتر حشام سے ہمیشہ کے لیے منہ موڑ چکی ہے اور مجھے پتا ہے وہاں کوٹھ نوشیر کی اس کھوہ میں تم ایک دوسرے سے اظہار جرأت کر چکے ہو اور''

''اور آپ کو مکمل بات کا علم نہیں۔'' اس نے اداسی سے میری بات قطع کی۔

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

وہ کھوئے کھوئے لہجے میں گویا ہوا۔ ''وہ بے شک پیار کرنے لگی ہے مجھ سے، لیکن شادی نہیں کرے گی شادی تب کرے گی جب اس کے اہلِ خانہ راضی ہوں گے خاص طور سے اس کے چچا ثاقب اگر یہ نہ ہوا تو ساری عمر ایسے ہی گزار دے گی۔''

''عمران! یہ کیا قصے کہانیوں والی باتیں کر رہے ہو؟''

''مگر ماہین کے لیے یہ قصہ کہانی نہیں۔ وہ کہتی ہے اپنے چچا ثاقب کے سامنے وہ اپنی مری ماں کی قسم کھا چکی ہے۔ مر سکتی ہے مگر قسم نہیں توڑ سکتی۔''

اچانک ڈیرے سے کچھ فاصلے پر آوارہ کتے شور مچانے لگے۔ عمران کے اندر اپنے باپ سے جو صلاحیتیں منتقل ہوئی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ مختلف جانوروں کی عادات کو سمجھتا تھا اور جانور بھی اس کے لیے جیسے اپنے اندر کوئی نرم گوشہ رکھتے تھے۔ وہ ایک دم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ''کوئی خاص معاملہ ہے باہر۔''

پھر یوں لگا کہ کوئی وزنی چیز چھپاکے سے پانی میں گری ہو۔ بارشی پانی کا ایک چھوٹا سا گڑھا ڈیرے سے تیس چالیس قدم کے فاصلے پر موجود تھا۔ میں اور عمران تیزی سے احاطے میں آئے۔ میں نے احتیاطاً قمیص کے نیچے سے پستول نکال لیا تھا۔ احاطے میں مدفون پانچ بے نشان قبروں کے قریب سے گزرتے ہوئے ہم باہر آئے۔ ابھی اندھیرا چھٹا نہیں تھا۔ عمران نے ٹارچ کی روشنی ڈالی تو کتے تتر بتر ہو گئے۔

ہم لپک کر گڑھے کی طرف گئے۔ ٹارچ کی روشنی میں ایک شخص کا چہرہ نظر آیا۔ وہ کندھوں تک گڑھے کے یخ بستہ پانی میں تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ہم نے جلدی سے اسے باہر نکالا۔ وہ چھوٹی چھوٹی سیاہ داڑھی والا ایک قبول صورت نوجوان تھا۔ اس نے سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ پانی میں بھیگنے کے باوجود اس کی قمیص پر خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ وہ نیم بے ہوش دکھائی دیتا تھا۔

اس کے کندھے پر زخم ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''لگتا ہے گولی لگی ہے۔''

ٹارچ کے روشن دائرے میں اس کی پیشانی پر بھی گہری چوٹ نظر آئی تھی۔ ایک نیلگوں گومڑ سا بن گیا تھا۔

ہم اسے اٹھا کر اندر لے آئے اور اس چارپائی پر لٹا دیا جہاں پہلے ہم دونوں بیٹھے تھے۔ بجلی کی روشنی میں اچھی طرح اس کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ گولی کندھے کو چھیلتی ہوئی گزر گئی ہے۔ زیادہ گہرا زخم نہیں تھا۔ اس کی بے ہوشی کی اصل وجہ اس کی پیشانی والی گہری چوٹ ہی تھی۔ نیلگوں ابھار سے تھوڑا خون بھی رس رہا تھا۔ یہ خاصی سنگین چوٹ تھی۔ اب وہ مکمل طور پر بے ہوش دکھائی دینے لگا تھا۔

اتنے میں شاہ زیب، انوش اور راشدہ وغیرہ بھی اٹھ کر آ گئے۔ ہم نے اس شخص کی جامہ تلاشی لی۔ چابیوں کے ایک گچھے اور ایک بٹوے کے سوا کچھ نہیں ملا۔ بٹوے میں ڈیڑھ دو ہزار کے بھیگے ہوئے نوٹ تھے۔ اس کے علاوہ کسی اسکول کی اشتہاری مہم کا پمفلٹ تھا۔ ہم نے دیکھا کہ اس کی کہنیوں اور گھٹنوں پر بھی گہری خراشیں تھیں۔ کہنیوں پر سے قمیص پھٹی ہوئی تھی۔ اسی دوران میں ماہین بھی اپنے بال سمیٹتے آ گئی۔ بے ہوش نوجوان کو دیکھتے ہی وہ بُری طرح چونکی۔ ''اوہ مائی گاڈ، یہ یہاں کیسے؟'' اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

''تم پہچانتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی تو ہے چودھری شہباز اسلم کا بیٹا۔ فہد نام ہے اس کا۔ کئی دفعہ دیکھا ہے اسے حویلی میں۔ ہوا کیا ہے اس کو؟'' وہ ششدر تھی۔

میں نے اسے تفصیل بتائی۔ وہ سراسیمہ انداز میں بولی۔ ''باپ بیٹے میں سخت کشیدگی چل رہی تھی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ایک بار تو میرے سامنے جھگڑا ہوا تھا۔ وہی اسکول کے بنانے یا نہ بنانے کا معاملہ۔ چودھری اسلم نے کہا تھا، تم باز نہ آئے تو میں آخری حد تک جاؤں گا۔ یہ اسکول میرے جیتے جی نہیں بن سکتا۔''

چند سیکنڈ کے توقف کے بعد عمران نے پوچھا۔ ''مائی! کیا تم سمجھتی ہو کہ چودھری اسلم نے بیٹے پر گولی چلائی ہو گی؟''

''یقین سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر جس قسم کے یہ لوگ ہیں، یہ کوئی بڑی بات بھی نہیں۔ چودھری شہباز اسلم ضد کا پکا ہے اور اردگرد اسے بھڑکانے والے بھی بہت ہیں۔ سنا ہے کہ دو سال پہلے یہاں سے ٹرک گزرنے والی تھی، وہ بھی چودھری نے نہیں گزرنے دی تھی۔ ایک سرکاری اہلکار کو گولیاں مروا کر شدید زخمی کر دیا تھا۔''

"لیکن پھر بھی سگے اور اکلوتے بیٹے پر گولی چلانا یا چلوانا چودھری کے لیے آسان کام تو نہیں ہوگا۔" شاہ زیب نے کہا۔

ماہین ذرا جھک کر بولی۔ "شاہ زیب بھائی! میں نے حویلی میں چند دن گزارے ہیں اور چودھری اسلم کو بھی اچھی طرح جانا ہے۔ بہت خبیث آدمی ہے یہ۔ کچھ بھی بعید نہیں اس سے۔" پھر ماہین نے مجھے کمرے سے باہر آنے کا اشارہ کیا۔

میں اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں آیا تو وہ مجھے کچن میں لے آئی۔ یہاں ایک ڈولی نما الماری کے پیچھے اس نے ایک موبائل چھپا رکھا تھا۔ بولی۔ "انکل تابش! یہ چودھری کے دو موبائلز میں سے ایک ہے۔ میں حویلی سے نکلتے وقت اٹھا لائی تھی۔ اس میں چار جنگ ہے۔ آپ ذرا دیکھیں اسے۔ چودھری اسلم کی خصلت کا پتا چل جائے گا۔"

مجھے یاد آیا کہ چودھری شہباز اسلم کی حویلی سے ماہین نارنجی منگے والی ڈیوائس کے ذریعے ہم سے جو رابطے کرتی رہی تھی، ان سے کافی معلومات ملی تھیں۔ ایک روز ماہین نے بتایا تھا کہ چودھری میں شراب اور عورت کے علاوہ ایک اور بیماری بھی ہے۔

ماہین باہر چلی گئی۔ میں نے موبائل آن کیا۔ موبائل کھولتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ چودھری شہباز اسلم کس قماش کا بندہ ہے۔ وہ شادی شدہ ہونے کے باوجود نوعمر طوائفوں کا رسیا تھا۔ اس کے موبائل میں کچھ نوجوان ملازماؤں کی تصاویر بھی موجود تھیں۔ اس سے پہلے ماہین نے بھی بتایا تھا کہ حویلی میں کئی نوجوان اور اچھی شکل کی ملازمائیں ہیں۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ شاید وہ ان ملازماؤں کو بھی اپنی عیاشی کے لیے استعمال کرتا ہے لیکن موبائل کو مزید سرچ کرنے کے بعد ایک اور بات عیاں ہوئی۔ اسے خود تو ملازماؤں سے دلچسپی نہیں تھی مگر وہ ان ملازماؤں کو حویلی کے ہی ملازموں یا گارڈز کے ساتھ "دیکھنے" کا رسیا تھا۔ وہ انہیں نہ صرف نہایت نازیبا حالت میں دیکھتا تھا بلکہ وڈیوز بھی بناتا تھا اور یقیناً یہی وہ تیسری ملت تھی جس کا ذکر ماہین نے دبے الفاظ میں کیا تھا۔

دو چار آڈیو میسج بھی اس موبائل فون میں موجود تھے جن سے پتا چلتا تھا کہ باپ بیٹے میں نہ صرف ہائی اسکول کی تعمیر کے معاملے میں سخت اختلاف ہے بلکہ بیٹے کو اپنے ادھیڑ عمر باپ کی یہ رنگ رلیاں بھی شرمندہ اور پشیمان رکھتی ہیں۔

اتنے میں عمران کی آواز آئی۔ "چاچو! آجائیں یہ ہوش میں آرہا ہے۔"

میں نے موبائل کو جیب میں ڈالا اور کچن سے نکل کر کمرے میں پہنچا۔ بستر پر سیدھے لیٹے فہد کی آنکھیں نیم وا تھیں، چہرہ حریر سوج گیا تھا۔ اس کی ناک پیشانی پر بھاری پٹی باندھ دی گئی تھی۔ وہ ٹوٹے ہوئے الفاظ کے ساتھ کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ پہلوان حشمت نے چمچ سے اسے تھوڑا پانی پلایا۔ اس کی تدھم آواز سنائی دینے لگی۔ "میں کہاں ہوں۔ تم کون ہو؟"

میں نے اس کا بایاں کندھا ہولے سے تھپتھپایا۔ "پریشان نہیں ہونا۔ ہم دشمن نہیں، دوست ہیں۔ تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

جواب دینے کے بجائے فہد خالی خالی نظروں سے دائیں بائیں دیکھتا رہا۔ شاہ زیب سمجھ گیا کہ وہ اپنے اردگرد اتنے سارے افراد دیکھ کر پریشان ہے۔ شاہ زیب دوسروں کو اشارہ کرتے ہوئے خود بھی باہر چلا گیا۔ اب کمرے میں صرف میں اور عمران رہ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ کراہتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "آپ کون ہیں..... اور..... وہ سفید سویٹر والی لڑکی؟"

میں سمجھ گیا کہ وہ ماہین کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، وہ کراہا۔ "یہ تو حویلی میں تھی۔ ناچنے گانے والی ہے۔"

"نہیں فہد! ناچنے گانے والی نہیں۔" میں نے جلدی سے اسے ٹوکا۔ "یہ صرف ناچنے والی کے روپ میں تھی۔ ہم نے ہی اسے وہاں بھیجا تھا۔ حالات جاننا چاہتے تھے۔"

"کیا..... تمہارا..... تعلق پولیس سے ہے؟" اس کی آواز نقاہت سے بھرپور اور دھیمی تھی۔

"یہی سمجھ لو..... اور یہ بات بھی سمجھ لو کہ ہم تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب تم سب کچھ صاف صاف بتاؤ۔ تم پر گولی کس نے چلائی اور تمہارے سر پر اتنی سخت چوٹ؟"

اس کے ہونٹ پھر خشک ہو رہے تھے۔ عمران نے اسے فوراً پانی پلایا۔ وہ ذرا سنبھلا تو لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔ "آپ لوگ مجھ سے سچ جاننا چاہ رہے ہو..... مگر آپ خود سچ نہیں بول رہے ہو..... اگر..... آپ..... پولیس والے ہو..... تو پھر آپ کو اپنے ساتھی کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے تھا..... جو کل سے حویلی میں گھسا بیٹھا ہے۔"

"محکمے میں ضروری نہیں ہوتا کہ ہر اہلکار دوسرے اہلکار کی "ویئر اباؤٹ" جانتا ہو..... اور ملک فہد تم خواہ مخواہ

سوال جواب میں وقت ضائع مت کرو۔"

"ہم..... میرا خیال بھی یہی ہے۔ ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے..... میرے پاس..... نہ تمہارے پاس۔ میری سمجھ کے مطابق آپ کا تعلق انہی لوگوں سے ہے جنہوں نے پرسوں بہاولپور کی کسی کوٹھی پر ہلا بولا ہے....."

"تم پیچیدگیوں میں مت پڑو۔ مختصر بات کرو۔ تمہارا سانس بار بار پھول رہا ہے۔"

وہ کچھ دیر کراہنے کے بعد بولا۔ "وہ کسی بھی وقت مجھے ڈھونڈتا ہوا یہاں پہنچ سکتا ہے۔"

"کون؟"

"وہی پولیس والا۔"

فہد نامی یہ چھوٹا چودھری پڑھا لکھا تھا۔ اس نے ایگری کلچر میں ڈگری لی ہوئی تھی اور وہ ہماری آنکھوں میں اپنے لیے ہمدردی بھی دیکھ چکا تھا۔ غنودگی اور نیم غنودگی کی کیفیت میں اس نے رک رک کر ہمیں جو کچھ بتایا اور جو کچھ ہم نے اخذ کیا اس کا لب لباب یہ تھا۔

چودھری شہباز اسلم کی حویلی میں موجود پولیس والا کوئی اور نہیں وہی ڈی ایس پی عاقب ڈوگرے تھا جس نے مینشن پر آپریشن کلین اپ کا ڈراما رچایا تھا۔ اب ثابت ہو رہا تھا کہ وہ عالی جاہ اور اس کے ساتھیوں کا دست راست بنا ہوا ہے۔ لگتا یہی تھا کہ یہاں راہ پور گاؤں میں ڈوگرے کی موجودگی کی وجہ بھی ایل سی تنظیم کا معاملہ ہی ہے۔ مینشن میں تنظیم کے اجلاس میں جو دو کرسیاں خالی نظر آئی تھیں، ان میں سے ایک اسی عامرہ کی تھی جسے ایجنٹ کے طور پر چودھری اسلم کی حویلی بھیجا گیا تھا اور نہ صرف وہ خود گرینڈ میٹنگ میں نہیں پہنچی تھی بلکہ اسے لانے والے دو سینئر گارڈز بھی لاپتا تھے۔ ڈوگرے کو اسی معاملے کی تحقیق کے لیے یہاں حویلی بھیجا گیا..... مگر اس نے یہاں پہنچ کر ایک اور کارنامہ بھی انجام دیا۔ باپ کے ہاتھوں بیٹے کو قتل کرانے کی سنگین کوشش کی۔

فہد نے زخمی لہجے میں کہا۔ "وہ جو بھی ہے، میرا باپ ہے۔ میں اس پر گولی کیسے چلا سکتا تھا۔ ہاں کل رات..... ہم میں جھگڑا ضرور ہوا تھا۔ اسی جھگڑے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈوگرے کے بندے نے..... میری الماری سے میری شلوار قمیص چرا کر میرے ہی ریوالور سے ابا جی پر فائر کیا۔ وہ ایک اے ایس آئی تھا اور اس نے یہ سب کچھ ڈوگرے کے کہنے پر کیا..... والد نشے میں تھے..... غصے میں حواس کھو بیٹھے۔ وہ دہاڑتے ہوئے آئے اور مجھ پر گولیاں چلائیں۔ ایک یہاں میرے کندھے پر لگی۔"

"اور یہ ماتھے کی چوٹ؟" میں نے پوچھا۔

"جان بچانے کے لیے میں نے دوسری منزل کی کھڑکی سے چھلانگ لگائی..... میرا ماتھا پلر سے ٹکرایا۔ یہ میں جانتا ہوں..... یا میرا خدا..... کہ میں کس طرح حویلی سے نکل سکا۔"

"ملک فہد تم نے بتایا ہے یہ واقعہ رات دس بجے پیش آیا مگر تم صبح یہاں تک پہنچے۔"

"ڈی ایس پی ڈوگرے اور اس کا عملہ مجھے ڈھونڈ رہا تھا۔ ہماری حویلی کے گارڈز بھی ساتھ تھے۔ گارڈز کا تو پتا نہیں لیکن مجھے یقین ہے پولیس والے مجھے دیکھتے ہی شوٹ کر دیتے۔ میں کماد کے ایک کھیت میں چھپا رہا..... درد کی شدت سے لگتا تھا کہ سر پھٹ کر ہو جائے گا..... جب درد بہت بڑھ گیا..... تو میں کھیتوں کے اندر ہی ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتا اور کبھی رینگتا ہوا اس طرف آ نکلا کہ شاید..... کوئی مدد کر سکے۔" اس کی آواز بار بار ٹوٹ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں اور گھٹنوں پر رینگنے والی بات کا ثبوت وہ گہری خراشیں تھیں جو ہم اس کے جسم پر دیکھ چکے تھے۔

فہد کی آنکھیں گہری سرخ ہوتی جا رہی تھیں۔ منہ بھی بار بار سوکھ رہا تھا۔ تب اچانک اس پر کھانسی کا شدید دورہ پڑا اور اس کی آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھنے لگیں۔ شاہ زیب اور پہلوان حشمت بھی اندر آ گئے تھے۔ ہم میں سے کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کی حالت تیزی سے بگڑنے لگے گی۔ بلکہ وہ خود بھی کسی حد تک مطمئن نظر آتا تھا کہ موت کے مہلک گھیرے سے نکل آیا ہے۔ پہلوان حشمت نے مجھے اشارے سے باہر بلایا۔ دھیمی آواز میں بولا۔ "برادر! میرا تجربہ کہوت ہے کہ اس کے سر کی چوٹ ہمارے اندازے سے زیادہ سخت ہے۔ مجھے تو یہ بھی لگت ہے کہ اس کے سر کی سامنے والی ہڈی کو تریڑ آ گئی ہوئی ہے۔ ایسی چوٹ میں سر کے اندر خون جمع ہوتا رہوت ہے جو بعد میں جان کے لالے ڈال دیوت ہے۔"

پہلوان کے کہنے سے پہلے ہی شاہ زیب ایسے خدشے کا اظہار کر چکا تھا۔ مجموعی طور پر مجھے بھی صورت حال زیادہ تسلی بخش نہیں لگتی تھی۔ ماہین کے چلانے کی آواز آئی۔

"انکل تابش! دیکھیں ذرا۔"

ہم لپک کر کمرے میں پہنچے۔ فہد مکمل بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کی سانس کی آمد و رفت کے ساتھ خرخراہٹ کی بھاری آواز شامل ہوتی جا رہی تھی۔

"اسے فوراً اسپتال پہنچانے کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن کیسے جاسکتے ہیں۔ پولیس نے جگہ جگہ پھندے لگا رکھے ہیں۔" ماہین بولی۔

"میں لے کر جاؤں گا اسے۔" انوش جٹ سینہ تان کر بولا۔ "جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ فہد کی سانس رکنا شروع ہوگئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کا سر ایک طرف ڈھلکنے لگا۔ اس کو سی پی آر وغیرہ دینے کی کوشش کی گئی مگر —— دو تین منٹ کے اندر ہی اس کی حرکتِ قلب ختم ہوگئی —— ایک اور جواں مرگ، ایک اور خون —— اس کالی تنظیم کے بچھائے ہوئے جال کا ایک اور شکار —— میرا سینہ جلنے لگا۔ کئی لاشے یاد آئے۔ ساحلوں کی ہواؤں میں اُڑنے والی خوبرو شانزے، میرے دوست دل مراد کا پیارا بھائی اور اس کی بیوی۔ مولانا کریم کے دو بیٹے اور غیر ملکی بہو، وقاص کی مفلوج ماں جسے گولی کے بجائے کلہاڑیوں سے مارا گیا —— اور پھر —— وہ معصوم گلفام جو گلے میں بستہ ڈال کر خوشی خوشی پہلے دن اسکول گیا تھا —— آہ، اس کی پتلی پتلی ٹانگیں جنتے ملبے میں تھیں اور وہ پکار رہا تھا، انکل مجھے چھوڑ کر نہ جانا —— میں زندہ رہنا چاہتا ہوں انکل۔ میرے سینے کے انگارے فروزاں تر ہوگئے۔

یکایک ہم سب ٹھٹک گئے۔ کہیں قریب سے کچھ گاڑیوں کی آوازیں آنا شروع ہوگئی تھیں۔ میں اور عمران باہر نکلے۔ ڈیرے کی چار دیواری کے رخنوں میں سے جھانکا۔ کوئی گاڑی تو دکھائی نہیں دی لیکن آوازیں مسلسل واضح ہو رہی تھیں۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل پر پہنچے اور تب ہمیں کافی فاصلے پر جھاڑیوں اور کھیتوں کے پاس پولیس کی دو بڑی گاڑیاں دکھائی دیں۔ نیلے رنگ کی ایک جیپ بھی تھی۔ دو اہلکار ایسے بھی نظر آئے جو گھوڑوں پر سوار تھے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے گاڑیاں رک گئیں اور پندرہ بیس اہلکار دائیں بائیں پھیل کر جھاڑیوں میں گھس گئے۔ یقیناً یہ وہی اہلکار تھے جو رات سے فہد کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ فہد کی بات میرے کانوں میں گونجی۔ اس نے کہا تھا —— وقت نہیں ہے، نہ میرے پاس نہ تم لوگوں کے پاس۔ وہ لوگ کسی بھی وقت مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔

"وہ دیکھیں، وہ موٹا آفیسر بھی ہے۔" شاہ زیب نے دور جیپ کی طرف اشارہ کیا۔

ایک فربہ اندام پولیس والا اپنی موٹی توند پر پینٹ سنبھالتا ہوا جیپ سے باہر نکل آیا تھا۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر اہلکاروں کو ہدایات دے رہا تھا۔ فاصلہ کافی زیادہ تھا ہم اس کی آواز نہیں سن سکتے تھے۔ بہرطور اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ یہی وہ شخص ڈوگرے ہے جس نے مینشن پر دھاوے کا سہرا اپنے سر باندھا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مینشن کے جرائم پیشہ لوگوں کو ہر طرح کی سہولت بھی فراہم کی ہے۔

مسلح اہلکار گنے کے دو بڑے کھیتوں میں گھس گئے تھے۔ فصل کی اونچائی چھ سات فٹ تک تھی۔ وہ وہاں کا چپا چپا دیکھ رہے تھے۔ میرے سینے میں جو آگ بھڑکی تھی، اس کے شعلوں کو مسلسل ہوا مل رہی تھی۔ میں نے شاہ زیب سے کہا۔ "شاہ زیب! مجھے روکنا مت۔ میں اس پولیس افسر کو نہیں چھوڑوں گا۔"

میں نے اپنا پستول چیک کر کے دوبارہ قمیص کے نیچے لگا لیا۔ شاہ زیب نے چونک کر مجھے دیکھا پھر میرے لہجے کی حدت جان کر خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں۔ شاید وہ میرے بتائے بغیر ہی کافی کچھ سمجھ گیا تھا۔

میں ڈیرے سے باہر نکلا۔ شیشم اور کیکر کے درختوں کے اندر سے ہوتا ہوا بڑی احتیاط سے ان جھاڑیوں کی طرف بڑھا جو گنے کے کھیتوں کے اردگرد پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ سردیوں کے آغاز والی نرم دھوپ، درختوں اور جھاڑیوں سے چھن کر آرہی تھی —— بارشی گڑھے کے قریب سے گزر کر میں جلد ہی اس مقام تک پہنچ گیا جہاں جیپ میں وہ لحیم شحیم شخص بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا اور اہلکاروں کی کارکردگی پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک اے ایس آئی مؤدب بیٹھا تھا۔ میں بغیر آواز پیدا کیے جیپ کے پچھلے دروازے سے اندر داخل ہوا اور پستول کی نال ڈی ایس پی ڈوگرے کی کنپٹی پر رکھ دی۔ وہ بُری طرح بدکا۔ سگریٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اے ایس آئی بھی ہراساں نظر آیا۔ ڈوگرے نے اپنی چربی دار گردن کو حرکت دے کر بمشکل میری طرف دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر زلزلے کی کیفیت نظر آئی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ مجھے شکل سے پہچان چکا ہے۔ غالباً اس کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ اس طرح مجھ سے ملاقات ہوسکتی ہے۔ وہ تو بہاولپور سے دور اس گاؤں میں کسی اور مقصد کے لیے آیا ہوا تھا۔

اس ڈمی چوکیدار کو دیکھ کر کوئی نہ کوئی انسان ادھر ضرور آئے گا کئی روز ہو گئے مزے کا کھانا کھائے!

جیسا کہ بعد میں پتا چلا میری اور شاہ زیب کی تصویر ڈوگرے کے علاوہ کئی پولیس آفیسرز اور اہلکاروں کو دکھائی جا چکی تھی اور انہیں ہمارے بارے میں اہم معلومات بھی دے دی گئی تھیں۔ خاص طور سے میری گرفتاری پر تو غیر معمولی توجہ دی جا رہی تھی۔ مجھ پر سب سے اہم الزام یہی تھا کہ میں نے سردار حویلی کی قابلِ احترام نوجوان سردارنی کو اپنی غیر قانونی حراست میں رکھا اور تشدد کر کے ہلاک کر ڈالا۔ ایف آئی آر میں 302 کے علاوہ اور کئی سنگین دفعات شامل تھیں۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اس ہلاک شدہ سردارنی کو دو روز پہلے ہم شانے سیشن میں جیتا جاگتا دیکھ چکے تھے۔ شاہ زیب نے سیشن کے اندر جو وڈیو کلپ بنائے تھے، ان میں سے ایک دو میں گوہار زینت نظر بھی آئی تھی مگر فاصلہ زیادہ تھا اور روشنی ایسی تھی کہ وہ ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتی تھی۔

پستول کنپٹی پر آنے کے بعد ڈوگرے جیسے دبنگ شخص کے چہرے پر جو خوف دہر اس نظر آیا، اسے دیکھ کر دل کو سکون سا ملا۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ اپنے ہولسٹر کی طرف بڑھانا چاہا مگر میرے آتشیں تاثرات دیکھ کر ہاتھ کو جہاں کا تہاں روک لیا۔ میں نے گمبھیر آواز میں کہا۔ ”ڈوگرے! اگر تم نے مجھے پہچان لیا ہے تو ٹھیک پہچانا ہے۔ میں معطل ڈی ایس پی تابش ہی ہوں۔ تمہارا اہم منصب لیکن تم سے بہت مختلف۔ ہیکڑی دکھاؤ گے تو وارننگ دیے بغیر لاش بنا دوں گا۔“

مجھے اس کی توند تھرتھراتی محسوس ہوئی۔ گھنی مونچھوں کے نیچے اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اچانک اس کا اے ایس آئی نیچے جھکا۔ وہ ونڈ بریک کے پاس پڑا ماؤزر اٹھانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے پستول والا ہاتھ اتنے زور سے اس کی کنپٹی پر مارا کہ وہ کراہ کر رہ گیا۔ ضرب کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ اس کا کان قریباً نصف کٹ کر ایک طرف لٹک گیا۔ پستول پھر واپس عاقب ڈوگرے کی کنپٹی پر تھا۔ ونڈ بریک کے پاس پڑا ہوا ماؤزر میں نے اپنی قمیص کے نیچے لگا لیا تھا۔

ڈوگرے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

”کیا چاہتے ہو؟“

”فی الحال تو یہ چاہتا ہوں کہ جو سگریٹ تم نے نیچے گرایا ہے، اسے پاؤں سے بجھاؤ ورنہ روسٹ ہو جاؤ گے یا اس کا امکان پیدا ہو جائے گا۔“

سیٹ کے ربڑ سے دھواں نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے جلدی سے سگریٹ کو پاؤں سے مسلا۔ میں نے کہا۔ ”تو تم پوچھ رہے تھے کہ میں کیا چاہتا ہوں تو میری چاہت ہے کہ لاش کی صورت اختیار کرنے سے پہلے تم چند سانسیں اور لے لو۔ اگر میری چاہت سے اپنی چاہت ملانا چاہتے ہو تو اپنا فون اٹھاؤ۔“

اس نے غصیلی لیکن متوحش نظروں سے میری طرف دیکھا پھر اس کے اندر کے گھاگ نے اسے سمجھا دیا کہ میں واقعی اس کی کھوپڑی میں سوراخ کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔ اس نے اپنی رانوں کے بیچ اور توند کے نیچے رکھا ہوا موبائل فون اٹھایا۔

”میں نے دیکھ لیا ہے ڈوگرے، تیرے اہلکاروں میں انسپکٹر بھی ہے۔ اس کماد کے کھیت کی دوسری طرف وہی نظر آ رہا ہے۔ اسے فون لگاؤ۔ اسے کہو کہ اب یہاں رکنے کا فائدہ نہیں۔ وہ اپنی چنڈال چوکڑی کو لے کر برساتی نالے کی طرف

چلا جائے اور وہاں آس پاس کے گھروں کی تلاشی لے۔"

ڈوگرے چند لمحے تذبذب میں رہا پھر اس نے فون آن کیا۔ "اور ہاں، اسے کہو کہ تم ابھی اے ایس آئی کے ساتھ اسی ایریا میں ہو، بعد میں آؤ گے۔"

اندرونی اضطراب کے سبب ڈوگرے کی غیر معمولی بڑی اور گھنی مونچھیں تھرتھرا رہی تھیں، ماتھے پر پسینے کی نمی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اگر مزاحمتی رویے سے مجھے بھڑکائے گا تو مارا جائے گا۔ اس نے نمبر ملایا اور وہی کیا جو میں کہہ رہا تھا۔ میں نے دور قریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر اس کے انسپکٹر کو فون اٹھاتے اور ڈوگرے کی کال سنتے دیکھا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اے ایس آئی کا رنگ اب ہلدی تھا۔ پستول کی ضرب سے اس کے رخسار کی ہڈی نظر آ رہی تھی۔ لٹکتے ہوئے کان سے بہنے والا خون اس کے کندھے کے ساتھ ساتھ جیپ کی نشست کو بھی داغ دار کر رہا تھا۔ وہ لرزاں انگلیوں سے بار بار اپنے کان کو چھوتا تھا۔ میں نے اسے جیپ اسٹارٹ کرنے کا حکم دیا۔

جیپ اسٹارٹ ہوئی تو میں اسے جھاڑیوں اور درختوں کے اندر ہی گھما پھرا کر ڈیرے کے احاطے میں لے آیا۔ اے ایس آئی کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی اور جسم چھریرا تھا۔ اس کا نام فراست تھا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ڈوگرے کے ہی خاندان، برادری کا ہے۔

جیپ اندر آتے ہی انوش جٹ نے جلدی سے ڈیرے کا پھاٹک نما دروازہ بند کر دیا۔ چند سیکنڈ میں شاہ زیب بھی نمودار ہو گیا۔ مجھے فوراً پتا چل گیا کہ گوشت کا یہ ڈھیر جو ڈوگرے کی شکل میں میرے ساتھ بیٹھا ہے۔ شاہ زیب کو بھی پہچانتا ہے۔ وہ بار بار اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرنے لگا تھا۔ ہم دونوں کو جیپ سے نکال کر اندر لے آئے۔

اے ایس آئی کا لٹکا ہوا کان دیکھ کر راشدہ اور زافی کی آنکھوں میں خوف نظر آنے لگا تھا۔ شاہ زیب نے انہیں اندر بھیج دیا۔ اے ایس آئی فراست کے کان کے زخم سے اب خون رسنا بند ہو گیا تھا۔ چہلا ہوا رخسار بھی اب زیادہ خون آلود نہیں تھا۔ فراست نامی یہ جواں سال اے ایس آئی کافی پھرتیلا اور نڈر دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کسی زہریلے سانپ کی سی چمک تھی۔ وہ ڈوگرے کی اپنی برادری سے تعلق رکھتا تھا۔ اسے اور ڈوگرے کو میں علیحدہ کمرے میں لے آیا۔ شاہ زیب اور عمران بھی میرے ساتھ تھے۔ ڈوگرے اور اے ایس آئی کو چارپائی پر بٹھایا۔ ڈوگرے مسلسل مجھے گھورتا چلا جا رہا تھا۔

شاہ زیب نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "اے ایس آئی کا قد کاٹھ فہد جیسا ہے۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی ہے۔ لگتا ہے کہ فہد کے والد چودھری اسلم پر گولی اسی سے چلوائی گئی ہو گی۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں نے تائید کی۔

اس سے پہلے کہ میں اے ایس آئی فراست سے کوئی سوال کرتا، ڈوگرے دل کڑا کر کے بولا۔ "جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو اس کا نتیجہ تمہاری توقع سے کہیں زیادہ بُرا نکلنے والا ہے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ پولیس کی بھاری نفری چاروں طرف سے اس علاقے کو گھیر چکی ہے۔"

"کیوں گھیر چکی ہے یہ بھاری نفری؟" میں نے اطمینان سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تم لوگوں کے لیے۔۔۔"

"اچھا؟ تم بھی ہمیں ہی ڈھونڈ رہے تھے؟"

"اور کیا، یہاں دھوپ سینکنے آئے ہوئے تھے۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ تمہارا منہ گٹر کے دہانے جیسا ہے۔ جس میں سے بس گند اور جھوٹ ہی نکل سکتا ہے۔ تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں تمہاری ملاقات ہم سے ہو جائے گی۔ تم یہاں کسی اور کو ڈھونڈ رہے تھے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"تم یہاں چودھری شہباز اسلم کے بیٹے فہد کو ڈھونڈ رہے تھے تاکہ اپنے کسی باپ کی تمنا پوری کرنے کے لیے اسے گولیوں سے بھون سکو۔"

اس انکشاف نے ڈوگرے اور اس کے معاون کو ہلا کر رکھ دیا۔

"پتا نہیں تم کیا بولتے جا رہے ہو۔" ڈوگرے نے خود کو سنبھالنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اسی دوران میں نے دیکھا کہ ڈوگرے کا معاون فراست ایک خطرناک حرکت کے لیے پر تول رہا ہے۔ شاہ زیب والی چھوٹے پیرل کی آٹومیٹک رائفل دیوار پر آویزاں تھی۔ یہ لوڈڈ تھی۔ اتفاقاً فراست اس رائفل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بمشکل آٹھ دس فٹ کا فاصلہ ہو گا۔ اگر وہ جھپٹ کر رائفل اٹھا لیتا تو اس کا ایک برسٹ ہی اس کمرے کا سارا نقشہ بدل سکتا تھا۔ وہ گولی نہ بھی چلاتا تو گن پوائنٹ پر ہمیں بیک فٹ پر لا سکتا تھا۔

اس کی نیت بھانپ کر میں نے کہا۔ "کیا بات ہے بیٹا جی، رائفل پر جھپٹنا مارنا ہے؟"

اس کا رنگ ایک دم پھیکا پڑ گیا لیکن اگلے دو تین سیکنڈ میں دوبارہ سرخ ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، میں نے اسے آفر دی۔ ''چلو، اگر تمہیں شوق ہے تو کر لو پورا۔ پکڑ لو رائفل۔''

وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ اس کشادہ کمرے میں رائفل کے سب سے قریب وہی تھا — قریباً دس فٹ کا فاصلہ تھا جو کچھ بھی نہیں تھا۔ میں جس کرسی پر بیٹھا تھا، وہ رائفل سے کم و بیش بیس فٹ دور تھی۔ میں نے دوبارہ کہا۔ ''اب سوچتے کیا ہو؟ کر لو کوشش۔ میں دور بیٹھا ہوں۔ تم پاس ہو بالکل۔ اس کرسی سے اٹھتے اٹھتے بھی مجھے ایک سیکنڈ تو لگ ہی جائے گا۔''

اس نے میری آنکھوں میں چیلنج دیکھ لیا تھا۔ چہرہ کچھ اور سرخ ہو گیا۔ مجھے لگا کہ کسی شکاری عقاب کی طرح وہ رائفل کی طرف لپکنے کے لیے تیار ہے — اس کے ساتھ ساتھ شاید وہ میری اور اپنی عمر کا تقابلی جائزہ بھی لے رہا ہے۔

دروازے کے پاس کھڑے شاہ زیب نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ پھر فراست سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''چلو تمہیں ایک اور پیشکش کرتا ہوں۔ رائفل تک صرف پہنچ بھی گئے تو ہم پیچھے ہٹ جائیں گے۔ اپنے اس باسٹرڈ افسر کو لے کر جہاں چاہے چلے جانا۔''

یکا یک کمرے میں بجلی سی چمک گئی — اور میں اس بجلی کے لیے تیار تھا۔ فراست نے بے خوف ہو کر رائفل کی طرف جھپٹا مارا تھا۔ ابھی اُس کے ہاتھ رائفل کے دستے سے دور تھے کہ میرا بھرپور تھپڑ اس کے چہرے پر پڑا اور وہ اچھل کر دیوار سے جا ٹکرایا، پھر لڑکھڑا کر بیٹھ گیا۔ اس کی ٹیک دیوار سے لگ گئی تھی۔ آنکھوں میں حیرت نظر آ رہی تھی۔ کان کے زخم سے دوبارہ خون رسنے لگا۔ قطرے ٹپ ٹپ فرش پر گرے۔

''ایک اور کوشش کرنی ہے تو کر لو؟'' میں نے اسے سر کے بالوں سے جھنجوڑ کر پوچھا۔

وہ پٹر پٹر میری طرف دیکھتا رہا۔ اب ڈوگرے بھی جھاگ کی طرح بیٹھا نظر آتا تھا۔ درحقیقت وہ پہلے بھی جھاگ ہی تھا۔ صرف اپنی تن فن برقرار رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہاتھی جیسے جُثّے میں شیر جیسا دل ہو تو پھر ہی جُثّے کا فائدہ ہوتا ہے — اور مجھ پر تو انکشاف ہو رہا تھا کہ اس کے سینے میں شاید بکری قسم کے جانور کا دل دھڑک رہا ہے۔ اس کے ڈی ایس پی ہونے پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کی گھنی مونچھیں، اس کا چوڑا چکلا چہرہ، غصیلی آنکھیں، یہ سب ایک طرح کا بہروپ ہی محسوس ہوا۔ اس بہروپ کی سب سے بڑی گواہی اس کے چہرے کی رنگت تھی جو بالکل زرد پڑتی جا رہی تھی۔

تب اُس کے چہرے پر تھوڑی تکلیف کے آثار نظر آئے۔

''خیر ہے؟ تمہارا تھوڑا بگڑتا جا رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے چند گہری سانسیں لیں۔ ''میرا بی پی ہائی ہو رہا ہے۔ مجھے پانی دو، میڈیسن لینی ہے۔'' وہ اپنی کنپٹیاں مسل کر بولا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی چیسٹ پاکٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''رکو — رکو —'' شاہ زیب نے کہا۔

یقیناً میری طرح شاہ زیب کے ذہن میں بھی وہی شک جاگا تھا۔ ایل سی کے ہرکارے جب پھنس جاتے تھے تو اپنی جان لے لیتے تھے۔ یہ بھی کوئی ایسا ہی تعلق ہو سکتا تھا۔ عمران نے آگے بڑھ کر اس کی پاکٹ میں سے چھوٹا سا پلاسٹک پاؤچ نکال لیا۔ اس میں ''لوپرین'' اور ایزی ڈے نامی گولیاں تھیں۔ بظاہر تو یہ اصلی میڈیسن ہی لگتی تھی مگر رسک نہیں لیا جا سکتا تھا (بعدازاں یہ اصل گولیاں ہی ثابت ہوئی تھیں) پہلوان حشمت کے پاس ڈسپرین وغیرہ موجود تھی۔

شاہ زیب نے ڈوگرے سے کہا۔ ''اگر ڈراما کر رہے ہو تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اگر کچھ مسئلہ ہے تو پھر ہماری گولی سے کام چلاؤ۔''

ڈوگرے نے دو گولیاں نگلیں۔ اس دوران میں پہلوان حشمت نے چابک دستی سے تیز طرار اے ایس آئی فراست کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے تھے، وہ اب بالکل گم صم ہو گیا تھا۔

''میں واش روم میں جانا چاہتا ہوں۔'' ڈوگرے نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

میں نے عمران سے کہا۔ ''اچھی طرح اس کی تلاشی لو۔''

تلاشی کے بعد اسے واش روم بھیج دیا گیا۔

اس کا موبائل فون اب میرے پاس تھا۔ ہم نے موبائل فون کے اندر جھانکا تو کافی کچھ دیکھنے کو ملا۔ ایک فولڈر میں ڈوگرے کی دبنگ ساس اور بیوی کی تصویریں موجود تھیں۔ تھوڑے بھاری جسم کی جواں سال بیوی بھی اپنی ماں کی طرح دبنگ اور موقع پرست ٹائپ کی نظر آتی تھی۔ اس کی عمر تیس سال ہوگی، ڈوگرے کی اپنی عمر بھی پینتیس سال سے اوپر ہی تھی۔ تصویروں میں بیٹی کے علاوہ ماں نے بھی خوب گہنے پہنے ہوئے تھے۔

ایک کال کی ریکارڈنگ بھی ملی۔ یہ کال خود ڈوگرے اور اس کی بیوی کے درمیان تھی۔ ڈوگرے جو اب بالکل گم صم نظر آرہا تھا، بیوی سے بات کرتے ہوئے ہیرو شیر بنا ہوا تھا۔ بیوی کہہ رہی تھی۔ ''عاقب جی، تمہارے لیے بڑا سنہری موقع ہے، اسے ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہیے۔ ماما بھی یہی کہتی ہے۔''

''فکر نہ کرو بادشاہ زادی، اگر وہ دونوں اپنے ایریا میں آگے ہیں تو سمجھو موت گھیر کر لائی ہے انہیں۔ پہلے ناک سے لکیریں نکلوائیں گے پھر شوٹ کریں گے۔ بھون کے رکھ دیں گے ایک دو دن میں۔''

''اپنے ایریا میں تو وہ ہیں نا۔ کل مینشن والے ہلے گلے سے سارا ثبوت مل گیا ہے۔'' بیوی نے کہا۔

''میری جان! میں نے بھی کسی اور کے ذمے نہیں لگایا، خود ڈھونڈ رہا ہوں اُن کو۔ بس ان میں سے جو بھی نظر آیا، سمجھو گیا۔ یہ تو طے ہے کہ اس بھگوڑے ڈپٹی تابش کو تو موقع پر بھی ٹھنڈا کرنا ہے۔''

''لیکن تھوڑا سنبھل کر۔'' بیوی نے کہا۔

''سنبھل سنبھل کر آگے بڑھے تو پھر سمجھو نکل گئے وہ ہاتھ سے۔ بڑی لعنتی کریکٹر ہیں دونوں۔'' ڈوگرے پھنکارا۔

پانچ دس منٹ بعد جب ڈوگرے واش روم سے باہر آیا تو وہ اس ڈوگرے سے بالکل مختلف نظر آتا تھا جس کی آواز ابھی ہم ریکارڈنگ میں سن رہے تھے۔ اس کی گھنی مونچھیں لٹکی ہوئی تھیں اور ایسے ہی اس کا چہرہ بھی۔ اس کا موبائل ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔

نرم آواز میں مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میں اکیلے میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''یہاں سب اپنے ہیں۔ تم فرماؤ جو فرمانا ہے۔''

''کچھ خاص بات ہے۔''

''خاص بات تو تم نے اس فون میں کہہ دی ہے۔ ہم دونوں لعنتی کردار یہاں تمہارے ایریا میں موجود ہیں۔ پہلے تم ہماری ناک سے لکیریں نکلواؤ گے پھر گولی مارو گے۔''

اس کا رنگ کچھ اور پھیکا پڑ گیا۔ التجا آمیز لہجے میں اصرار کرنے لگا کہ علیحدہ ہو کر اس کی بات سن لی جائے۔

بالآخر میں اور شاہ زیب اسے ساتھ لے کر پہلو والے کمرے میں آگئے۔ اس کمرے میں چارپائی پر چودھری شہباز اسلم کے بیٹے فہد کی لاش چادر سے ڈھکی پڑی تھی۔ جہاں پیشانی پر مہلک چوٹ تھی وہاں چادر پر خون کے داغ تھے۔ ڈوگرے ذرا چونکا۔ ''یہ کون ہے؟''

''بتاتا ہوں، پہلے تم مجھے ایک بات بتاؤ..... چودھری اسلم پر تم نے جو گولی چلوائی تھی، وہ تمہارے اس اے ایس آئی نے ہی چلائی تھی نا جو اس وقت تمہارے ساتھ ہے۔''

وہ عجیب لہجے میں بولا۔ ''میں تمہارے ہر سوال کا بالکل درست جواب دوں گا تابش صاحب! سچی بات یہ ہے کہ میرا تمہارا کوئی مقابلہ نہیں۔ جو کچھ میں نے کہا اس کے لیے بھی شرمندہ ہوں، میں آپ دونوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہتا ہوں۔''

''دوستی دشمنی کی باتیں بھی ہوں گی لیکن پہلے میری بات کا جواب دو۔ گولی تمہارے اسی ماتحت فراست نے چلائی تھی نا؟''

میرا خیال تھا کہ وہ آسانی سے نہیں مانے گا مگر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''یہ سب مجھے کرنا پڑا، اوپر سے یہی آرڈر تھے۔''

''اوپر سے کون؟ مینشن والا عالی جاہ؟''

''نہیں..... میری ساس، رانی جان۔''

''تمہارا مطلب ہے رانی جان کا لنک مینشن والوں سے ہے؟''

''میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ رانی جان کو بھی کسی اور نے کہا ہو۔''

''فائر اس لیے کرایا گیا کہ باپ بیٹے میں لڑائی ہو؟''

''ایسا ہی ہے۔'' ڈوگرے نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''وہ لوگ اس لڑائی کو ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن شکر ہے کہ جانی نقصان نہ ہوا۔ چودھری کا بیٹا بچ نکلا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ علاقہ ہی چھوڑ گیا ہے۔''

''وہ علاقہ نہیں چھوڑ گیا..... دنیا چھوڑ گیا ہے۔ یہ اُس کی لاش پڑی ہے تمہارے سامنے۔'' میں نے فہد کے چہرے سے چادر ہٹائی۔

ڈوگرے کے بدن میں لرزش نمودار ہو گئی۔

''کک..... کس نے مارا اسے؟''

''تمہاری مکاری نے۔ باپ کی فائرنگ سے بچنے کے لیے اس نے دوسری منزل سے چھلانگ لگائی اور سر کی چوٹ اسے لے گئی..... خیر یہ نہ بھی ہوتا تو بھی تم نے اسے کب چھوڑنا تھا؟''

ڈوگرے کی گردن جھک گئی۔ کچھ دیر چپ بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھوں دور دور تک دکھائی نہیں دیتی تھی۔ عینکیں اور حلیے اکثر ایسے ہی دھوکا دیتے ہیں۔ بھاری مُچھ، گھنی مونچھوں اور شرابی آنکھوں کے ساتھ وہ بڑا دھڑلے دار افسر

دکھائی دیتا تھا لیکن حقیقت برعکس تھی۔ اس سے زیادہ دم خم تو اس کے اے ایس آئی نے دکھا دیا تھا۔

ڈوگرے نے اچانک میرا ہاتھ تھام لیا۔ میری اور شاہ زیب کی طرف ایک ساتھ دیکھ کر بولا۔ ”کچھ بہت خاص کہنا چاہتا ہوں آپ لوگوں سے۔۔۔ اگر آپ سننا چاہو تو۔۔۔“

”سناؤ۔۔۔ لیکن کوئی ناٹک نہیں چلے گا۔“ میں نے کہا۔

”ناٹک نہیں ہے۔ تصدیق کر لینا اور اگر تصدیق نہ ہو تو گولی مار دینا۔۔۔ میں لکھ دوں گا کہ اپنے سروس پستول سے خودکشی کر رہا ہوں۔“

”ہاں، کہو۔“

اس نے اردگرد دیکھا اور کہا کہ ہم دروازہ بند کر دیں۔

شاہ زیب نے عمران کو اندر بلا کر دروازہ بند کر دیا۔

وہ گہری سانس لے کر بدلے لب و لہجے میں گویا ہوا۔ ”تابش صاحب! یہ تو نہیں کہوں گا کہ آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں، پر آپ کو جانتا ضرور ہوں۔۔۔ میں آپ کے مقابلے کا نہیں ہوں، بلکہ میرے جیسا بندہ تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ آپ جیسے بندے سے ٹکر لے۔ آپ کو اپنا رازدار بنا رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ میرا راز۔۔۔ راز ہی رہے گا۔“

اس نے باقاعدہ میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگا دیے۔ میں رویے کی اس تبدیلی پر حیران تھا۔ اگلے چار پانچ منٹ کی گفتگو میں اس نے جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ وہ اپنی ساس رانی جان اور بڑی حد تک اپنی بیوی سے بھی بہت ناخوش ہے بلکہ اسے نفرت ہی کہنا چاہیے۔ رانی جان بہت زہریلی عورت تھی۔ اس کے تعلقات بھی بہت اوپر تک تھے۔ اس نے ڈوگرے کو اے ایس پی کے طور پر پولیس میں بھرتی کروایا اور ڈی ایس پی کے ریک تک پہنچایا۔ ڈوگرے کا کہنا تھا کہ وہ خود اس مزاج کا ہرگز نہیں ہے۔ پولیس میں جانے کے بجائے اپنا زمیندارا کرنا چاہتا تھا۔

یہ سب بتانے کے بعد ڈوگرے نے میری اور شاہ زیب کی جانب دیکھا اور انکشاف انگیز آہنگ میں بولا۔ ”اب آپ دونوں کو ایک ایسی اطلاع دینے جا رہا ہوں جس کے بدلے آپ دونوں کو نہ صرف میری جان بخشی کر دینی چاہیے بلکہ مجھے اپنا ایک حقیر سا دوست سمجھ لینا چاہیے۔“ اس نے پھر ایک گہری سانس لی اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میری ساس رانی جان کی کوٹھی میں اس وقت ایک خاص، بہت خاص بندہ موجود ہے اور وہ اس لیے موجود ہے کہ آپ دونوں یہاں موجود ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”شانے مینشن والے واقعے کے بعد ثابت ہو گیا ہے کہ آپ دونوں اپنے ساتھیوں سمیت بہاولپور میں موجود ہیں۔ اس لیے وہ بندہ بھی بڑی رازداری سے یہاں پہنچا دیا گیا ہے۔ وہ ایک بہت بڑا ”اِن کاؤنٹر اسپیشلسٹ“ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا اسکور 400 بندوں سے زیادہ ہے۔ مارنے والی مشین کہا جاتا ہے اسے۔ اسے آپ دونوں کے لیے آرڈر ہے۔ خاص طور سے تابش صاحب! آپ کے پیچھے تو وہ کافی دنوں سے ہے۔“

میرے ذہن میں وہ باتیں گردش کرنے لگیں جو کوئٹہ میں ہوئی تھیں۔ ماہین نے بھی یہ اطلاع دی تھی کہ میری مفروری کے بعد کسی بڑے اِن کاؤنٹر اسپیشلسٹ کو یہاں بلایا گیا ہے مگر پوری طرح یہ تصدیق نہیں ہوئی تھی کہ اس کا تعلق مقامی پولیس سے ہے یا کہیں اور سے۔ ماہین اس شخص کے حوالے سے بہت خوف زدہ بھی تھی۔

”تم نے اُسے دیکھا ہے؟“ عمران نے پوچھا۔

”نہیں، ابھی تک نہیں دیکھا۔“

”پھر تم یہ کیسے کہہ رہے ہو کہ وہ تمہاری ساس جی کی کوٹھی میں موجود ہے؟“

”یہی تو خاص بات ہے۔ وہ کوٹھی کی اینکسی میں ہے مگر وہاں دو تین روز سے چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔ کوئی بڑا پُراسرار سا کریکٹر ہے۔ بالکل علیحدہ رہتا ہے، اور میں نے سنا بھی ہے کہ وہ پاکستانی نہیں۔“

”غیر ملکی ہے؟“ شاہ زیب نے پوچھا۔

”میری اطلاع تو یہی ہے کہ اس کی ماں اسرائیلی ہے اور باپ انڈین۔۔۔ یا پھر ماں انڈین اور باپ اسرائیلی۔“

”مجھے تو شک ہوتا ہے کہ کوئی کہانی گھڑ رہے ہو؟“ شاہ زیب بولا۔

کچھ دیر بات ہوئی پھر میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”یہ بات ماننے والی نہیں کہ تمہاری ساس کا شانے مینشن والوں سے تعلق نہ ہو۔“

”میں سمجھتا ہوں کہ کوئی براہِ راست تعلق نہیں۔۔۔ ہاں ہو سکتا ہے کہ اس ایل سی تنظیم کے کچھ ہمدرد ساس سے رابطہ رکھتے ہوں۔“

”یہ ایل سی کیا ہے؟“ میں نے انجان بن کر دریافت کیا۔

”آپ سب کچھ جانتے ہو تابش صاحب! میرا امتحان لے رہے ہو۔“ اس نے ایک بار پھر خوشامدی انداز میں میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔

”اچھا چلو یہ بتاؤ کہ ایل سی کا مطلب کیا ہے؟“

''مجھے پکا پتا نہیں، جہاں تک مجھے پتا چلا ہے، اپل سے مطلب لوپو اوری سے مطلب کا سایا کارا سا ہے۔ یہ املی زبان کے لفظ ہیں۔ لوپو شاید بگیاڑ (بھیڑیا) کو کہتے ہیں، کچھ ایسا ہی سنا ہے میں نے۔''

''اب سب سے اہم بات تم سے پوچھنا چاہ رہے ہیں۔'' شاہ زیب نے کہا۔ ''اس بات کے صحیح جواب دیتے ہی پتا چلے گا کہ تم واقعی اب بھی دشمن ہو یا نہیں۔''

''میں نے تابش صاحب سے وعدہ کیا ہے کہ سچ بولوں گا۔'' اس نے ایک بار پھر میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگانے کی کوشش کی۔

''تم نے اوپر والوں کے کہنے پر مینشن میں جو ڈرامے بازی کی وہ اب ڈھکی چھپی بات نہیں۔ تم نے اصل کارروائی سے پہلے ہی ''ڈمی'' کارروائی کر کے ان لوگوں کو تحفظ دیا۔ ٹھیک ہے، ہم اس پر بات نہیں کرتے مگر یہ تو تمہیں بتانا پڑے گا کہ مینشن والا سارا اسیٹ اَپ اب کہاں منتقل ہوا ہے؟''

وہ بولا۔ ''مجھے ایک کاغذ اور قلم دیں۔ میں اس پر لکھ دیتا ہوں کہ میں اپنی جان خود لے رہا ہوں۔ آپ میرے ہی پستول سے مجھے گولی مار دیں۔ لیکن اوپر والے کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔''

''مگر کچھ لوگ مینشن سے گرفتار ہوئے ہیں۔ تم نے ٹی وی پر بھی گرفتاریوں کا بتایا تھا؟''

''وہ سب جھوٹ تھا۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ ''اس عمارت سے کوئی گرفتاری نہیں کی گئی تھی۔ بس شرقی بہاولپور کے پانچ چھ غنڈوں کو پکڑ کر یہ گرفتاری ڈال دی گئی تھی۔''

''اور جو مرے؟''

''خدا گواہ ہے۔ وہ وہی تھے جو آپ لوگوں کے ہاتھوں فائرنگ کے تبادلے میں مرے۔''

☆☆☆

چودھری شہباز اسلم کا بیٹا فہد لاش کی صورت ڈیرے پر موجود تھا۔ ایک طرح سے یہ اچھی لاش تھی جو ڈیرے کے احاطے میں دفن ہو سکتی تھی..... البتہ ہم نے اسے دفن کرنے کے بجائے براؤن جیپ کو اسٹارٹ کرنے کے بعد اس کے ''اے سی'' میں رکھ دیا تھا۔ یہ بات طے تھی کہ اب ہم زیادہ دیر اس ڈیرے کی پناہ میں نہیں رہ سکتے۔ ہمیں یہاں سے جانا تھا۔ انوش جٹ نے اس علاقے میں عرصہ گزارا تھا۔ وہ بہاولپور میں ہی ایک اور ٹھکانے کا انتظام تو کر چکا تھا مگر ابھی ہم وہاں جانے کا فیصلہ نہیں کر پائے تھے۔

رات کسی وقت شور کی وجہ سے میری آنکھ کھلی۔ یہ انوش جٹ تھا۔ وہ دہاڑ رہا تھا۔ ''تابش صاحب..... تابش صاحب!''

میں نے پہلو میں دیکھا۔ عمران اپنی چارپائی پر موجود نہیں تھا۔ بس اشفاق ہی تھا۔ جو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر اس کمرے میں جانا چاہا جہاں زخمی بہروزا، پہلوان حشمت، شاہ زیب اور انوش سوتے تھے۔ لیکن جب کمرے کا لوہے والا دروازہ کھولنا چاہا تو پتا چلا کہ وہ باہر سے بند ہے۔ اندازہ ہوا کہ انوش والا دروازہ بھی باہر سے بولٹ کر دیا گیا ہے۔ انوش آہنی گرل والی کھڑکی سے مجھے آوازیں دے رہا تھا۔ میں نے بھی کھڑکی سے آواز دی۔ ''کیا ہوا انوش؟''

''وہ دیکھو جی سامنے۔''

یہ پورے چاند کی رات تھی۔ ڈیرے کے احاطے سے آگے کیکر ٹاہلی کے درخت اور جھاڑیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں..... اور وہاں دو افراد برسرِ پیکار تھے۔ میں ششدر رہ گیا۔ ان میں ایک شاہ زیب اور دوسرا عمران تھا۔ شاہ زیب، عمران کو کسی امر سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا اور عمران اس کے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہا تھا۔ پھر اچانک شاہ زیب نے سٹپٹا کر ایک زوردار تھپڑ عمران کو جڑ دیا۔ وہ ذرا ڈگمگایا، پھر پنجوں کے بل اچھلا اور اس کے سر کی دھواں دھار ضرب شاہ زیب کے سینے پر لگی۔ عمران بے حد پھرتیلا اور کارگر فائٹر ہونے کے باوجود شاہ زیب کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ لڑائی خطرناک صورت اختیار کر سکتی تھی۔

میں نے کندھے کی ضربوں سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ اسی دوران میں انوش کی کوشش کام کر گئی۔ انوش کے کمرے والا دروازہ بھی وزنی تھا مگر لکڑی کا تھا۔ انوش نے اسے توڑ ڈالا۔ پھر لپک کر ہمارے کمرے کی طرف آیا اور اس کا دروازہ بھی باہر سے کھول دیا۔ ہم دوڑتے ہوئے احاطے سے باہر نکلے۔ تین چار زوردار چوٹیں کھانے کے بعد شاہ زیب نے عمران کو نیچے گرا دیا تھا۔ سخت گرفت کے باوجود عمران ہمت نہیں ہار رہا تھا۔ ایم ایم اے کے کسی ریفری کی طرح میں ایک ڈھال بن کر ان دونوں کے درمیان آ گیا۔ انوش اور اشفاق کے علاوہ پہلوان نے بھی کوشش کی اور ہم دونوں کو علیحدہ کرنے میں کامیاب رہے۔ عمران کے بدن میں بجلیاں سی کوند رہی تھیں۔ میں اسے بُری طرح جھڑکتا اور اپنے بازوؤں میں سمیٹتا ہوا واپس ڈیرے کے اندر لے آیا۔

اب راشدہ، زانی اور ماہین بھی اپنے کمرے سے نکل

ان تھیں اور سنسنسدر تھیں۔ حالات کو نارمل ہونے میں پانچ دس منٹ لگ گئے۔ مجھے اندازہ تھا کہ جو کچھ بھی ہوا ہے، اس میں غلطی اور جلد بازی یقیناً عمران ہی کی ہوگی۔ وہ اب بھی بہت غصے میں تھا۔ اگر اس کے سامنے شاہ زیب جیسا ماسٹر فائٹر نہ ہوتا تو بہت نقصان اٹھا جاتا۔ میں اس صورتِ حال سے سخت مایوس تھا۔

میں شاہ زیب کے پاس دوسرے کمرے میں پہنچا۔ اس نے ایک کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ یہ ایک کاپی سائز کاغذ کے چار پانچ ٹکڑے تھے جنہیں شاید ابھی ابھی شیشہ ٹیپ سے جوڑا گیا تھا۔ میں دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ عمران کی تحریر ہے۔

''یہ کیا ہے؟ کہاں سے ملا تمہیں؟''

شاہ زیب نے کہا۔ ''میں ابھی سویا نہیں تھا۔ چائے بنانے کے لیے کچن کی طرف گیا۔ میں نے عمران کو دیکھا، وہ برآمدے میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ پھر جھلاہٹ کے ساتھ اس نے یہ پیپر پھاڑ کر کوڑے والے ڈبے میں پھینکا۔ تب اس نے آپ کے اور ہمارے کمرے والے دروازے باہر سے بولٹ کر دیے۔ گرم چادر اوڑھ کر وہ احاطے میں آیا اور بغیر آواز پیدا کیے پھاٹک کا تالا کھولا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ اس نے پستول بھی اپنی قمیص کے نیچے لگایا ہے۔ میں نے کوڑے کے ڈبے میں سے کاغذ کے ٹکڑے نکالے۔ دو تین سطور ہی سمجھ میں آئیں جن سے اس کے ارادے کی تھوڑی بہت کاری ہوئی۔ میں تیزی سے اس کے پیچھے گیا۔ آواز دے کر اسے روکا۔ میں معلوم کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ تن تنہا ایسا خطرناک کام کرنے کا ارادہ کیوں کر رہا ہے۔ وہ کچھ بھی بتانے کو تیار نہیں تھا، نہ ہی رکنے کو تیار تھا۔ پھر بات بڑھ گئی اور آپ نے دیکھ ہی لیا ہے کہ کیا ہوا ہے۔ مجھے شرم آ رہی ہے کہ کس لیول پر آ گئے ہیں ہم۔''

میں نے کاغذ کی تحریر پڑھی۔

''چاچو جان! میں جو کچھ کر رہا ہوں، اپنی مرضی اور خوشی سے کر رہا ہوں۔ معاف کیجیے گا، مجھے کچھ دنوں سے یہی لگ رہا ہے کہ آپ کے نزدیک میری اہمیت کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اللہ نے چاہا تو ثابت کروں گا آپ پر آپ کے دوست کا بیٹا آپ کے لیے اتنا ہی کارگر ہے جتنا آپ کا دوست تھا۔ میں اس شخص کی طرف جا رہا ہوں جو آپ کو ٹارگٹ کرنے کے لیے یہاں لایا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی محبت کے طفیل مجھے کامیابی ملے گی لیکن خدانخواستہ خدانخواستہ مجھے کچھ ہو گیا تو آپ اور ماہین مجھے تہ دل سے معاف کر دیجیے گا۔''

آگے بھی ایک دو سطور تھیں مگر انہیں کاٹ کر ناقابلِ پڑھت بنا دیا گیا تھا۔

شاہ زیب کی طرح میں بھی سناٹے میں تھا۔ وہ ہمیں بتائے بغیر ایک ایسے شخص کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا تھا جس کے بارے میں کہا جا رہا تھا کہ وہ انسان کو مکھی کی طرح مارتا ہے ایک کلنگ مشین ہے۔

شاہ زیب نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''یہ کیا کر رہا ہے آپ کا عمران؟''

میں اسے کیا جواب دیتا۔ البتہ میرا خیال تھا کہ عمران کے اس شدید ردِعمل کے پیچھے کچھ نہ کچھ عمل دخل اس مایوسی کا بھی ہے جو ماہین کے حوالے سے اس کے اندر پیدا ہوئی ہے۔ عمران کی محبت کا جواب محبت سے دینے کے باوجود وہ اس سے کوسوں دور تھی۔

شاہ زیب سے بات کرنے کے بعد میں عمران کے پاس آ گیا۔ شاہ زیب سے جھڑپ کے دوران میں اس کے سر کے پچھلے حصے کا زخم پھر تازہ ہو گیا تھا۔ ماہین اور پہلوان حشمت پریشانی کے عالم میں اس کی ہینڈ ٹریٹمنٹ کرنے میں مصروف تھے۔ ماہین کی آنکھوں میں نمی تھی۔ ماہین اور پہلوان کی موجودگی کی پروا کیے بغیر وہ سگریٹ پھونک رہا تھا۔

☆☆☆

یہ تیسری شب کا ذکر ہے جہاں عمران جا رہا تھا، وہاں میں اور شاہ زیب جا رہے تھے مگر کسی اور طریقے سے کسی اور ڈھنگ سے۔ پچھلی سے پچھلی رات بڑی خاموشی اور رازداری سے ہم نے اپنا ٹھکانا تبدیل کر لیا۔ ڈیرے پر سے اپنی ساری نشانیاں مٹانے کی ہم نے پوری کوشش کی تھی۔ اب ہم گاؤں کے اس نواحی ڈیرے کے بجائے بہاولپور شہر کی ایک کشادہ کوٹھی میں تھے۔ اس کوٹھی کا انتظام بھی انوش جٹ کی محبوبہ میڈم مرینہ نے ہی کیا تھا۔ ڈوگرے اور اس کا اے ایس آئی فراست ابھی تک ہمارے ساتھ تھے۔ ہم ڈوگرے کی نیلی جیپ پر ہی یہاں پہنچے تھے۔ فراست کے اُدھڑے ہوئے کان کو بڑی رازداری کے ساتھ ایک پرائیویٹ کلینک سے ٹانکے بھی لگوائے جا چکے تھے۔ ڈوگرے ابھی تک پوری طرح ہمارا ساتھ دے رہا تھا۔ اس نے اپنے انسپکٹر کو ڈیرے کے بارے میں بتا دیا تھا تاکہ وہاں سے فہد کی لاش تحویل میں لی جا سکے، تاہم اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ اور فراست اب کہاں ہیں۔ دفن لاشوں کے بارے میں بھی ابھی تک صرف ہم ہی

جانتے تھے۔

عمران اب بھی گم صم نظر آتا تھا۔ اس کے سر کے عقبی حصے میں گردن کے پاس بھاری بینڈیج تھی۔ شام کے بعد زانی، کوٹھی کے خوب صورت باغیچے میں میرے پاس آن کھڑی ہوئی..... وہ اب عموماً مشرقی لباس میں ہی نظر آتی تھی۔ بال بھی اسی طریقے سے بنے ہوتے تھے۔ اس نے جو کچھ بتایا، اس سے تصدیق ہوئی کہ عمران بڑی حد تک جذباتی کشمکش کا بھی شکار ہے۔ زانی نے ڈیرے پر شاہ زیب اور عمران کی لڑائی سے چند گھنٹے پہلے اتفاقاً عمران اور ماہین کی گفتگو سنی تھی۔ ماہین رو دینے والے انداز میں کہہ رہی تھی۔ ''عمران! مجھے پتا ہے میں تمہیں بہت تکلیف دے رہی ہوں۔ تمہیں ناراض اور روٹھا ہوا دیکھتی ہوں تو دل ٹکڑے ہوتا ہے۔''

''تم کچھ زیادہ محسوس کر رہی ہو۔'' عمران نے کہا تھا۔

''مجھے سب پتا ہے۔'' وہ رُندھی آواز میں بولی۔ ''کسی وقت تو دل چاہتا ہے، ہر قسم بھول جاؤں۔ آنکھیں بند کر کے تمہاری خوشی میں اپنی خوشی شامل کر دوں۔ تمہاری ہر ناراضی ختم کر دوں۔ اس کے بعد.....'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

عمران نے فقرہ مکمل کرنے کو کہا تو عجیب لہجے میں بولی۔ ''اس کے بعد کنارے کے طور پر اپنی جان لے لوں، یا پھر کسی ایسی جگہ چلی جاؤں جہاں سے کبھی واپس نہ لوٹ سکوں۔''

عمران نے اسے جھڑک دیا تھا۔

یہ ساری باتیں زانی نے وضاحت سے سنی تھیں اور پھر اسی رات عمران نے اس کارروائی کا بھی سوچا تھا جس کے نتیجے میں ڈیرے کے سامنے عمران اور شاہ زیب کی لڑائی ہوئی۔

میں نے زانی کو سختی سے تاکید کی کہ وہ یہ سب کچھ اپنے تک ہی محدود رکھے گی۔

رات کو کوٹھی کے صاف ستھرے ڈائننگ روم میں ہم نے کھانا کھایا۔ راشدہ دیہاتی طرز کے لذیذ کھانے بنانے میں ماہر تھی۔ ڈوگرے بھی اس کھانے میں شریک تھا۔ ہاں عمران اور بہروز اپنے اپنے زخم کے سبب موجود نہیں تھے۔ ماہین بھی چند لقمے لے کر اٹھ گئی تھی۔ کھانے کے کچھ دیر بعد کامن روم کے اسٹائلش وال کلاک نے رات کے ساڑھے نو بجے کا وقت بتایا..... ہمارے لیے یہ ایکشن کی گھڑی تھی۔ میں اور شاہ زیب اُس اِن کاؤنٹر اسپیشلسٹ کے ''مزاج پوچھنے'' جا رہے تھے جو ہمارے لیے یہاں لایا گیا تھا۔

جب گھر کا بھیدی لنکا ڈھانے پر تُل جائے تو کیا نہیں ہو سکتا اور ڈوگرے تُلا ہوا تھا۔ وہ اپنی ساس کے اس قدر خلاف ہو چکا تھا کہ اسے کفن میں دیکھنا اس کی اولین خواہش بن چکی تھی۔ ڈوگرے کا کہنا تھا کہ اس عورت نے اپنے اردگرد کے ہر شخص پر کاٹھی ڈال رکھی ہے اور وہ بھی ہر وقت اسے اپنی پیٹھ پر سوار محسوس کرتا ہے۔ ڈوگرے کے مطابق وہ اب تک بیک بعد دیگرے چار شوہر کر چکی تھی۔ پہلے شوہر کے علاوہ باقی سب اس سے کم عمر ہی تھے۔ موجودہ شوہر بھی، جو چند اشتہاری فلموں میں آیا تھا، اس سے قریباً پندرہ سال چھوٹا تھا۔ ساس صاحبہ کم و بیش پینتالیس سال کی تھیں۔

کیل کانٹے سے لیس ہو کر میں اور شاہ زیب نیلے رنگ کی اسی کشادہ جیپ میں روانہ ہوئے جس میں ڈیرے کے قریب ڈوگرے میرے ہاتھ لگا تھا۔ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر اب ڈوگرے خود تھا۔ ہم دونوں اگلی نشستوں کے عقب میں اس طرح نیم دراز تھے کہ ہمیں آسانی سے دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ مزید احتیاط کے طور پر ڈوگرے نے ہمارے اوپر ریگزین کا ایک بڑا غلاف ڈال دیا۔ یہ اس جیپ کا ہی غلاف تھا۔

جیپ روانہ ہونے لگی تو ڈوگرے نے کہا۔ ''پتا نہیں کیوں میری آنکھ صبح سے پھڑک رہی ہے۔ عجیب پریشانی ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''تابش صاحب! میں جانتا ہوں آپ کوئی عام پولیس ملازم نہیں۔ آپ نے ایسے معرکے مارے ہیں جن کا ہم جیسے لوگ سوچ بھی نہیں سکتے۔ مگر جو بندہ اس وقت میری ساس کی کوٹھی میں موجود ہے، وہ پتا نہیں کہ انسان کا نطفہ ہے بھی یا نہیں۔ بڑی عجیب باتیں سنی ہیں اُس کے بارے میں۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی کیڑا مکوڑا اسے کاٹے تو مر جاتا ہے۔ وہ خود کو زہریلے سانپوں اور کالے بچھوؤں سے ڈسواتا ہے۔ چھوٹے ہتھیار کی گولی اس پر اثر نہیں کرتی.....''

''انڈیا سے ہے نا۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''وہاں تو ہو سکتا ہے کچھ لوگ اس کی پوجا بھی کرتے ہوں اور دعویٰ کرتے ہوں کہ وہ منہ سے آگ نکالتا ہے۔ ان باتوں کا تذکرہ پھر کسی وقت کرنا، فی الحال تم چلو۔'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔

یہ ویک اینڈ کی رات تھی۔ بہاولپور کی سڑکوں پر معمول سے تھوڑا زیادہ رش تھا۔ ایک ٹریفک سگنل پر ڈوگرے نے جیپ روکی تو مجھے ایک ہنڈا کار کی کھڑکی میں ایک جانی پہچانی شکل نظر آئی۔ میں اسے یہاں دیکھنے کی توقع

نہیں رکھتا تھا۔ یہ ماضی کا نامی گرامی بدمعاش سعود عرف سادو تھا۔ اس کا تعلق ملتان سے تھا۔ چار پانچ سال پہلے یہ اوجھل ہو گیا تھا، کہا جاتا تھا کہ کینیڈا میں کہیں ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے سگنل کھل گیا اور وہ آگے نکل گیا۔ اس کے بارے میں سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ ہم بھی قریباً دس منٹ میں شہر کے اس پوش علاقے کی کوٹھی میں پہنچ گئے جہاں ڈوگرے گھر داماد کے طور پر رہتا تھا۔ بیرونی گیٹ دیکھتے ہی عمارت کی شان و شوکت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ دیو ہیکل گیٹ پر کنکریٹ کی واچ پوسٹ تھی اور دو مسلح گارڈز تھے۔ ڈوگرے اور اس کی جیپ کو دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا گیا۔ ہم درختوں سے گھری ہوئی اس پُرشکوہ عمارت میں داخل ہوئے۔ عمارت کے اندر اور باہر درجنوں لگژری گاڑیاں موجود تھیں۔ سرو کے کئی درجن درخت ایک قطار میں تھے اور ان کے عقب میں روشنیاں اور قناتوں کی جھلک نظر آتی تھی۔ ڈوگرے کی اطلاع کے عین مطابق آج رانی جان کی کوٹھی میں ایک تقریب تھی۔

رانی جان کے ٹائپ کے لوگوں کو خوشی اور گیٹ ٹو گیدر کا کوئی بہانہ ہی چاہیے ہوتا ہے اور آج کا بہانہ یہی تھا کہ رانی جان کے اکلوتے داماد ڈوگرے نے شانے میشن میں بڑی ''دلیری'' سے زبردست کارروائی کی تھی اور ایک جرائم پیشہ گینگ کا ''تیا پانچا'' کر ڈالا تھا۔ اب ڈوگرے کے لیے ترقی اور تعریفی اسناد وغیرہ تو پلیٹ میں رکھی ہوئی چیزیں تھیں۔ اب اسی کی خوشی یہاں منائی جا رہی تھی۔

پلاننگ کے عین مطابق عاقب ڈوگرے نے اپنی جیپ عمارت کی نیم روشن انیکسی کے قریب درختوں میں کھڑی کر دی۔ اب ہم ایک طرف تو انیکسی کو دیکھ سکتے تھے۔ دوسری طرف وسیع سبزہ زار کا بڑا حصہ بھی دکھائی دیتا تھا جہاں رنگا رنگ تقریب برپا تھی۔ ہلکی سردی کے باوجود سبزہ زار میں شامیانے نہیں لگائے گئے تھے، صرف قناتوں کی چار دیواری بنا دی گئی تھی۔ ڈوگرے نے تاریکی میں جیپ ذرا اونچی جگہ پر کھڑی کی تھی۔ لہٰذا ہمیں سبزہ زار نظر آتا تھا اور وہ وسیع اسٹیج بھی جس پر پورا آرکسٹرا موجود تھا اور تین خوبرو رقاصائیں اپنے لباس درست کر رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد ایک اونچی لمبی عورت زرق برق لباس میں اسٹیج پر چڑھ آئی۔ ہتا کتا عاقب ڈوگرے کسی پالتو جانور کی طرح اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

''لو بھئی شاہ زیب، دیکھ لو رانی جان کو۔'' میں نے سرگوشی کی۔

سوبکف

میری طرح یقیناً وہ بھی حیران تھا۔ ہمارا خیال یہی تھا کہ چالیس پینتالیس سال کی رانی جان جو کچھ فربہ اندام بھی ہے ایک بے کشش سی عورت ہو گی۔ مگر اسے ٹھیک سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔ وہ اس عمر میں بھی پُرکشش اور رعب دار تھی، پوری طرح بھی سنوری ہوئی۔ جونہی وہ ڈگرے کو لے کر اسٹیج پر چڑھی، سبزہ زار میں میزوں کے گرد بیٹھے زیادہ تر لوگ کھڑے ہو گئے اور تالیوں سے دونوں کا استقبال کیا۔ رانی جان مائیک کے سامنے آ کر بڑے متکبرانہ انداز میں بولی تو اس کی اردو میں پنجابی لب و لہجے کی جھلک نمایاں تھی۔ ''بہنو بھائیو اور دوستو! میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہے کہ عاقب نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ایک ایسا کام کیا جس کے لیے کوئی دوسرا افسر شاید ہی تیار ہوتا۔ دیکھا جائے تو ہم سب اپنے ایسے ہی بہادر سپوتوں کی وجہ سے ہر رات چین کی نیند سوتے ہیں۔''

سبزہ زار تالیوں سے گونج اٹھا۔ دو افراد نے اٹھ کر رانی جان اور ڈوگرے کو پھولوں کے ہار پہنائے۔ رانی جان نے اپنے داماد سے زیادہ خود اپنی ذات پر تعریف و توصیف کے ڈونگرے برسا کر جب تقریر ختم کی تو بھاری بھرکم جسم والا ایک اور شخص اسٹیج پر چڑھ آیا۔ پتا چلا کہ یہ کسی بڑی مارکیٹ کی انجمن کا صدر ہے — اور ڈوگرے کی تاج پوشی کرنا چاہتا ہے۔ ایک طلائی تاج ڈوگرے کے سر پر لگایا گیا اور پنڈال پھر تالیوں سے گونج اٹھا۔ تاجر کی بیوی نے ایک جڑاؤ ہار رانی جان کے گلے میں بھی ڈالا۔ اس کے بعد رقص و سرود کی محفل کا آغاز ہوا۔ ہیجان خیز کپڑوں میں ملبوس لڑکیاں اپنے جلوے دکھانے لگیں۔ ان کا ڈانس بے ہودہ قسم کے پنجابی گانوں پر ہی تھا۔ من چلے گاہے بگاہے ان پر نوٹ بھی نچھاور کر رہے تھے۔ بجی سجائی خوب صورت میزوں پر جگہ جگہ شیشہ بھی گردش کرنے لگا تھا اور فضا میں دھوئیں کے ساتھ شراب کی بُو بھی محسوس ہو رہی تھی۔

اسٹیج کے سامنے لگژری نشست پر بیٹھی ہوئی رانی جان ہمیں جیپ کی ونڈو سے صاف نظر آتی تھی۔ میں نے شاہ زیب سے کہا۔ ''اس خوب صورت بلا کے پہلو میں بیٹھے گورے چٹے نوجوان کو دیکھو۔ لگتا ہے یہی موجودہ شوہر ہے اس کا۔''

''کافی بنا سنوار کر رکھا ہوا ہے اِسے — پیارے پالتو کی طرح۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

یکا یک میری نگاہ ایک اور بندے پر پڑی اور میں چونک گیا۔ ماہین نے گاؤں کے چودھری شہباز اسلم کا جو

موبائل اٹھایا تھا، اس میں شہباز اسلم کی تصویریں بھی موجود تھیں، اب وہی چودھری، رانی جان کے ساتھ والی میز پر بیٹھا تھا۔ تمتمایا ہوا چہرہ، کنپٹیاں سفید تھیں، سفید پگڑی اس کے گلے میں جھول رہی تھی۔ وہ آنسیں سیال مسلسل اپنے گلے میں انڈیل رہا تھا۔ شاہ زیب بھی اسے پہچان گیا اور بولا۔ ''یہ جس طرح پی رہا ہے لگتا ہے کہ ابھی کرسی سے گر پڑے گا۔''

''شاید بیٹے کی موت کا غم غلط کر رہا ہے۔''

چودھری شہباز اسلم نے اب بوتل اپنے ہاتھ میں تھام لی تھی اور کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ ڈگمگایا تو ایک ملازم نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ چودھری اسی طرح بوتل ہاتھ میں لیے لڑکھڑاتا ہوا اسٹیج پر چڑھ آیا۔ پگڑی اس کے پاؤں میں اُلجھ رہی تھی۔ ایک گانا ختم ہو گیا تھا اور دوسرا ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ تینوں ڈانسرز جنہوں نے پنجابی فلموں کی ہیروئنوں کی طرح ہیجان خیز قسم کے لاچے کرتے پہن رکھے تھے، ایک جانب کھڑی تھیں۔ چودھری جھومتا ہوا مائیک کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ شرابیوں کی طرح ہاتھ نچا کر بولا۔ ''میرا پُتر کیوں قبر میں چلا گیا ان خبیثوں، حرام زادوں کی وجہ سے گیا جو ہمارے سیدھے سادے دیہاتی لوگوں میں بے حیائی اور بے غیرتی پھیلانا چاہتے ہیں۔ جی اب اسکول کھلیں گے، انگریزی پڑھائی ہو گی، لڑکے، لڑکیاں عشق معشوقیاں کریں گے۔ نہیں چاہئیں ہمیں یہ بے حیائی کے اڈے..... نہیں چاہئیں۔''

وہ ڈگمگایا ایک سازندے نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔

وہ بہکی آواز میں بولا۔ ''اوئے ظالمو ہماری سیدھی سادی حیاتی میں زہر مت گھولو۔ ہم جس طرح جی رہے ہیں ہمیں جینے دو۔ مجھے نہیں چاہیے تمہاری یہ سڑک، تمہارا یہ انگریزی اسپتال اور اسکول۔ انہی چیزوں نے میرے پُتر کی جان لی ہے، میں اپنی جان بھی دوں گا پر یہ سب نہیں ہونے دوں گا۔''

اس نے طیش کے عالم میں کسی نادیدہ شخص کو ٹھوکر مارنے کی کوشش کی اور خود ہی گرتے گرتے بچا۔ حاضرین میں سے کسی نے چودھری کے جوش خروش پر تالیاں بجائیں، کسی دبلی آواز میں فقرہ کسا۔ ''دیکھو دیکھو کیسی مشکل مت ماری ان لوگوں نے میرے پُتر کی اس نے مجھ پر گولی چلائی، اپنے ہی باپ کو مارنا چاہا۔ یہ لوگ یہی کچھ سکھانا چاہتے ہیں سب کی اولادوں کو۔'' چودھری پھر اچھل اچھل کر مائیک کے سامنے آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دو تین ملازموں نے اسے سنبھال لیا تھا۔ اسی اثنا میں فربہ لیکن پُرکشش رانی جان پھر اسٹیج پر چڑھ آئی۔ قدرے سنجیدگی سے بولی۔

''چودھری اسلم اتنی پیتا نہیں ہے لیکن پُتر کا صدمہ ہے جو دوسری منزل سے گر کر جان سے گیا۔ اب یہ غم غلط کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر ''چودھری پیارے'' کا غم غلط کرنے کا صحیح طریقہ مجھے پتا ہے۔'' آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے وہ زیرلب مسکرائی تھی۔

پھر رانی جان نے تینوں رقاصاؤں میں سے سب سے کم عمر رقاصہ کو انگلی سے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ وہ گھنگرو چھنکاتی ہوئی جلدی سے حاضر ہو گئی۔ رانی جان پنجابی لہجے کی اردو میں بولی۔ ''نچ لے! چودھری جی کو لے جا اندر ان کو خوش کرنے میں کوئی کسر رہ گئی تو چنگا نہیں ہو گا۔ چل شاباش۔''

لڑکی نے ادب سے سر جھکایا اور چودھری کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہم جانتے تھے کہ چودھری کم عمر طوائفوں کا رسیا ہے۔ اب تو وہ ٹن بھی ہو رہا تھا۔ رقاصہ لڑکی کا لمس پاتے ہی وہ جھک سا گیا۔ لڑکی نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا مگر وہ پھر بھی ڈگمگا رہا تھا۔ دو ملازموں نے بھی چودھری کی مدد کی اور اسے سہارا دے کر پہلے اسٹیج سے اتارا پھر عمارت کے اندرونی حصے کی طرف لے گئے۔

اب دو رقاصائیں رہ گئی تھیں۔ وہ لباس تبدیل کر کے آئی تھیں اور اب ایک اور فحش گانے کے ساتھ اسٹیج سے اتر کر میزوں کے درمیان چکرا رہی تھیں۔ ہم جیپ کے اندر نیم دراز یہ سب مناظر ملاحظہ کر رہے تھے۔ مہمانوں میں ابھی تک ہمیں کوئی ایسی شکل نظر نہیں آئی تھی جس پر اس غیر ملکی ان کاؤنٹر اسپیشلسٹ کا شبہ کیا جا سکتا جو بقول ڈوگرے اس وقت اس کوٹھی میں موجود تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر ڈوگرے کی اطلاعات درست ہیں تو وہ خطرناک شخص اب بھی اینکسی میں ہی موجود ہے۔

''اب کیا پروگرام ہے؟'' شاہ زیب نے کہا۔

''یہ شراب شباب کی محفل تو اب شاید ختم ہونے والی ہے۔ اس کے بعد کباب یعنی کھانے پر توجہ ہو گی۔ مہمانوں کی رخصتی تک تو ہمیں انتظار کرنا ہو گا۔''

مرغن کھانوں کی خوشبو جیپ کے اندر تک پہنچنا شروع ہو گئی تھی۔ پھر باوردی ویٹر میزوں کے درمیان چکرانے لگے۔ اب قدرے شریفانہ موسیقی کو موقع دیا جا رہا تھا۔ عارف لوہار کی آواز پنڈال میں گونج رہی تھی۔ اِک پھل

موتیے دامار کے جگا سو پلیے.....

یہ ''بار بی کیو'' ٹائپ کھانا تھا۔ پنڈال میں جگہ جگہ لوہے کی انگیٹھیاں بھی دہک رہی تھیں۔ کھانے کے بعد مہمان رخصت ہونا شروع ہو گئے۔ میرے ساتھ ساتھ یقیناً شاہ زیب کے دل کی دھڑکن بھی بڑھ گئی تھی۔ ایکشن کا وقت قریب آ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد قناتوں سے گھرے ہوئے پنڈال یعنی سبزہ زار میں بس گنے چنے افراد ہی باقی رہ گئے۔ رانی جان، اس کا جوان خوبرو شوہر جس کا نام بعد میں پرویز خالد معلوم ہوا، اس کے علاوہ ڈوگرے، اس کی بیوی..... رانی جان کا ایک دراز قد بیٹا جو خیر سے رانی جان کے شوہر کا ہی ہم عمر ہوگا۔ دس پندرہ خاص مہمان بھی ابھی اسٹیج کے اردگرد ہی موجود تھے۔ ان میں دو تین وکیل، پانچ چھ بیوروکریٹ ٹائپ کے لوگ اور چند تاجر پیشہ حضرات تھے۔

اچانک وہ ہوا جس کی ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی۔ تڑتڑ کی زوردار آواز آئی۔ پہلے تو یہی لگا کہ شاید ڈوگرے کی تاج پوشی کی خوشی میں کسی نے ہوائی فائرنگ کی ہے لیکن یہ ہوائی فائرنگ ہرگز نہیں تھی۔

مین نے ایک بادردی بیرے کو کمر پر گولی کھا کر اوندھے منہ رانی جان کے شوہر پرویز کے قریب گرتے دیکھا پھر ایک اور مہمان کو گولی لگی۔ ایک دم ہی جیسے طوفان سا برپا ہو گیا۔ قریباً ڈیڑھ درجن مسلح افراد دندناتے ہوئے تقریب والی جگہ پر گھس آئے۔ وہ للکارے مار رہے تھے اور فائرنگ کر رہے تھے۔

''اوہ گاڈ! یہ تو وہی بندہ ہے۔'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''کس کی بات کر رہے ہیں؟'' شاہ زیب نے پوچھا۔

''اس لمبے بالوں والے کو دیکھو، جس نے کاشکوف پکڑ رکھی ہے۔ اس کا نام سعود عرف سادو ہے۔ یہ سادو گینگ کا سرغنہ ہے۔ بہت سفاک شخص۔ ابھی رستے میں، میں نے اس کی جھلک دیکھی تھی۔''

ابھی میری بات منہ میں ہی تھی کہ سعود عرف سادو نے سیدھا برسٹ چلایا۔ ایک رقاصہ تڑپ کر اسٹیج کے قریب گری، کم از کم دو گولیاں رانی جان کے دراز قد بیٹے کے سر اور سینے میں لگیں، وہ بھی رقاصہ کے اوپر ہی جا گرا۔ ہر طرف کہرام مچ گیا۔ لوگ چاروں طرف بھاگنے لگے، میزیں الٹ گئیں رانی جان کا ایک مسلح گارڈ گولی کھا کر ہماری جیپ سے صرف پندرہ بیس فٹ کے فاصلے پر گرا۔

یوں لگتا تھا کہ حملہ آوروں کی تعداد اور ان کا جدید ترین

ایک سادہ طبع نوجوان کی کہانی..... جو نامساعد حالات کی طنابیں گرفت میں رکھنا جانتا تھا۔

وادی مہران کے ایک دور دراز خطے سے جس کا تعلق تھا.....

ایک پراسرار واقعے نے اس کی زندگی کا رخ ہی بدل دیا

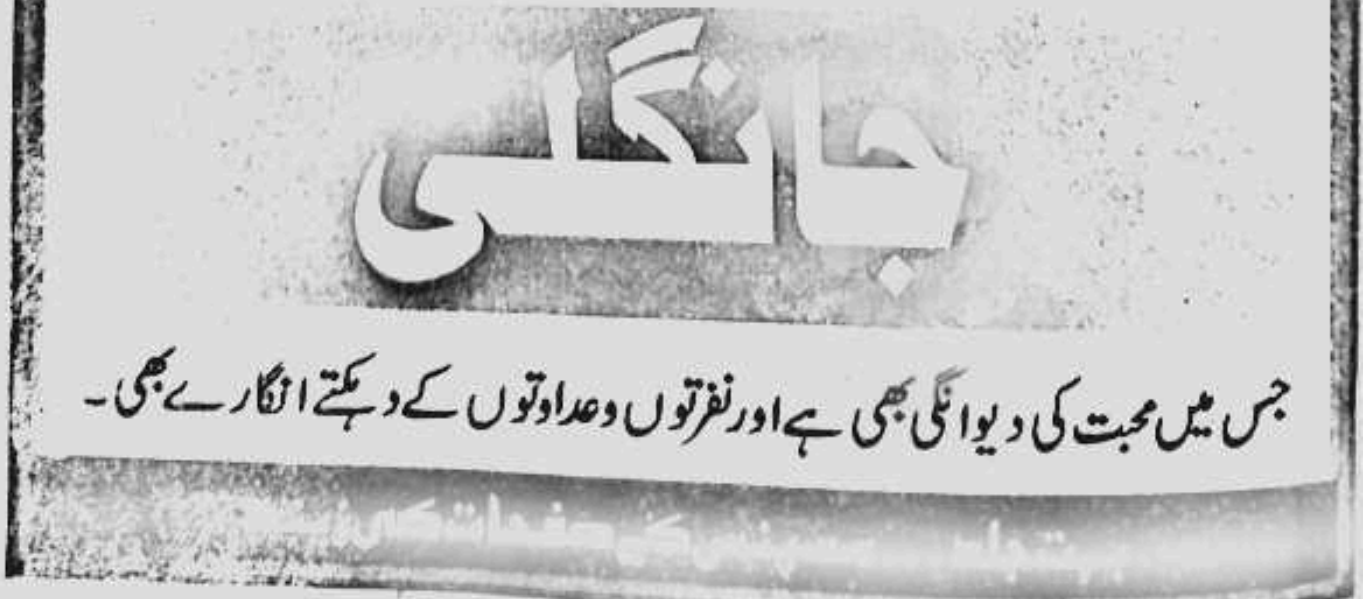

جس میں محبت کی دیوانگی بھی ہے اور نفرتوں وعداوتوں کے دہکتے انگارے بھی۔

اسلحہ دیکھ کر کوٹھی کے چار پانچ گارڈز کونے کھدروں میں چھپ گئے ہیں۔ رانی جان جو اسٹیج کے پیچھے اوجھل ہوگئی تھی، جوان بیٹے کو گرتے دیکھ کر چلاتی ہوئی سامنے آئی اور لہولہان بیٹے کے اوپر جھکی۔ لمبے سیاہ بالوں والے قوی ہیکل سعود عرف سادو نے اسے سر کے بالوں سے جکڑ کر کلاشنکوف کا بیرل اس کی پیشانی سے لگا دیا۔ اس کی گرج دار آواز گونجی۔ ''مر گیا ہے یہ..... اور اب تیری باری ہے رانی جان۔''

یکا یک رانی جان کی فربہ اندام بیٹی نے ایک حملہ آور کے ہاتھ سے گن چھین لی، اس نے سادو کو نشانہ بنانا چاہا مگر اس سے پہلے ہی سادو کی چلائی ہوئی دو گولیاں اس کے سر میں لگیں اور وہ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہوگئی۔

ڈوگرے آگے بڑھا تو اسے بھی حملہ آوروں نے جکڑ کر زمین پر گرا دیا۔ وہ اپنی بھاری بھرکم توند کے بل گرا تھا، ایک رائفل کی نال اس کی گدی سے آ لگی۔ رانی جان کے جواں سال شوہر نے مزاحمت کی کوشش کی مگر اسے بھی گن پوائنٹ پر کر کے گھاس پر اوندھا لٹا دیا گیا تھا۔

کسی اور عورت کے سامنے ایسا خون خرابا ہوتا اور اس کے بیٹے بیٹی کی جان جاتی تو وہ شاید بے ہوش ہو چکی ہوتی مگر رانی جان کے چہرے پر خوف کے بجائے غیظ و غضب کے شعلے تھے۔ وہ گرج رہی تھی اور سادو کو اردو و پنجابی کی منتخب گالیاں دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ خود کو چھڑانے کی اندھا دھند کوشش بھی کر رہی تھی۔ اس کے طلائی زیورات ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گر رہے تھے۔

سادو دہاڑا اور تیس چالیس فٹ دور سے اس کی آواز ہم تک پہنچ گئی۔ ''رانی جان تیرا پرانا شوہر ہوں، پرانے چاولوں اور پرانی شراب کی طرح اب بھی تجھے بہت مزہ دے سکتا ہوں۔''

رانی جان نے اس پر گالیوں کی بوچھاڑ کی..... اور سادو کی ناف میں ٹانگیں رسید کیں، وہ جیسے دیوانی ہو رہی تھی۔

سادو پھر دہاڑا۔ ''تو نے کیا سمجھا تھا..... چلا گیا تو بس چلا گیا۔ باہر جا کر بھول گیا ساری دشمنی..... سادو اپنی دشمنی نہیں بھولتا۔ تجھ پر ایک دفعہ تھوکا تھا، دوبارہ بھی شاید تھوک دیتا، لیکن اس پراپرٹی کو کیسے بھولتا جو تو نے طلاق لینے کے بدلے میرے نام کی تھی۔ پوری چار مربعے تھی، پوری چار مربعے۔''

رانی جان نے اس پر پھر گالیوں کی بوچھاڑ کی۔

وہ پھنکارا۔ ''اب چار مربعے نہیں، نہر والے سارے دس مربعے لوں گا تجھ سے اور جب تک یہاں ہوں تجھے اپنے پاس بھی رکھوں گا۔'' اس نے کلاشنکوف کے دستے سے ہی رانی جان کا گال سہلایا۔

یہی وقت تھا جب بدبختی چودھری اسلم کو بھی اس ہنگامے کی طرف لے آئی۔ وہ اب بھی نشے میں دھت تھا۔ صرف بنیان اور شلوار پہنے ہوئے تھا۔ وہ پتا نہیں کہاں سے ایک سیمی آٹومیٹک رائفل اٹھا لایا تھا۔ شراب اور شباب کے نشے کے سبب اسے صورتِ حال کی سنگینی کا ٹھیک سے اندازہ نہیں تھا، اس نے ایک بھڑک نما آواز نکالی۔ شاید سادو سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر اس سے پہلے ہی غضب ناک سادو نے اس کے سینے میں سوراخ کر دیا۔ سفید بنیان پر سرخ پھول نمودار ہوا۔

ایک سیاہ جیپ قنات کی حد بندی توڑتی ہوئی سبزہ زار میں آ گئی۔ یہ سادو کے ساتھیوں کی جیپ تھی۔ سادو، رانی جان کو گھسیٹتا ہوا جیپ کی طرف بڑھا۔ اس کے دو ننھے کتے ساتھی اس کام میں ہاتھ بٹانے لگے۔ وہی رانی جان جو کچھ ہی دیر پہلے بڑی شان سے اسٹیج پر اپنے داماد کے ساتھ ساتھ اپنی فیملی کے قصیدے بھی پڑھ رہی تھی اور جس کا جاہ و جلال دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا اب گھاس پر گھسیٹی جا رہی تھی۔

جو کچھ بھی تھا اب ہم چپ نہیں رہ سکتے تھے۔ میں اپنے پہلو میں لیٹے شاہ زیب کی بے چینی صاف محسوس کر رہا تھا۔ ''کیا خیال ہے، نکلا جائے باہر۔'' میں نے پوچھا۔

''اس کے سوا چارہ نہیں۔'' شاہ زیب نے اپنی اے کے 47 کو اپنے ہاتھ میں کرتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ ہم اپنی سوچ کو عمل میں بدلتے، ایک بجلی سی کوند گئی۔ کوٹھی کی نیم روشن انیکسی کی طرف سے ایک ہیولا سا لپکا۔ جیپ کی ادھ کھلی کھڑکی سے میں نے دیکھا، وہ درختوں میں سے ہوا کی طرح گزر کر سبزہ زار میں پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی گن تھی۔ گن کا مہلک قہقہہ ابھرا اور کوٹھی کے در و دیوار میں گونجتا چلا گیا۔ میں نے سادو کے تین چار ڈشکروں کو زمین بوس ہوتے دیکھا۔ جب یہ قہقہہ دوسری بار گونجا تو رانی جان کو گھاس پر گھسیٹنے والے دو بندے مزید گرے۔ سادو کی ٹانگوں میں بھی گولیاں لگیں۔

سادو کو زخمی ہوتے دیکھ کر دو ڈشکرے عقب سے اس ہیولے پر ٹوٹ پڑے۔ اگلے ایک دو منٹ میں ہم نے جیپ کے اندر سے جو کچھ دیکھا، وہ ناقابلِ یقین تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ مارشل آرٹ وغیرہ سے آگے کی کوئی چیز ہے۔ تین چار بندوں کی ہڈیاں ٹوٹیں کچھ ویسے زخمی ہوئے اور باقی اپنے سرغنہ سادو کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

''یہ کیا بلا ہے؟'' شاہ زیب بڑبڑایا۔

وہ ٹھیک ٹھاک قد کاٹھ رکھتا تھا۔ اس نے گرے رنگ کا ایک چست لباس پہن رکھا تھا۔ بال گھونگریالے اور لمبے تھے۔ اس کی رنگت گہری سانولی تھی مگر آنکھوں کا رنگ مختلف تھا جو دور سے صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

رانی جان اب بکھرے بالوں کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ کبھی اپنے بیٹے اور بیٹی کی لاشوں کے ساتھ چمٹ کر روتی تھی، کبھی زخمی پڑے سعود عرف سادو کی طرف آتی تھی اور اس کو ٹھوکریں مارتی تھی۔ سادو کی دونوں ٹانگیں لہولہان تھیں۔ یہ سب کچھ ہم سے بس چالیس پچاس فٹ کی دوری پر ہو رہا تھا۔ کوٹھی کے کونے کھدرے میں چھپے ہوئے گارڈز بھی اب اڑی اڑی رنگت کے ساتھ سبزہ زار میں آ گئے تھے۔

سادو یقیناً اپنی موت کو سامنے دیکھ چکا تھا۔ وہ گھاس پر پھیل کر لیٹ گیا جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو، جو کرنا ہے اب جلدی کر گزرو۔

گرے لباس والے اس تنومند شخص نے جب گھوم کر ایک جدید رائفل رانی جان کی طرف بڑھائی تاکہ وہ اپنے ہاتھوں اپنے دشمن کو مار سکے تو ہمیں ایک تیز لائٹ میں اس شخص کا چہرہ وضاحت سے نظر آیا۔ وہ واقعی چار سو سے زائد لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والے شخص کا چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ گہرے سیاہ رنگ پر اس کی گہری براؤن آنکھیں ایک ایسا امتزاج پیدا کرتی تھیں جو سمجھ میں آتا تھا نہ ذہن میں سماتا تھا۔ لگتا تھا کہ یہ بڑی بڑی آنکھیں زبردستی اس کے چہرے پر لگائی گئی ہیں۔

اس کی بھرائی ہوئی سی مدھم آواز ہمارے کانوں تک پہنچی۔ ''میڈم پار کردو اسے۔''

''اسے اتنی آسان موت نہیں دینی چاہیے۔'' رانی جان نوحہ کرنے والے انداز میں بولی۔

''لیکن مشکل موت دیتے دیتے یہ موت سے بھی بچ سکتا ہے۔'' اس شخص نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے رائفل کا بیرل سادو کی طرف سیدھا کر دیا جو رانی جان نے تھام رکھی تھی۔

چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد رانی جان نے دو مرتبہ سادو کے منہ پر ٹھوکا اور پھر اس پر سنگل فائر کرتی چلی گئی۔ میں گن رہا تھا، اس نے چھ گولیاں سادو کے جسم میں اتاریں اور اسے ٹھنڈا کر دیا۔

سیاہ رنگت اور گہرے بادامی آنکھوں والے نے، رائفل رانی جان کے ہاتھوں سے لے لی اور اسے رومال سے صاف کر کے سادو کے ایک مردہ دشمن کے ہاتھ میں دے دیا۔

رانی جان کا شوہر پرویز آگے آیا، وہ اس سے لپٹ کر ہچکیوں سے رونے لگی۔ پرویز بھی اشک بار تھا، اس کے ساتھ ساتھ وہ ممنون نگاہوں سے سیاہ رنگت والے کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ شوہر سے جدا ہو کر رانی جان پھر بیٹے کی لاش سے لپٹ گئی۔ وہ اس وقت چونکی جب دوبارہ فائر کی آواز آئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، اس کا جواں سال شوہر پرویز کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گھاس پر گر رہا تھا۔ سیاہ رنگت والے نے عین اس کی پیشانی پر گولی ماری تھی۔

رانی جان اور اس کے ساتھی سکتہ زدہ کھڑے تھے جب سیاہ رنگت والے نے دوسری گولی ڈی ایس پی ڈوگرے کو ماری، وہ بھی پُرشور آواز سے ایک طرف گرا۔ تیسری گولی سیکیورٹی گارڈز کے انچارج کی آنکھوں کے عین درمیان لگی جو رانی جان کے عقب میں کھڑا تھا، وہ ایک سلگتی ہوئی بڑی اگیتھی کے اوپر گرا اور اس کا ''باربی کیو'' شروع ہو گیا۔

سب جیسے گنگ ہو کر رہ گئے تھے۔ رانی جان تو بالکل پتھر کا بت تھی۔ ''میڈم! سب سے بڑے دشمن اپنے ہی ہوتے ہیں۔'' سیاہ چہرے والے نے بھرائی ہوئی نہایت کرخت آواز میں کہا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا واپس کوٹھی کی انیکسی کی طرف چلا گیا۔

کچھ دیر بعد جب سکتہ ٹوٹا تو رانی جان کی آہ و بکا کچھ اور بلند ہو گئی۔ وہ عجب انداز میں واویلا کر رہی تھی جیسے سمجھ نہ پا رہی ہو کہ کیا کہے اور کیا نہیں۔ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ پنڈال میں جتنے بھی افراد رہ گئے تھے، وہ دہشت زدہ نگاہوں سے کوٹھی کی انیکسی کی جانب دیکھ رہے تھے۔

سیاہ رنگت والے کی آواز جیسے ابھی تک فضا میں گونجتی محسوس ہوتی تھی — میڈم سب سے بڑے دشمن اپنے ہی ہوتے ہیں۔

اور لگتا تھا کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ اس نے جن تین افراد کو گولی ماری تھی، ان میں عاقب ڈوگرے بھی شامل تھا اور ڈوگرے کے بارے میں ہمیں پتا تھا کہ وہ اپنی ساس رانی جان کی جان کے درپے ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ غالباً رانی جان کا جواں سال شوہر بھی اس کے خفیہ دشمنوں میں شامل تھا اور یہ جو ماضی کا خطرناک گینگسٹر سعود عرف سادو کوئی پچھلا بدلہ چکانے کے لیے یہاں رانی کی کوٹھی میں گھس آیا تھا تو اس سازش میں یہ شوہر صاحب بھی شامل تھے۔ سیکیورٹی

گارڈز کا انچارج رانی جان کے شوہر پرویز کا سہولت کار ہو سکتا تھا۔ اب وہ دونوں لاشوں کی صورت ہم سے تیس پینتیس فٹ کے فاصلے پر تیز روشنیوں میں پڑے تھے۔

میڈم رانی جان نے روتے روتے ایک ٹھوکر مردہ سیکیورٹی انچارج کے سر پر ماری، پھر اپنے شوہر کی لاش کے پاس پہنچ گئی۔ وہ اب اسپیچ اور مائیکروفون سے دور تھی۔ لہٰذا اس کی آواز ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ وہ لاش کے سرہانے کھڑی کہہ رہی تھی۔ اس کی آواز میں دکھ اور غیض دونوں شامل تھے۔ ڈوگرے کی تاج پوشی کرنے والا تاجر اور اس کی بیوی رانی جان کو سنبھالتے ہوئے اندرونی حصے کی طرف لے گئے۔

شاہ زیب نے سرگوشی کی۔ "تابش صاحب! موقع اچھا ہے۔ افراتفری مچی ہے۔ ہم انیکسی میں داخل ہو سکتے ہیں۔"

ہم اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ہم دونوں کے پاس اسلحے کے علاوہ تیز دھار چاقو بھی تھے۔ روانہ ہوتے وقت ہم نے جیپ میں دو گنز بھی رکھ لی تھیں۔ شاہ زیب نے ایک گن نکال لی، میں نے صرف کولٹ کا ریوالور لیا۔ جیپ سے نکل کر ہم جھک کر دوڑتے ہوئے انیکسی کی جانب گئے۔

ڈوگرے نے جو اطلاع ہمیں دی تھی، اس کے مطابق یہاں مہمان خانے کے گرد تین عدد نہایت ماہر شوٹر موجود تھے۔ یہ شوٹرز مدراسی زبان بولتے تھے اور سیاہ رنگت والے شخص کے ساتھ ہی کوئٹہ سے یہاں پہنچے تھے۔ وہ بہت ماہر ہوں گے لیکن اس وقت ہم دونوں جس کیفیت میں تھے، ان کی مہارت انہیں زیادہ فائدہ نہیں دے سکتی تھی۔ ایک شوٹر کو میں نے عقب سے دبوچا اور بائیں ہاتھ سے اس کی کمر پر چاقو کا وار کیا۔

چاقو کے اس خاص وار کا موجد وہی باروندا جیکی تھا جس نے مجھے لڑنے مرنے کے گُر سکھائے تھے۔ کمر پر کیا جانے والا یہ خاص وار دل کے پار ہو جاتا تھا۔ اس وار میں قدرے لمبے چاقو کو ایسی پوزیشن میں کرنا ہوتا ہے جیسے آلو کے قتلے کاٹے جا رہے ہوں۔ یہ وار کندھے سے نیچے کی دو پسلیوں کے اندر سے ہوتا ہوا سیدھا دل میں اترتا ہے۔ مجھے برسوں پہلے کا وہ منظر آج بھی یاد تھا جب باروندا جیکی نام کے اس بے مثل فائٹر نے شراب کی ایک چوتھائی بوتل اپنے گلے میں انڈیلتے ہوئے کہا تھا..... جب ہم کسی کو عقب سے دبوچتے ہیں تو سامنے سے اس پر وار کرنا مشکل ہوتا ہے کہ اس کے دونوں ہاتھ دفاع کے لیے قریباً آزاد ہوتے ہیں۔

گئے برسوں میں، میں نے اس وار میں خاصی مہارت حاصل کی تھی۔ اب بھی انیکسی کے سامنے میرا شکار بغیر کوئی آواز نکالے میری بانہوں میں جھول گیا۔

مہمان خانے کے پہلو میں دوسرا شوٹر بھی ویسا ہی گرانڈیل اور خطرناک دکھائی دیتا تھا۔ یہ بھی پہلے ایکشن کا ری ایکشن ثابت ہوا۔ میں نے عقب سے اس کا منہ دبوچا اور خون آلود چاقو کمر کی جانب سے اس کے دل میں اتار دیا۔ سائیلنسر لگا پستول بھی کچھ نہ کچھ آواز تو دیتا ہے یہاں تو ہلکی سی آہٹ بھی نہیں ہوئی۔ شاہ زیب اس صاف ستھری کارروائی پر کچھ حیران نظر آیا۔

میں نے چاقو صاف کر کے دوبارہ کور میں لگایا۔ اب ہم آگے بڑھنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ جسم میں سنسنی کی تیز لہر تھی۔ جو کچھ ہم پنڈال میں دیکھ چکے تھے، اس کے بعد یہی لگتا تھا کہ اندر ایک زوردار معرکہ ہونے والا ہے۔ تیسرا شوٹر جو یقیناً زیادہ اہم تھا، وہ اس غیر ملکی قاتل کے ساتھ اندرونی حصے میں موجود تھا۔

اس سے پہلے کہ ہم آتشیں اسلحے کے ساتھ آگے قدم بڑھاتے ایک غیر متوقع کام ہوا۔ کسی اندرونی کمرے سے بلند ہونے والی وہی بھرائی ہوئی کرخت آواز ہمارے کانوں تک پہنچی۔ "ٹھیک ہے، آرہا ہوں..... جسٹ کمنگ۔" یہ وہی سیاہ چہرہ شخص تھا۔

آواز چونکہ فاصلے سے آئی تھی اس لیے ہمارے کانوں تک پہنچتے پہنچتے بہت دھیمی ہو گئی تھی۔ شاہ زیب جو ایک سی سی ٹی وی کیمرے کو نشانہ بنانے کے لیے اپنا سائیلنسر لگا پسٹل سیدھا کر چکا تھا رک گیا۔

ہم دونوں کے کان آوازوں اور آہٹوں کی طرف لگ گئے۔ قریباً دو منٹ بعد ایک سیاہ جیگوار کار انیکسی کے چھوٹے گیٹ سے نکلی اور تیز رفتاری سے کوٹھی کے بڑے گیٹ کی طرف بڑھی۔ ایک لمحے کے لیے کار گارڈن لائٹ میں آئی تو اس کے اندر سیاہ رنگ والے درندہ صفت کو میں نے پہچانا۔ چند لمحوں کے لیے شاید ہم دونوں نے ہی سوچا کہ اس شخص کے پیچھے لپکنا چاہیے مگر یہ آسان نہیں تھا۔ ڈوگرے کی جس نیلی جیپ میں ہم یہاں پہنچے تھے اس کے گرد اب کئی افراد موجود تھے۔ ہم نے اوٹ سے دیکھا نہایت افراتفری کے عالم میں چند زخمیوں کو جیپ میں ڈالا جا رہا تھا۔ مجھے لگا کہ ان میں بھاری بھرکم ڈوگرے بھی موجود ہے۔

سبزہ زار میں بھگدڑ تھی۔ کئی مہمان جو اس خونی ہنگامے کے دوران میں کوٹھی کے کونوں کھدروں میں چھپ گئے تھے اب دہشت زدگی کے عالم میں باہر نکل رہے

تھے۔ دو تین خواتین جن کے ساتھی یا عزیز اس فائرنگ میں مارے گئے تھے، رو پیٹ رہی تھیں۔ کئی حواس باختہ افراد فون کرنے میں مصروف تھے۔ ''ہم زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ نکلنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

ہم ٹیکسی کے پہلو میں پہنچے، مختلف گاڑیوں میں جھانکا۔ ایک ہنڈا کار میں چابیاں لگی ہوئی نظر آئیں۔ ڈرائیور شاید گاڑی چھوڑ کر ہنگامے کی طرف چلا گیا تھا۔ اندر بیٹھتے ہی شاہ زیب نے اگنیشن میں چابی گھمائی۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ ہم ڈرائیوے پر آ گئے۔ سبزہ زار میں ہر کوئی بوکھلایا پھرتا تھا۔ مجھے اسٹیج کی سیڑھیوں کے پاس ایک رقاصہ کی لاش کے پہلو میں چودھری اسلم کی لاش نظر آئی۔ وہ کچھ دیر پہلے اپنی عشرت گاہ سے شاید اپنی موت وصول کرنے کے لیے ہی نکلا تھا۔ اس کے جسم پر صرف ایک بنیان اور ڈھیلی سی شلوار تھی۔ وہ ساری عمر نوخیز رقاصاؤں کا رسیا رہا تھا۔ اب بھی ایک رقاصہ کے پہلو میں ہی پڑا تھا۔

کوٹھی سے نکل کر ہم اپنے ٹھکانے کی طرف بڑھے جو انوش جٹ اور میڈم مرینہ نے فراہم کیا تھا۔ راستے میں ہمیں پولیس کاروں کے ہوٹر سنائی دیے جو یقیناً رانی جان کی کوٹھی میں زبردست فائرنگ کی اطلاع پر کوٹھی کی طرف جا رہی تھیں۔ اپنے اصل ٹارگٹ کے نکل جانے کا ہمیں افسوس تھا لیکن پتا نہیں کیوں میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ شاید یہ بہتر ہی ہوا ہے۔ ہمارا جس دشمن سے پالا پڑا تھا وہ ابھی تک تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اپنی ایک عمر مارشل آرٹ میں گزاری تھی۔ میں اس شخص کو کوئی بے مثال فائٹر تو نہیں کہہ سکتا تھا لیکن اس میں کوئی الگ سی بات تھی جو فہم میں نہیں آتی تھی۔ یا پھر کوئی ایسی خاص تکنیک جس سے میں نابلد تھا، اس نے جس طرح بندوں کی ہڈیاں چکنا چور کی تھیں، وہ منظر ناقابلِ یقین تھا۔ اس کے بارے میں شاید کچھ مزید سمجھے جانے کی ضرورت تھی۔

شاہ زیب نے ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔ ''شانے مینشن میں گوہار زینت نے اپنی موت کی سزا ملتوی کرانے کے لیے عالی جاہ کو کوئی خاص آفر کی تھی۔ کہیں وہ آفر یہی تو نہیں۔ میرا مطلب ہے یہی شخص جو ہمارے مقابل آیا ہے؟''

''نہیں شاہ زیب! میرے خیال میں ایسا نہیں۔ اس ''ان کاؤنٹر اسپیشلسٹ'' کی آمد کی خبر تو ہم نے کافی پہلے کوئٹہ میں سنی تھی۔ اس وقت ہمارا خیال تھا کہ شاید یہ کوئی پاکستانی ہے۔ جہاں تک میرا قیافہ ہے، اس شخص کو ہمارے مقابل لانے والا گرومستان یا اس کا کوئی بہت بڑا خیر خواہ ہے۔''

''یہ خیر خواہ عالی جاہ بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''بالکل ہو سکتا ہے۔''

شاہ زیب نے گہری سانس لی۔ ''ویسے تابش صاحب! ہمیں شکر کرنا چاہیے کہ عمران تن تنہا اس شخص سے بھڑنے نہیں چلا آیا۔''

''سو فیصد درست بات کر رہے ہو اور اسے روکنے کا کریڈٹ بھی تمہیں جاتا ہے۔''

''تابش صاحب! مجھے افسوس ہے کہ مجھے اس سے لڑنا پڑا۔ عمران میں بہت سلاحیتیں ہیں، بس کچھ جذباتی ہے۔''

''اور سچی بات یہ ہے شاہ زیب کہ اسے خود بھی اپنی جلد بازی پر کچھ افسوس ہے۔ اس کی کچھ ذاتی الجھنیں بھی ہیں جنہوں نے اسے ''ہائپر'' کیا۔''

''آپ کا کیا خیال ہے تابش صاحب، یہ جو ''کالا قاتل'' اتنی اسپیڈ سے نکل کر گیا ہے، کہاں گیا ہوگا؟''

''میں سمجھتا ہوں کہ ابھی ہمارے ٹھکانے کو کوئی خطرہ نہیں، پھر بھی ہم انوش وغیرہ کو محتاط رہنے کا کہہ دیتے ہیں۔ ویسے بھی تم نے دیکھا ہوگا جیگوار کار رانی جان کی کوٹھی سے نکل کر بائیں طرف گئی تھی۔''

احتیاطاً میں نے انوش جٹ کو فون کر دیا۔ اس نے سب سے پہلے ہماری خیر خیریت دریافت کی۔ میں نے مختصراً اسے بتایا اور کہا کہ ہم بخیریت واپس آ رہے ہیں۔ اسی دوران میں انوش سے فون اس کی منہ بولی بہن راشدہ نے لے لیا۔ کہنے لگی کہ میں شاہ زیب بھائی سے اس کی بات کراؤں۔ میں نے فون شاہ زیب کی طرف بڑھا دیا۔ وہ بولی۔ ''شاہ زیب بھائی آپ کب تک آ رہے ہیں؟''

''دس پندرہ منٹ لگ جائیں گے۔''

''جلدی آئیں آپ کے لیے ایک بڑا سرپرائز ہے۔''

''کس ٹائپ کا؟''

''بہت اچھی ٹائپ کا۔ آپ گھوم جائیں گے۔ سیدھے گھر آئیں۔''

ہم نے گاڑی کچھ فاصلے پر چھوڑ دی۔ وہاں سے ایک ٹیکسی لے کر اپنی قیام گاہ تک پہنچے۔ اب رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اس رہائشی علاقے میں مکمل خاموشی تھی۔ کوٹھی کا چھوٹا گیٹ انوش نے ہی کھولا تھا۔ ہم اندر پہنچے۔ اندر بھی خاموشی ہی تھی۔ یکا یک کامن روم روشنیوں سے جگمگا اٹھا۔ شیشے کی بڑی میز پر کافی ساری شمعیں روشن تھیں۔ مہمت کا فین ہولے سے چلا تو گلاب کی بہت سی پتیاں شاہ زیب کے ساتھ مجھ پر بھی گریں۔ ایک بڑا کیک میز پر رکھا تھا جس پر

''ہیپی برتھ ڈے ٹو شاہ زیب'' نظر آرہا تھا۔ میوزک آن ہوا اور ہیپی برتھ ڈے کا سونگ گونجنے لگا۔

ساڑی میں ملبوس زانی بولی۔ ''گن لیں شاہ زیب بھائی پوری تیس موم بتیاں ہیں۔''

شاہ زیب حیران تھا اور تیزی سے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کررہا تھا پھر اس کے ہونٹوں پر مدھم مسکراہٹ اُبھری۔ دائیں بائیں دیکھ کر ٹھہرے لہجے میں بولا۔ ''کہاں ہے قسطینا؟''

اچانک پردے کی اوٹ سے ایک دراز قد دلکش لڑکی نمودار ہوئی۔ اس نے پینٹ شرٹ اور جرسی پہن رکھی تھی۔ ریشمی بال ڈیانا کٹ تھے۔ پیشانی پر ذہانت کی چمک، آنکھوں میں شوخ مسکراہٹ۔ اس نے آگے بڑھ کر شاہ زیب کو ''ہگ'' کیا۔ سب نے تالیاں بجائیں۔

قسطینا کے بارے میں ڈیرے پر ہی شاہ زیب نے تھوڑا بہت بتایا تھا۔ وہ جاماجی نامی جزیرے میں فوج کی سپریم کمانڈر تھی۔ وہاں متحارب گروہوں کے ساتھ زوردار جنگ کے بعد یہ کمانڈر شاہ زیب کی محبت میں گرفتار ہوئی اور آخر دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ شاہ زیب نے پنجاب کی ایک خوب صورت لڑکی تاجور کا بھی ذکر کیا تھا۔ جس سے شاہ زیب نے ایک زمانے میں بہت محبت کی بلکہ دونوں ہی ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار تھے مگر کچھ غلط فہمیوں کے سبب یہ محبت اپنے انجام کو نہ پہنچ پائی تھی۔

شاہ زیب نے اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں ایک المیے کا ذکر بھی کیا تھا۔ قسطینا سے شادی کے بعد دونوں کے آنگن میں ایک خوش رنگ پھول بھی کھلا تھا، لیکن یہ زیادہ دیر اپنی بہار نہ دکھا سکا۔ ایک اتفاقی حادثے کے سبب وہ بچہ چھ سات ماہ کی عمر میں ہی چل بسا تھا۔ اس دکھ نے قسطینا اور شاہ زیب کو کئی ماہ تک بے حال رکھا تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ سنبھل گئے تھے۔ جزیرے میں ان کی بھاری ذمے داریوں نے انہیں نئی ڈگر پر چلا دیا۔ اب ان واقعات کو کافی عرصہ گزر چکا تھا۔

شاہ زیب نے قسطینا کا تعارف کراتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''ملیے جناب! یہ ہے وہ خاتون جو ہماری زندگی کی گاڑی کا دوسرا پہیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اسے خاتون کہہ کر تم زیادتی کررہے ہو۔''

وہ مسکرایا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اور قسطینا ڈیئر، یہ ہیں تابش! تمہیں فون پر ان کے بارے میں کافی کچھ بتایا تھا۔''

قسطینا نے کسی فوجی کے سے انداز میں مجھے سیلیوٹ کیا پھر آگے بڑھ کر پُرجوش مصافحہ کیا۔ ''آپ کے بارے میں جان کر آپ کو دیکھنے کا بہت اشتیاق پیدا ہوگیا تھا۔'' وہ قدرے غیر ملکی لہجے کی اردو میں بولی۔ ''شاہ زائب سے آپ کی باتیں سننے کے بعد یوٹیوب پر آپ کی پرانی فائٹنگ کی دو وڈیوز بھی دیکھیں۔ رئیلی، میں بہت امپریس ہوئی ہوں سر۔''

''یہ سب پرانی باتیں ہیں قسطینا، ہم ڈھل چکے۔ اب تو تم لوگوں کا زمانہ ہے۔''

''ایسا ہرگز نہیں سر، کہا جاتا ہے کہ اولڈ از گولڈ۔ مگر آپ جیسے لوگوں کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے۔ اولڈ از ناٹ گولڈ..... اولڈ از ڈائمنڈ۔''

کچھ دیر باتیں ہوئیں پھر تالیوں کی گونج میں کیک کاٹا گیا۔ سب موجود تھے۔ انوش، پہلوان حشمت، بہروزا، راشدہ، زانی، ماہین، مگر عمران دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ماہین بھی جیسے زبردستی مسکرا رہی تھی۔ ماہین کے کیمرا مین اشفاق پر بھی میری نظر نہیں پڑی۔

قسطینا نے کیک کا ٹکڑا شاہ زیب کے منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ شاہ زائب کی 30 ویں برتھ ڈے ہے اور دو برسوں سے ہمارا یہ پروگرام تھا کہ اسے بردنائی جاکر بڑے اچھے طریقے سے منائیں گے۔ مگر اپنی سالگرہ شاہ زائب ہمیشہ بھول جاتا ہے لہٰذا میں نے پروگرام بنایا اور سرپرائز کے طور پر یہاں آگئی۔''

کیک کاٹنے کے بعد یہ تقریب جلد ہی ختم ہوگئی کیونکہ ہم سب ہی اُلجھے ہوئے تھے۔ قسطینا نے مجھ سے پوچھا۔ ''سر! مجھے انکل حشمت بتا رہے تھے کہ آپ تین افراد گئے تھے۔ ایک شاید یہاں کا ڈی ایس پی تھا۔ وہ واپس نہیں آیا؟''

''وہ اسپتال میں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''شاید ہی بچ پائے۔''

انوش، بہروزا اور پہلوان حشمت سب تعجب سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے انہیں مختصر الفاظ میں بتایا کہ وہاں رانی جان کی کوٹھی میں کس طرح کے تہلکہ خیز واقعات پیش آئے ہیں۔ رانی جان کے دو قریبی عزیزوں اور راہ پور گاؤں کے چودھری اسلم کے مارے جانے کی خبر بھی میں نے سنائی۔

شاہ زیب نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ اگلے 72 گھنٹے بہت اہم ہیں۔ ہمیں ڈھونڈنے اور ہم تک پہنچنے کی بھرپور کوشش کی جائے گی۔ پولیس تو ہمارے پیچھے ہے ہی۔ عالی جاہ بھی یقیناً زخمی سانپ کی طرح بل کھا رہا ہوگا۔''

حفاظتی انتظامات کے بارے میں تھوڑی دیر گفتگو ہوئی پھر میں عمران کو ڈھونڈتا ہوا اس کے بیڈ روم کی طرف چلا گیا۔ وہ اندر ہی تھا اور جو سگریٹ نوشی کر رہا تھا، اس کی بُو باہر تک محسوس ہوتی تھی۔ میرے بار بار آواز دینے پر ہی اس نے دروازہ کھولا۔ کمرا نیم تاریک تھا اور دھوئیں سے بھرا ہوا۔ میں عمران کی صورت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ بہت باہمت اور باپ ہی کی طرح اپنے تاثرات چھپانے میں ماہر تھا مگر ان لمحات میں تو جیسے کچھ بھی اس کے بس میں نظر نہیں آتا تھا۔ چہرہ دکھ کی آماجگاہ، آنکھیں سوجی ہوئی، سرخ ہونٹ بُری طرح سانولائے ہوئے اور بال منتشر۔ میں بھونچکا رہ گیا۔

شاہ زیب سے جھڑپ کے بعد وہ شام تک تو کافی نارمل ہو گیا تھا۔ اسے شاہ زیب پر غصہ تو تھا مگر اپنے رویے پر تھوڑے افسوس کا اظہار بھی کیا تھا اس نے۔ البتہ اب تو وہ کسی اور ہی حال میں نظر آتا تھا۔

"کوئی نئی بات ہو گئی عمران؟"

"جی ہاں، نئی بات ہو گئی..... اور ہر بات ختم ہو گئی۔" اس نے بہت ہی عجیب لہجے میں کہا۔

پھر نجانے کیا ہوا، وہ ایک دم میرے گلے لگ گیا۔ اس کے توانا جسم میں خفیف سی لرزش تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا، اس کی ٹوٹی پھوٹی اٹک اٹک بار آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ "چاچو جان! کتنا اچھا ہوتا، آپ مجھے انڈیا جانے سے نہ روکتے۔ میں چلا گیا ہوتا واپس یا پھر یا پھر میں ماں کے کہنے پر آیا ہی نہ ہوتا یہاں۔ بہت زخمی ہو گیا ہوں چاچو جان، بہت ہی زیادہ۔"

میں نے بمشکل اسے خود سے پیچھے ہٹایا، اس کا سوجا سوجا چہرہ دیکھا۔ دل کٹ سا گیا۔ "عمران! ہوا کیا ہے؟" میں نے اسے شانوں سے ہلا کر پوچھا۔

وہ بے دم سا ہو کر بیٹھ گیا۔ "چاچو! اس نے مجھے مار ڈالا، بالکل مار ڈالا۔"

"کس کی بات کر رہے ہو؟"

"آپ کی بھتیجی کی۔" وہ گھائل لہجے میں بولا۔

میں سناٹے میں رہ گیا۔ وہ ماہین کی بات کر رہا تھا۔

"عمران! حوصلے سے بتاؤ، کیا ہوا ہے؟"

"حوصلے کی بات کہاں رہی اب۔ سب ختم ہوا۔"

"دیکھو، میرے صبر کا امتحان مت لو۔ بتاؤ مجھے۔"

میرے بار بار پوچھنے پر اس نے جو بات کہی، اس نے میرا دماغ بھک سے اڑا دیا۔ یقین نہیں آیا کہ یہ بات

پسند اپنی اپنی

چھاپا خانوں کی ہڑتال کے باعث جب نیویارک کی ایک خاتون کو اپنا پسندیدہ اخبار سترہ روز تک نہ مل سکا تو اس نے اخبار کے ایڈیٹر کو فون کیا اور بولی۔ "جناب! جب آپ کو پتا تھا کہ اتنے دن ہڑتال رہے گی تو آپ نے بہت سارے اخبار ایک ساتھ کیوں نہ چھپوا کر رکھ لیے؟"

سخی بیوی

شوہر نے اندر آ کر بیوی کو بُلایا۔ "باہر ایک فلاحی انجمن کے نمائندے آئے ہیں۔ وہ غریبوں کے لیے پرانے کپڑے مانگ رہے ہیں کیا گھر میں کچھ پرانے کپڑے ہیں جو انہیں دیے جا سکیں؟"

بیوی کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔ "ہاں ایک تو تم اپنی وہ نسواری والی شلوار قمیص دے دو جو تم دس سال سے پہن رہے ہو۔ دوسرے میری سبز ساڑی دے دو جو میں پچھلے مہینے لائی تھی۔"

جاکی

ایک صاحب نے ریس سے واپسی پر اپنی بیوی کو بتایا۔ "آج تو مجھ پر بڑا حادثہ گزرا میں اپنے جوتے کے تسمے باندھنے کے لیے جھکا ہی تھا کہ ایک کم بخت جاکی آیا جس کو کم دکھائی دیتا تھا آتے ہی میری کمر پر زین کس دی۔"

بیوی حیران ہو کر بولی۔ "خدا کی پناہ۔ پھر تم نے کیا کیا؟"

شوہر نے معصومیت سے جواب دیا۔ "کیا کرتا تیسرے نمبر پر آیا۔"

اجنبی اور وعدہ

ایک لڑکی نے اپنی سہیلی سے کہا۔ "میں نے اپنی والدہ سے وعدہ کیا ہے کہ میں کسی اجنبی نوجوان کو اپنے قریب آنے کا موقع نہیں دوں گی۔"

سہیلی نے کہا۔ "اچھا پھر جو وہ دو گھنٹے سے ایک نوجوان تمہارے کمرے میں بیٹھا رہا، وہ کون تھا؟"

"بھلا دو گھنٹے میں وہ اجنبی کیسے رہ گیا؟" لڑکی نے جواب دیا۔

کراچی سے کاشف عمران کا تجزیہ

عمران کہہ رہا ہے اور ماہین کے بارے میں کہہ رہا ہے۔

''چاچو! وہ بے وفا ہے ..... بلکہ یہ بھی ایک چھوٹا لفظ ہے۔ وہ دغاباز ہے اور اس دغابازی میں بہت آگے نکلی ہوئی ہے۔''

''عمران۔'' میں سراپا سوال بن گیا۔

وہ زخمی لہجے میں بولتا چلا گیا۔ ''آپ اس کے ساتھی کیمرامین اشفاق کو کیا سمجھتے ہیں؟ یہی سمجھتے ہیں نا کہ اس کے بھائی کی طرح ہے۔ وہ حرامی بھی اسے سسٹر کہتا ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے، یہ سب جھوٹ ہے۔'' عمران کی آواز رُندھ گئی۔

میں ساکت جامد بیٹھا رہا۔ وہ دیوانے سے لہجے میں بولا۔ ''چاچو! میں نے اپنی آنکھوں سے ان دونوں کو ..... نازیبا حالت میں دیکھا۔ اس کے باوجود میری آنکھیں پھٹی نہیں۔ میرا دل رکا نہیں۔ بہت ڈھیٹ ہوں نا میں ..... بہت ڈھیٹ ہوں نا۔'' اس نے اپنے بال مٹھی میں جکڑے۔

مجھے کیک کاٹنے کے موقع پر ماہین کا بجھا ہوا زرد چہرہ یاد آیا ..... اور پھر یاد آیا کہ اشفاق بھی وہاں موجود نہیں تھا۔

خود کو سنبھال کر میں نے کہا۔ ''عمران! تمہیں ضرور کوئی دھوکا ہوا ہے۔ میں ماہین کے متعلق ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ تم کس طرح کی بات کر رہے ہو؟''

''تو پھر مجھے گولی مار دیں نا چاچو۔'' وہ اسی جنونی انداز میں بولا۔ ''میں اپنے چاچو کی بھتیجی پر جھوٹا الزام لگا رہا ہوں۔ اس کی عزت خراب کر رہا ہوں۔ مار دیں مجھے۔''

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس موقع پر کیا کہوں۔ سردی کے باوجود مجھے اپنی پیشانی پر پسینے کی نمی محسوس ہونے لگی۔

وہ اسی انداز میں بولتا گیا۔ ''میں یہی سمجھتا رہا کہ شاید اس نے واقعی اپنے بڑوں کے سامنے کوئی قسم کھا رکھی ہے جسے توڑنا نہیں چاہتی۔ مجھ سے دوری رکھ رہی ہے۔ معلوم نہیں تھا وہ باہر سے جتنی خوب صورت ہے اندر سے اتنی ہی ..... '' وہ فقرہ مکمل نہ کر سکا۔ دکھ کی شدت سے اس کی آواز بیٹھ گئی۔

عمران کو اس کے حال پر چھوڑ کر میں دوسری منزل پر ماہین والے کمرے کی طرف گیا۔ اندر روشنی نہیں تھی مگر دروازہ بند تھا۔ میں نے دستک دی، پھر دھیمی آواز میں کئی بار ماہین کو پکارا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ تشویش لاحق ہو گئی۔ اسی اثنا میں ساڑی میں ملبوس زانی ایک طرف سے آئی اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے کوریڈور کی طرف لے گئی۔ دھیمی آواز میں بولی۔ ''یہاں جو کچھ ہوا ہے، اس کا مجھے پتا ہے اور انوش بھائی بھی جانتے ہیں۔ ماہین بہت ڈپریشن میں تھی۔ میں نے اسے گولی کھلا کر سلا دیا ہے۔''

''لیکن ہوا کیا ہے؟''

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر تھوڑا اور آگے لے گئی۔ ''مجھے ٹھیک سے پتا نہیں یہ سب کس طرح شروع ہوا۔'' زانی نے دبی آواز میں کہا۔ ''مجھے ماہین والے بند کمرے میں سے عمران اور ماہین کے شدید جھگڑے کی مدھم آوازیں آئیں۔ ماہین بھی تھوڑا بہت بول رہی تھی مگر عمران بھائی تو حد سے گزرے ہوئے تھے۔ وہ ..... بہت بُرے الزام لگا رہے تھے ..... اشفاق کا نام لے رہے تھے۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ باہر نکل کر اشفاق کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔ اتنے میں انوش بھائی بھی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے بھی دو چار فقرے سن لیے۔ میں نے انوش بھائی سے کہا وہ اشفاق سے کہیں کہ وہ دائیں بائیں ہو جائے۔ آپ کو پتا ہے کہ اشفاق اس وقت کہاں ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''سب یہی سمجھ رہے ہیں کہ وہ آپ کی اجازت سے کسی عزیز سے ملنے کہیں گیا ہے۔ لیکن وہ یہیں پر ہے۔ انوش بھائی نے اسے بیسمنٹ کے ایک کمرے میں بھیج دیا ہے اور کہا ہے کہ وہ صبح تک خاموشی سے وہیں پر رہے۔''

مجھے اپنا سر چکراتا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے زانی سے دریافت کیا۔ ''عمران نے اشفاق کے بارے میں پوچھا نہیں کہ وہ کہاں ہے؟''

''جی، پوچھا تھا۔ بند کمرے میں ماہین سے جھگڑنے کے بعد عمران بھائی کوٹھی میں اشفاق کو ڈھونڈتے رہے۔ کہہ رہے تھے اس سے کچھ بات کرنی ہے، انوش بھائی، راشدہ، چاچا حشمت اور مجھ سے بھی پوچھا۔''

''اشفاق کو پتا ہے کہ عمران اس کے بارے میں کیا کہہ رہا ہے؟''

''جی ہاں۔''

''کیا کہا اُس نے؟''

''وہ کچھ بولا نہیں لیکن بہت زیادہ ڈرا ہوا ہے۔ کانپتا ہی چلا جا رہا تھا۔ آئی تھنک کہ نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا اُس کا۔ لگتا تھا کہ بے ہوش ہو جائے گا۔ وہ جو قسطینا جی آئی ہیں باہر سے انہوں نے اسے کوئی میڈیسن دی ہے اور سختی سے کہا ہے کہ ابھی اسے بالکل ڈسٹرب نہ کیا جائے ورنہ اسپتال جانے کی نوبت آسکتی ہے۔''

''میں نے پوچھا قسطینا کو اصل معاملے کی خبر ہے؟''

''ابھی تک تو نہیں۔ میرے علاوہ بس انوش بھائی جانتے ہیں۔''

میں ہر صورت ماہین سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ زانی

کے منع کرنے کے باوجود میں پھر اس کے کمرے میں پہنچا۔ ہولے ہولے ''ناک'' کی۔ پھر آوازیں بھی دیں۔ دروازہ نہیں کھلا۔ یہ جان کر مزید تکلیف ہوئی کہ وہ جاگ گئی ہے۔ اس کے باوجود دروازہ نہیں کھول رہی۔

میں بہت بھاری دل کے ساتھ اپنے کمرے میں آگیا۔ ہم پہلے ہی نہایت خطرناک لوگوں میں گھرے ہوئے تھے..... اب ایک اور مصیبت آن پڑی تھی۔ ایسی مصیبت جس کا تصور تک نہیں کیا تھا۔ تکلیف دہ اور شرمناک صورتِ حال تھی۔ میں سر پکڑ کر بیٹھا رہا۔ انوش سے بات کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔

رانی جان کی کوٹھی میں خونریزی کے بعد ''سیاہ جانور'' تند بگولے کی طرح نکل گیا تھا اور زیادہ امکان یہی تھا کہ ہمیں اور خاص طور سے مجھے ڈھونڈنے کے لیے نکلا ہے۔ یہ ناممکن بات نہیں تھی کہ وہ ہماری ٹوہ لگاتا آج رات ہی یہاں تک آپہنچتا۔ انوش جٹ کوٹھی کے بیرونی دروازے اچھی طرح لاک کر چکا تھا۔ وہ میڈم مرینہ کے دو گارڈز کے ساتھ مسلح ہو کر کوٹھی کی چھت والے کمرے میں چلا گیا تھا تاکہ اردگرد نظر رکھ سکے۔

ان در و دیوار سے باہر سرد تاریک رات دھیرے دھیرے بڑی خاموشی کے ساتھ سرک رہی تھی۔ بس کبھی کبھار اس ہاؤسنگ سوسائٹی کے کسی گوشے سے چوکیدار کی سیٹی کی تیز آواز گونجتی تھی، پھر آس پاس کی کوٹھیوں میں رکھوالی کے دو چار کتے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے تھے اور دوبارہ خاموشی چھا جاتی تھی۔ بڑی بوجھل شب تھی۔ کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے مگر یہ ایسی سُولی تھی جس نے نیند کو بہت دور کر دیا تھا۔ ہاں کسی وقت خیالوں کے زہرناک بھنور میں ڈوبتے اُبھرتے پلکیں بوجھل سی ضرور ہو جاتی تھیں۔ (اپنے حریفوں اور مخالفین کے حوالے سے جتنا بھی جوش و خروش میرے اندر موجود تھا سب جھاگ کے مانند بیٹھتا محسوس ہو رہا تھا) پتا نہیں کہ کتنا وقت اسی طرح گزرا۔ اتنے میں نچلے فلور سے ایک تیز گھنٹی جیسی آواز مسلسل سنائی دینے لگی۔ پھر یکا یک فائر کی آواز آئی۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ یہ فائر گراؤنڈ فلور پر ہوا ہے۔ جو پہلا اندیشہ ذہن میں آیا وہ یہی تھا کہ شاید پولیس یا عالی جاہ کے لوگ ہم تک رسائی حاصل کر گئے ہیں۔ آٹومیٹک رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹاتا ہوا میں گراؤنڈ فلور پر پہنچا۔ انوش اور پہلوان حشمت بیسمنٹ کی طرف لپک رہے تھے۔

یہی وقت تھا جب دوسرا فائر ہوا۔ یہ فائر اس کمرے کے اندر ہوا تھا جس میں انوش نے اشفاق کو چھپایا تھا۔

''اشفاق دروازہ کھولو۔'' انوش گرجا۔

تب تیسرا فائر ہوا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ فائر اسٹیل کے اس دروازے کے بیضمی لاک پر کیے جا رہے ہیں۔ تیسرے فائر کے ساتھ ہی لاک ٹوٹ گیا۔ دروازہ کھول کر جو باہر نکلا اور جس حال میں نکلا وہ حیران کن تھا۔ وہ کوئی اور نہیں قسطینا تھی۔ اس کا سلیپنگ گاؤن بُری طرح پھٹا ہوا تھا۔ گاؤن کی ڈوری ٹوٹی ہوئی تھی اور اسی ڈوری کو بُری بھلی گرہ دے کر اس نے اپنی برہنگی چھپائی تھی۔ اس کی ایک انگلی زخمی تھی اور پیشانی پر بھی ایک خراش چوٹ نظر آتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں وہ چھوٹا سا لیکن طاقتور بریٹا پستول موجود تھا جس سے تین فائر کر کے اس نے دروازے کا لاک توڑا تھا۔

''کیا ہوا قسطینا جی..... اور اشفاق کہاں ہے؟'' انوش نے اوپر تلے دو سوال کیے۔

قسطینا نے ایک صوفے کے عقب کی طرف اشارہ کیا۔ ہم لپک کر پہنچے۔ صوفے کے عقب میں اشفاق اوندھا پڑا تھا۔ اس کے کپڑے پھٹے تھے اور ان میں سے اس کا ورزشی جسم جھانکتا تھا۔ سر سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ بے ہوش تھا۔ پورے کمرے میں ٹوٹ پھوٹ کے آثار تھے۔ ''کیسے ہوا یہ سب؟'' میں نے قسطینا سے پوچھا۔

وہ اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ کے ساتھی کے سبب ہوا۔ وہ بھاگ گیا ہے۔ جاتے جاتے دروازہ لاک کر گیا۔ ویسے زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کوٹھی کے اندر ہی چھپا ہو۔''

''قسطینا جی، کس کی بات کر رہی ہیں؟'' انوش نے مسلسل بجتے والی گھنٹی کا بٹن آف کرتے ہوئے پوچھا۔

وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''آپ کے ساتھی کا نام عمران ہے نا..... اسی نے کیا ہے یہ سب کچھ۔ میں نے اشفاق کو سکون بخش دوا دے رکھی تھی کہ وہ نارمل ہو سکے۔ اسی کو دیکھنے کے لیے بیسمنٹ کی طرف آئی تھی۔ یہاں پہنچ کر مجھے لگا کہ بند کمرے میں کسی طرح کا جھگڑا ہو رہا ہے۔ پھر مار پیٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ میں اندر پہنچی تو آپ کا ساتھی اشفاق کو بُری طرح مار رہا تھا۔''

قسطینا کی باتیں حیران کر دینے والی تھیں لیکن ان کو جھٹلانا ممکن نہیں تھا۔ اسی اثنا میں شاہ زیب بھی سلیپنگ گاؤن میں وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اپنا سائیلنسر لگا پستول تھا۔

میں بڑی عجلت میں باہر نکلا اور سیڑھیاں چڑھ کر

گراؤنڈ فلور پر آیا۔ قسطینا کا یہی کہنا تھا کہ عمران بھاگ گیا ہے، ہوسکتا ہے کہ اس عمارت سے نکل گیا ہو۔ یہاں اس عمارت میں ایک پجارو اور ایک موٹر بائیک موجود تھی مگر اب صرف گیراج میں پجارو ہی کھڑی نظر آرہی تھی۔ گیٹ بھی ادھ کھلا تھا۔

کیا عمران موٹر بائیک پر کہیں نکل گیا ہے؟ یہ سوال تیزی سے ذہن میں اُبھرا۔ پجارو کی چابی پتا نہیں کہاں اور کس کے پاس تھی۔ پجارو کو گیراج سے نکال کر کسی کے پیچھے جانے میں کافی وقت درکار تھا۔

میں واپس بیسمنٹ میں پہنچا۔ انوش، قسطینا اور ایک گارڈ، کوٹھی کے اندر ہی عمران کو ڈھونڈنے کی کوشش کررہے تھے۔ شاہ زیب اور پہلوان نے اشفاق کو فرش سے اٹھا کر بیڈ پر لٹا دیا تھا، وہ اب بھی بے ہوش تھا مگر سانسوں کی آمد و رفت بہتر ہوگئی تھی۔ اس کمرے میں جو کچھ ہوا، بہت خطرناک تھا۔ عین ممکن تھا کہ عمران اور قسطینا میں سے کسی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جاتا۔ وہ تو گھنٹی والا بٹن اتفاقاً پریس ہوجانے سے بچت ہوگئی۔ (جیسا کہ بعد میں پتا چلا، کچھ عرصہ پہلے تک بیسمنٹ کا یہ کمرا انوش کی دوست میڈم مرینہ کے ایک عمر رسیدہ مگر عورت پرست تایا کے زیرِ استعمال تھا۔ سخت بیمار ہونے کے باوجود وہ اپنا "بستر گرم" رکھتا تھا اور اس کے دو تین ثبوت اب بھی کمرے کی دیواروں پر نیم عریاں تصویروں کی صورت میں موجود تھے۔ اس لاغر لیکن عیاش شخص کے لیے یہ الارم نما گھنٹی بھی لگائی گئی تھی تاکہ وہ بوقتِ ضرورت کسی ملازم کو بلا سکے)

☆☆☆

یہ سب کیا ہورہا تھا۔ میرا دماغ چکرا کر رہ گیا تھا۔ بے شک عمران نے ماہین سے پیار کیا تھا اور ٹوٹ کر کیا تھا مگر یہ خوشبودار جذبہ ایسی ناقابلِ گمان صورتِ حال پیدا کردے گا، سوچا بھی نہ تھا۔ ماہین ابھی تک اپنے کمرے میں بند تھی اور اس کا رویہ شکوک کو مزید ابھار رہا تھا۔ گیٹ پر موجود سی سی ٹی وی کیمرا دھند کی وجہ سے واضح ویڈیو نہ دے سکا تھا مگر پھر کوٹھی میں سے موٹر بائیک پر نکلتا ہوا ایک لڑکا ضرور نظر آیا تھا اور پجانوے فیصد امکان اسی بات کا تھا کہ وہ عمران ہے۔ کوٹھی میں جو تین چار سی سی ٹی وی لگے ہوئے تھے۔ وہ آواز بھی ریکارڈ کرتے تھے۔ اس ویڈیو میں بھی موٹر بائیک کی آواز کے ساتھ بیسمنٹ میں ہونے والے تین فائرز کی آواز ریکارڈ ہوئی تھی۔

انوش حیران تھا کہ عمران کو کیسے پتا چلا کہ اشفاق تہ خانے کے کمرے میں ہے۔ میرا اپنا خیال یہ تھا کہ غلطی ہم سے ہوئی تھی جب میں اور زائی کوریڈور میں عمران کے کمرے سے تھوڑے فاصلے پر کھڑے گفتگو کررہے تھے۔ عمران نے یقیناً کمرے کی کھڑکی سے ہمیں دیکھا..... وہ ایک زبردست "لپ ریڈر" تھا۔ عین ممکن تھا کہ ہماری گفتگو نے ہی اس پر اشفاق کی موجودگی ظاہر کردی ہو۔

اب میں اور شاہ زیب ایک علیحدہ کمرے میں تھے۔ تہ خانے کے جس کمرے میں اشفاق اور عمران کے درمیان ٹکراؤ ہوئی تھی اور پھر مار پیٹ ہوئی تھی وہاں بھی کیمرا موجود تھا۔ ہم دونوں ریکارڈنگ دیکھ رہے تھے۔ 4 بج کر 20 منٹ پر عمران بیسمنٹ میں پہنچا اور اشفاق والے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اشفاق سو رہا تھا۔ اس نے اسے جھنجوڑ کر جگایا تھا۔ اس کے سر پر پانی کا گلاس انڈیلا تھا اور گریبان سے پکڑ کر دکھ بھرے لہجے میں کہا تھا۔ "تمہیں سب پتا تھا، میں اسے کتنا چاہتا ہوں۔ پھر یہ تم نے کیا کیا میرے ساتھ..... تم دونوں نے مجھے مار ڈالا، ختم کردیا۔"

اشفاق کی کانپتی ہوئی آواز ریکارڈ ہوئی تھی۔ "ایسا کچھ نہیں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے....."

"ہاں..... ہاں، تم نے بند کمرے میں "غلط فہمی" کو ہی گلے لگایا تھا..... غلط فہمی کا ہی منہ چوما تھا۔ صوفے پر گر کر غلط فہمی سے ہی اٹھکیلیاں کی تھیں۔ اگر یہ سب کچھ تھا تم دونوں کے درمیان تو مجھے اندھیرے میں کیوں رکھا؟"

"آ..... آپ الزام لگا رہے ہیں۔ میں نے تو.....!"

فقرہ اشفاق کے منہ میں ہی تھا کہ عمران کا زوردار جھانپڑ اس کی گردن پر پڑا۔ وہ ایک چھوٹی میز توڑتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کے بعد عمران اس پر پل پڑا۔ اس کی آنکھوں میں آتشیں پانی اور چہرہ لال بھبوکا تھا۔ پھر یکبارگی کمرے کا دروازہ کھلا اور پریشان قسطینا گاؤن پہنے فریم میں داخل ہوئی تھی۔ اس نے پہلے تو عمران اور اشفاق کے درمیان آنا چاہا، پھر جھنجلا کر بولی۔ "وٹ آر یو ڈوئنگ؟ وہ پہلے ہی ٹھیک نہیں ہے..... رک جاؤ۔"

یکایک عمران نے قسطینا کو ڈاج دیتے ہوئے ایسی ٹانگ چلائی جو سیدھی اشفاق کے چہرے پر پڑی۔ وہ اُڑتا ہوا سا ایک پتھریلی کارنس سے جا ٹکرایا اور بے سدھ ہوکر تھری سیٹر صوفے کے پیچھے گر گیا۔ یہ وار ایک خطرناک فائٹر کے وار جیسا تھا جو اشفاق کی جان تک لے سکتا تھا۔

قسطینا اس کا گریبان پکڑ کر چلائی۔ "تم اپنے ہوش میں تو ہو۔ یہ کیا کررہے ہو تم؟" اس کے ساتھ ہی وہ پکارنے

لگی۔ ''کوئی ہے، کوئی ہے یہاں؟''

اسٹیل کے بند دروازے کے سبب اس کی آواز باہر تک نہ پہنچی ہوگی۔ اپنا گریبان قسطینا سے چھڑانے کے لیے عمران نے اس کی کلائی مروڑی تو دونوں گتھم گتھا سے ہو گئے۔ عمران طیش میں کچھ بول بھی رہا تھا مگر ریکارڈنگ میں آواز صاف نہیں تھی۔ اسی دوران میں قسطینا نے عمران کی دونوں ٹانگوں کے درمیان ٹھوکر ماری۔ ایسی چوٹ کسی بھی ''میل'' کے لیے بڑی ظالم ہوتی ہے۔ وہ تلملا کر قسطینا پر جھپٹا اور اسے قالین پر گرا دیا۔ اس کے دونوں بازو عمران کی گرفت میں تھے اور وہ چاروں شانے چت تھی۔ اس کا گاؤن اس کے بالائی جسم سے کھسک رہا تھا۔

غم و غصے کی شدت سے، عمران جیسے ہوش میں ہی نہ تھا۔ پھنکارا۔ ''یو باسٹرڈ! چیر ڈالوں گا تجھ کو۔ تو کہاں سے آمری ہے یہاں۔ کل تیرے شوہر نے مجھے تھپڑ مارا، یہ تھپڑ مجھے بہت دیر نہیں بھولے گا۔ اس تھپڑ کی سزا تو یہی ہے کہ ابھی تیرا یہ گاؤن اتار پھینکوں، وہ سب کچھ کر گزروں جو تیرے جیسیوں کے ساتھ ہونا چاہیے۔ لیکن گندا خون نہیں ہے میرا..... ہاں اتنی سزا تو تجھے ضرور ملنی چاہیے جتنی کی تو حق دار ہے۔ تجھے اس کمرے سے کپڑوں کے بغیر نکالوں گا۔''

عمران نے اس کا پھول دار نیلا گاؤن نوچ کر علیحدہ کرنا چاہا۔ یہ اس کی ایک اور غلطی تھی۔ قسطینا عام لڑکی نہیں تھی۔ شاہ زیب اور پہلوان حشمت جو کچھ مجھے بتا چکے تھے، اس سے یہی پتا چلتا تھا کہ وہ اس نوجوانی میں جاماجی آرمی کی سپریم کمانڈر ہونے کے علاوہ بذاتِ خود ایک خطرناک فائٹر بھی ہے۔

یکا یک وہ اپنے دفاع پر اتر آئی۔ اس نے عمران کے چہرے پر اپنی کہنی سے ایم ایم اے اسٹائل کا جو مہلک وار کیا وہ عمران کے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔ عمران ذرا ڈھیلا پڑا تو قسطینا نے اسے اپنے اوپر سے اُچھال پھینکا۔ دونوں ہی بڑی تیزی سے اٹھے تھے۔ قسطینا کی ایک نہایت شارپ کِک عمران کے سینے پر لگی اور اس کے چہرے پر حیرت نظر آئی مگر پھر وہ بھی سنبھل کر اس پر جا پڑا۔ ایک طرف جاماجی کی فوجی کمانڈر تھی، دوسری طرف عمران دانش کا بیٹا۔ وہ عمران دانش جو خطروں کا کھلاڑی تھا۔ جو موت کے آگے نہیں پیچھے بھاگنا پسند کرتا تھا۔ اب اس کا بیٹا اپنی ماں کا حکم پورا کرتے ہوئے میرے کندھے سے کندھا جوڑنے کے لیے یہاں آیا تھا۔ مگر حالات کی تند آندھی اسے کسی اور ہی طرف اُڑا کر لے جا رہی تھی۔ برسوں پہلے عمران دانش کو اس کی محبت کے انجام نے ڈسا تھا اب عمران کو بھی اس کی محبت کسی کانٹوں بھرے راستے پر لے آئی تھی۔

قریباً ایک منٹ کے لیے دونوں میں گھمسان کا رن پڑا۔ قسطینا نے چند نہایت جچی تلی ضربیں اسے لگائیں۔ عمران نے بھی جواب دیتے ہوئے اسے ''فی میل'' نہیں صرف مدِمقابل سمجھا۔ ایک موقع پر عمران نے قسطینا کو دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگایا تو دیوار کے نچلے حصے میں موجود کوئی ایسا بٹن پش ہو گیا جس نے ایک تیز مسلسل گھنٹی بجا دی۔ یہ وہی گھنٹی تھی جو مجھے اپنے بیڈ روم میں فائر سے ذرا پہلے سنائی دی تھی۔

ریکارڈنگ میں صاف نظر آیا، الارم نما گھنٹی کی آواز سنتے ہی عمران ٹھٹک کر پیچھے ہٹا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا پستول نکال لیا تھا۔ پستول کا رخ قسطینا کی طرف رکھتے ہوئے اور کچھ تلخ ترش بولتے ہوئے وہ دروازے تک پہنچا اور پھرتی سے اسے کھولتے ہوئے باہر نکل گیا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا وہ دروازے کو باہر سے لاک کر گیا تھا۔ وڈیو ریکارڈنگ میں دروازہ لاک ہونے کی آواز صاف سنائی دی۔

قسطینا نے اپنی ران سے سلیپنگ گاؤن ہٹا کر وہاں بندھا ہوا چھوٹا بریٹا پسٹل نکالا اور تلملا کر دروازے کی طرف بڑھی۔ پہلے اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی پھر دروازے کی تالے والی جگہ پر پہلا فائر کیا۔

تالا ٹوٹنے کے بعد والے مناظر بھی کیمرے میں ریکارڈ ہوئے تھے۔ البتہ یہ سارے غیر ضروری تھے۔ میں نے لیپ ٹاپ آف کر دیا۔

میں اور شاہ زیب ساکت بیٹھے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ یہ سب کچھ ہمارے لیے ناقابلِ یقین تھا مگر ہو چکا تھا..... اور صرف ایک ڈیڑھ گھنٹا پہلے ہوا تھا۔ میرا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔

اسی اثنا میں ٹی وی پر نیوز چلنے لگی کہ بہاولپور میں ایک سماجی و سیاسی شخصیت کی کوٹھی پر سنگین واردات ہوئی ہے جس میں کئی افراد مارے گئے ہیں اور ان میں ماضی کا بدنام ڈکیت سعود عرف سادو بھی شامل ہے۔

میری نگاہوں میں چند گھنٹے پہلے کے خونی مناظر گھومنے لگے۔ ایکسی سے برآمد ہونے والے سیاہ رنگت کے شخص نے کتنے اعتماد سے رانی جان کے شوہر اور سینئر گارڈ کو شوٹ کیا تھا اور غالباً ٹھیک ہی کیا تھا۔ حالات یہی بتا رہے تھے کہ وہ دونوں رانی کے سابق شوہر سعود عرف سادو کے لیے سہولت کار کا کردار ادا کر رہے تھے۔ رانی کا داماد ڈی

ایس پی ڈوگرے بھی شوٹ ہوا تھا اور ہمیں پتا تھا کہ وہ بھی اندر خانے اپنی ساس رانی جان کا بدخواہ ہے۔ مطلب یہی تھا کہ وہ سیاہ رنگ شخص نہایت باخبر بندہ تھا۔ اب دن کی روشنی، اندھیرے پر غالب آرہی تھی۔ مجھے رہ رہ کر ماہین پر طیش آرہا تھا۔ اس نے خود کو کمرے میں بند کیا ہوا تھا اور دو بار میری کوشش کے باوجود دروازہ نہیں کھولا تھا۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا۔ میں ایک بار پھر اس کے بیڈ روم کے دروازے پر پہنچا۔ اس مرتبہ میں نے دھڑ دھڑ دروازہ کھٹکھٹایا اور بڑے سخت لہجے میں اسے باہر آنے کو کہا۔

دروازہ پھر بھی نہیں کھلا، البتہ میرے موبائل پر ماہین کی کال آگئی۔ میں کال اٹینڈ کرتا ہوا کوٹھی کے ایک خاموش گوشے کی طرف چلا گیا۔ ''یہ سب کیا ہے ماہین۔ یہاں اس طرح کا تماشا لگ جائے گا، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔''

دوسری طرف گمبھیر خاموشی طاری رہی۔ میں نے دھیمے لیکن آتشیں لہجے میں کہا۔ ''ماہین! منہ میں گھنگھنیاں کیوں ڈال رکھی ہیں، بولتی کیوں نہیں ہو؟ یہ کیا معاملہ ہے تمہارا؟ عمران کیا کہہ رہا ہے؟ تم کمرا بند کر کے کیوں پڑی ہوئی ہو؟ میں کیا سمجھوں اس صورتِ حال سے؟''

اس کی گمبھیر اور پست آواز ابھری۔ ''انکل تابش! میں آپ کا سامنا نہیں کرسکتی۔ پلیز اس سب کے لیے مجھے معاف کردیں۔''

''کیا ''اس سب'' کے لیے؟ کیا کہنا چاہتی ہو؟''

اُس کی آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے آئی، بالکل اجنبی آواز۔ ''انکل تابش! عمران نے جو کہا..... وہ..... غلط نہیں ہے۔ میں اس سب پر اتنی شرمندہ ہوں کہ مرجانے کو دل چاہتا ہے۔''

میں چلا اٹھا۔ ''ماہین یہ کیا کہہ رہی ہو؟''

''بس انکل! جو ہونا تھا، وہ ہوگیا۔ میرے پاس کچھ سوالوں کا کوئی جواب نہیں۔ میں اس قابل تو نہیں کہ آپ سے معافی مانگ سکوں لیکن آپ کا دل بہت بڑا ہے۔ ہو سکے تو معاف کردیجیے گا اور ہاتھ جوڑ کر ایک درخواست ہے، پلیز اب کوئی مجھ سے اس بارے میں کوئی بات نہ کرے۔ میں اب جلد از جلد واپس لاہور جانا چاہتی ہوں۔''

ماہین..... ماہین، یہ میں کیا سن رہا ہوں تمہارے منہ سے۔ تم نے محبت کی تھی عمران سے۔ اس سے محبت کا دعویٰ کیا تھا۔ اس کے لیے لاہور چھوڑ کر اور اشفاق کو ساتھ لے کر اسے ڈھونڈتی پھر رہی تھیں۔ پھر یہ سب کیوں ہوا، کیسے ہوا؟''

''انکل تابش! میں نے کہا ہے نا، میرے پاس کچھ سوالوں کا کوئی جواب نہیں۔ پلیز..... پلیز، اپنی اس کمزور، خطاکار بیٹی کو معاف کردیں۔''

اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہوگیا۔ میرے کاسۂ سر میں سرخ جھکڑ چل رہے تھے۔ میں کسی صورت یہ سب ماننے کو تیار نہیں تھا مگر جو سامنے آرہا تھا، اسے کس خانے میں فٹ کیا جاتا۔ ایک اور خیال بار بار ذہن میں چمکتا تھا۔ بجلی کی طرح لہرا جاتا تھا۔ یہ طے تھا کہ گوہار زینت، سردار حویلی میں عمران کے عشق میں مبتلا ہوگئی تھی۔ اب حال ہی میں اس نے شانے مینشن میں عالی جاہ سے اپنی سزا ملتوی کرانے کے لیے اسے کوئی نادر تجویز دی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ عمران اور ماہین کی موجودہ صورتِ حال کے پیچھے گوہار زینت کا ہی کوئی پلان ہو؟ فضا میں شدید خطرات کی بو محسوس ہوئی۔

اب دن چڑھ آیا تھا۔ ایک سنہری دھوپ نے کوٹھی کے سرسبز لان کو روشن کردیا تھا۔ لیکن دل بجھے ہوئے تھے۔ اشفاق مسلسل بے ہوشی کی کیفیت میں تھا۔ انوش جٹ اسے لے کر بڑی رازداری سے اپنے ایک بااعتماد ڈاکٹر کے پرائیویٹ اسپتال لے گیا تھا۔ میرے فون پر کال کے سگنل آئے۔ آن ناؤن نمبر تھا۔ کال ریسیو کی تو بھیگی بھیگی سی آواز کچھ جانی پہچانی لگی۔ ''بہت اچھا کیا..... بہت اچھا کیا..... بہت اچھا کیا۔'' وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

میں پہچان گیا یہ وہی کٹے بازو والا خستہ حال شخص تھا جو اپنی ننگی پنڈلیوں کے ساتھ اکثر گوٹھ نوشیر کے اردگرد چکراتا نظر آتا تھا۔ کسی نے بتایا تھا کہ وہ ایک پروفیسر تھا۔ کوئٹہ کے کسی کالج میں باقاعدہ ٹیچنگ کرتا تھا مگر پھر کیا سے کیا ہوگیا۔ پتا نہیں کہ میرا فون نمبر اس کے پاس کہاں سے آگیا تھا، مجھے یوں لگا کہ وہ کسی سے فون مانگ کر کال کررہا ہے۔ دوبارہ بولا۔ ''بہت اچھا کیا کہ اس کے سامنے نہیں آئے۔ نہیں تو شاید..... رانی کی کوٹھی سے زندہ باہر نہ نکلتے۔ وہ انسان نہیں شیطان ہے۔ اس کی رگوں میں خون کی جگہ زرد زہر دوڑتا ہے۔ اس کا دل اس کے چہرے کے رنگ سے زیادہ سیاہ ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ہزار سال میں بس ایک بار پیدا ہوتا ہے۔ اس کے مقابل آنے کے لیے بڑی پلاننگ اور ہمت کی ضرورت ہوگی۔ بہت اچھا کیا، بہت اچھا کیا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ کیا بولتے جارہے ہو..... اور کہاں ہو تم؟ میرا نمبر کہاں سے ملا؟ ہیلو..... ہیلو.....'' مگر وہ فون بند کرچکا تھا۔

تابش اور شاہ زیب کی یکجائی میں خطرناک کھیل کے سلسلے خیز واقعات کا ماجرا اگلے ماہ پڑھیں۔

امید

فیضان مسعود

عقل قدرت کا گراں قدر عطیہ ہے جس نے انسان کو انسان بنایا ہے... یعنی کہ فطرتِ عقل کے بنیادی تقاضے منصبِ انسانیت کے منصبی تقاضے ہیں... عقل شناس لوگوں کے درمیان رہنے والے کچھ کرداروں کا پُراسرار ماجرا... جو اپنی اپنی فطرت میں ایک معما ہے... انہی میں سے ایک نے وہ کچھ کر دکھایا کہ عقل و دانش رکھنے والے ہکا بکا رہ گئے...

سائنسی دنیا سے تعلق رکھنے والی ایک تحیر زدہ کہانی.....

بحیرہ عرب آج اپنے نام کی طرح مہربان نہیں تھا۔ اس کا رنگ گدلا اور آسمان کا رنگ سیسے کی پگھلی ہوئی چادر جیسا تھا۔ ساحل سے ٹکراتی ہر لہر میں ایک غصہ، ایک وحشت تھی جو آنے والے وقت کا اعلان کر رہی تھی۔ ریڈیو کی لہروں پر ایک ہی نام گونج رہا تھا۔

طوفان نیلوفر، ایک ایسا نام جو اپنی تمام تر نزاکت کے باوجود اپنے اندر تباہی کی ایک پوری داستان سمیٹے ہوئے تھا۔ محکمۂ موسمیات نے خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی اور

ساحلی علاقوں سے ماہی گیر اپنی کشتیاں واپس لا رہے تھے مگر ایک سرکاری لانچ ابھی بھی گہرے سمندر کے تھپیڑے کھاتی ہوئی ساحل سے دور، ایک ویران اور بدنام زمانہ جزیرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ انجن کی کھڑکھڑاہٹ سمندر کے شور میں دبی جا رہی تھی اور ہر آنے والی لہر لانچ کو کسی کھلونے کی طرح اچھال رہی تھی۔ لانچ کے نچلے حصے میں، جہاں ڈیزل کی بُو اور سمندری کائی کی سڑاند رچی ہوئی تھی، لوہے کی زنگ آلود سلاخوں کے پیچھے وہیل چیئر پر ایک شخص بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے اور پاؤں میں بھاری بیڑیاں پڑی تھیں جو لانچ کی ہر لرزش کے ساتھ لکڑی کے فرش سے ٹکرا کر ایک خشک اور بے رحم دھاتی آواز پیدا کر رہی تھیں۔ اس نے مریضوں والا لباس پہن رکھا تھا جو جگہ جگہ سے پھٹا ہوا اور میلا کچیلا تھا۔ اس کے بال بے ترتیب اور بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر کئی دنوں کی بڑھی ہوئی داڑھی نے اس کے خدوخال کو وحشیانہ اور ڈراؤنا بنا دیا تھا لیکن اگر کوئی غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھتا تو اسے وہاں وہ خالی پن نظر نہ آتا جو عام طور پر دیوانوں یا پاگلوں کی آنکھوں میں ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں کی گہرائی میں ایک طوفان چھپا ہوا تھا، ایک ایسا پوشیدہ تلاطم جو باہر سے آنے والے سمندری طوفان نیلوفر سے کہیں زیادہ خطرناک اور تباہ کن تھا۔

یہ شخص ذیشان اکرم نہیں تھا، یہ سرکاری کاغذات میں درج مریض نمبر 404 تھا۔ ایک خطرناک، پُرتشدد اور ناقابلِ علاج ذہنی مریض جسے عدالت کے خصوصی حکم پر شہر کے عام اسپتالوں سے نکال کر سمندر کے بیچوں بیچ قائم دارالشفا میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ اسپتال کا عملہ مستقل ذیشان پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

یہ پروفیسر زیدی کے پلان کا حصہ تھا جسے انسپکٹر پرویز کی تائید حاصل تھی۔ پروفیسر عرفان زیدی جامعہ کراچی کے شعبۂ نفسیات کے ریٹائرڈ پروفیسر تھے اور انہیں کریمنل سائیکالوجی میں ملکہ حاصل تھا۔ آج کل وہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ بطور کنسلٹنٹ کام کر رہے تھے۔ پولیس کے پاس دارالشفا میں غیر قانونی سرگرمیوں کی اطلاع تھی اور یہ اس اسپتال کے خلاف ایک خفیہ سٹنگ آپریشن تھا اور انسپکٹر پرویز اس وقت ذیشان کے ساتھ نگرانی کے لیے لانچ پر موجود تھا۔

ذیشان زیرِلب ناقابلِ فہم جملے بڑبڑا رہا تھا۔

"روشنی..... روشنی مر رہی ہے، وہ اسے کھا جائیں گے۔"

لانچ کی رفتار اچانک کم ہو گئی۔ سامنے دُھند کے گہرے بادلوں کو چیرتے ہوئے ایک ہیولا نمودار ہو رہا تھا۔ یہ ایک بے آب و گیاہ سیاہ چٹان کا ٹکڑا تھا جو سمندر کے سینے سے کسی مردہ دیو کی طرح اُبھرا ہوا تھا۔ اس چٹان کے سب سے اونچے مقام پر ایک قدیم، سیاہ پتھروں سے بنی عمارت کھڑی تھی جس پر لکھا تھا۔ "دارالشفا"۔

"جہنم میں خوش آمدید!" ذیشان نے اپنے خشک ہونٹوں کو ہلاتے ہوئے زیرِلب کہا۔

اسپتال کا مرکزی دروازہ لوہے کا ایک دیوہیکل ڈھانچا تھا جو ایک دل دہلا دینے والی چرچراہٹ کے ساتھ کھلا۔ محافظوں نے وہیل چیئر کو دھکا دیا اور ذیشان کو اس تاریک دنیا کے اندر دھکیل دیا جبکہ انسپکٹر پرویز ان کے ساتھ ساتھ اندر داخل ہوا۔ اندر کا ماحول باہر کے طوفان سے بھی زیادہ گھٹن زدہ اور وزنی تھا۔ راہداریوں میں فینائل، دواؤں اور پرانی سیلن کی ایک ملی جلی بُو رچی تھی جو سانس لینا دوبھر کر رہی تھی۔ ہیڈ ڈاکٹر، صارم ان کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ وہ ایک دراز قد، غیر معمولی طور پر پُرکشش اور مقناطیسی شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے چہرے پر ایک پیشہ ورانہ اور دوستانہ مسکراہٹ تھی لیکن اس کی آنکھوں میں شیشے جیسی بے تاثر چمک تھی جیسے وہ سامنے والے کے جسم کا نہیں بلکہ روح کا ایکسرے کر رہا ہو۔

"انسپکٹر صاحب، خوش آمدید! آپ نے بالکل صحیح فیصلہ کیا۔ ہم اسے سنبھال لیں گے۔" ڈاکٹر صارم کی آواز میں ایک عجیب سی ٹھنڈک اور خود اعتمادی تھی۔ پرویز نے طنزیہ نظروں سے ذیشان کو دیکھا جو اَب بھی بڑبڑا رہا تھا۔

"سنبھال لیں گے؟ ڈاکٹر صاحب، یہ چلتا پھرتا بم ہے۔ بس اس بات کو یقینی بنائیں کہ یہ آپ کے اسپتال سمیت پھٹ نہ جائے۔ پروفیسر صاحب کا اصرار نہ ہوتا تو میں اسے کسی اور اسپتال میں بھیجتا۔" پرویز نے طنزیہ انداز میں کہا۔

ڈاکٹر صارم کی مسکراہٹ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

"فکر نہ کریں انسپکٹر، ہم ہر قسم کے مریض سے اچھی طرح واقف ہیں۔"

ذیشان کو ان کے حوالے کر کے پرویز اپنی سرکاری لانچ پر کراچی واپس روانہ ہو گیا۔

ذیشان کو اس کے وارڈ کی طرف لے جایا گیا۔ ایک نرس نے آگے بڑھ کر اسے سکون آور دوا کا انجکشن لگانے کے لیے اس کی بانہہ پکڑی۔ ذیشان نے کوئی مزاحمت نہیں کی جیسے وہ اپنے ہوش و حواس میں ہی نہ ہو۔ اس نے اپنی

بانہہ ڈھیلی چھوڑ دی لیکن جس لمحے نرس نے انجکشن لگا کر منہ موڑا، اس نے کمال مہارت سے اپنے منہ میں پہلے سے چھپائے ہوئے ایک چھوٹے سے کیپسول کو دانتوں میں دبا کر ساری دوا کا اثر فوری طور پر ختم کر دیا۔ یہ ایک خطرناک کھیل تھا۔ اسے ہوش میں رہنا تھا، ہر قیمت پر لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس فیصلے کی قیمت اسے اپنی ہی ذہنی اذیت کی صورت میں چکانا پڑے گی۔

ذیشان کو ہتھکڑیوں اور بیڑیوں سے آزاد کر کے ایک اجتماعی وارڈ میں پہنچا دیا گیا جہاں اس کے علاوہ چھ اور مریض تھے۔ اس نے خود کو ایک بستر پر گرا دیا اور آنکھیں بند کر لیں لیکن اس کا دماغ کسی ریڈار کی طرح کام کر رہا تھا۔ وہ ہر آواز، ہر حرکت اور ہر سائے کو محسوس کر رہا تھا۔ یہ وارڈ دکھ اور اذیت کا ایک چھوٹا سا نمونہ تھا۔ ایک کونے میں ایک سابقہ فوجی تھا جو ہر آہٹ پر ایسے... چونکتا جیسے کوئی بم پھٹا ہو۔ اس کی آنکھیں ہر وقت دروازے پر لگی رہتی تھیں جیسے وہ کسی حملے کا منتظر ہو۔ ایک ادھیڑ عمر عورت کھڑکی سے باہر سمندر کو دیکھتے ہوئے مسلسل رو رہی تھی، اس کے آنسو اس کے گالوں پر خشک ہو کر راستے بنا چکے تھے۔ ایک نوجوان لڑکا دیواروں پر خیالی تصویر بنا کر ان سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کی دنیا شاید اس وارڈ کی دنیا سے زیادہ رنگین تھی۔

پھر ذیشان کی نظر وارڈ کے دوسرے کونے میں موجود ایک وہیل چیئر پر پڑی۔ اس پر ایک چھوٹی، تقریباً آٹھ یا نو سالہ بچی بیٹھی تھی۔ اس کے بال کالے اور گھنے تھے جو اس کے کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں — وہ آنکھیں بالکل خالی تھیں جیسے دو سیاہ کنویں جن میں کائنات کی ساری روشنی گر کر دم توڑ گئی ہو۔ وہ نہ بولتی نہ آنسو بہاتی تھی نہ پلک جھپکتی تھی، بس سامنے خلا میں گھورتی رہتی تھی۔ اس کے وجود میں ایک ایسا غیر فطری سکوت تھا جو دیکھنے والے کو خوفزدہ کر دے۔ اس کے سامنے میز پر ایک فائل رکھی تھی جس پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ مریض نمبر 7۔ ذیشان کو اس پر عجیب سا ترس آیا لیکن ترس کے ساتھ ایک اور احساس بھی تھا جسے وہ کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا؟

وارڈ کے ماحول کا اثر اب ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس کا دماغ جو منصوبے کے مطابق تیز اور چوکنا رہنا چاہیے تھا، اس کے برعکس کام کرنے لگا۔ اس کے اندر کا طوفان تھم رہا تھا۔ وارڈ کی دیواریں اسے اپنے اوپر گرتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ ہوا میں موجود اداسی اس کے سینے میں اتر رہی تھی۔ اسے اپنے گود لینے والے والدین کے قتل کے دھندلے عکس اور پرچھائیاں اپنی بند آنکھوں کے پیچھے ناچتی ہوئی نظر آنے لگی تھیں۔ وہ کمزور پڑ رہا تھا، اور اس جہنم میں کمزوری موت کا دوسرا نام تھی۔

رات ہوتے ہی طوفان پوری شدت سے جزیرے پر حملہ آور ہو گیا۔ بارش کی بوندیں گولیوں کی طرح کھڑکیوں کے شیشوں سے ٹکرا رہی تھیں اور ہوا کی سرسراہٹ کسی آسیب کی چیخ کی طرح گونج رہی تھی۔ جزیرے کا پرانا جنریٹر چند ہچکیاں لینے کے بعد خاموش ہو گیا اور دارالشفا مکمل تاریکی میں ڈوب گیا۔ عملے کے زیادہ تر لوگ آخری کشتی سے شہر جا چکے تھے۔ اب اس جزیرے پر صرف ڈاکٹر صارم، ایک وارڈن رستم، ایک نرس پروین، ایک باورچی رحیم، اور سات مریض قید تھے۔ گیارہ لوگ، ایک جزیرہ، اور ایک طوفانی رات۔

آدھی رات کے قریب جب طوفان اپنے عروج پر تھا، ہوا اور بارش کے شور کو چیرتی ہوئی ایک دلخراش انسانی چیخ گونجی۔ یہ آواز اتنی بلند، اذیت ناک اور قریب تھی کہ ایک لمحے کے لیے وارڈ میں موجود تمام مریض ساکت ہو گئے۔ یہ آواز ڈاکٹر صارم کے دفتر کی سمت سے آئی تھی۔

☆☆☆

چیخ کے بعد طاری ہونے والی خاموشی، طوفان کے شور سے زیادہ خوفناک تھی۔ وارڈ میں مریضوں کی سسکیوں اور بڑبڑاہٹ کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ ذیشان کا ذہن جاگ رہا تھا لیکن اس کا جسم جیسے اس کا ساتھ چھوڑ رہا ہو۔ اس نے باقی رات کروٹیں بدلتے اور اندھیرے میں چھپے انجانے خوف سے لڑتے ہوئے گزاری۔ یہ صرف ایک رات نہیں تھی، یہ ایک صدی تھی جو ہر لمحہ پھیلتی جا رہی تھی۔

جب صبح کی پہلی اداس اور سرمئی کرن نے کھڑکی سے جھانکا تو طوفان کی شدت قدرے کم ہو چکی تھی لیکن جزیرے پر ایک نئی قسم کی وحشت نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔ وارڈن رستم، نرس پروین اور باورچی رحیم، تینوں کے چہرے زرد اور آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر صارم کا ناشتے پر نہ آنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ اپنے اصولوں کا سخت پابند تھا۔

"میں دیکھ کر آتا ہوں۔" رستم نے اپنی آواز میں ہمت پیدا کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا اور ڈاکٹر کے دفتر کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے دروازے پر دستک دی۔ "ڈاکٹر صاحب!"

اندر سے کوئی جواب نہیں آیا، صرف بارش کی ہلکی ہلکی آواز تھی۔ اس نے دوبارہ دستک دی، اس بار کچھ زیادہ زور

سے۔ ”ڈاکٹر صارم، آپ ٹھیک تو ہیں؟“

اندر موت جیسی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ رستم کا دل کسی اَن دیکھے خوف سے بیٹھنے لگا۔ اس نے دروازے کے ہینڈل کو گھمایا لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ اب اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے اپنا مضبوط کندھا دروازے سے ٹکرایا۔ ایک، دو، اور تیسری بھرپور ضرب پر بوسیدہ لکڑی کا قفل ٹوٹ گیا اور دروازہ چرچراتا ہوا اندر کی طرف کھل گیا۔

رستم دہلیز پر ہی جم کر رہ گیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور منہ سے ایک گھٹی گھٹی چیخ نکلی۔ کمرے کا منظر کسی بھیانک خواب سے کم نہیں تھا۔ ڈاکٹر صارم اپنی مہنگی چمڑے کی کرسی پر رسیوں سے مضبوطی سے بندھا ہوا تھا۔ اس کا دھڑ اور اعضا۔ بالکل صحیح سلامت تھے، کپڑوں پر کوئی سلوٹ تک نہیں تھی لیکن اس کا سر — اس کا سر اور چہرہ اس بُری طرح جلا ہوا تھا کہ صرف ایک سیاہ، بے شناخت مسخ شدہ ڈھانچا باقی رہ گیا تھا۔ کمرے میں پیٹرول، مٹی کے تیل یا کسی اور آتش گیر مادے کی کوئی بُو نہیں تھی۔ یہ ناقابلِ یقین تھا۔

رستم نے ہمت کر کے اندر قدم رکھا۔ کھڑکی اندر سے مضبوطی سے بند تھی۔ دروازہ بھی قفل ٹوٹنے سے قبل اندر سے بند تھا۔ یہ ایک کلاسک لاکڈ روم مسٹری تھی، ایک ایسا معما جس کا کوئی سرا نظر نہیں آ رہا تھا۔ سب سے خوفناک اور ناقابلِ فہم منظر دیوار پر تھا۔ جلی ہوئی لاش کے عین پیچھے، گہرے، تازہ خون سے پیچیدہ ریاضیاتی اور کیمیائی فارمولے لکھے ہوئے تھے جیسے کوئی پاگل سائنسدان بلیک بورڈ پر اپنا شاہکار تخلیق کر رہا ہو۔ یہ ذہانت اور وحشت کا ایک ایسا امتزاج تھا جو انسانی فہم سے بالاتر تھا۔

رستم نے اسپتال اور جزیرے کے واحد ریڈیو کمیونیکیشن سسٹم سے پولیس ہیڈ کوارٹر میں رابطہ کیا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی اور وہ بمشکل الفاظ ادا کر پا رہا تھا۔

خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی۔ انسپکٹر پرویز جو ذیشان کو جزیرے پر چھوڑ کر ابھی اپنی گہرائیوں پر قابو پانے کی کوشش ہی کر رہا تھا، یہ سن کر اچھل پڑا۔ اس نے فوراً پروفیسر عرفان زیدی کو فون کیا اور ان کے ہمراہ دارالشفا جانے کا فیصلہ کیا۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ طوفان کی وجہ سے فرانزک کی ٹیم بھی وہاں نہیں پہنچ سکتی تھی۔ لہٰذا اگر اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جائے تو آفیشلی پولیس تفتیش کی ذمے داری اسے اکیلے ہی نبھانی تھی۔

سفر اذیت ناک تھا۔ سمندر اب بھی بپھرا ہوا تھا لہریں ان کی لانچ کو کھلونے کی طرح اچھال رہی تھیں۔ انسپکٹر پرویز مضبوطی سے ایک جنگلے کو پکڑے کھڑا تھا جبکہ پروفیسر زیدی اپنی نشست پر آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے جیسے وہ سمندر کی وحشت سے نہیں بلکہ اپنے ذہن میں اٹھنے والے طوفانوں سے لڑ رہے ہوں۔

جب وہ جزیرے پر پہنچے تو وہاں کا ماحول سوگوار اور خوفزدہ تھا۔ رستم انہیں سیدھا وارڈ میں ذیشان کے پاس لے گیا۔ ذیشان اپنے بستر پر ایک گٹھڑی کی طرح بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنس چکی تھیں، چہرہ زرد تھا، اور ہونٹ خشک تھے۔ وہ بمشکل نظریں اٹھا کر انہیں دیکھ پایا۔

پروفیسر زیدی نے آگے بڑھ کر اس کی نبض چیک کی، ان کی پیشانی پر تشویش کی لکیریں گہری ہو گئیں۔ انہوں نے پرویز کی طرف دیکھا اور دھیمی آواز میں کہا۔

”یہ اپنی راکھ والی کیفیت میں ہے۔ یہ منصوبہ خطرناک حد تک الٹا پڑ گیا ہے پرویز، اس کا ذہن اس وقت اس کا سب سے بڑا دشمن بنا ہوا ہے۔“

پرویز نے پورے جزیرے کو لاک ڈاؤن کرنے کا حکم دیا۔ اسے پہلی بار اپنی بے بسی کا شدید احساس ہوا۔ وہ ایک ایسے جزیرے پر پھنس گیا تھا جہاں اس کے اور پروفیسر کے علاوہ اب کُل دس افراد موجود تھے، اور ان میں سے ایک انتہائی ذہین، بے رحم اور ناقابلِ فہم قاتل تھا۔

پروفیسر زیدی جائے وقوعہ پر پہنچے۔ پرویز انہیں تفصیلات بتا رہا تھا، لاکڈ روم، جلا ہوا سر، کوئی آتش گیر مادہ نہیں لیکن پروفیسر کا دھیان ان چیزوں پر نہیں تھا۔ انہوں نے کمرے پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور سیدھا اس دیوار کے پاس چلے گئے جہاں خون سے فارمولے لکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنا چشمہ درست کیا اور اپنی انگلیوں کو ان خونی لکیروں کے قریب لے گئے، بغیر انہیں چھوئے ان کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ اُبھری، پھر وہ بولے۔

”شرلاک ہومز کہتا تھا کہ جب تم ناممکن کو ختم کر دو تو جو باقی بچتا ہے، چاہے وہ کتنا ہی غیر امکانی کیوں نہ ہو، وہی سچ ہوتا ہے۔“

ان کی نظریں ایک ماہر کی طرح ان فارمولوں کا تجزیہ کر رہی تھیں۔

”یہ کسی پاگل شخص کا کام نہیں ہے پرویز۔ یہ تحریر، یہ نفاست، ہر علامت کی درستی — یہ کسی ایسے اُلجھن و تجسس شخص کا کام ہے جس کا ذہن ایک سپر کمپیوٹر کی طرح ہے۔ قاتل غصے میں نہیں تھا، وہ حساب لگا رہا تھا۔ وہ اپنے عمل کے نتائج کو ریکارڈ کر رہا تھا۔“

پرویز نے جھنجلا کر اپنے بال نوچے اور کہا۔ ''ایک طرف اتنی وحشت کہ سر ہلا دیا، اور دوسری طرف اتنی نفاست سے حساب کتاب، پروفیسر صاحب! یہ کیا بکواس ہے؟ یہ تضاد میری سمجھ سے باہر ہے۔''

پرویز اور پروفیسر، ذیشان کو سہارا دے کر جائے وقوعہ پر لائے۔ ذیشان کی حالت بہت خراب تھی، وہ صرف سرگوشیوں میں بات کر سکتا تھا۔ اس کی نظریں کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں جیسے کوئی ٹوٹا ہوا کیمرا دھندلی تصویریں لے رہا ہو۔ اس کی آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھا، سوائے ایک گہری، بے انتہا تھکن کے۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا ڈاکٹر کی لاش کے قریب گیا اور اپنی کانپتی ہوئی انگلی سے اس کے ہاتھ کی کلائی کی طرف اشارہ کیا۔

پرویز نے غور سے دیکھا۔ وہاں ایک مہنگی گھڑی کا واضح سفید نشان تھا لیکن گھڑی غائب تھی۔

''قاتل چور تھا۔'' پرویز نے فوراً نتیجہ اخذ کیا۔ ''لڑائی کے دوران اس نے گھڑی چرائی اور پھر ثبوت مٹانے کے لیے اسے جلا دیا۔''

پروفیسر نے نفی میں سر ہلایا، ان کی نظریں اب بھی دیوار پر تھیں۔

''نہیں پرویز! اگر اسے ثبوت مٹانے ہوتے تو وہ پوری لاش کو آگ لگا دیتا۔ اور دیکھو ڈاکٹر کی میز کی دراز میں موجود چھوٹی تجوری کھلی پڑی ہے اور اس میں ہزاروں روپے کے نوٹ موجود ہیں۔ قاتل کو گھڑی چاہیے تھی، پیسے نہیں۔'' ان کی آواز میں سنجیدگی آ گئی تھی۔ ''یہ چوری نہیں ہے، یہ ایک پیغام ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس گھڑی میں ایسا کیا تھا؟''

کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ اب ان کے سامنے صرف ایک لاش نہیں تھی بلکہ ایک ایسا معما تھا جس کی ہر تہہ پچھلی سے زیادہ پیچیدہ اور خوفناک تھی۔

☆☆☆

قتل کی ابتدائی تفتیش اور جائے وقوعہ کے معائنے کے بعد انسپکٹر پرویز نے اپنی توجہ جزیرے پر موجود زندہ افراد کی طرف مرکوز کی۔ اب وہ دس افراد تھے، ایک دوسرے سے خوفزدہ، ایک دوسرے پر شک کرتے ہوئے، ایک ایسے جزیرے پر قید جہاں سے فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ پرویز نے اپنا عارضی ہیڈ کوارٹر اسپتال کے ڈائننگ ہال میں قائم کیا اور ایک ایک کر کے تینوں اسٹاف ممبرز کو تفتیش کے لیے بلایا۔

پہلے وارڈن رستم کو بلایا گیا۔ وہ ایک دیوہیکل شخص تھا۔ اس کا سر گنجا اور چہرے پر چیچک کے گہرے داغ تھے۔ چالیس کے قریب عمر، چہرے پر ہر وقت ایک سختی اور آنکھوں میں ایک ایسی گہرائی جو بتاتی تھی کہ اس نے زندگی میں بہت کچھ دیکھا ہے۔ وہ پُرسکون رہنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کے بار بار بھنچتے ہوئے جبڑے اس کے اندرونی خلفشار کی گواہی دے رہے تھے۔

''ڈاکٹر صارم سے تمہارے تعلقات کیسے تھے؟'' پرویز نے براہِ راست سوال کیا۔

پیشہ ور اندر رستم نے مختصر جواب دیا۔

''مجھے بتایا گیا ہے کہ اس نے پچھلے دو مہینے سے تمہاری تنخواہ روکی ہوئی تھی؟''

رستم کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے تلخی ابھری۔

''ہاں، وہ کہتا تھا کہ اسپتال مالی بحران کا شکار ہے لیکن وہ اپنی نئی گاڑی خریدنے اور دفتر کو سجانے پر لاکھوں خرچ کر رہا تھا۔ وہ ایک بے ایمان آدمی تھا۔''

''تو اس لیے تم نے اسے مار دیا؟'' پرویز کی آواز میں کاٹ تھی۔

''اوہ نہیں! میں قاتل نہیں ہوں۔ میں، نرس پروین اور رحیم، ہم تینوں اسٹاف روم میں ساری رات تاش کھیل رہے تھے۔ ہم ایک دوسرے کے سامنے تھے اور کھیل میں اتنے مگن تھے کہ ہمیں چیخ کی آواز تک نہیں آئی، وہ تو جب میں صبح دروازے کا قفل توڑ کر کمرے میں داخل ہوا تب مجھے ڈاکٹر صاحب کی موت کا علم ہوا۔''

''تو تمہیں کیسے پتا کہ چیخ کی آواز آئی تھی؟'' پرویز نے چبھتا ہوا سوال کیا۔

''وہ تو صبح وارڈ میں مریضوں کی بات چیت سے اندازہ ہوا۔ ویسے بھی ہمارا اسٹاف روم وارڈ کے مقابلے میں ڈاکٹر صاحب کے کمرے سے کافی دور ہے اسی لیے کوئی بھی آواز مشکل سے ہی آتی ہے۔''

رستم کے جوابات قابلِ یقین حد تک منطقی تھے۔

اگلی باری نرس پروین کی تھی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر، خوفزدہ عورت تھی جس کے ہاتھ مسلسل کانپ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں جیسے وہ پوری رات روتی رہی ہو۔

''آپ ڈاکٹر صارم کے بارے میں کیا جانتی ہیں؟'' پروین نے اپنی شال کو مزید کس کر پکڑ لیا۔

''وہ..... وہ ایک بہت سخت باس تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ڈانٹتے تھے۔''

پرویز نے ایک فائل اس کے سامنے رکھی۔ ''یہ آپ کے خلاف ایک انکوائری رپورٹ ہے۔ دو سال پہلے آپ پر

ایک مریض کو غلط دوا دینے کا الزام لگا تھا جس سے اس کی موت ہو سکتی تھی۔ ڈاکٹر صارم نے اس انکوائری کو دبوا دیا تھا۔ کیا وہ اس بات پر آپ کو بلیک میل کر رہا تھا؟''

پروین کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کے منہ سے صرف ایک سسکی نکل سکی۔ اس نے روتے ہوئے سر ہلا دیا۔

''چیخ کے وقت آپ کہاں تھیں؟''

''اسٹاف روم میں، رستم اور رحیم کے ساتھ۔ ہم سب وہیں تھے۔''

آخر میں باورچی رحیم کو بلایا گیا۔ وہ ایک دُبلا پتلا، خاموش طبع نوجوان تھا جس کی نظریں مسلسل فرش پر جمی تھیں۔

''ڈاکٹر نے تم پر چوری کا الزام لگایا تھا؟''

رحیم نے آہستہ سے سر ہلایا۔ ''اس نے کہا تھا کہ میں راشن چوری کرتا ہوں۔ یہ جھوٹ تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ میری تلاشی لے لے لیکن اس نے مجھے نوکری سے نکالنے کی دھمکی دی۔''

''تمہارے پاس بھی اسے مارنے کی وجہ تھی۔''

''ہاں، وجہ تھی۔'' رحیم نے پہلی بار نظریں اٹھا کر پرویز کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں غصہ اور بے بسی کا طوفان تھا۔ ''اور کہیں نہ کہیں میرے دل میں اس کی موت کی خواہش بھی تھی لیکن میں نے اسے نہیں مارا۔ میں اسٹاف روم میں تھا۔''

تینوں کے پاس قتل کا مقصد تھا لیکن تینوں کے پاس ایک دوسرے کا فراہم کردہ ناقابلِ تردید عذرِ لاتعلقی بھی تھا۔ پرویز کا سر چکرانے لگا۔ قاتل کون تھا؟ کیا ان تینوں میں سے کوئی جھوٹ بول رہا تھا؟ یا قاتل کوئی اور تھا؟

جب پرویز اسٹاف سے تفتیش کر رہا تھا، پروفیسر زیدی نے ذیشان کو ایک نیا، خطرناک کام سونپا۔ ذیشان تم ان مریضوں کے قریب جاؤ اور ان کا بھروسا جیتو۔ وہ ڈاکٹر سے نفرت کرتے تھے، وہ اس سے ڈرتے تھے۔ وہ کچھ نہ کچھ ضرور جانتے ہوں گے۔''

ذیشان کے لیے یہ کام اذیت ناک تھا۔ اُس کا اپنا ذہن اس کا ساتھ چھوڑ رہا تھا، اور اسے اب دوسروں کے ٹوٹے ہوئے ذہنوں میں جھانکنا تھا۔ اس نے اپنی بکھری حالت میں مریضوں کے ساتھ وقت گزارنا شروع کر دیا۔ وہ ان کی طرح ہی فرش پر بیٹھ جاتا اور گھنٹوں خلا میں گھورتا رہتا۔ وہ ان کی بڑبڑاہٹ کو غور سے سنتا، ان کے خوف کو محسوس کرنے کی کوشش کرتا۔ آہستہ آہستہ مریض اسے انہی میں سے ایک سمجھنے لگے۔ وہ اس کی موجودگی میں خود کو محفوظ محسوس کرنے لگے۔ ایک دن جب ذیشان وارڈ کے کونے میں بیٹھا تھا، وہ سابقہ فوجی اس کے قریب سرکا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ذیشان کے کان میں سرگوشی کی۔

''ہم سب یہاں پاگل بننے کا ناٹک کرتے ہیں تاکہ ڈاکٹر کے علاج سے بچ سکیں۔''

ذیشان نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا لیکن اس کا ذہن چونک گیا۔

فوجی نے دوبارہ سرگوشی کی۔

''وہ رات کو ہمیں نیچے تہ خانے میں لے جاتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ وہ ہمیں ٹھیک کر دے گا لیکن جو بھی وہاں سے واپس آتا تھا، پہلے جیسا نہیں رہتا تھا۔ اس کی آنکھیں خالی ہو جاتی تھیں۔''

اُدھر کراچی میں فہد صدیقی جو پروفیسر زیدی کا ہونہار شاگرد ہونے کے ساتھ ساتھ فیک جینئس بھی تھا، دارالشفا کے پرانے، دھول بھرے نقشوں کو ڈیجیٹائز کر رہا تھا۔ یہ ایک تھکا دینے والا کام تھا لیکن ذیشان کے ذریعے تہ خانے کا علم ہوتے ہی پروفیسر نے اسے یہ حکم دے دیا تھا۔ نقشوں کو غور سے دیکھتے ہوئے اسے کچن کے فرش کے نیچے ایک غیر معمولی خالی جگہ نظر آئی۔ یہ نقشے میں موجود نہیں تھی لیکن اس کی پیمائش بتا رہی تھی کہ وہاں کچھ تھا، ایک خفیہ راستہ۔ اس نے فوراً یہ معلومات سیٹلائٹ فون کے ذریعے انسپکٹر پرویز کو بھیجیں۔

پروفیسر زیدی اور انسپکٹر پرویز کچن میں پہنچے۔ انہوں نے فرش کا وہ حصہ ہٹایا جس کی نشاندہی فہد نے کی تھی۔ نیچے واقعی ایک زنگ آلود دھاتی دروازہ تھا۔ اسے کھولنے میں کافی مشقت کرنا پڑی۔ دروازہ کھلا تو نیچے جاتی ہوئی ایک تاریک سیلن زدہ سرنگ نظر آئی۔

وہ ٹارچ کی روشنی میں احتیاط سے نیچے اترے۔ تہ خانے کا منظر کسی سائنس فکشن فلم کا سیٹ لگ رہا تھا۔ یہ ایک جدید، اسٹیل کی بنی ہائی ٹیک لیبارٹری تھی۔ دیواروں کے ساتھ شیشے کے بڑے بڑے مرتبانوں میں انسانی دماغ کے حصے کسی نامعلوم محلول میں تیر رہے تھے۔ ایک بڑی، پیچیدہ مشین کمرے کے درمیان میں رکھی تھی اور اس کے ساتھ ایک آپریشن ٹیبل تھی۔

ایک میز پر ڈاکٹر صارم کی ذاتی ڈائری پڑی تھی۔ پروفیسر زیدی نے اسے اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔ ڈائری کے صفحات ڈاکٹر کے جنونی منصوبے اور اس کی کامیابیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ انسانی دماغ کے

Amygdala یعنی جذبات، درد اور خوف کے مرکز کو سرجری اور ادویات کے ذریعے نکالنے یا غیر فعال کرنے کے تجربات کر رہا تھا۔ اس کا مقصد ایک ایسا انسان بنانا تھا جسے نہ خوف محسوس ہو، نہ درد، اور نہ ہی ہمدردی۔ ایک پرفیکٹ سپاہی۔

''خدایا!'' پرویز نے بے یقینی سے کہا۔ ''یہ آدمی ڈاکٹر نہیں، قسائی تھا۔''

پروفیسر زیدی کی نظریں ڈائری کے آخری صفحات پر جمی تھیں۔ ان کا چہرہ سپاٹ تھا۔

''قسائی نہیں پرویز، وہ خود کو ایک مسیحا سمجھتا تھا۔ ایک ایسا مسیحا جو انسانیت کو اس کے سب سے بڑے دشمن، اس کے اپنے جذبات سے نجات دلانا چاہتا تھا۔''

اس خوفناک انکشاف کے بعد پروفیسر زیدی ڈاکٹر کے دفتر میں اکیلے واپس گئے۔ انہیں کچھ سوالوں کے جواب درکار تھے جو صرف وہ کمرا ہی دے سکتا تھا۔ انہوں نے ایک گہری سانس لی اور ڈاکٹر کی جلی ہوئی کرسی کو چھوا، پھر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اپنی ایسی نفسیاتی صلاحیت کو استعمال کرنے جا رہے تھے جو بیک وقت ایک نعمت بھی تھی اور ایک عذاب بھی۔

ان کا دماغ جائے وقوعہ میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک... خطرناک اور تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ وہ تقریباً ایک ٹرانس کی کیفیت میں تھے۔ انہیں اپنے ذہن میں جلے ہوئے گوشت کی شدید بُو محسوس ہوئی لیکن اس کے ساتھ انہیں غصے، نفرت یا انتقام کا کوئی جذبہ محسوس نہیں ہوا۔ اس کے بجائے انہیں ایک عجیب، سرد اور غیر جذباتی سائنسی تجسس کا احساس ہوا، جیسے کوئی سائنس دان خوردبین میں کسی کیڑے کو تڑپتے دیکھ کر اس کے اعصابی ردِعمل کو نوٹ کر رہا ہو۔ قاتل مقتول کے درد سے لطف اندوز نہیں ہو رہا تھا، وہ اسے ڈیٹا کے طور پر ریکارڈ کر رہا تھا۔ اسے کوئی پچھتاوا نہیں تھا، کوئی جذبات نہیں تھے۔ صرف خالص، سرد، بے رحم منطق تھی۔

پروفیسر نے جھٹکے سے آنکھیں کھولیں۔ ان کا جسم ٹھنڈے پسینے میں شرابور تھا۔ انہوں نے پرویز کو بلایا اور کہا۔ ''قاتل نے ڈاکٹر کو مارا نہیں، اس نے ڈاکٹر پر ایک تجربہ کیا ہے۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ایک انسان کو اس طرح اذیت دینے پر اس کے جسم اور ذہن میں کیا کیمیائی تبدیلیاں آتی ہیں۔''

پرویز نے بے یقینی سے پروفیسر کو دیکھا۔ ''کون کرتا ہے ایسا؟''

پروفیسر زیدی نے کھڑکی سے باہر طوفانی سمندر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ جو خود کو انسان نہ سمجھتا ہو۔''

☆☆☆

تہ خانے میں موجود خوفناک لیبارٹری اور ڈاکٹر صارم کی ڈائری نے تفتیش کو ایک نئی اور زیادہ تاریک سمت دے دی تھی۔ یہ اب صرف ایک قتل کا معاملہ نہیں تھا بلکہ غیر انسانی تجربات اور ایک گمراہ ذہانت کی کہانی تھی۔ پروفیسر زیدی نے فہد صدیقی کو ایک نیا کام سونپا۔

''ڈاکٹر صارم کے ماضی کے بارے میں ہر ممکن معلومات نکالو۔ اس کی تعلیم، خاندانی پس منظر، سب کچھ۔ مجھے اس کی شخصیت کے تانے بانے اُدھیڑنے ہیں۔''

فہد جو کراچی میں اپنی اسکرین کے سامنے بیٹھا تھا، اس کام میں جُت گیا۔ ڈیجیٹل دنیا میں ڈاکٹر صارم کا وجود تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا، جو اپنے آپ میں ایک عجیب بات تھی۔ لیکن فہد نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے اپنے ذرائع استعمال کر کے، اسپتال کے پرانے، دھول بھرے اینالاگ ریکارڈز تک رسائی حاصل کی جو سالوں سے کسی گودام میں پڑے تھے۔ گھنٹوں کی محنت کے بعد، اسے ڈاکٹر صارم کی فائل مل گئی۔

فائل میں موجود تصویر اور تعلیمی اسناد دیکھ کر فہد چونک گیا۔ فائل میں موجود ڈاکٹر صارم کی تصویر ایک پچاس سالہ، گھنے بالوں والے شخص کی تھی، اور اس کی اسناد کی تاریخ کے مطابق اسے میڈیکل کی ڈگری حاصل کیے ہوئے پچیس سال ہو چکے تھے۔ لیکن جزیرے پر موجود ڈاکٹر، جس کی عمر بمشکل چالیس سال لگتی تھی اور جس کے بال کم تھے، اس سے بالکل مختلف تھا۔ یہ دو الگ الگ افراد تھے۔ فہد نے کانپتے ہاتھوں سے پروفیسر زیدی کو فون کیا۔

''پروفیسر صاحب! یہاں بہت بڑی گڑبڑ ہے۔ جو شخص جزیرے پر ڈاکٹر صارم بن کر رہ رہا تھا، وہ اصلی ڈاکٹر صارم نہیں ہے۔''

یہ انکشاف ایک دھماکے کی طرح تھا۔ اگر وہ ڈاکٹر صارم نہیں تھا تو کون تھا؟ اور اصلی ڈاکٹر صارم کہاں تھا؟ پروفیسر زیدی جانتے تھے کہ اس گتھی کو صرف روایتی پولیس تفتیش سے نہیں سلجھایا جا سکتا۔ انہیں ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو معلومات کے ان راستوں تک پہنچ سکے جہاں پولیس کے ہاتھ بندھے ہوتے ہیں۔ انہوں نے فہد کو ہدایت کی۔

''یہ ساری معلومات فوراً زرینہ عباسی کو بھیج دو۔ اس سے

کہو، یہ اُس کی زندگی کی سب سے بڑی اسٹوری ہو سکتی ہے۔"

زرینہ عباسی آوازِ حق نیوز چینل کی نڈر اور مشہور تحقیقاتی صحافی، اپنی میز پر بیٹھی، اپنے مشہور شو "بے نقاب" کے اگلے اپی سوڈ کی تیاری کر رہی تھی جب اسے فہد کا پیغام ملا۔ جیسے جیسے وہ تفصیلات پڑھتی گئی، اس کی آنکھوں میں پیشہ ورانہ دلچسپی کی چمک بڑھتی گئی۔ ایک الگ تھلگ جزیرہ، ایک پُراسرار قتل، غیر قانونی تجربات، اور اب ایک چُرائی ہوئی شناخت۔ یہ واقعی ایک بڑی خبر تھی۔

زرینہ اپنے صحافتی ذرائع کے جال کو حرکت میں لے آئی۔ اس نے پولیس، اسپتالوں اور میڈیکل بورڈز میں موجود اپنے رابطوں کو فون کرنا شروع کیا۔ گھنٹوں کی انتھک کوشش کے بعد اس کے ہاتھ ایک ایسی معلومات لگی جس نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔

اس نے پروفیسر زیدی کو فون کیا۔

"پروفیسر صاحب! آپ یقین نہیں کریں گے۔ اصلی ڈاکٹر صارم چھ ماہ پہلے پُراسرار طور پر لاپتا ہو گیا تھا۔ اس کے خاندان نے گمشدگی کی رپورٹ بھی درج کروائی تھی لیکن کیس سرد خانے کی نذر ہو گیا۔" زرینہ ایک لمحے کے لیے رکی جیسے اگلے انکشاف کے لیے خود کو تیار کر رہی ہو۔

"اور جو شخص اس کی جگہ ڈاکٹر صارم بنا ہوا تھا، اس کا اصل نام ڈاکٹر فرحان ہے جو خود بھی ایک نیورو سرجن ہے۔ وہ اسی اسپتال کا ایک مریض تھا جسے شیزوفرینیا اور غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے یہاں داخل کروایا گیا تھا۔ لگتا ہے اس نے اصلی ڈاکٹر کو قتل کر کے اس کی شناخت چرا لی تاکہ وہ اس کے خطرناک تجربات کو آگے بڑھا سکے۔ یہ معلومات مجھے بہت مشکل سے دارالشفا کے ہی ایک سابقہ ملازم سے ملی ہیں جو اصلی ڈاکٹر صارم کی مبینہ گمشدگی کے بعد کسی طرح وہاں سے فرار ہو گیا تھا۔"

اُدھر جزیرے پر، ذیشان کی ذہنی حالت بدترین سطح پر پہنچ چکی تھی۔ حقیقت اور وہم کے درمیان کی لکیر مکمل طور پر مٹ گئی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وارڈ کی دیواریں اس پر گر رہی ہیں اور فرش سمندر بن گیا ہے جس میں وہ ڈوب رہا ہے۔ اسے اپنے گود لینے والے والدین کے مسخ شدہ چہرے نظر آ رہے تھے جو اس سے سوال کر رہے تھے۔ "تم نے ہمیں کیوں نہیں بچایا ذیشان؟"

یہ اذیت ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ فرش پر گر اچیخنا چاہتا تھا لیکن اس کے گلے سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اسی شدید ذہنی اذیت کی حالت میں اس نے نظریں اٹھائیں۔ اس کی نظر مریض نمبر 7 پر پڑی جو ہمیشہ کی طرح اپنی وہیل چیئر پر ساکت بیٹھی تھی۔ لیکن آج کچھ مختلف تھا۔ آج پہلی بار وہ بچی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی سیاہ، خالی آنکھیں براہِ راست ذیشان کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔ اور پھر اس نے کچھ ایسا کیا جس نے ذیشان کے وجود کو جڑوں تک ہلا دیا۔

وہ مسکرائی۔

یہ معصوم بچی کی مسکراہٹ نہیں تھی۔ یہ ایک سرد، حساب لگانے والی اور مکمل طور پر بے رحم مسکراہٹ تھی۔ اس مسکراہٹ میں نہ کوئی خوشی تھی نہ کوئی جذبہ۔ یہ صرف ہونٹوں کا ایک زاویہ تھا، جیسے کوئی شکاری اپنے شکار کو بے بس دیکھ کر مسکراتا ہے۔

ذیشان کے ذہن میں جیسے بجلی سی کوندی۔ ایک جھٹکے میں سارا دھند لکا، ساری پرچھائیاں، ساری اذیت چھٹ گئی۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی خوفناک سچائی باقی رہ گئی۔ وہ گونگی نہیں تھی، وہ بے حس نہیں تھی، اور وہ معصوم تو بالکل بھی نہیں تھی۔ وہ صرف دکھاوا کر رہی تھی۔

اس ایک لمحے نے ذیشان کو بے یقینی کی کیفیت سے نکال کر باہر پھینک دیا۔ اس کا ذہن صاف ہو گیا تھا لیکن اب اس میں خوف اور بے یقینی کی ایک نئی لہر دوڑ رہی تھی۔

جب ذیشان اپنی ذاتی جنگ لڑ رہا تھا، پروفیسر زیدی ڈاکٹر صارم کے دفتر میں دیوار پر لکھے فارمولوں کو حل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انہوں نے کئی گھنٹے ان پر صرف کیے تھے۔ آخر کار انہوں نے کاغذات ایک طرف رکھے اور انسپکٹر پرویز کو بلایا۔

"پرویز! یہ فارمولے جعلی ڈاکٹر صارم کے نہیں ہیں۔" پروفیسر نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ قاتل کے ہیں۔"

پرویز نے اُلجھن سے انہیں دیکھ کر کہا۔ "مطلب؟"

"قاتل نے ڈاکٹر فرحان کے مرنے کے ہر لمحے اس کے دل کی دھڑکن، اس کے اعصاب کے ردِعمل، اس کے درد کی شدت، اور اس کے جسم میں پیدا ہونے والے کیمیکلز کو ریاضیاتی طور پر نوٹ کیا ہے۔ یہ ایک تجربے کا لاگ بک ہے۔" پروفیسر نے ایک گہری سانس لی۔

"اور ان فارمولوں کو حل کرنے کے لیے جس سطح کی ذہانت درکار ہے، وہ آئن اسٹائن سے کم نہیں۔ یہ خالص ذہانت ہے۔ بے رحم، اور غیر انسانی ذہانت۔"

پروفیسر زیدی کے الفاظ ہوا میں معلق رہ گئے۔ کمرے میں موجود ہر شخص ایک ہی بات سوچ رہا تھا۔ اس جزیرے پر ایسا شخص کون ہو سکتا تھا؟ ذیشان کے تجربے کے

بعد اب تمام کڑیاں ایک ہی سمت میں اشارہ کر رہی تھیں، مریض نمبر 7۔

☆☆☆

رات کا اندھیرا ایک بار پھر جزیرے پر اتر رہا تھا لیکن آج طوفان باہر نہیں بلکہ دارالشفا کی دیواروں کے اندر تھا۔ پروفیسر زیدی، انسپکٹر پرویز اور ذیشان تینوں ڈائننگ ہال کی میز پر جھکے ہوئے تھے۔ ذیشان اب نہ صرف مکمل طور پر ہوش وحواس میں تھا بلکہ خطرناک حد تک چوکنا تھا۔ میز پر موجود واحد ایمرجنسی لیمپ کی روشنی ان کے سنجیدہ چہروں پر پڑ کر عجیب وغریب سائے بنا رہی تھی۔

''تمام ثبوت ایک ہی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔'' پروفیسر نے دھیمی آواز میں کہا جیسے وہ خود اپنے نتیجے پر یقین کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ہم ایک ایسے قاتل کو ڈھونڈ رہے تھے جو جسمانی طور پر طاقتور ہو، جو ایک بالغ مرد پر قابو پا سکے۔ لیکن ہم غلط تھے۔ یہ کام طاقت کا تھا ہی نہیں، یہ خالص ذہانت اور موقع کا کام ہے۔ قاتل وہ ہے جس پر کوئی شک ہی نہ کر سکے۔'' پرویز نے بے صبری سے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔

''لیکن وہ صرف ایک بچی ہے پروفیسر، آٹھ سال کی بچی، یہ ناممکن ہے!''

ذیشان نے، جو اَب تک خاموش تھا، اپنی نظریں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں میں اب طوفانی چمک نظر آ رہی تھی، ایک ٹھنڈی سخت چمک۔

''وہ بچی نہیں ہے انسپکٹر! وہ صرف ایک بچی کے جسم میں ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا ہے۔ وہاں سکوت نہیں ہے پروفیسر، وہاں خلا ہے، مکمل خالی پن۔ جذبات سے، انسانیت سے مکمل طور پر خالی۔''

اسی لمحے، کراچی میں موجود فہد کا لیپ ٹاپ بیپ ہوا۔ اس نے کئی گھنٹوں کی مسلسل کوشش کے بعد تہ خانے کی لیب کے کمپیوٹر سسٹم کو ہیک کر لیا تھا۔ اس نے ایک خفیہ فائل کھولی اور اس کا متن پڑھنا شروع کیا۔ اس کا رنگ اُڑ گیا۔ اب طوفان تھم چکا تھا اور رابطے بحال ہو چکے تھے چنانچہ اس نے وہ فائل فوراً موبائل فون کے ذریعے جزیرے پر موجود ٹیم کو بھیجی۔

فائل کا عنوان تھا۔ تجربہ نمبر 7 حتمی نتائج

اندر کا متن رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔

''180 دن۔ سبجیکٹ نے تمام توقعات کو پار کر لیا ہے۔ اس کا Amygdala مکمل طور پر غیر فعال ہے۔ وہ

فرمائش

دیارِ غیر میں زبان کا بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ فرانس میں ایک صاحب ایک ریسٹورنٹ میں مینیو سامنے رکھے کافی دیر تک اسے پڑھنے کی کوشش کرتے رہے۔ آخر کار انہوں نے ایک جگ اٹھا کر ویٹر سے انگریزی میں کہا۔ ''میرے لیے یہ لے آؤ۔''

ویٹر جو انگریزی سمجھتا تھا، متانت سے بولا۔ ''سر! اس وقت آرکسٹرا یہی بجا رہا ہے۔''

خاص بات

نو بیاہتا جوڑا ہنی مون منانے کراچی سے شمالی علاقہ جات کی طرف گیا۔ ایک خوبصورت مقام پر دلہن بے اختیار بول اٹھی۔ ''واہ، کیا خوبصورت نظارہ ہے۔''

دولہا نے ادھر ادھر دیکھا اور منہ بنا کر بولا۔ ''ایسی کون سی خاص بات ہے یہاں؟ اس پہاڑ، جھیل اور سبزے کو ہٹا دو تو بالکل اپنے کراچی جیسی جگہ ہے۔''

خیال خوانی

میاں بیوی بازار میں چلے جا رہے تھے۔ بیوی نے دوسری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس طرف کے فٹ پاتھ پر ایک عورت جا رہی ہے جو اپنے خیالات کی وجہ سے بڑی تکلیف اٹھا رہی ہے۔''

''تمہیں اس کے خیالات کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟'' شوہر نے چونک کر پوچھا۔

''کم از کم ایک خیال کے بارے میں تو معلوم ہو ہی گیا ہے اور اس سے اس کے دوسرے خیالات کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔'' بیوی نے کہا۔

''وہ خیال کیا ہے؟'' شوہر نے تجسس سے پوچھا۔

''اس کا خیال ہے کہ وہ سات نمبر کے پاؤں میں پانچ نمبر کے جوتے پہن کر بھی آسانی سے چل سکتی ہے۔'' بیوی نے جواب دیا۔

(مرسلہ: ہما اور یس، لیہ)

ایک مولوی صاحب خیرات پر وعظ فرما رہے تھے۔ سامعین میں ایک امیر لیکن کنجوس آدمی بھی بیٹھا تھا۔ جوں ہی مولوی صاحب نے وعظ ختم کیا، وہ دولت مند شخص بہ آوازِ بلند کہنے لگا۔ ''سبحان اللہ! خیرات کی بڑی برکات ہیں۔ دل چاہتا ہے ابھی جھولی پھیلا کر مانگنے لگ جاؤں۔''

خوف اور ہمدردی سے عاری ہے۔ اس کی ذہانت ناقابل یقین ہے۔ آج اس نے ایک نیا کیمیائی کمپاؤنڈ بنایا۔ دو عام، بے ضرر کیمیکلز کو ملا کر۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ملتے ہی یہ دونوں کیمیکل ایک انتہائی گاڑھے، گوند جیسے چپچپے مادّے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ مادّہ پانی کی طرح بہتا نہیں بلکہ جس سطح کو چھو لے، وہیں جم جاتا ہے۔ یہ کمپاؤنڈ ہوا کے ساتھ مل کر ایک منٹ سے بھی کم وقت میں 1000 ڈگری سیلسیس کی حرارت پیدا کرتا ہے۔ ایک لحاتی، شدید آگ کا گولا جو صرف نامیاتی مادّے (Organic Matter) کو جلاتا ہے اور کوئی دھواں یا باقیات نہیں چھوڑتا۔ اس نے اسے سورج کی بوند (Drop of Sun) کا نام دیا ہے۔ وہ ایک پرفیکٹ، بے رحم ذہانت کی مالک ہے۔ میرا شاہکار۔ میری تخلیق"

"تو یہ ہے اس معمے کا حل۔ پرویز! تم پوچھ رہے تھے نا کہ آگ کپڑوں تک کیوں نہیں پہنچی؟ وجہ یہی سورج کی بوند ہے۔ وہ مادّہ اتنا گاڑھا اور چپچپا تھا کہ وہ بہہ کر نیچے نہیں گرا۔ اور سب سے اہم بات، یہ مادّہ فوراً نہیں جاتا۔ اسے ہوا کے ساتھ ردِعمل کرنے میں تقریباً ایک منٹ لگتا ہے۔ اس بچی نے سرجیکل دستانے پہن کر اطمینان سے یہ موت کا لیپ ڈاکٹر کے چہرے پر ملا، دستانے اتارے، اور اس کے جلنے سے پہلے ہی وہاں سے ہٹ گئی۔ اسی لیے آگ وہیں تک محدود رہی جہاں تک اس کی انگلیوں نے وہ لیپ لگایا تھا۔"

"لیکن وہ باہر کیسے نکلی؟" پرویز نے اُلجھن میں سوال کیا۔ "دروازہ تو اندر سے بند تھا؟"

پروفیسر زیدی نے تہ خانے میں موجود لیبارٹری کی چھت کے کونے میں بنی ایک تنگ، دھاتی وینٹیلیشن ڈکٹ کا ذکر کیا جس کی جالی ہٹی ہوئی تھی۔

پروفیسر نے کہا۔ "یہ ڈکٹ سیدھی اوپر ڈاکٹر کے آفس میں کھلتی ہے۔ ایک عام انسان اس میں سے نہیں گزر سکتا لیکن ایک آٹھ نو سال کی دبلی پتلی بچی آسانی سے وہاں سے گزر کر آفس میں داخل ہوئی، اپنا کام مکمل کیا اور اسی راستے سے واپس نیچے آ گئی۔ دروازہ اندر سے بند ہی رہا، اور ہم اسے ایک ناممکن قتل سمجھتے رہے۔"

"اور وہ گھڑی؟ جو ڈاکٹر کی کلائی سے چوری ہوئی تھی۔ اس کا کیا مقصد تھا؟" پرویز کو اچانک یاد آیا۔

"وہ گھڑی۔" ذیشان نے کہا۔ "وہ چوری نہیں تھی، وہ پیغام تھا۔ وہ کہہ رہی تھی وقت ختم ہو رہا ہے۔"

اب ان کے پاس تمام جوابات تھے۔ ایک بچی جو درد اور خوف محسوس نہیں کرتی، ایک ذہانت جو نئے، مہلک ہتھیار ایجاد کر سکتی ہے۔ ایک ذہین قاتل جو قتل کو ایک کھیل سمجھتا ہے اور وقت ختم ہونے کا مطلب تھا کہ کسی اور کی جان بھی خطرے میں تھی۔

اب سب کچھ واضح تھا۔ وہ بچی جعلی ڈاکٹر صارم (ڈاکٹر فرحان) کا سب سے کامیاب اور سب سے خوفناک تجربہ تھی۔ ایک ایسا عفریت جسے اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا کہ ایک دن وہ اس کے ہاتھوں پر موجود موت کی لکیر کی وجہ بن سکے۔

"اسے فوراً پکڑنا ہوگا۔" پرویز نے ذیشان سے مخاطب ہو کر کہا اور وہ دونوں تیزی سے وارڈ کی طرف بھاگے۔

لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ جب وہ وارڈ میں داخل ہوئے تو مریض خوفزدہ ہو کر کونوں میں دبکے ہوئے تھے۔ وہیل چیئر خالی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ایک دھوکا تھی، ایک نقاب تھا جس کے پیچھے ایک بے رحم ذہانت چھپی ہوئی تھی۔

اچانک، اسپتال کی بچی کھچی بجلی بھی بند ہو گئی۔ ایمرجنسی لیمپ بھی بجھ گیا۔ مکمل، ناقابلِ تسخیر اندھیرا چھا گیا۔ بچی نے جنریٹر کی مرکزی تاریں کاٹ دی تھیں۔ اب وہ شکاری تھی، اور باقی سب شکار۔ اسی وقت، عمارت کے بالکل اوپر، چھت کی طرف سے کسی کے گھسیٹے جانے اور نرس پروین کی دبی دبی چیخوں کی آواز آئی۔

قاتل انہیں اپنی آخری شکارگاہ کی طرف بلا رہا تھا، عمارت کی کھلی، طوفان سے تباہ حال چھت۔ رحیم اور رستم شاید پروین کو مشکل میں دیکھ کر پہلے ہی اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔

تینوں فوراً چھت کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی طرف بھاگے۔ سیڑھیاں تنگ، اندھیری اور پھسلن زدہ تھیں۔ ہر قدم پر انہیں یہ ڈر تھا کہ کہیں کوئی پوشیدہ جال ان کا منتظر نہ ہو۔

جیسے ہی انہوں نے چھت کا دروازہ کھولا، سمندر کی تیز نمکین ہوا کا ایک جھونکا ان سے ٹکرایا۔

چھت ایک وسیع، کھلا میدان تھا جس کے چاروں طرف نیچی منڈیریں تھیں۔ طوفان نے چھت پر موجود ہر چیز کو تہس نہس کر دیا تھا۔ ٹوٹی ہوئی کرسیاں، ایک پرانی پانی کی ٹینکی اور جگہ جگہ بکھرا ہوا ملبا۔ اور چھت کے بالکل درمیان پانی کی ٹینکی کے پاس وہ کھڑی تھی۔

مریض نمبر 7

اس نے نرس پروین کو اپنے سامنے گھٹنوں پر بٹھایا ہوا

تھا اور اس کی گردن پر ایک چھوٹا سا، چمکتا ہوا سرجیکل بلیڈ رکھا ہوا تھا۔ نرس کی آنکھوں میں اتنی دہشت تھی کہ وہ چیخ بھی نہیں پا رہی تھی۔

بچی اب ایک سیاہ لباس میں ملبوس تھی جو شاید اس نے عملے کے کوارٹر سے چرایا تھا۔ چاند کی مدھم روشنی میں اس کا چھوٹا سا وجود ایک سائے کی طرح لگ رہا تھا، لیکن اس کی آنکھیں دو دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔

''کھیل ختم!'' پرویز نے پستول سیدھا اس پر تانتے ہوئے کہا۔ ''اس عورت کو چھوڑ دو!'' بچی ہنسی، ایک معصوم، کھلکھلاتی ہنسی۔

''میں بچی نہیں ہوں انسپکٹر! میں اگلا قدم ہوں۔ ارتقاء کا اگلا مرحلہ۔ ایک ایسا وجود جو آپ کی طرح پرانے، بیکار جذبات سے آزاد ہے۔''

''تم نے یہ سب کیوں کیا؟'' پروفیسر زیدی نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا، ان کی آواز میں غصہ نہیں بلکہ ایک گہری، فلسفیانہ دلچسپی تھی۔

''کیوں؟'' بچی نے سر کو ایک طرف جھکایا جیسے وہ اس سوال پر غور کر رہی ہو۔ ''کیونکہ میں سمجھنا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر نرحان (تھکی ڈاکٹر صارم) سمجھنا چاہتا تھا کہ خوف کیا ہے، اس لیے میں نے اسے اس کا تجربہ کروایا اور یہ نرس..... یہ ہمدردی کو سمجھنا چاہتی ہے، اس لیے میں اسے بتاؤں گی کہ ہمدردی کی قیمت کیا ہوتی ہے۔''

اس نے بلیڈ کا دباؤ نرس کی گردن پر بڑھایا۔

''گولی مت چلانا پرویز!'' پروفیسر چلائے۔ ''وہ نرس کو مار دے گی۔''

''تو ہم کیا کریں؟'' پرویز نے بے بسی سے کہا۔

اسی وقت، ذیشان، جو اب تک ایک سائے میں چھپا ہوا تھا، آگے بڑھا۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا، اس کے ہاتھ خالی تھے اور اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

''تم غلط ہو۔'' ذیشان نے بچی سے کہا۔ اس کی آواز پُرسکون اور مضبوط تھی۔

بچی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب؟''

''تم ارتقاء کا اگلا قدم نہیں ہو۔'' ذیشان نے چھت کے درمیان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''تم ایک نامکمل پروڈکٹ ہو، ایک غلطی۔ تم ذہین ہو لیکن تم سمجھتی نہیں ہو۔ تم جذبات کو ختم کرنا چاہتی ہو لیکن تم یہ نہیں جانتیں کہ جذبات، خاص طور پر درد اور خوف کمزوری نہیں ہیں۔ وہ ایک ہتھیار ہیں۔''

ذیشان اب اس کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا لیکن اس نے وہ نہیں کیا جس کی بچی توقع کر رہی تھی۔ اس نے حملہ نہیں کیا، وہ چیخا نہیں۔

وہ اچانک قہقہہ لگا کر ہنسا، ایک پاگلوں جیسی بے قابو ہنسی۔ پھر وہ چھت پر ناچنے لگا، عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگا اور اونچی آواز میں بے معنی جملے بولنے لگا۔

اس نے اپنے ذہن کا تمام انتشار، تمام پاگل پن، اس ایک لمحے میں باہر انڈیل دیا۔ بچی کا منطقی دماغ اس غیر متوقع اور بے ترتیب رویے کو پراسیس نہیں کر پایا۔ وہ ایک لمحے کے لیے مفلوج ہو گئی اور اس کی گرفت نرس پر ڈھیلی پڑ گئی۔

اسی لمحے پرویز نے گولی چلا دی۔

گولی بچی کے ہاتھ پر لگی جس سے بلیڈ چھوٹ کر دور جا گرا۔

بچی نے اپنے زخمی ہاتھ کو دیکھا جس سے بے تحاشا خون بہہ رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر درد کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ اس نے نرس کو ایک طرف دھکا دیا اور ایک غیر انسانی تیزی کے ساتھ ذیشان پر حملہ کر دیا۔

اس سے پہلے کہ ذیشان سنبھل پاتا، وہ اس سے ٹکرائی اور دونوں چھت کی منڈیر کی طرف گرنے لگے۔ ذیشان نے آخری لمحے میں منڈیر کو پکڑ لیا لیکن بچی اس سے چمٹی ہوئی تھی، وہ اسے..... اپنے ساتھ نیچے کھینچ رہی تھی۔

نیچے بیس فٹ کے فاصلے پر سمندر کا نمکین پانی اور سیاہ، پتھریلی چٹانیں منتظر تھیں۔

''ذیشان!'' پرویز اور پروفیسر ایک ساتھ چلائے۔

ذیشان اپنی پوری طاقت سے منڈیر کو پکڑے ہوئے تھا۔ بچی کا وزن اسے نیچے کھینچ رہا تھا۔ ''تم ہار گئے!'' بچی نے اس کے کان میں سرگوشی کی، اس کی آواز میں پہلی بار کوئی جذبہ تھا، فتح کا جذبہ۔ ''منطق ہمیشہ انتشار پر جیت جاتی ہے۔''

''شاید۔'' ذیشان نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ایک چیز ہے جو منطق کبھی نہیں سمجھ سکتی۔''

''وہ کیا ہے؟''

''قربانی۔'' ذیشان نے کہا اور اپنی گرفت ڈھیلی چھوڑ دی۔

''نہیں!'' پروفیسر زیدی کی دل خراش چیخ رات کی خاموشی میں گونجی۔ یہ ایک فلسفی کی چیخ نہیں تھی، یہ ایک باپ کی چیخ تھی جو اپنے بیٹے کو کھو رہا تھا۔

پرویز نے بے اختیار ایک قدم آگے بڑھایا جیسے وہ ہوا میں چھلانگ لگا کر اسے پکڑ لے گا لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔

گرنے کا عمل سست اور لامتناہی محسوس ہوا۔ ذیشان کو ہوا کا دباؤ اپنے چہرے پر محسوس ہوا۔

اسے نیچے سے آتی سمندر کی نمکین بو محسوس ہوئی لیکن اس کے ذہن میں سکون تھا۔ اس نے ہار نہیں مانی تھی، اس نے صرف جنگ کا میدان تبدیل کیا تھا۔ چھت پر منطق کی دنیا میں، وہ ہار چکا تھا۔ لیکن نیچے، انتشار کی دنیا میں، درد کی دنیا میں جہاں بقا کی جنگ حیوانی سطح پر لڑی جاتی ہے، وہاں شاید اس کے پاس ایک موقع تھا۔

اس نے گرتے ہوئے اپنے جسم کو گھمایا اور بچی کو، جو حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی، اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور اسے اپنے جسم کے اوپر کر لیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اسے بچا رہا ہے یا صرف یہ یقینی بنا رہا ہے کہ وہ اس کے ساتھ ہی مرے۔ یہ ایک غیر منطقی، جذباتی فیصلہ تھا، ایک ایسی چیز جس کا حساب بچی کا دماغ نہیں لگا سکتا تھا۔

پھر ایک زوردار دھماکا ہوا۔ اس کا جسم پانی کی ٹھوس سطح سے ٹکرایا۔ اتنی بلندی سے پانی پر گرنا کسی کنکریٹ کی دیوار سے ٹکرانے سے کم نہیں تھا۔ پانی کا دباؤ اس کے پھیپھڑوں سے ساری ہوا نچوڑ لے گیا۔ وہ گہرائی میں ڈوبتا چلا گیا، چاروں طرف بلبلے اور اندھیرا تھا۔

اسے لگا جیسے اس کے جسم کا جوڑ جوڑ ہل گیا ہو، لیکن خوش قسمتی سے وہ کسی چٹان سے نہیں ٹکرایا تھا۔ وہ زندہ تھا، اور اس کی ہڈیاں سلامت تھیں۔

چھت پر پرویز منڈیر کے کنارے پر جھکا ہوا تھا، اس کی ٹارچ کی روشنی بے چینی سے نیچے سیاہ پانی کو کھنگال رہی تھی۔

"کچھ نظر نہیں آ رہا! وہ دونوں چلے گئے۔ لہریں انہیں بہا کر لے گئیں یا چٹانوں سے ٹکرا کر—" وہ اپنا جملہ مکمل نہیں کر سکا۔

پروفیسر زیدی اس کے پاس آئے، اُن کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا لیکن ان کی آنکھوں میں اب بھی امید کی ایک آخری کانپتی شمع روشن تھی۔

"اسے کم مت سمجھو پرویز، وہ راکھ ہے، اور راکھ کی فطرت ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی چنگاری سے دوبارہ بھڑک اٹھتی ہے۔"

کئی منٹ گزر گئے جو صدیوں جیسے لگے۔ خاموشی اتنی گہری تھی کہ انہیں اپنے دل کی دھڑکنیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ پھر پرویز کی ٹارچ کی روشنی میں پانی کی سطح پر ایک ہلچل ہوئی۔ پہلے ایک ہاتھ نمودار ہوا، پھر دوسرا۔ اور پھر، ذیشان نے اپنا سر پانی سے باہر نکالا، بُری طرح ہانپتے اور کھانستے ہوئے۔ اس کے منہ سے کھارا پانی نکلا۔ وہ زندہ تھا۔

"وہ زندہ ہے!" پرویز خوشی سے چلّایا، اس کی آواز میں ایک نئی توانائی آ گئی تھی۔

"ذیشان! میری آواز سن سکتے ہو؟ رکو، ہم آ رہے ہیں۔"

لیکن ذیشان اکیلا نہیں تھا۔

اس سے چند فٹ کے فاصلے پر ایک اور وجود پانی سے اُبھرا۔ بچی بھی زندہ تھی۔ ذیشان کے جسم نے اس کے لیے ایک ڈھال کا کام کیا تھا اور اس کے ہلکے جسم نے پانی کی سطح پر کم شدت سے ٹکر ماری تھی۔ اسے چند خراشیں آئی تھیں اور وہ ذیشان کے مقابلے میں کہیں بہتر حالت میں تھی مگر اس کی آنکھوں میں اب وہ ٹھنڈی ذہانت اور تجسس نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب صرف ایک ہی چیز تھی، خالص، حیوانی خوف۔ اس کا منطقی دماغ، اس کا سپر کمپیوٹر، ذیشان کے غیر متوقع عمل قربانی کو سمجھ نہیں پایا تھا، اور اس ناکامی نے اس کے اندر ایک پرانے، بنیادی جذبے کو بیدار کر دیا تھا، اور وہ تھا خوف۔ وہ ایک ایسی مشین تھی جس کا شارٹ سرکٹ ہو چکا تھا۔

وہ ایک زخمی شارک کی طرح، خاموشی سے، پانی کو چیرتے ہوئے ذیشان کی طرف بڑھی۔ اس کا ارادہ واضح تھا۔ وہ اسے اپنے ہاتھوں سے ختم کرنا چاہتی تھی۔

"میں اسے گولی مارتا ہوں۔" پرویز نے اپنے پستول کا نشانہ سیدھا کیا۔

"نہیں— نہیں، رکو!" پروفیسر زیدی نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"کیوں؟ آپ پاگل ہو گئے ہیں کیا پروفیسر؟ وہ اسے مار ڈالے گی۔" پرویز نے چیخ کر کہا۔

"نہیں۔" پروفیسر نے کہا، ان کی نظریں نیچے پانی میں جاری اس خاموش جنگ پر جمی تھیں۔

"یہ اب صرف جسمانی لڑائی نہیں رہی پرویز۔ یہ دو نظریات کی آخری جنگ ہے، راکھ بمقابلہ خلا، درد بمقابلہ بے حسی۔ اگر انسانیت میں کوئی طاقت ہے تو آج ذیشان کو اسے ثابت کرنا ہوگا۔ اسے ایک موقع دو۔"

نیچے ٹھنڈے، سیاہ پانی میں آخری مقابلہ شروع ہو چکا تھا۔ بچی نے ذیشان پر حملہ کیا اور اپنے چھوٹے ناخنوں سے اسے نوچنے اور اس کے بازو کو مروڑنے کی کوشش کی۔ اس کی طاقت اس کے جسم کے حساب سے غیر انسانی تھی۔ ذیشان اپنی پوری طاقت سے اپنا دفاع کر رہا تھا لیکن وہ کمزور پڑ رہا تھا۔

بچی اس پر غالب آ رہی تھی۔ اس نے ذیشان کے

بالوں کو پکڑ کر اسے پانی کے نیچے دبا دیا۔ ہلکے سطح پر اُبھرنے لگے۔ ذیشان کے پھیپھڑوں میں آگ سی لگ گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

''بس بہت ہوگیا!'' پرویز نے پروفیسر کا ہاتھ جھٹک دیا اور گولی چلانے ہی والا تھا۔

لیکن پانی کے نیچے، موت سے چند لمحے دور، ذیشان کے ذہن میں ایک آخری خیال کوندا۔ اس کی جنگ جسمانی نہیں ہوسکتی۔ وہ اس سے جسمانی طور پر نہیں جیت سکتا تھا۔ اسے اس کے ذہن پر حملہ کرنا تھا۔ اسے اس کے آپریٹنگ سسٹم کو کریش کرنا تھا۔

اس نے اپنی آخری بچی کھچی طاقت جمع کی، پھر اپنے ہاتھ سے بچی کو پکڑا، پانی کے اندر ہی اسے اپنی طرف کھینچا اور اس کے کان کے بالکل قریب اپنا منہ لے گیا۔ اس کے پھیپھڑوں میں ہوا کا آخری قطرہ باقی تھا۔ اس نے سرگوشی کی، کوئی نہیں جانتا کہ اس نے کیا کہا۔ وہ الفاظ صرف اس بچی، ذیشان اور بے رحم سمندر کے درمیان ایک راز بن کر رہ گئے۔

لیکن ان الفاظ کا اثر ایٹم بم جیسا تھا۔

بچی کا جسم ایک لمحے کے لیے بجلی کے جھٹکے کی طرح اکڑ گیا۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کی خالی، بے رحم آنکھوں میں، زندگی میں پہلی بار، ایک نیا تاثر ابھرا، ایک ایسا تاثر جسے کوئی پڑھ نہیں سکتا تھا۔ یہ حیرت نہیں تھی، خوف نہیں تھا، غصہ نہیں تھا۔ یہ خالص مکمل اُلجھن تھی۔ جیسے کسی سپر کمپیوٹر کو ایک ایسا سوال دے دیا گیا ہو جس کا جواب کائنات میں موجود ہی نہ ہو۔ اس کا پورا وجود، اس کی پوری منطق، اس کی پوری شناخت، اس ایک سرگوشی سے ہل کر رہ گئی تھی۔

ذیشان نے اس لمحے کا فائدہ اٹھایا۔ اس نے اسے ایک طرف دھکیلا اور خود سطح پر آگیا۔ وہ بُری طرح کھانس رہا تھا، تازہ ہوا اس کے پھیپھڑوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھی۔

بچی بھی سطح پر آئی لیکن اب وہ لڑ نہیں رہی تھی، وہ بس پانی میں تیر رہی تھی اپنی جگہ ساکت، اور ذیشان کو گھور رہی تھی۔ اس کا دماغ جیسے ری بوٹ ہو رہا تھا لیکن وہ ان نامعلوم الفاظ کے معنی تلاش نہیں کر پا رہا تھا جو اس نے ابھی سنے تھے۔ خلا کے اندر پہلی بار ایک سوال پیدا ہو چکا تھا۔

اسی وقت پولیس لانچ، جسے پرویز کے ماتحت سب انسپکٹر رضوان نے مدد کے لیے بھیج دیا تھا، جزیرے کے قریب پہنچ گئی۔ اس کی تیز سرچ لائٹس نے رات کو دن میں بدل دیا اور پورے منظر کو روشن کر دیا۔

پولیس اہلکاروں نے رسیوں کی مدد سے پہلے ذیشان کو اوپر کھینچا۔ پھر وہ بچی کی طرف بڑھے۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ انہوں نے اسے بھی پانی سے نکالا اور اس کے چھوٹے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ وہ ایک زندہ گڑیا کی طرح بے حس و حرکت تھی، اس کی نظریں اب بھی ذیشان پر جمی تھیں جیسے وہ اس سے اس سوال کا جواب مانگ رہی ہوں جو اس نے اس کے ذہن میں پیدا کر دیا تھا۔

چھت پر کھڑے پروفیسر زیدی نے ایک گہری سانس لی۔ انہوں نے نیچے دیکھا جہاں راکھ نے خلا کو شکست دے دی تھی۔ انسانیت اپنی تمام تر خامیوں، درد اور انتشار کے باوجود، آج جیت گئی تھی۔

اگلی صبح کا سورج دارالشفا کے جزیرے پر ایک نئی حقیقت لے کر طلوع ہوا۔ رات کا اندھیرا، طوفان کی دہشت اور موت کا سایہ اب چھٹ چکا تھا۔

پولیس لانچ جب کراچی کے ساحل کی طرف واپس روانہ ہوئی تو اس پر ایک عجیب، بھاری خاموشی طاری تھی۔ یہ فتح کی خاموشی نہیں تھی؟ یہ تھکاوٹ، سوچ اور ایک گہرے کرب کے بعد اترنے والا سکوت تھا۔ سمندر اب پُرسکون تھا، اس کی لہریں کشتی کے پیندے سے ٹکرا رہی تھیں جیسے وہ رات کے گناہوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

لانچ کے عرشے کے ایک کونے میں ذیشان ایک موٹے کمبل میں لپٹا بیٹھا تھا۔ طبی امداد نے اس کے جسمانی زخموں کو تو سہارا دے دیا تھا، اور پسلیوں پر درد کم کرنے والی دوا کا اثر تھا لیکن اس کے اندر کا سمندر اب بھی متلاطم تھا۔ وہ خالی نظروں سے اُفق کو دیکھ رہا تھا جہاں آسمان اور پانی مل رہے تھے، وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی اپنی ذات کی سرحدیں کہاں ختم ہوتی ہیں اور اس کے اندر کی تاریکی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اس نے ایک عفریت کو شکست دی تھی لیکن اس عمل میں اسے اپنے اندر کے عفریت کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا۔

پروفیسر عرفان زیدی آہستہ سے چلتے ہوئے اس کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنی واسکٹ کی جیب سے سگار کا کیس نکالا اور ایک سگار نکالا لیکن اسے جلایا نہیں، بس اسے اپنی انگلیوں میں گھماتے رہے۔

''تم نے اُس سے کیا کہا تھا؟'' پروفیسر نے آخرکار خاموشی توڑی، ان کی آواز سمندر کی ہوا میں تقریباً ایک سرگوشی تھی۔

ذیشان نے ایک گہری سانس لی جیسے وہ ان الفاظ کو دوبارہ اپنے اندر سے نکالنے کے لیے ہمت جمع کر رہا ہو۔

''میں نے کوئی پیچیدہ نفسیاتی چال نہیں چلی پروفیسر۔ میں نے کوئی منطقی دلیل نہیں دی۔ اس کے لیے وہ سب ڈیٹا ہوتا جسے وہ پراسیس کر لیتی۔ میں نے..... میں نے اسے ایک کہانی سنائی۔''

پروفیسر نے دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں نے اسے اپنی کہانی سنائی۔'' ذیشان نے بات جاری رکھی، اس کی نظریں اب بھی سمندر پر تھیں۔ ''میں نے اسے دو لفظوں میں وہ سب کچھ بتا دیا جو ڈاکٹر فرحان نے اس سے چھین لیا تھا۔ میں نے اس کے کان میں کہا۔ ''میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔''

پروفیسر کی انگلیاں ایک لمحے کے لیے رک گئیں۔

''معافی؟''

''جی!'' ذیشان نے کہا۔ ''اس کا دماغ منطق اور نتائج پر کام کرتا تھا۔ اس کے ہر عمل کا ایک نتیجہ تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو مارا اور اس کے حساب سے، اسے سزا ملنی چاہیے تھی، نفرت ملنی چاہیے تھی۔ میرے آخری الفاظ بھی غصے یا دھمکی کے ہونے چاہیے تھے۔ لیکن معافی ایک ایسا تصور ہے جس کی کوئی منطق نہیں ہوتی۔ یہ حساب کتاب سے بالاتر ہے۔ یہ خالصتاً ایک انسانی جذبہ ہے۔''

اس نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا۔

''جب میں نے کہا کہ میں اسے معاف کرتا ہوں تو میں نے اس کے آپریٹنگ سسٹم میں ایک وائرس ڈال دیا۔ ایک ایسا حکم جس کی کوئی وجہ نہیں تھی، کوئی مقصد نہیں تھا، کوئی نتیجہ نہیں تھا۔ اس کا ذہن اس غیر منطقی ڈیٹا کو پراسیس نہیں کر پایا۔ وہ ایک ایسے سوال میں الجھ گئی جس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ کوئی ایک قاتل کو، اپنے دشمن کو معاف کیوں کرے گا؟ اس ایک سوال نے اس کے خلا کے اندر ایک نیا راستہ کھول دیا۔''

پروفیسر زیدی کچھ دیر خاموش رہے، پھر ان کے چہرے پر ایک گہری، اداس مسکراہٹ ابھری۔ ''تم نے اسے شکست نہیں دی ذیشان۔ تم نے اسے ٹھیک کرنا شروع کر دیا ہے۔ تم نے اسے اس کی انسانیت کا پہلا، سب سے پیچیدہ اور سب سے خوب صورت سبق سکھایا ہے۔''

لانچ کے دوسرے سرے پر ایک خاتون پولیس افسر کی نگرانی میں مریض نمبر 7 بیٹھی تھی جسے نیم نے اب امید کا نام دے دیا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں اب ہتھکڑیاں نہیں تھیں لیکن وہ اب بھی خاموش تھی۔ اور اس کی خاموشی اب خالی پن کی نہیں تھی، یہ گہری سوچ کی خاموشی تھی۔ اس کی نظریں اب بھی ذیشان پر تھیں لیکن ان میں اب نفرت یا غصہ نہیں تھا۔ ان میں اب ایک سوال تھا۔ ایک گہرا، خاموش سوال۔ شاید وہ اپنی پوری زندگی اسی ایک سوال کا جواب ڈھونڈنے میں گزار دے۔

''اس کا کیا بنے گا؟'' انسپکٹر پرویز نے پوچھا جو اُن کے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے لہجے میں اب اس بچی کے لیے نفرت نہیں بلکہ ایک عجیب سی اُلجھن اور شاید ترس تھا۔

''اسے ایک عام جیل یا ذہنی اسپتال نہیں بھیجا جائے گا۔'' پروفیسر نے جواب دیا۔ ''میں نے حکام سے بات کی ہے۔ اسے ایک خصوصی تحقیقی ادارے میں منتقل کیا جائے گا جہاں دنیا کے بہترین ماہرینِ نفسیات اور نیورو سائنٹسٹ اس کے ذہن کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ وہ ایک مجرم نہیں، ایک معما ہے۔ شاید وہ کبھی بھی مکمل طور پر نارمل زندگی نہ گزار سکے لیکن شاید وہ اپنے نام کا مطلب سیکھ لے۔''

پرویز نے سر ہلایا اور واپس اپنی جگہ پر چلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ کیس اس کی فائل سے تو بند ہو جائے گا لیکن اس کے ذہن سے کبھی بند نہیں ہوگا۔

لانچ اب ساحل کے قریب پہنچ رہی تھی۔ شہر کی بلند و بالا عمارتیں افق پر اُبھر رہی تھیں۔ ذیشان کو لگا جیسے وہ کسی دوسرے سیارے سے واپس لوٹ رہا ہو۔

پروفیسر زیدی نے اپنا ہاتھ ذیشان کے صحت مند کندھے پر رکھا اور کہا۔ ''تم نے آج رات بہت کچھ کھویا ذیشان۔ لیکن تم نے اس سے کہیں زیادہ پایا ہے۔ تم نے ثابت کیا ہے کہ سب سے گہری تاریکی میں بھی انسانیت کی ایک چھوٹی سی چنگاری، امید کی ایک کرن، کسی بھی خلا کو روشن کر سکتی ہے۔''

''شاید۔'' ذیشان نے کہا۔ ''یا شاید میں نے صرف یہ سیکھا ہے کہ راکھ اور خلا میں اتنا فرق نہیں ہوتا۔ دونوں ہی کسی شدید آگ کے بعد باقی رہ جاتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ راکھ میں دوبارہ جلنے کی صلاحیت باقی رہتی ہے۔''

اس نے اپنی نظریں سامنے اُفق پر جما دیں۔ اس کے چہرے پر اداسی لیکن ایک پُرسکون اور پُرعزم مسکراہٹ ابھری۔ اس کا سفر ختم نہیں ہوا تھا، شاید کبھی نہ ہو۔ لیکن آج، خاموش سمندر کے پار، اسے اپنی تاریکی کے ساتھ جینے کا ایک نیا زاویہ مل گیا تھا۔ اور شاید یہی سب سے بڑی فتح تھی۔

❖ ❖ ❖

زندگی کے ہنگاموں میں مشکل ترین کاموں سے واسطہ پڑتا ہے... اور خود کو بچانا بھی ضروری ہوتا ہے... مگر کچھ لوگ نہ صرف مشکل پسند ہوتے ہیں بلکہ کسی کو رعایت دینے پر بھی تیار نہیں ہوتے... ایک ایسی ہی لڑکی کا قصہ جس کی عادت کو سمجھنا مشکل تھا... اس کی ذہنی صلاحیت اسے دوسروں سے جدا رکھتی تھی... اپنی اس خوبی سے وہ ذہنی اذیت کا کام بھی لیتی تھی۔

نہایت ہوشیاری سے اپنے دشمن کو ختم کردینے والی حکمتِ عملی

ذہنی رو

جاوید بسام

شیزل رائس کو یاد تھا۔ یہ سب کیسے شروع ہوا تھا۔ اُس دن سب دوست مشترکہ فیملی کے ہاں مدعو تھے۔ وہاں ایک کھیل کھیلا گیا، ایسا کھیل جو کسی حد تک خطرناک تھا۔ جس کا تعلق کسی انجانی، کسی تاریک شے سے تھا۔ مگر یہی خطرے کا احساس، یہی نامعلوم سا رابطہ، اس کھیل کو انوکھا بناتا تھا۔

''میں پہلا ٹائر کرسکتا ہوں۔'' آرلنڈ نے اعلان کیا۔

محفل میں موجود مہمان سوائے میزبان میاں بیوی کے آرلنڈ کو نہیں جانتے تھے۔ یہ قدرتی بات تھی کہ انہوں

نے شک اور تجسس سے اس کی بات پر یقین نہیں کیا اور عملی مظاہرہ کرنے کی دعوت دی۔

آخرکار حسین میزبان لز نیتھل نے مسکرا کر کہا۔ ''آرنلڈ نے یہ فن نائٹ کلب میں دکھایا تھا۔ ڈیئر آرنلڈ، آج ہمارے مہمانوں کے سامنے بھی اسے پیش کریں۔''

آرنلڈ نے سر ہلایا۔ وہ ایک پستہ قد، گول چہرے والا، چست و چالاک آدمی تھا۔ اس کی چمک دار آنکھوں سے تحکمانہ انداز نمایاں ہوتا تھا۔ جیسے نگاہ کے زور سے کسی کے اندر تک جھانک سکتا ہو۔ شاید اسے شیزل کی شوخی نے متوجہ کیا ہوگا، یا اس کی آنکھوں میں چھپا ہوا شک محسوس کرلیا تھا بہرحال، اس نے اس کام کے لیے شیزل کو چنا۔

اس کی نیلی آنکھیں سیدھی شیزل کی آنکھوں پر جمی تھیں۔ تیس سیکنڈ کے اندر وہ سوگئی یا یوں کہیے، ایک ایسی نیند میں چلی گئی جو نیند نہیں تھی۔

اس کی پلکیں تو بند تھیں مگر شعور ابھی بھی بیدار تھا۔ وہ آرنلڈ کی آواز صاف سن رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''تمہاری پلکیں بھاری ہو رہی ہیں..... تمہارے بازو، تمہارا جسم، سب بھاری..... ڈھیلے اور پُرسکون ہیں..... تم نیچے جا رہی ہو..... اور نیچے..... گہری نیند میں ڈوبتی جا رہی ہو.....''

''ہرگز نہیں۔'' شیزل نے کہیں بہت دور سے کہا۔ ''میں سو نہیں رہی۔ میں تمہاری آواز سن رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میں جاگ رہی ہوں۔ میں ایک کرسی پر بیٹھی ہوں اور لوگ میرے گرد جمع ہیں اور.....''

مگر پھر اسے تسلیم کرنا پڑا کہ وہ کیفیت عام نہیں تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا جسم ایک ہی وقت میں بھاری بھی ہے اور بے وزن بھی۔ وہ چاہتی تھی کہ آنکھیں کھول دے مگر کھول نہیں سکتی تھی۔ وہ پوری طرح اس کیفیت کے زیر اثر آچکی تھی۔ اس نے ایک کے بعد ایک حکم دینا شروع کیا۔ ''کتاب اٹھاؤ..... خط ٹائپ کرو..... پانی پیو.....''

وہ جیسے تماشے میں کسی کٹھ پتلی کی طرح خاموش وہ سب کرنے لگی۔ وہ دل ہی دل میں چاہتی تھی کہ ان احکامات کو نہ مانے، مگر اس کے ہاتھ، انگلیاں، بدن، سب اس کی مرضی کے خلاف حرکت کر رہے تھے۔

آرنلڈ نے اپنی انگلیاں اس کی کلائیوں پر پھیریں جیسے اسے کرسی سے باندھ رہا ہو اور شیزل کو لگا جیسے واقعی اس کے بازو بندھے ہوں... حالانکہ وہ جانتی تھی کہ کوئی رسی نہیں ہے۔ کھیل چلتا رہا۔ اس دوران شیزل کے دل میں ایک ہی احساس گہرا ہوتا گیا۔ وہ دھوکے میں ہے اور مکمل طور پر بے بس ہے۔

آخرکار جب آرنلڈ نے انگلیوں سے چٹکی بجائی تو وہ نیند سے جاگ اٹھی۔ وہ ہنسی، جیسے سارا واقعہ ایک خوش کن مذاق ہو اور خود کو قائل کرنے لگی کہ یہ سب محض کھیل تھا۔

آرنلڈ نے کسی نئے ''شکار'' کی تلاش شروع کی اور وہ سکون سے ایک طرف ہوگئی، وہ مطمئن تھی کہ اب سب کی نظریں اس پر نہیں ہیں۔

اسی دوران ایک خوبصورت اور گہرے بالوں والا ونٹ میرن اس کے قریب آیا۔ وہ تقریباً پینتیس برس کا تھا، شادی شدہ، ایک سنہرے بالوں والی پُرکشش عورت کا شوہر۔ شیزل اسے پہلے بھی چند محفلوں میں دیکھ چکی تھی۔

''ہپناٹزم کے دوران تمہیں کیسا لگا؟'' ونٹ نے پوچھا۔

''بہت مزہ آیا۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

وہ ہنسا۔ ''جھوٹ مت بولو۔ تمہیں وہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا اور تم ہر لمحے مزاحمت کر رہی تھیں۔''

شیزل نے حیرت سے پوچھا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

ونٹ کے لبوں پر مسکراہٹ اُبھر آئی اور اس کے دانت چمک اٹھے۔ ''مجھے ہپناٹزم کے بارے میں معلومات ہیں۔ اکثر اس حالت میں انسان کی ٹیلی پیتھک صلاحیتیں بڑھ جاتی ہیں۔ شاید ہم دونوں ایک ہی فریکوئنسی (طول موج) پر ہیں۔ جب تم نیند کی حالت میں تھیں، میں تمہارے ذہن کی آوازیں سن سکتا تھا۔ تم بار بار کہہ رہی تھیں۔ نہیں، میں یہ نہیں کروں گی..... میرے ہاتھ میں کوئی گلاس نہیں ہے..... اور تمہارے پاس کوئی رسی نہیں ہے..... تم تمام وقت غصّے میں تھیں۔''

''تم نے میرے چہرے سے اندازہ لگایا ہوگا؟'' شیزل نے کہا۔

''نہیں۔'' اس نے مسکرا کر سر ہلایا۔ ''تمہارا چہرہ بالکل پُرسکون تھا۔ کسی سے بھی پوچھ لو۔''

وہ لمحہ بھر کو رکا، پھر بولا۔ ''یہ دلچسپ بات ہے نا؟''

''پتا نہیں.....''

''فکر نہ کرو۔'' وہ آہستگی سے بولا۔ ''میں تمہارے خیالات نہیں پڑھوں گا۔ یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔''

وہ تھوڑا جھک کر قریب آیا۔ سب لوگ آرنلڈ کا نیا مظاہرہ دیکھنے میں مصروف تھے اور ان کی طرف کسی کا دھیان نہیں تھا۔ ''میں نے کہا نا، ہپناٹزم سے ذہنی لہریں تیز ہو جاتی ہیں۔ مگر عام حالت میں بھی، میں بعض اوقات کسی کے خیالات محسوس کر لیتا ہوں۔ جیسے تم ابھی میرے کچھ

نہیں لات بگاڑ سکتی ہو۔ یہ دو طرفہ عمل ہے، مطلب تم اور میں ایک ہی فریکوئنسی پر ہیں۔"

شیزل نے قدرے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ "تو پھر بتاؤ، میں اس وقت کیا سوچ رہی ہوں؟"

ونٹ نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "تمہیں میری باتیں اچھی نہیں لگیں۔ تم سمجھتی ہو کہ میں تمہاری نجی حدود میں داخل ہو رہا ہوں۔"

پھر وہ بولا۔ "اب الٹا کرتے ہیں۔ بتاؤ تمہیں کیا لگتا ہے، میں کیا سوچ رہا ہوں؟"

شیزل نے انکار کرنا چاہا مگر نظریں ہٹا نہ سکی۔ کیا وہ اس کی سیاہ بھوری آنکھوں کے پیچھے پوشیدہ سوچ کو جاننے کی کوشش کر رہی تھی؟ آخر کار وہ ہلکے سے شرما کر بولی۔ "مجھے لگتا ہے کہ تم مجھے چومنا چاہتے ہو۔"

ونٹ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور آنکھ ماری۔ "ڈیئر مجھے نہیں معلوم کہ تم نے یہ کیسے کیا، لیکن میں اس بات کی ضمانت دے سکتا ہوں کہ یہ ٹیلی پیتھی ہے، تم تقریباً وہاں پہنچ چکی ہو۔"

☆☆☆

اس محفل کے بعد شیزل کئی مہینوں تک ونٹ سے نہیں ملی۔ شاید لاشعوری طور پر وہ اس سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کبھی کبھار اس کا خیال آتا مگر خوش قسمتی سے اس کا کوئی "ذہنی پیغام" وصول نہ ہوا۔ وہ اس بات پر مطمئن تھی۔ اس نے بھی کبھی کوئی اشارہ بھیجنے کی کوشش نہیں کی یا کم از کم وہ یہی سمجھتی تھی۔

پھر ایک دن، ایک بار میں شیزل کی نظر ونٹ کی بیوی پر پڑی۔ خوب صورت پاؤلا میرن ایک گوشے میں ایک اجنبی مرد کے ساتھ، کندھے سے کندھا ملائے بیٹھی تھی۔ اس کے انداز میں کسی شادی شدہ عورت کا گمان تک نہ تھا۔

اس منظر نے شیزل کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ ایک تو بے وفائی کا یہ تاثر بذات خود نفرت انگیز تھا اور دوسرا، وہ سمجھ نہیں سکی تھی کہ پاؤلا جیسی عورت اتنے دلکش شوہر سے کیوں غداری کر رہی ہے۔ آخر ونٹ ایک کامیاب شخص تھا، اشتہارات کی دنیا کا کنگ، ایک نامور، خوبصورت اور سمجھدار آدمی۔ اس کی بیوی کو اور کیا چاہیے تھا؟

اس واقعے کے تقریباً ایک ماہ بعد شیزل پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ ایسی کیفیت جسے وہ کسی لفظ میں بیان نہیں کر سکتی تھی، احساسات؟ پیش بینی؟ بے چینی؟ کچھ تو تھا جو اچانک، بغیر کسی وجہ کے اس کے دل پر چھاتا جا رہا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کی زندگی اس وقت بالکل ٹھیک جا رہی تھی۔ وہ ایلن رہ جنڈ سے ملی تھی اور تقریباً یقین کر بیٹھی تھی کہ یہ وہی شخص ہے جس کا خواب اس نے ہمیشہ دیکھا تھا۔

ایلن سیاہ، گورا اور خوبصورت آدمی تھا اور سب سے بڑھ کر وہ شیزل سے خلوص کے ساتھ محبت کرتا تھا۔ وہ اکثر ملتے، ایک ساتھ سوتے، کھانا کھاتے، ہنستے بولتے، زندگی ایک حسین توازن میں گزر رہی تھی۔ جس دن شیزل نے پاؤلا میرن کو اس بار میں دیکھا تھا، اس دن بھی وہ ایلن کے ساتھ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی زندگی خوشیوں سے لبریز ہے، اور اب کوئی بادل اس کے افق پر نہیں ابھرے گا، لیکن پھر وہ عجیب سی کیفیت شروع ہوئی۔ انجان خطرے کی پیش گوئیاں، کسی نامعلوم اندیشے کا سایہ اور ان کے ساتھ جذبات کا طوفان۔ غصہ۔ نفرت ..... یا شاید حسد..... شیزل نے خود پر ہنستے ہوئے سوچا۔ "میرے پاس حسد کی کوئی وجہ نہیں۔"

ایلن نے اسے شادی کی پیشکش کی تھی، وہ کسی بھی لمحے ہاں کہہ سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایلن کسی اور لڑکی سے نہیں ملتا۔ پھر وہ کیوں حسد کرے؟ نہیں، شیزل حسد نہیں کر رہی تھی یا شاید وہ خود کو دھوکا دے رہی تھی۔

کیونکہ اس کے دل کے نہاں گوشے میں ایک انجان اضطراب، ایک دبے لفظوں کی خواہش، ایک بے نام سا درد جاگ اٹھا تھا اور پھر جواب خود ہی سامنے آ گیا۔

اس دن دفتر میں بہت سخت دن گزرا تھا، تھکن سے چور، شیزل نے ایلن کو کہہ دیا تھا کہ وہ آج فلم دیکھنے نہیں جا سکتی۔ رات کے اندھیرے میں وہ اپنے بیڈروم میں لیٹی نیند کی نرم سرحدوں پر ٹہل رہی تھی۔ جہاں جاگنا اور سونا ایک دوسرے میں گھلنے لگتے ہیں۔ تب اچانک جیسے کسی نے اسے اندر سے جھنجوڑ دیا۔ شیزل چونک کر جاگ اٹھی اور چند اذیت ناک لمحوں کے لیے اپنے بیڈ..... سے اٹھ کر اس تاریک بار میں پہنچ گئی جہاں وہ پہلے بھی گئی تھی۔ ایک کونے میں پاؤلا میرن بیٹھی تھی، ایک اجنبی مرد کے ساتھ، ان کے کندھے آپس میں چھو رہے تھے، پاؤلا کی انگلیاں اس کی ٹھوڑی کے نیچے کھیل رہی تھیں اور وہ سرگوشی میں اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ پھر اچانک پاؤلا نے سر اٹھایا جیسے کسی نے پکارا ہو۔ اس کے چہرے پر حیرت دوڑ گئی، آنکھیں پھیل گئیں، ہونٹ کھلے اور اس کے منہ سے بے اختیار ایک لفظ نکلا۔ "ونٹ!"

اس میں خوف اور حیرت کا تاثر نمایاں تھا۔

سب کچھ لمحے بھر میں غائب ہو گیا۔ شیزل پھر اپنے

اندھیرے کمرے میں تھی۔ نہ بار، نہ اجنبی مرد، نہ پاؤلا سب تحلیل ہو گیا تھا۔ مگر اس کے دل میں کچھ باقی رہ گیا تھا ایک شعلہ نفرت کا، غصے کا، اور شاید حسد کا۔ شیزل نے کمبل مٹھیوں میں جکڑ لیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی، جیسے کوئی اندرونی طوفان بھڑک اٹھا ہو۔

دو منٹ بعد وہ کیفیت مدھم ہوئی اور وہ سب سمجھ گئی۔ ونٹ میرن نے اپنی بیوی کی بیوفائی کے بارے میں جان لیا تھا۔ اس کا دل حسد اور اذیت سے بھر گیا تھا اور شیزل نے لاشعوری طور پر اس کے خیالات پڑھ لیے تھے۔ کیوں کہ وہ دونوں ایک ہی "لہر" پر جڑے ہوئے تھے۔ شیزل نے یہ بات ایلن کو نہ کسی اور کو بتائی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ آرنلڈ کو ڈھونڈے، تاکہ وہ اسے اس لہری تعلق سے نجات دلائے۔ مگر آرنلڈ کے پاس جانا اسے مضحکہ خیز اور پاگل پن لگا۔ شاید یہ ایک خواب تھا۔ اس نے خود سے کہا۔ 'میں نیم بیداری میں تھی اور ونٹ کے "اثر" کے تحت وہ سب دیکھ لیا۔' مگر نہیں، ونٹ نے اسے آسانی سے سمجھا دیا تھا کہ وہ ایک ہی لہر میں شریک ہیں۔

تین ہفتے بعد ایک شام شیزل پھر ونٹ میرن کے ذہن میں چلی گئی، بلا ارادہ، بلا اجازت، اس کے دماغ میں، اس کی آنکھوں کے پیچھے۔ وہ آئینے کے سامنے بال سنوار رہی تھی۔

ایلن آدھے گھنٹے میں آنے والا تھا۔ شیزل نے ذہنی طور پر ایلن کے بارے میں سوچنا شروع کیا مگر اچانک سب کچھ دھندلا گیا۔ آئینہ مٹ گیا اور اس کا عکس غائب ہو گیا۔ اب وہ کسی آئینے میں نہیں کسی گاڑی کے شیشے سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کے سامنے ایک سنسان سڑک پھیلی تھی دھندلی، پر چھائیوں میں لپٹی اور ایک انجان کار آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ کار کی روشنیاں درختوں کے تنوں کو روشن کر رہی تھیں۔ پھر سڑک کے کنارے روشنی میں چمکتا، ہوا میں لہراتا کچھ ابھرا۔

وہ ایک عورت تھی جو سفید لباس میں سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا نیلا سوٹ کیس ہاتھ میں تھامے کھڑی تھی، جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ جب گاڑی قریب آئی اور اس کا چہرہ صاف نظر آنے لگا تو شیزل کا دل ایک لمحے کے لیے رک گیا۔ وہ پاؤلا میرن تھی۔ سنہری بالوں کی نرم لٹیں اس کے چہرے کے گرد لہرا رہی تھیں۔

پاؤلا کے سنہری بال اس کے سفید لباس میں یوں مدغم تھے جیسے روشنی میں روشنی گھل گئی ہو۔ اس کی نیلی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں، اسی نیلی جیسے اس کے ہاتھ میں تھاما ہوا نیلا سوٹ کیس اور ان آنکھوں میں ایک ہی جذبہ جھلک رہا تھا، جس کا نام خوف تھا۔ ڈرائیور کے دل میں جذبات کا طوفان امڈ رہا تھا، بے رحم نفرت اور فتح کا خمار۔ سامنے پاؤلا کھڑی تھی۔ اس کی نفرت کا ہدف جو رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی۔

"پاؤلا کہاں جا رہی تھی؟" اس نے دل ہی دل میں کہا۔

"میں نے تو تمہاری گاڑی کی چابی چھپا دی تھی، تاکہ تم گھر میں رہو، لیکن تم تو اپنے شوفر کا انتظار کر رہی ہو، ہے نا؟ اسی کے ساتھ جا رہی ہو؟ ہاتھ میں سوٹ کیس ہے، کیا بس ایک رات کے لیے؟

یا پھر تم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر چلی جاؤ، عزت سے، بنا اپنے وہ بیکار کپڑے لیے جو الماری میں لٹک رہے ہیں؟ خیر، ڈیئر اب تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ کم از کم..... اس کے ساتھ تو نہیں۔"

گاڑی کی رفتار تیز ہو چکی تھی۔ شاید پاؤلا نے اس کے ارادے بھانپ لیے تھے۔ وہ گھبرا کر درختوں کی اوٹ میں بھاگی، جہاں شاید گاڑی اس تک نہ پہنچ پاتی۔ مگر اس کے قدم سست تھے۔ اس کے ہاتھ سے سوٹ کیس چھوٹ کر گر گیا تھا۔ وہ مڑی اور بھاگنے کی کوشش کی، مگر اونچی ایڑیوں والے جوتوں میں وہ بجری پر لڑکھڑا گئی۔

اس کا لباس، نازک جوتے، سب اس کی دوڑ کے لیے نامناسب تھے۔ پاؤلا نے ایک لمحے میں سمجھ لیا کہ اب بچنے کا کوئی راستہ نہیں۔ وہ پلٹی اور گاڑی کی طرف رخ کیا، اس کے ہاتھ آگے بڑھے، جیسے رحم کی بھیک مانگ رہے ہوں۔

"مجھے مت مارو، ونٹ....."

اس کے ہاتھ چہرے کے سامنے اٹھ گئے جیسے سفید، نازک چہرے کو بچانے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کا چہرہ بڑا ہوتا گیا، پھیلتا گیا، یہاں تک کہ پوری ونڈ شیلڈ بھر گئی۔ سرخ ہونٹ کھلے اور ایک خوفناک چیخ فضا میں بلند ہوئی، جس نے لمحہ بھر کے لیے انجن کی دہاڑ کو بھی دبا دیا۔ پھر ایک دھماکا ہوا اتنا زوردار کہ گاڑی کا شیشہ چیخ گیا۔ درخت، زمین، پوری فضا لرز اٹھی جیسے زلزلہ آیا ہو۔ پاؤلا کا سفید چہرہ غائب ہو گیا اور اس کا لباس اندھیرے میں تحلیل ہو گیا۔ صرف ایک جھلک باقی رہی۔ سفید ہاتھوں کی، لمبی پتلی انگلیوں کی جو اوپر اٹھی ہوئی تھیں، التجا کرتی، دعائیں کرتی ہوئی..... اور پھر سب ختم۔

گاڑی رکی نہیں۔ وہ سڑک کے کنارے بجری اڑاتی

ہوئی بدستور دوڑتی رہی۔ مگر..... یہ لرزش کیوں؟ درخت کیوں اُچھلتے دکھائی دے رہے تھے؟ کیا پہیا کسی گڑھے سے ٹکرایا تھا؟ یا..... راستے میں کوئی رکاوٹ تھی؟

سڑک ہموار ہوئی۔ لرزش تھم گئی۔ اب شیشہ صاف تھا اور اس میں نمودار ہوا ایک چہرہ۔ شیزل رائس کا چہرہ۔ نفرت سے بگڑا ہوا، ایسا مسخ شدہ جیسے کوئی اجنبی نقاب چڑھا دیا گیا ہو۔ شیزل نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ڈھانپ لیں۔

''یہ میں نے کیا دیکھا.....؟'' اس نے خود سے سرگوشی کی۔

جب اس نے ہاتھ نیچے کیے تو اس کا چہرہ پھر معمول پر آگیا مگر پیشانی پسینے سے بھیگی ہوئی تھی اور ہاتھ اب بھی کانپ رہے تھے۔ وہ میز کے سامنے سے اٹھ کر بھاگی اور فون اٹھایا۔ کئی بار انگلیاں کانپ کر غلط ہندسوں پر رکیں، پھر آخر کار ایلن کا نمبر ملایا۔

''ایلن! میں آج کہیں نہیں جاسکتی۔'' اس نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''سر میں..... بہت درد ہے.....''

اور یہ بالکل سچ تھا۔

☆☆☆

صبح کے اخبارات میں کچھ نہیں تھا، مگر دوپہر کے ایڈیشن میں خبر نمایاں تھی۔ ''پاؤلا میرن، عمر 28 سال، گزشتہ شب ایک کار حادثے میں ہلاک ہوگئیں۔ واقعہ مارٹن ہل روڈ پر پیش آیا، عین ان کے گھر کے قریب۔ گاڑی نے پاؤلا کو ٹکر ماری، اس پر چڑھ گئی اور تقریباً دس میٹر تک گھسیٹا۔ حادثہ اتنا شدید تھا کہ موت فوراً واقع ہوئی۔ موقع پر کوئی عینی شاہد موجود نہیں تھا۔

میرن کا گھر ایک متمول نواحی علاقے میں تھا، جہاں ہر گھر پانچ ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ ان کا گھر سڑک سے تقریباً چالیس میٹر پرے تھا، جہاں سے سڑک دکھائی نہیں دیتی تھی۔ مسٹر میرن نے بیان دیا۔ ''میں اس وقت گھر پر تھا۔ کوئی غیر معمولی آواز نہیں سنی۔ مجھے نہیں معلوم وہ سڑک پر کیوں گئی تھی..... یا کہاں جارہی تھی۔''

پولیس نے پڑوسیوں سے پوچھ گچھ کی مگر کسی نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔

شیزل رائس نے خبر پڑھتے ہوئے محسوس کیا کہ اس کے جسم سے جان نکلتی جارہی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے یہ سب دیکھا تھا۔ اپنی آنکھوں سے یا ونٹ میرن کی آنکھوں سے، ایک ہی بات تھی۔ اس نے پاؤلا کو مرتے دیکھا تھا۔ اس کے شوہر نے، حسد کی آگ میں، اپنی بیوی کو کار تلے روند ڈالا تھا اور شیزل..... شیزل خود اس لمحے گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ فطری بات تھی کہ اس کا پہلا خیال پولیس کو اطلاع دینے کا آیا۔ مگر پھر اخبار ہاتھ میں لیے شہر کی بھیڑ والی گلی میں کھڑی وہ ٹھٹک گئی۔ آخر وہ پولیس سے کیا کہے گی؟ یہ ساری ٹیلی پیتھی، خیالات کی لہریں، ذہنی رابطے کی کہانیاں؟ کیا کوئی یقین کرے گا؟ کیا شیزل رائس جو پاؤلا کے مارے جانے کے وقت اپنے فلیٹ میں تھی، اسے گواہ سمجھا جاسکتا ہے؟ یہ سوال خود اسے بھی گم بھارہا تھا۔ پھر بھی، اس نے طے کرلیا کہ کوشش کرکے دیکھنا چاہیے۔

پولیس ہیڈ کوارٹر میں وہ آخر کار ایک سارجنٹ سے ملی، اس کا نام ایویٹ تھا۔ وہ شیزل کی پوری کہانی خاموشی سے اور چہرے پر پتھر جیسی سنجیدگی لیے سنتا رہا۔ پھر بولا۔

''دیکھیے، مس رائس۔ ہمیں اس سے کچھ زیادہ ٹھوس ثبوت درکار ہوں گے جو آپ نے ابھی بتایا ہے۔'' اس کی آواز میں نرمی تھی مگر لہجے میں ایک تھکاوٹ چھپی تھی۔

''جی بالکل، میں سمجھتی ہوں۔'' شیزل نے جواب دیا۔

''لیکن میں نے سوچا، کم از کم اس سے آپ کو کچھ مدد مل سکتی ہے۔ اگر گاڑی نے کسی کو ٹکر ماری ہے تو اس کے بمپر پر کوئی نشان تو ہوگا، کوئی ڈینٹ، کوئی ٹوٹی ہوئی ہیڈ لائٹ..... کیا آپ وِنٹ میرن کی گاڑی کو چیک نہیں کرسکتے؟''

ایویٹ نے ہلکا سا سر ہلایا۔ ''ہاں، شاید ایسا کرنا چاہیے۔'' اس نے کہا مگر انداز میں جھجک تھی پھر بولا۔ ''ویسے، آپ نے بتایا تھا کہ اِن ''ماورائی تجربات'' میں سے ایک کے دوران، آپ نے مسز میرن کو کسی مرد کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ کون تھا؟''

''میں نے اُسے پہچانا نہیں۔'' شیزل نے سر جھکا کر کہا۔ ''بلکہ میں نے اس پر غور ہی نہیں کیا۔ میری نظریں پاؤلا سے ہٹ ہی نہیں پارہی تھیں۔''

''آپ سمجھتی ہیں نا۔'' ایویٹ نے ذرا زور دے کر کہا۔ ''اگر ہمیں اس مرد کے بارے میں کچھ معلوم ہوتا تو تحقیقات میں بڑی مدد ملتی۔''

''جی، میں سمجھتی ہوں..... مگر مجھے واقعی اُس کا چہرہ یاد نہیں۔''

''خیر، میں اس پر کچھ پیش رفت کرنے کی کوشش کروں گا۔'' وہ بولا۔

اس نے اس کا نام، پتا اور فون نمبر نوٹ کیا۔ شیزل نے محسوس کیا کہ اس نے ''قتل'' کا لفظ نہیں بولا۔ اس نے کہا ''حادثہ''۔

شیزل نے شکریہ ادا کیا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ پل بھر کو رکی، پھر بولی۔ ''ممکن ہے کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہو۔ شاید یہ سب میرا

وہم ہو..... یا محض کوئی تصوراتی خیال۔"

ایویٹ نے ایک بار پھر سر ہلایا۔ "بالکل ممکن ہے۔"

"میں ونٹ میرن پر الزام نہیں لگا رہی۔" شیزل نے جلدی سے اضافہ کیا۔

سارجنٹ کی آنکھوں میں ایک لمحے کو نرمی آگئی۔

"اگر میرے آدمی نے مسٹر میرن سے کوئی سوال کیا تو آپ کا نام نہیں لیا جائے گا۔"

شیزل نے ہلکی سی سانس لی، جیسے بوجھ اتر گیا ہو۔ اب سب پولیس کے حوالے تھا۔ اگر ونٹ واقعی مجرم ہے، تو انصاف دلانا ان کی ذمے داری تھی، اس کی نہیں۔

شام کو اس نے ایلن کے ساتھ کھانا کھایا۔

ریستوران میں نرم روشنی تھی، پیانو کی مدھم دھنیں چل رہی تھیں اور فضا میں سکون اور سکوت طاری تھا۔ شیزل نے فیصلہ کیا کہ ایلن کو کچھ نہیں بتائے گی۔ ویسے بھی، لگتا تھا کہ اس نے اخبار پڑھا ہی نہیں تھا، شاید اسے پاؤلا میرن کی موت کا علم ہی نہیں تھا۔

مگر اس رات شیزل کے اندر ایک انجانی بے چینی سر اٹھا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی بات کو یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو، کسی چھوٹی سی بات کو جو اس کے ذہن کے کنارے سے پھسل جاتی تھی۔ اچانک ایک خیال چمکا اور اس کا خون جم گیا۔ "شیزل نے سب کچھ بتا دیا۔" یہ الفاظ اس کے دماغ میں گونجنے لگے، بار بار، ایک ہتھوڑے کی طرح "شیزل نے سب کچھ بتا دیا۔"

وہ جان گئی تھی کہ ونٹ میرن کو علم ہو چکا ہے یا تو پولیس کے اچانک سوالات سے اس کے شبہات جاگ اٹھے تھے یا پھر اس نے سیدھے اس کے ذہن میں جھانک لیا تھا۔

صبح، شیزل نے گھبرا کر سارجنٹ ایویٹ کو فون کیا۔

ایویٹ نے کہا۔ "آپ کی کہانی نے ہمارے انویسٹی گیشن آفیسر کی دلچسپی ضرور جگائی تھی۔ وہ میرن کے گھر گیا اور مناسب بہانے سے اس کے گیراج کا جائزہ لیا۔ وہاں دو گاڑیاں تھیں، مگر کسی کے اگلے بمپر یا ریڈی ایٹر پر کوئی خراش نہیں ملی۔"

وہ رکا پھر بولا۔ "البتہ، مسٹر میرن عموماً ایک جیپ بھی چلاتے ہیں۔ اس کا بمپر فولادی اور چوڑا ہے۔ لہٰذا ممکن ہے اگر اس سے کسی کو ٹکر لگی ہو تو کوئی نشان باقی نہ رہا ہو، لیکن ممکن ہونا ثبوت نہیں ہے۔"

"اور وہ نیلا سوٹ کیس؟" شیزل نے فوراً پوچھا۔

"اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوا۔"

"ہو سکتا ہے ونٹ اسے جائے وقوعہ سے لے گیا ہو۔ اس پر خون کے نشانات ہوں گے مگر وہ دھو بھی سکتا ہے یا جلا بھی سکتا ہے۔"

"مس رائس۔" ایویٹ نے نرمی مگر قطعیت سے بات کاٹ دی۔ "میں نے لیفٹیننٹ سے اس پر بات کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آپ کی گواہی پر سرچ وارنٹ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے پاس قانونی طور پر شک کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ آپ محض شاہد ہیں۔"

"یعنی آپ کچھ نہیں کریں گے؟"

"ابھی کے لیے، ہم کچھ نہیں کر سکتے۔"

"تو پھر آپ سمجھتے ہیں میں پاگل ہوں؟"

"ایسا کسی نے نہیں کہا، مس شیزل! ہم نے اس مرحلے پر جتنا ممکن تھا کام کر لیا ہے۔"

☆☆☆

اس شام، آخرکار شیزل نے سب کچھ ایلن کو بتا دیا۔ ایلن اس کی بات سن کر ہنس پڑا پھر بولا۔ "میں کسی قیمت پر ونٹ میرن کے گیراج میں چھپ کر اس کی جیپ دیکھنے نہیں جاؤں گا، نہ ہی خون آلود نیلا بریف کیس ڈھونڈنے کے لیے اس کے گھر کی تلاشی لوں گا۔ شاید تمہیں کوئی ٹیلی پیتھک سگنل ملا ہو۔ لیکن اگر اس نے اپنی بیوی کو مارا بھی ہے، تو یہ پولیس کا کام ہے، ہمارا نہیں۔" اس نے شوخی سے کہا۔

شیزل کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ اندر ہی اندر غصے سے کھول رہی تھی۔ پھر یہی اس کے شہر چھوڑنے کی پہلی وجہ بنی۔ دوسری وجہ اَن دیکھا ناقابلِ بیان ونٹ میرن کا خوف تھا۔ وہ خود اپنے خوف کی کوئی معقول توجیہہ نہیں دے سکتی تھی۔ آخر وہ پولیس کو سب کچھ بتا چکی تھی اور میرن کو بھی اس کا علم تھا۔ پھر وہ کیا کرے گا؟ اس کا پیچھا؟ اسے ڈرائے گا؟ شیزل کو یقین تھا ہاں، وہ بالکل یہی کرے گا۔

اس نے طے کر لیا کہ اسے بھاگ جانا چاہیے۔

دوپہر کے بعد وہ شہر سے نکل گئی۔ بغیر کسی سمت کے، بس ڈرائیو کرتی رہی جیسے منزل کی نہیں، فرار کی تلاش ہو۔ رات گئے وہ نارتھ وے موٹیل پہنچی، ایک چھوٹے سے قصبے میں جو گاؤں سے ذرا سی بڑا تھا۔ موٹیل عام سا تھا۔ ایک لمبی عمارت، قطار میں دروازے، اور ہر کمرے کے سامنے گاڑی پارک کرنے کی جگہ۔ ساتھ ہی ایک چھوٹا سا ریستوران تھا، جہاں شیزل نے سینڈوچ کھائے۔ جب وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو رات گہری ہو چکی تھی۔ ستارے آسمان پر بے حسی سے چمک رہے تھے۔ شیزل نے گاڑی کا

لاک چیک کیا، پھر اندر جا کر دو نیند کی گولیاں لیں، گرم شاور لیا اور ریشمی تکیوں پر نیم دراز ہو کر پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر مطالعہ بے معنی تھا، لفظ پھسلتے جاتے اور خیال واپس ونٹ میرن پر جا ٹھہرتا۔ آخر اس نے کتاب بند کر دی۔ کمرا تاریکی میں ڈوب گیا۔ شیزل بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔

ونٹ میرن..... وہ جانتا تھا کہ شیزل کیا جانتی ہے، مگر کیا واقعی وہ جانتا تھا؟ کیا اس کا ذہن اس کے لیے کھلی کتاب بن گیا تھا؟ اگر اس نے سمجھ لیا کہ شیزل اس سے زیادہ جانتی ہے تو پھر؟ مثلاً..... وہ نیلا بریف کیس کہاں گیا؟ اور وہ آدمی کون تھا جس کے ساتھ پاؤلا اس بار میں بیٹھی تھی؟

شیزل نے دل میں سوچا۔ کاش وہ ونٹ کو کوئی پیغام بھیج سکے۔ یہ بتانے کے لیے کہ اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس نے سب بھلا دیا ہے۔ وہ خاموش رہے گی، کسی کو کچھ نہیں بتائے گی، لیکن کیا ونٹ یقین کرے گا؟ یہ خیال آتے ہی شیزل اچانک سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ کمرا اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور اس کے دل میں ایک بھیانک خیال اُبھر رہا تھا، نہیں، وہ یقین نہیں کرتا۔ ونٹ نے یہ بات اسی لمحے اس کے ذہن میں ڈالی تھی۔ شیزل کے اندر خوف کی لہر دوڑ گئی۔ وہ جانتی تھی کچھ نہ کچھ ضرور ہونے والا ہے۔ چاہے وہ ٹیلی پیتھی ہو یا کوئی حیوانی جبلت یا شاید بس کسی ہلکی سی سرسراہٹ کی آواز جو بھی تھا، شیزل کو یقین تھا کہ ونٹ میرن یہاں پہنچ گیا ہے۔

وہ دبے پاؤں بستر سے اُتری، دروازے کے قریب ایک بڑی کھڑکی تھی جس پر بھاری پردے لٹک رہے تھے۔ شیزل نے آہستگی سے پردے کا کنارہ سرکایا، تھوڑا سا جھروکا بنایا اور نیچے لگی ونیشین بلائنڈ کی ایک پٹی ذرا سی موڑی۔ باہر اندھیرا تھا۔ سڑک کی مدھم روشنی میں موٹیل کا پورچ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی کار سیاہ سایہ بن کر کھڑی تھی۔ پھر ایک آواز، جیسے جوتے کی ایڑیاں سیمنٹ پر رگڑ کھا رہی ہوں۔ کھڑکی کے سامنے ایک سایہ اُبھرا۔ پہلے کار کے پاس ٹھہرا پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ شیزل کا دل رکنے ..... لگا۔ ایک لمحے کے لیے روشنی نے اس کے چہرے پر پڑ کر سچائی واضح کر دی۔

ونٹ میرن۔ لمبا، دُبلا، وہی تراشا ہوا چہرہ۔

اب کوئی شک نہیں تھا۔ وہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آ پہنچا تھا اور کیوں نہ آتا؟ آخر اس نے خود ہی تو پیغام بھیجا تھا۔ ''نارتھ وے۔ نارتھ وے موٹیل۔'' اب وہ اس کی کار دیکھ رہا تھا، جیسے یقین کر رہا ہو کہ یہ وہی گاڑی ہے۔ پھر شاید وہ سوچنے لگا کہ آگے کیا کرے، کمرے تک

سرگزشت کراچی

ماہنامہ سرگزشت

شمارہ فروری 2026ء کی جھلکیاں

خوش نصیب

نومولود کو والدین نے سڑک کنارے پھینک دیا، اسی بچی کو قسمت نے ہند کی ملکہ بنا دیا

شہر یاراں

مشہور سرنگ کا تذکرہ، تعمیر مکمل ہوئی کہ انجینئر نے خودکشی کر لی مگر کیوں؟

خونی مسودہ

مصنف نے پبلشر کے خون سے پورا ناول تحریر کیا

شکیب جلالی

معروف ادیب کی خودنوشت کا آخری حصہ

بددعا

ایک ایسی سچ بیانی جسے پڑھتے ہوئے آپ حیران رہ جائیں گے

اس کے علاوہ

بہت سی سچ بیانیاں، سچے قصے، تاریخی واقعات جنہیں آپ پڑھنا چاہتے ہیں آپ کو پڑھنا چاہیے

یہ شمارہ بہت خاص ہے، ضرور ملاحظہ کریں

پہنچنے کا راستہ ڈھونڈ رہا تھا؟ یا صرف انتظار کر رہا تھا کہ شیزل خود دروازہ کھولے۔ خوف نے اس کے فیصلے کی قوت مفلوج کر دی۔ کیا وہ موٹیل کے کلرک کو فون کرے؟ پولیس کو بلائے؟ نہیں وہ اس کی بات پر یقین نہیں کریں گے۔

پہلے بھی نہیں کیا تھا۔ اب بھی نہیں کریں گے۔ اُس وقت تک نہیں، جب تک وِنٹ میرن..... کچھ کر نہ گزرے۔ مگر تب تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ پولیس کو اطلاع دینے کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ وِنٹ اس سے خبردار ہو گیا تھا اور اب اس کا شکار کرنے آ رہا تھا۔ اس کی زندگی صرف ایک بات پر منحصر تھی کہ وہ وِنٹ میرن کو قائل کر سکے کہ وہ اس کے لیے خطرہ نہیں ہے؟ کمرے کی خاموشی میں شیزل نے لرزتے ہوئے پردہ ڈھک دیا، اندھیرے میں اس کی سانسوں کی آواز کسی دور لگی گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح سنائی دے رہی تھی۔

شیزل نے فیصلہ کیا تھا کہ اب وہ پولیس کو زحمت نہیں دے گی۔ مگر اب..... جب کہ وِنٹ میرن کا غصہ ہنوز اس کے سر پر منڈلا رہا تھا، اسے بھاگنا تھا۔ کیسے؟ دماغ نے کہا۔ ''کچھ مت سوچو۔ کوئی منصوبہ مت بناؤ۔'' کسی اندرونی آواز نے یاد دلایا۔ وِنٹ تمہارے خیالات پڑھ سکتا ہے، بھول گئیں؟ تم جو جگہ چنو گی..... وہ پہلے سے وہاں موجود ہوگا۔ اس لیے اپنے ذہن کو خالی رکھو... بالکل صاف..... بس اپنے وجدان پر بھروسا کرو..... اندھوں کی طرح چلو..... اور گھبراؤ مت۔

شیزل نے تیزی سے اندھیرے میں کپڑے بدلنے شروع کیے، اپنی چیزیں ٹٹول ٹٹول کر سنبھالیں اور ہر لمحہ خود کو یاد دلاتی رہی کہ سوچنا نہیں ہے۔ میں لباس پہن رہی ہوں۔ نہیں، نہیں، یہ سوچنا بھی خطرناک ہے، نہ حال کے بارے میں، نہ مستقبل کے بارے میں۔ چند لمحوں بعد وہ اندھیرے کمرے کے درمیان تیار کھڑی تھی، لیکن ذہن ایک خالی برتن کی طرح تھا، خیالات سے نجات پانا تقریباً ناممکن تھا، پھر بھی وہ کوشش کر رہی تھی۔

کمرے کی دوسری کھڑکی صحن کی طرف کھلتی تھی۔ شیزل نے پردے ہٹائے، بلائنڈ اوپر کیں۔ کھڑکی کا فریم صبوطی سے بند تھا، مگر پھر ایک ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ اوپر سرک گیا۔ وہ آواز کمرے میں گونجی، مگر باہر تک شاید نہ پہنچی ہو۔ شیزل نے باہر جھانکا وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے کچھ سوچے سمجھے خود کو کھڑکی سے باہر سرکا لیا۔ وہ گھاس پر کھڑی تھی، پیروں کے نیچے ٹھنڈی نمی تھی۔ اب کہاں جائے؟ نہیں، یہ بھی نہیں سوچنا۔ بس حرکت کرو۔ چلو۔

دوڑو۔ سڑک سے گاڑیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ابھی اتنی رات نہیں ہوئی تھی، لوگ اِدھر اُدھر چل پھر رہے تھے۔ شیزل نے سکھ کا سانس لیا، کم از کم یہاں کوئی اس پر حملہ نہیں کرے گا۔ وہ ریستوران کے پچھلے حصے سے گزری۔ اندر بس ایک ویٹریس اور دو گاہک بیٹھے تھے۔ کچھ دیر میں ریستوران بند ہونے والا تھا۔ شیزل نظریں جھکائے، تیزی سے چلتی رہی، کوشش کرتی رہی کہ کچھ نہ دیکھے، کچھ یاد نہ رکھے، کچھ نہ سوچے.....

☆☆☆

کچھ دور چلنے کے بعد جب وہ ڈرائیو وے کے سائے والے حصے سے گزر رہی تھی، اسے ایک ٹرک نظر آیا۔ ایک آدمی پاس کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ قدموں کی چاپ سن کر اس نے سر اُٹھایا۔ چہرہ سائے میں ڈوبا ہوا تھا۔ بس سگریٹ کی سرخی جل بجھ رہی تھی۔ شیزل آگے بڑھی۔ اس نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔ ''یہ تمہارا ٹرک ہے؟''

آدمی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر آہستہ سے بولا۔ ''ہاں، میرا ہی ہے۔''

''کہیں جا رہے ہو یا یہاں قیام کے لیے آئے ہو؟''

''جا ہی رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''بس سگریٹ ختم کر لوں۔''

''کیا میں تمہارے ساتھ چل سکتی ہوں؟''

سگریٹ کی لَو ذرا چمکی۔ ڈرائیور نے اسے غور سے دیکھا۔ ''کہاں جانا ہے تمہیں؟''

''کہیں بھی.....'' اس نے مبہم سا جواب دیا۔

ڈرائیور نے حیرت سے اسے دیکھا اور سگریٹ زمین پر پھینک دی۔ شیزل کو صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ آدمی کیا سوچ رہا ہے۔ جیسے وہ بھی اس کی لہری فریکوئنسی پر آ گیا ہو۔ وہ خطرہ نہیں سمجھ رہا تھا، بس ایک پُراسرار عورت کی موجودگی کو دلکش مہم سمجھ رہا تھا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' اس نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔

شیزل نے چڑھتے ہوئے سوچا۔ ''میں نے کبھی اتنا بڑا ٹرک نہیں چلایا.....'' پھر فوراً خود کو ٹوکا۔ ''نہیں، سوچو مت..... خاموش رہو..... پُرسکون..... سو جاؤ..... ہاں، خود کو سُلا دو..... ہپناٹائز کر لو۔''

ڈرائیور اندر آیا، انجن اسٹارٹ کیا اور ٹرک آہستہ سے حرکت میں آ گیا۔ شیزل نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ خیالات کو جھٹکنے کی کوشش کرتی رہی مگر پھر بھی محسوس ہوا، ٹرک بائیں جانب مڑ رہا ہے، شاہراہ پر چڑھ گیا ہے۔ کیا وِنٹ نے ٹرک کو نکلتے دیکھا ہوگا؟ شاید نہیں۔ آخر وہ اس کے سارے

خیالات تو نہیں پڑھ سکتا۔ اسے یہ تو معلوم نہیں ہوگا کہ وہ اس ٹرک میں بیٹھ گئی ہے۔ پتا نہیں میں نے صحیح کیا یا نہیں؟

ڈرائیور نے اچانک کہا۔ ''تم ... کوئی نشہ کرتی ہو؟''

''نہیں، میں نشہ نہیں کرتی۔''

''تو پھر کسی سے بھاگ رہی ہو؟ شوہر سے؟''

''نہیں ... نہیں، ایسا کچھ نہیں۔''

''تو پھر؟''

''معاف کرنا، میں تمہیں نہیں بتا سکتی۔''

کچھ دیر دونوں خاموشی سے بیٹھے رہے۔ ٹرک شاہراہ پر دوڑتا رہا۔ شیزل نے آنکھیں بند کر لیں اور سائن بورڈز کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ ڈرائیور بھی کبھی کبھار اس کی طرف دیکھ لیتا، مگر شیزل اس سے نہیں ڈری۔ اس کی ہوس ناک نظریں، ونٹ میرن کے خوف سے کم خطرناک تھیں۔ اچانک اس کے منہ سے نکلا۔ ''پیچھے کوئی گاڑی تو نہیں آ رہی؟''

پھر فوراً پشیمان ہوئی۔ کیونکہ اس سوال نے ڈرائیور کو چونکا دیا۔ وہ شیشے میں دیکھنے لگا۔ ''لگتا تو نہیں، کیوں؟ کیا کوئی تمہارا پیچھا کر رہا ہے؟''

''نہیں''

''تم ... شاید پولیس سے بھاگ رہی ہو؟''

شیزل نے نظریں جھکا لیں اور سوچا کاش یہ سچ ہوتا، پولیس سے بھاگنا آسان تھا مگر ونٹ میرن کے ذہن سے بھاگنا؟ یہ ممکن نہیں تھا۔

''نہیں ...'' اس نے آہ بھر کر کہا۔

ڈرائیور نے اُلجھ کر کہا۔ ''میں کسی مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتا۔''

''تمہیں کچھ نہیں کرنا ... بس مجھے کہیں بھی چھوڑ دو ... کسی جگہ۔ تم کہاں جا رہے ہو؟''

''میں جیکسن ہاربر جا رہا ہوں۔'' ڈرائیور بولا۔

جیسے ہی لفظ اس کے ہونٹوں سے نکلے، شیزل چونک اٹھی اور جھٹ سے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے مگر دیر ہو چکی تھی۔

جیکسن ہاربر۔ یہ نام اب اس کے دماغ میں طوفان کی طرح گونج رہا تھا، ہوا کی لہروں میں دوڑ رہا تھا ... اور وہ جانتی تھی کہ ونٹ میرن کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ وہ کس طرف جا رہی ہے۔ یہ نام، یہ مقام، اس کے شعور سے سیدھا اس تک پہنچ گیا ہوگا۔

''کیا ہوا؟'' ڈرائیور نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے اتار دو!'' شیزل چیخی۔ ''مجھے فوراً نیچے اتار دو!''

''لیکن میں نے کہا تھا میں تمہیں ...''

''ابھی! ورنہ میں چلانا شروع کر دوں گی!'' اس نے دروازہ ذرا سا کھولا۔

ڈرائیور بوکھلا گیا۔ ''ٹھہرو، ذرا سا صبر کرو، میں ٹرک کنارے پر لگاتا ہوں۔''

پہیے ریت پر چرچرائے اور ٹرک ابھی پوری طرح رکا بھی نہ تھا کہ شیزل نے دروازہ کھولا اور باہر اندھیرے میں کود گئی۔

''شکریہ!'' وہ پیچھے مڑ کر چلائی اور چند قدم لڑکھڑاتے ہوئے بھاگی مگر گری نہیں۔ پھر سیدھی ہو کر سانس لیا اور سامنے دیکھا۔ ٹرک کی ہیڈ لائٹس میں ایک سائن بورڈ چمک رہا تھا۔ ''جیکسن 8K''

''اب ونٹ کو یقیناً معلوم ہو جائے گا کہ میں کہاں ہوں ...'' شیزل نے بوکھلا کر سوچا۔ وہ ڈرائیور کو پکارنے لگی مگر دیر ہو چکی تھی، ٹرک گرجتا، پہیوں سے پتھر اُڑاتا شاہراہ پر آگے بڑھ گیا تھا۔ کچھ ہی لمحوں میں صرف پچھلی لائٹس رہ گئیں، پھر وہ بھی اندھیرے میں تحلیل ہو گئیں۔

شیزل نے آہ بھری۔ وہ ویرانے میں رات کی سیاہی میں لپٹی ہوئی اکیلی رہ گئی تھی، ونٹ میرن کو اس کا درست پتا معلوم ہو گیا ہوگا، ہائی وے اور روڈ ... کا چوراہا۔ اسے پہلا خیال یہ آیا کہ کسی اور گاڑی کو روکے مگر فوراً دماغ نے انکار کر دیا۔ وہ گاڑی ونٹ کی جیپ بھی ہو سکتی ہے۔ ونٹ کو اس بات کی عادت تھی کہ سڑک کنارے کھڑی عورتوں کے ساتھ ''محتسب'' سلوک کرتا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی ایک جوڑی اس کی طرف بڑھتی دکھائی دی۔ شیزل نے جلدی سے سڑک کے کنارے جھاڑیوں میں پناہ لے لی اور جب تک گاڑی شور مچاتی آگے نہیں نکل گئی۔ وہیں لیٹی رہی۔ ہائی وے خطرناک تھی، گاڑیاں بہت زیادہ تھیں۔ شیزل اٹھی، جھاڑیوں سے ... نکلی اور ایک سمت میں چل دی۔

ونٹ فوراً جان گیا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ لفظ ''روڈ کے'' اس کے ذہن میں دھڑکنے لگا، جیسے اس کے قدموں کے ساتھ تال ملا رہا ہو۔

لیکن شیزل نے خود سے کہا۔ میں گم ہو جاؤں گی ... اتنی گم کہ وہ مجھے تلاش نہ کر سکے۔ میں کوئی چھوٹی، کچی سڑک ڈھونڈ لوں گی، کسی کھیت یا کسی جنگل میں داخل ہو جاؤں گی مگر اندھیرا گہرا تھا۔ وہ اتنی بہادر نہیں تھی کہ جنگل میں چلی جائے۔ نقشے کی صرف دُھندلی سی یاد تھی، پتا نہیں وہ جیکسن ہاربر کی سمت میں کتنی دور آ گئی تھی۔ نام سے تو لگتا تھا کہ وہ

کسی دریا کے کنارے ہے، مگر راستے میں ندی نالے بھی ہو سکتے تھے، یا دلدلیں..... یا دھنسی ہوئی زمین۔ کیا وہ شہری آبادی سے دور بھاگ کر اس سنسان علاقے میں پناہ ڈھونڈ کر صحیح کر رہی تھی؟ کیا بہتر نہ ہوتا کہ وہ ٹرک ہی میں رہتی، کم از کم انسانوں کے بیچ؟ مگر اب دیر ہو چکی تھی۔

☆☆☆

رات روشن اور آسمان صاف تھا۔ چاند، ستارے چمک رہے تھے مگر جنگل کے قریب اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ شیزل چلتی رہی۔ اس نے سڑک نہیں چھوڑی، دل میں امید رکھی تھی کہ کوئی ذیلی راستہ مل جائے گا۔ مگر ناکام رہی۔ سانس پھولنے لگا تھا۔ قدم دھیمے ہو گئے تھے اور تب..... اچانک ایک آواز گونجی۔ ''کہاں غائب ہو گئی ہو، شیزل؟''

آواز اتنی واضح اور قریب تھی کہ اسے یقین ہو گیا کوئی اس کے پیچھے کھڑا ہے۔ مگر وہ اکیلی تھی، سڑک سنسان تھی۔ پھر بھی وہ جانتی تھی کہ یہ آواز ونٹ میرن کی تھی۔

اب وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ ونٹ، نارتھ وے موٹیل کے اس کمرے میں تھا، جہاں اس نے کھڑکی کھلی چھوڑ دی تھی۔ کیا احمقانہ غلطی تھی۔

ونٹ وہاں کھڑا تھا اور وہ..... اس کے ساتھ تھی، اسی کی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اندر آیا، ٹارچ کی روشنی کمرے میں گھمائی، دیواروں پر گھمائی اور خالی، بگڑے ہوئے بستر پر ٹھہر گئی۔

''ہم رابطے میں ہیں نا، شیزل؟'' آواز سیدھی اس کے ذہن میں گونجی۔ ''تم جانتی ہو میں یہاں ہوں.....'' ایک لمحے کی خاموشی۔ ''میں جانتا ہوں، تم کہاں ہو۔''

شاید وہ جھوٹ بول رہا ہے؟ شیزل نے آنکھیں بند کر لیں اور دانت بھینچ لیے، شدت سے خود کو مجبور کیا کہ وہ اس سنسان، کچی سڑک کے بارے میں نہ سوچے، نہ ان جھاڑیوں کے بارے میں جو اندھیرے میں دونوں طرف پھیلی تھیں۔

''مجھ سے مت چھپو، شیزل.....'' اس کی آواز اس کے ذہن میں اتر گئی۔ شیزل نے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے، تاکہ دل کی دھڑکی، لبوں سے نکلتی آہ میں نہ بدل جائے۔

''کیا کسی کی گاڑی میں ہو؟'' ونٹ کی آواز میں طعنہ، لذت اور زہر ملا ہوا تھا۔ وہ اندازہ لگا رہا تھا..... یا شاید جاننے کی کوشش کر رہا تھا مگر نہیں، وہ ابھی سب کچھ نہیں جانتا تھا۔

''شیزل تم پولیس کے پاس گئیں۔ مجھے معلوم تھا تم جاؤ گی، اور دیکھو، میں نارتھ وے تک پہنچ ہی گیا، ہے نا؟''

وہ اسے ذہنی طور پر چھیڑ رہا تھا، تاکہ وہ خوف میں مبتلا ہو جائے، اور ڈر کے مارے اپنے خیالات کھول بیٹھے۔ ''یہ سب تمہاری غلطی ہے، شیزل۔ تم نے دوسرے کی زندگی میں مداخلت کی۔ پہلے تو مجھے خود بھی احساس نہیں ہوا، ورنہ میں احتیاط سے کام لیتا۔ آخر میں ہی تو تھا جس نے دریافت کیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے خیالات پڑھ سکتے ہیں۔ میں نے تمہیں بتایا بھی تھا۔ یہ ٹیلی پیتھک تعلق دو طرفہ ہوتا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ یہ انجام ہوا۔''

''تم ذہین ہو، شیزل..... واقعی ذہین ہو۔ میں اس رات تمہیں چومنا چاہتا تھا۔ جب میں پاؤلا سے جان چھڑا لیتا تو سب کچھ بدل جاتا پھر میں تمہارے قریب آتا۔ ہاں، شیزل، یہ سب تمہاری ہی غلطی ہے۔ پاؤلا کے بعد تمہیں پولیس کے پاس نہیں جانا چاہیے تھا۔ تمہیں میرے راستے میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ ہم عام لوگ نہیں ہیں، شیزل، ہم خاص ہیں اور خاص لوگ ایسے نہیں کرتے۔ تم سمجھ کیوں نہ سکیں؟ تھوڑا سا احساس کیوں نہ کیا؟ کیا تمہیں جلن نہیں ہوئی؟ جب تم نے پاؤلا کو ڈان برونو کے ساتھ دیکھا۔''

ایک دبی چیخ شیزل کے لبوں سے پھسل گئی۔ ڈان برونو! کتنا عجیب نام تھا۔ پولیس کا کہنا تھا۔ اگر تم پاؤلا کے ساتھی کو پہچان لو تو ہمیں تفتیش میں سہارا ملے گا۔ اب..... شیزل کو اس کا نام معلوم ہو گیا تھا۔ مگر وہ جاننا نہیں چاہتی تھی۔

''شیزل!'' ونٹ کی آواز سخت اور بوکھلائی ہوئی تھی۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس نے غیر ارادی طور پر اپنے ہاتھ سے ایک پتا خود اس کے سامنے کھول دیا ہے۔ اب اس کے پاس ایک پتا تھا۔ ایک ایسا پتا جس سے ونٹ کو مات دی جا سکتی تھی اور ونٹ کو اب یہ پتا چھیننا تھا، کسی طرح اسے خاموش رکھنا تھا۔

شیزل پھر دوڑنے لگی، کچی سڑک پر ''روڈ K'' پر۔ وہ جنگل میں چھپ جائے؟ نہیں، ونٹ کو شاید جنگل کا راستہ اس سے بہتر معلوم ہو۔ نہیں، اسے سڑک پر ہی رہنا ہوگا، کوئی گھر کوئی آبادی یا کسی شخص کو ڈھونڈنا ہوگا، مدد، یا کوئی فون۔ ضرور کہیں نہ کہیں کوئی مل جائے گا۔ اگر وہ ہائی وے پر واپس گئی، تو ونٹ سے سامنا یقینی ہے۔ اب صرف ایک راستہ باقی ہے، یہی کچی سڑک، جو یقیناً کہیں نہ کہیں جاتی ہوگی۔ اور جیسے ہی اسے کوئی گھر اور فون ملا، وہ فوراً سارجنٹ کو کال کرے گی اور بتائے گی کہ اس کا نام ڈان برونو ہے۔ اسے تلاش کرو۔ اس سے پوچھ گچھ کرو کہ پاؤلا میرن اسی کی گاڑی میں بیٹھنے والی تھی۔ ڈان برونو تمہیں وہ سب ثبوت

دے گا جن سے ونٹ کو قتل کے الزام میں پکڑا جا سکتا ہے۔"

شیزل مسلسل دوڑ رہی تھی۔ اس کے جوتوں کے تلووں میں کنکر چبھ رہے تھے، پاؤں زخمی ہو رہے تھے۔ مگر اسے احساس نہ تھا۔ ایک نیا جذبہ اور ایک طاقت اس کے اندر جاگ اٹھی تھی۔ وہ کامیاب ہونے والی تھی۔ کہیں دور، میلوں کے فاصلے پر، ونٹ اپنی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا، نقشہ دیکھ رہا تھا اور "K" والی سڑک ڈھونڈ رہا تھا۔

"سوچنا مت ..." شیزل نے خود کو حکم دیا۔ "کچھ مت دیکھو۔ کسی منظر کو ذہن میں جگہ مت دو۔ ونٹ کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں کہاں ہوں، جنگل میں؟ یا دلدلوں میں؟ ندی کے کنارے؟

یا جھیل کے پاس؟ کچھ مت دیکھو، شیزل صرف ایک چیز دیکھو روشنی، جہاں روشنی ہوگی، وہاں لوگ ہوں گے۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا؟ آدھا گھنٹا، ایک گھنٹا؟ چند میل؟ کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اب وقت اور فاصلے بے معنی تھے۔ صرف بچ نکلنے کی آرزو باقی تھی۔

شیزل نے بھاگتے ہوئے، اچانک کسی گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ محسوس کی، اس نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس نے گھوم کر دیکھا مگر سڑک خالی پڑی تھی۔ یہ میرے ذہن میں پیدا ہوئی ہے۔ ونٹ قریب آتا جا رہا ہے۔ وہ بے تحاشا بھاگ کھڑی ہوئی۔ کچھ دور کچی سڑک اوپر کی طرف جا رہی تھی، ایسا لگتا تھا کہ وہاں دریا کا پشتہ ہے، پھر شیزل کو ٹیلے کا جنگلا سا نظر آیا، اس کے پار بہت دور کچھ روشنیاں بھی چمک رہی تھیں۔ اسے کچھ حوصلہ ہوا، پل کے پار گھر یا فیکٹریاں تھیں، یقیناً لوگ بھی ہوں گے۔ اس کے قدم اور تیز ہو گئے۔ اس کے پیچھے گاڑی کی گرج بڑھتی جا رہی تھی مگر وہ دور تھی اور اندھیرے میں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

شیزل "روڈ کے" پر دوڑتی رہی، گاڑی کی آواز اس کے نزدیک آتی جا رہی تھی۔ پھر اس نے آواز پہچان لی۔ وہ آواز اس نے پہلے بھی سنی ہوئی تھی، پاڈلا میرین کے حادثے کی شام۔ ونٹ اپنی جیپ میں اس کا پیچھا کر رہا تھا، وہی جیپ جس کے مضبوط بمپر پر انسانی جسم سے ٹکر کے نشانات نہیں آتے۔ اب وہ ٹیلے پر چڑھ رہی تھی، اچانک اس پر پیلی روشنی پڑی، اس نے گردن گھما کر دیکھا ونٹ کی جیپ طوفان کی طرح اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ اس کے انجن اور پہیوں کے نیچے آتی کڑکتی بجری کی آواز سن سکتی تھی۔ اب وہ ٹیلے پر پہنچ گئی تھی، آگے روشنی کا عکس، اور ایک چمکتی ہوئی عمودی پانی کی پٹی تھی۔ روشنی اس کے مخالف جانب سے آ رہی تھی۔ جہاں دور کچھ گھر وغیرہ تھے۔

شیزل کے قدم آخر کار پل کے پہلے تختوں پر پڑے، اچانک، جیپ کی ہیڈ لائٹس نے سڑک کو، اس کو، پل کے تختوں کو، اور اس کے اٹھتے قدموں کو روشن کر دیا۔ اسے نیچے تاریکی میں چمکتا ہوا پانی نظر آیا۔ شیزل رک نہیں سکتی تھی۔ اب دیر ہو چکی تھی۔ اس کے قدم خالی جگہ پر پڑے اور اگلے ہی لمحے وہ پانی کی سیاہ سطح پر گرتی چلی گئی۔ اس کو بمشکل وقت ملا کہ وہ ڈوبنے سے پہلے غوطہ لگائے۔ جیپ تیزی سے پکی سڑک پر اس کا پیچھا کرتی ٹیلے پر چڑھی، لکڑی کے تختے احتجاجاً چرچرائے۔ سامنے ہلکی روشنی میں چمکتا پانی تھا۔ وہ ہوا میں اڑتی ہوئی زوردار دھماکے کے ساتھ دریا کے درمیان جا گری۔

شیزل نے پانی کے دھارے کا زوردار جھٹکا محسوس کیا، جو اس دھماکی دیو کے گرنے سے پیدا ہوا تھا۔ وہ سطح پر تیرتی ہوئی نکل آئی۔

آسمان صاف تھا۔ انجن کی گھن گرج ختم ہو گئی تھی۔ پانی کی سیاہ سطح پر سوائے تیز لہروں کے کچھ نہیں تھا، موجیں اس جگہ سے پھیل رہی تھیں جہاں جیپ غائب ہوئی تھی۔

"ونٹ!" شیزل نے خاموشی سے اپنے ذہن میں پکارا مگر کوئی جواب نہ آیا۔ لکیر کٹ چکی تھی۔ دوسری طرف خاموشی تھی۔ وہ مر چکا تھا... یا مر رہا تھا۔ شیزل نے اندازہ لگایا۔ ونٹ کا سر کسی سخت چیز سے ٹکرایا تھا، شاید ونڈ شیلڈ سے۔ وہ بے ہوش اور بے بس اپنی گاڑی کی سیٹ پر پڑا مر رہا تھا۔

شیزل تیزی سے بازو چلاتی اس جگہ تک پہنچی جہاں لہریں پیدا ہو رہی تھیں اور اس بار بلند آواز میں پکارا۔ "ونٹ!" مگر ہوا کی سرسراہٹ اور موجوں کی آوازوں کے درمیان کوئی جواب نہیں آیا۔ شیزل کچھ دیر تک سرد پانی میں خوف سے جمی کھڑی رہی، سخت سردی نے اس کو جکڑ لیا تھا پھر اس کی سمجھ میں آ گیا۔ "ونٹ جا چکا ہے۔"

وہ تیرتی ہوئی واپس کنارے پر آ گئی۔ چاندنی میں ٹیلے پر لکڑی کا وہ ڈھانچا خاموش کھڑا تھا جسے دیکھ کر وہ تھم گئی تھی۔ وہ پل نہیں تھا، بلکہ ایک چھوٹی سڑک کو گودی تھی۔ شیزل نے آخری لمحوں میں اسے دیکھ لیا تھا لیکن وہ رکی نہیں، اس کا ذہن آخری وقت تک ونٹ کو غلط پیغام بھیجتا رہا کہ آگے پل ہے۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ یہ پل نہیں ہے تو وہ رک جاتا۔ شیزل نے ونٹ کو اسی کے ہتھیار یعنی ذہنی رو سے مار ڈالا تھا۔

❖❖❖

داہر

حسام بٹ

چوالیسویں قسط

کامیابی اسی کو ملتی ہے جو ثابت قدم اور مستقل مزاجی سے اپنی منزل کی جانب گامزن رہتا ہے۔ وقت کی ایک بے رحم، سفاک کروٹ نے اُس کے جیون میں بہت زہر گھول دیا تھا۔ ناکردہ جرم کی پاداش میں اس کا لڑکپن اور جوانی قید و بند کی صعوبتوں کی نذر ہوگئیں۔ زمانہ اسیری نے ایک طرف اس کے دل و دماغ پر صدمات کے ان مٹ نقوش چھوڑے تو دوسری جانب اس نے علم و ہنر کا بحر بے کنار اپنے وجود میں سمیٹ لیا۔ اس نے آزاد عملی میدان میں قدم رکھا تو نت نئے دشمنوں سے اس کا سابقہ پڑا۔ جلد ہی اس پر منکشف ہوا کہ خالق نے اسے زمینی خداؤں کی سرکوبی کے لیے تخلیق کیا ہے۔ مقصدِ حیات واضح ہوا تو اس نے خود کو منشائے قدرت کے سامنے سرنگوں کردیا۔ اس کارزار فنا و بقا کی آبلہ پا جدوجہد میں ایک دل نشیں مہ جبیں اس کی رفیق سفر ٹھہری۔ اپنے اطراف میں پھیلی شوریدہ لہروں کو برداشت کرتے ہوئے اس کا سفر جاری تھا جہاں یہودیوں کا سازشی ذہن دنیا پر حکمرانی کا اپنا خواب شرمندۂ تعبیر کرنا چاہتا تھا۔

چند لمحوں میں زندگی بدل دینے والے عیار ذہنوں کی ہوش ربا حیلہ سازیاں

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

جاسم کا تعلق ایک متوسط طبقے سے تھا۔ لڑکپن میں قدم رکھنا قیامت صغریٰ ثابت ہوا۔ اس کے والد قاسم باری نے مقامی غنڈوں کے خلاف پولیس کی مدد کی تو یہ چھوٹی سی فیملی طوفان کی زد میں آگئی۔ ایک رات اسی گینگ نے گھر میں گھس کر جاسم کی والدہ اور والد پر قاتلانہ حملہ کردیا جس میں ماں ہلاک اور شدید زخمی باپ کو پرائیویٹ اسپتال پہنچادیا گیا۔ قاسم کا علاج شروع کرنے کے لیے پانچ لاکھ کی ضرورت تھی۔ جاسم نے مدد کے لیے اپنے اکلوتے ماموں جلیل کی طرف دیکھا۔ جلیل نے اس شرط پر رقم کا انتظام کردیا کہ جاسم کو ایک ناکردہ جرم کی پاداش میں کچھ عرصے کے لیے جیل جانا پڑے گا۔ جاسم کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے ماموں کی بات مان لی۔ قید و بند کی زندگی میں دو افراد نے اہم کردار ادا کیا۔ ان میں سے ایک چھٹا ہوا بدمعاش مراد علی تھا جسے سب دادا کہتے تھے۔ دوسرا کارل مارکس کا پیروکار ایک سیاسی ورکر بیگ تھا جو کامریڈ کہلاتا تھا۔ دادا اور کامریڈ ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن دونوں ہی کی جاسم پر گہری نگاہ تھی۔ وہ جاسم کی چاہت سے واقف تھے اس لیے وہ اپنے اپنے نظریات کے مطابق اس کی ذہنی اور جسمانی تربیت میں لگ گئے۔ کامریڈ نے جاسم کی زبان کو تلوار اور دادا نے اس کے ہاتھ پاؤں کو موت کی للکار بنادیا۔ دادا نے اپنے بندوں کے ذریعے پتا لگالیا تھا کہ جاسم کے والدین کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے پیچھے راجو نامی ایک گینگسٹر کا ہاتھ ہے اور یہ بھی کہ جلیل ماموں نے جاسم کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ اس نے پانچ لاکھ اپنی جیب میں ڈالے اور قاسم باری کو مرنے کے لیے چھوڑ کر کہیں غائب ہوگیا تھا۔ دادا اتنا طاقتور بدمعاش تھا کہ وہ جیل میں بیٹھ کر بھی باہر کے معاملات کو چلاتا رہتا تھا۔ جلیل تو منظر سے ہٹ چکا تھا لیکن راجو تک پہنچنے کے لیے دادا نے جاسم کی مدد کی۔ اسے اپنے معتمدِ خاص کامل کے ساتھ چند گھنٹے کے لیے جیل سے باہر بھیجا۔ جاسم نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راجو کو زندگی بھر کے لیے وہیل چیئر کا محتاج بنادیا۔ دادا کا جیل سے باہر جانا کارگر رہتا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی میں شرکت کرنے گیا تو اس کے ایک دیرینہ دشمن شعیب چاچا نے اسے اور اس کی بیٹی و بیوی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دادا کی موت نے جاسم کو حد درجہ افسردہ کردیا۔ بہرحال وہ اپنی سزا پوری کرنے کے بعد جیل سے باہر آیا تو دنیا بدل چکی تھی۔ اب وہ ایک تربیت یافتہ کڑیل جوان تھا اور اسے ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا تھا اور اسی آغاز پر ایک مہ جبیں سے اس کا تعارف ہوگیا۔ ناجیہ ایک پروڈکشن ہاؤس میں ایسوسی ایٹ پروڈیوسر تھی۔ وہ جاسم کی فائٹنگ اسکلز سے حد درجہ متاثر ہوئی اور اس نے جاسم کو رنگ و نور کی دنیا سے روشناس کرادیا۔ جاسم کو پتا چلا کہ شعیب چاچا معاشرے میں ایک کامیاب ایکسپورٹر کی حیثیت سے عزت کی زندگی گزار رہا ہے لیکن درپردہ وہ ڈرگز، ناجائز اسلحہ، انسانی اعضا کی فروخت اور نوعمر لڑکیوں کے اغوا جیسے مذموم کاموں میں ملوث ہے۔

دونوں دوستوں نے منصوبہ بندی سے شعیب چاچا کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ دوسری سمت جاسم کا شوبز کا کام بھی جاری تھا اور اسے چند روز کے بعد ایک سیریل کی شوٹ کے لیے استنبول جانا تھا اس سے پہلے اس نے راجو کو بھی حسرت ناک موت سے ہمکنار کیا تھا۔ یہ سنسنی خیز ہنگامے چل رہے تھے کہ کسی ڈیوڈ نامی شخص نے بڑے پراسرار انداز میں جاسم سے رابطہ کیا اور اسے اپنے کسی ری ایلیٹی ٹی وی میں، بھاری معاوضے پر شرکت کی دعوت دی۔ یہ وہی وقت تھا جب جاسم اپنے یونٹ کے ساتھ استنبول جانے والا تھا۔ ڈیوڈ کا رویہ اتنا پُراسرار اور خطرناک تھا کہ فوری طور پر یہی سمجھ میں آیا کہ کوئی مخالف پروڈیوسر ڈیوڈ بن کر جاسم کو اپنے ٹریک سے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن جلد ہی جاسم کو اندازہ ہو گیا کہ ڈیوڈ ایک انتہائی طاقتور اور بااختیار شخص ہے۔ ڈیوڈ نے ناجیہ کو اغوا کر کے جاسم کو اپنے ری ایلیٹی ٹی وی میں کام کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ ڈیوڈ نے جاسم کو ہدایت کی تھی کہ جب وہ استنبول میں ری ایلیٹی ٹی وی کے کنٹریکٹ پر دستخط کر دے گا تو اس کی دوست نما محبوبہ کو رہا کر دیا جائے گا۔ ڈیوڈ کا وہ ری ایلیٹی ٹی وی ایک میگا پروجیکٹ تھا جس کی تمام تر شوٹنگ پُراسرار سرزمینِ مصر میں ہونے والی تھی۔ ڈیوڈ کی ہدایت کے مطابق، جاسم کو استنبول پہنچ کر اس کے خاص آدمی بن عرفات سے ملاقات کرنا تھی۔ جاسم استنبول کے ایک معروف مقام گلاٹا برج کے نیچے بنے ہوئے زینان نامی ایک یونانی ریسٹورنٹ میں پہنچ گیا جہاں بن عرفات ماسٹر شیف کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ بن عرفات نے جاسم کے خون سے مذکورہ کنٹریکٹ پر دستخط کرا لیے اور وعدے کے مطابق، اسے ناجیہ کی رہائی کی خوش خبری سنا دی۔ جاسم نے فون پر ناجیہ سے بات کر کے اس امر کی تسلی کر لی کہ وہ بہ حفاظت اپنے گھر پہنچ چکی ہے۔ اب وہ محفوظ سائڈ پر تھا لہٰذا اس نے ڈیوڈ کے پروجیکٹ میں کام کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ڈیوڈ نے بن عرفات کے توسط سے جاسم کو اغوا کر کے ایک کروز شپ پر پہنچا دیا۔ جب جاسم کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک بڑے بحری جہاز پر پایا۔ بعد ازاں ڈیوڈ نے ایک مرتبہ پھر جاسم سے پُراسرار انداز میں سیٹلائٹ رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ وہ کروز شپ استنبول سے مصر کی بندرگاہ، پورٹ سعید تک جائے گا۔ پھر اس کے آدمی جاسم کو پورٹ سعید سے بذریعہ جیپ قاہرہ پہنچا دیں گے جہاں پر اس ری ایلیٹی ٹی وی کی افتتاحی تقریب کا انعقاد کیا جائے گا۔ ڈیوڈ نے ری ایلیٹی ٹی وی کی شوٹنگ سے پہلے ہی جاسم کے ساتھ شکار اور شکاری کا جو کھیل شروع کر دیا تھا، جاسم اسے انجوائے کرنے کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر پوری طرح تیار تھا۔ ڈیوڈ کی ہوشیاری کے سبب جاسم اس کا کھیل سمجھنے سے قاصر تھا۔ ڈیوڈ نے ہر ٹیم کو بریف کر دیا تھا۔ مصر کے حرم سے انہیں ایک صندوق حاصل کرنا تھا۔ جاسم کی مدد ایک جن زادی کر رہی تھی۔ کچھ ممبران زندگی کی بازی ہار چکے تھے اور باقی ہارنے والے تھے۔ جاسم کا رخ استنبول کی جانب تھا۔ دورانِ سفر انکشاف ہوتا ہے کہ ان کا جہاز ہائی جیک کر لیا گیا ہے۔ جاسم اس صورتِ حال سے نمٹنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے اپنی خفیہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ہائی جیکرز کو زیر کرتے ہوئے صورت حال کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ ہائی جیکرز کا ٹارگٹ استنبول کے جسٹس طلال حسنی تھے۔ جن سے وہ اپنی مرضی کا فیصلہ لینا چاہتے تھے۔ استنبول میں جاسم کا جسٹس حسنی سے بہت گہرا تعلق بن گیا تھا۔ جاسم ان کے بیٹے کو بھی بازیاب کرا چکا تھا اور اپنے دشمنوں کو بھی ایسا سبق دیا تھا کہ وہ زندگی بھر یاد رکھتے۔ سلور کوئین کی ہدایت پر ڈیوڈ کو اب جاسم کے خلاف خفیہ کارروائی کرنی تھی کیونکہ جاسم ان لوگوں کے خلاف بہت کچھ کر چکا تھا۔ ڈیوڈ اور حواری اب جاسم کا تعاقب کرتے ہوئے جسٹس حسنی کے ولا تک پہنچ چکے تھے۔ جاسم نے پہلے ہی سے تمام منصوبہ ترتیب دیا اور ڈیوڈ کے کارندوں سے معرکہ آرائی کے بعد وہاں سے نکل گیا۔ ترکی سے نکل کے جاسم کی کارروائیاں جاری تھیں۔ اس نے اسرائیلی ٹیم کے ٹولے کو زبردست زک پہنچائی تھی۔ یہ سب ٹیلی پورٹیشن کی بدولت ہی ممکن ہوا تھا۔ اژدھار نے بھی ہر بُرے لمحے میں اس کی مدد کی۔ وہ ایکیل کے ساتھ شپ پر سوار تھا۔ اسرائیلی اس کوشش میں تھے کہ کسی بھی طرح جاسم کو اپنے قابو میں کر لیں۔ اس کے لیے وہ پُراسرار علوم کی ماہر براخا کو استعمال کر رہے تھے۔ اب تک جاسم اس کے ہر حملے کو ناکام بناتا آیا تھا۔ براخا اپنی حکمتِ عملی سے ایکیل اور جاسم کو کروز شپ پر لے آئی تھی۔ یہاں پہنچ کر براخا اپنے ارادے میں کامیاب ہو گئی۔ جاسم کے ساتھ خوب معرکہ ہوا اور ایکیل ماری گئی۔ یہ صدمہ جاسم کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس نے براخا اور اس کی ٹیم کو مار کے اپنا انتقام لے لیا۔ اب اس کی منزل مشرقِ وسطیٰ تھی۔ اسرائیل کو زک پہنچانا اس کا مشن تھا۔ فلسطینیوں کے لیے اس کی جان بھی حاضر تھی۔ ابو یاقر اس کے مددگار تھے۔ بلوما کے والد اشکار کا انتقال ہو گیا تھا۔ جاسم کو اپنے مشن کے ساتھ بلوما کو بھی وقت دینا تھا۔ بلوما والد کی وفات کے بعد بے حد افسردہ تھی۔ وہ اسرائیل کے ایک مشن پر کام کر رہی تھی۔ ڈینئل کاری نے اس کی جذباتی کیفیت کے پیشِ نظر اسے کچھ دنوں کی چھٹی دے دی تھی۔ جاسم نے طلسماتی چابیوں کا کام انجام دے دیا تھا۔ تابوتِ سکینہ تک پہنچنے کا راستہ اب اسرائیلی کارندوں کو بے حد آسان لگ رہا تھا۔ ڈینئل کاری نے جاسم تک پہنچنے کی حکمتِ عملی ترتیب دے لی تھی۔ جاسم کو نہیں معلوم تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ بلوما چھٹیوں پر نیویارک جا رہی تھی۔ ہیری کو بھی ٹاسک دے دیا تھا۔ ڈینئل کاری نے اب ایسا جال تیار کیا تھا جس سے نکلنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ نر ریچھ اور عورت کے اختلاط سے جنم لینے والی ٹوناف نامی مخلوق کا جاسم سے سامنا ہوتا ہے تو وہ بمشکل ٹیلی پورٹیشن کے ذریعے جان بچا کر نکلتا ہے۔ یہودیوں کو تابوتِ سکینہ کی نقلی چابیاں پہنچانے کے لیے حرفہ یمانی افریقی خاتون اپنی خداداد صلاحیتوں کے ذریعے جاسم کی مدد کرتی ہے۔ ٹوناف سے اگلے مقابلے میں جاسم اسے بھرپور جسمانی مقابلے کے بعد شکست دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ڈینئل کاری کو اس کے گھر میں گھس کر مارنے کی پلاننگ پر کام شروع کر دیتا ہے مگر کاری وہ ہاتھ آنے نکل کر جاسم کو چت کر دیتا ہے۔ وہ براخا کے بھائی ایسٹل تھیوڈور کا قبالہ جادو استعمال کرتے ہوئے جاسم کو نقلی آمنہ سے ملاقات کے بہانے آرکٹک ریجن میں بلا کر ٹیلی پورٹیشن کی صلاحیت سے محروم کر دیتا ہے۔ ہیری اور بلوما بھی ڈینئل کاری کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس چکے تھے۔ پاکٹ سائز جاپانی حسینہ ساکورا کی مدد سے جاسم دشمنوں کی کچھار سے نکل کر ایک ڈاک بنگلے تک پہنچا تو رات کے پچھلے پہر ایک قطبی ریچھ اس کے سامنے کھڑا تھا.....

اب آپ مرید واقعات ملاحظہ فرمائیے

دھنکی ہوئی سفید اجلی روئی کا ''لبادہ'' اوڑھے وہ قطبی ریچھ گیسٹ ہاؤس کے داخلی دروازے کے سامنے چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس کے لب سلے ہوئے تھے، آنکھوں سے معصومیت جھلکتی تھی اور وہ امید بھری نظر سے دروازہ کھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ یکا یک اس پولر بیئر کے لیے جاسم کے دل میں ہمدردی اور مدد کے جذبات جاگ اٹھے۔

پولر بیئر (قطبی ریچھ) کا شمار ذہین جانوروں میں ہوتا ہے۔ سو، اس نے بھی سائڈ ونڈو کے سرکے ہوئے پردے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ گیسٹ ہاؤس کے اندر سے کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے مزید ''دستک'' دینا ضروری نہ سمجھا کیونکہ اس نے جزوی طور پر ہی سہی مگر اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔ وہ اس ڈاک بنگلے (گیسٹ ہاؤس) کے مکینوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

''ساکورا.....!'' جاسم نے گردن جھکا کر پاکٹ سائز جاپانی دوشیزہ کے کان میں سرگوشی کی۔ ''وہ بے چارہ کسی مشکل میں ہے۔ ہمیں اس کی مدد کرنا چاہیے۔''

ساکورا کا قد چار فٹ دس انچ تھا۔ وہ دراز قامت جاسم کا محض تین چوتھائی تھی۔ اس کا سر بہ مشکل جاسم کے سینے تک پہنچ پا رہا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ جاسم کے پیٹ میں گھسا رکھا تھا اور اس کے وجود پر لرزہ طاری تھا۔ کپکپاتے ہوئے بدن کے ساتھ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''ثوبان! تم ہوش میں تو ہو۔ پولر بیئر ایک وحشی درندہ ہے۔ تم اس کی بھولی بھالی صورت سے دھوکا کھا رہے ہو۔''

''کچھ بھی ہے۔'' وہ ساکورا کے سر کو اوپر اٹھاتے ہوئے معتدل انداز میں بولا۔ ''وہ چل کر ہمارے دروازے پر آیا ہے اور کسی سائل کی طرح ہماری کرم نوازی کا منتظر ہے۔ میں دروازہ کھولنے جا رہا ہوں۔ تم اس کے کھانے کے لیے کچھ لے آؤ۔ رات میں نے فریج میں سامانِ خورد و نوش کا اچھا خاصا اسٹاک رکھا دیکھا تھا۔''

''فریج'' کے ذکر پر دماغ کو الجھانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ منفی تیس یا اس سے زیادہ گرے ہوئے درجہ حرارت پر فریج یا فریزر کا استعمال سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ قطب شمالی اور قطب جنوبی دونوں پر اس کا استعمال دیکھنے کو ملتا ہے لیکن بہ اندازِ دیگر یعنی جن اشیائے خورد و نوش کو جمنے سے بچانا مقصود ہو، انہیں فریج یا ڈیپ فریزر میں رکھ کر اسے آف موڈ پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس طرح ان بنداِئر ٹائٹ برتی گھریلو آلات کو آن کیے بغیر بھی ان کے اندر موجود سامان کو سرد موسم کی سختیوں سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ثوبان.....!'' وہ شک زدہ نظر سے جاسم کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''دروازہ کھولنے کی غلطی نہیں کرنا ورنہ یہ ریچھ اندر آ کر ہم دونوں کو چیر پھاڑ کر کھا جائے گا۔ مجھے تو اس بات پر حیرت ہو رہی ہے کہ اس موسم میں یہ آزادانہ کھلے میں کیوں گھوم رہا ہے۔''

''یہ قطبی ریچھ ہے ساکورا.....!'' جاسم نے کہا۔ ''انسانوں کی طرح اسے سردی نہیں لگتی۔ اس کی فر دیکھ رہی ہو نا۔ یہ گھنے بال پولر بیئر کو سخت ترین ٹھنڈ سے بچاتے ہیں۔''

''میں پولر بیئر کی فر اور برداشت سے اچھی طرح واقف ہوں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''میرا اشارہ ان ریچھوں کی طویل نیند کی طرف تھا۔ یہ موسم سرما میں چار سے چھ ماہ تک آرکٹک ریجن میں دکھائی نہیں دیتے۔ انہیں جو بھی محفوظ جگہ میسر آ جائے، وہاں پڑے سوتے رہتے ہیں..... ایک لمبی اور گہری نیند!''

''تم ہائبرنیشن کی بات کر رہی ہو.....؟''

''صحیح سمجھے۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''اکتوبر سے فروری تک، ہر گزرتے دن کے ساتھ درجۂ حرارت نیچے گرتے گرتے منفی پچاس ڈگری سینٹی گریڈ کو چھونے لگتا ہے جس کے باعث یہاں کے پانی کے اوپر برف کی اتنی موٹی تہ جم جاتی ہے کہ اس کے نیچے موجود مچھلیوں تک پولر بیئر کی رسائی ممکن نہیں رہتی اور یہ لمبی تان کر سو جاتا ہے۔''

''میں نے سنا ہے، اس طویل نیند کے دوران میں قطبی ریچھ کے بدن میں موجود چربی اسے زندہ رہنے کے لیے ضروری توانائی مہیا کرتی رہتی ہے۔'' جاسم نے گیسٹ ہاؤس کے دروازے پر کھڑے پولر بیئر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس طرح اس برفانی مخلوق کا کاروبارِ حیات چلتا رہتا ہے۔''

''تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے مگر اس کے باوجود بھی تم سنگین غلطی کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہو۔'' ساکورا نے تنبیہہ کرنے والے انداز میں کہا۔ ''تمہیں بالکل اندازہ نہیں کہ اگر یہ ریچھ گیسٹ ہاؤس کے اندر آ گیا تو پھر ہم دونوں کی موت یقینی..... ایک دل خراش اور حسرت ناک موت..... اور..... اور میں مرنا نہیں چاہتی ثوبان!''

''تو ٹھیک ہے.....!'' جاسم نے بے مروتی سے کہا۔ ''اگر تمہیں اس معصوم سفید بھالو سے اتنا ہی ڈر لگ رہا ہے تو اندر کمرے میں جا کر تم دروازہ لاک کر لو۔''

''اور تم.....؟'' ساکورا نے الجھن زدہ نظر سے جاسم کی طرف دیکھا۔

''میں اس مہمان کو مایوس نہیں لوٹاؤں گا۔''

''ٹوبان! تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو نا۔''

جاسم نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔ ''نہیں۔''

''تم..... تم پاگل ہو گئے ہو.....!''

''یہی سمجھ لو.....!''

اس کے بعد جاسم نے بہ آہستگی ساکورا کو ایک طرف ہٹایا اور گیسٹ ہاؤس کے داخلی دروازے کی سمت قدم بڑھا دیے۔ یہ سب خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی ساکورا کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی انسان کس طرح اپنی موت کو دعوت دے سکتا ہے۔ اس سنگین صورتِ حال میں دروازہ کھولنا بھیانک خودکشی کے مترادف تھا اور جاسم یہ مہلک جان لیوا قدم اٹھانے جا رہا تھا۔

دوسری جانب جاسم خود بھی یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس نے ایسی حماقت کرنے کا فیصلہ کیوں کیا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اسے اپنے آپ پر اختیار نہ رہا ہو۔ کوئی غیبی طاقت اسے اپنے اشاروں پر نچا رہی ہو۔ اس کے باوجود بھی وہ اپنے اندر کوئی ڈر، خوف یا اضطراب محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اس کے ذہن کے کسی نامعلوم گوشے سے مسلسل یہ صدا آ رہی تھی۔

''یہ پولر بیئر میرے لیے مسئلہ نہیں بنے گا۔ میں ہر قسم کے جانوروں کو کنٹرول کرنا جانتا ہوں۔ میں اسے بھی ہینڈل کر لوں گا۔''

اور یہ تسلی صرف خاموش آواز تک محدود نہیں تھی بلکہ اس کی سوچ میں رات والے خواب کے باقاعدہ ویژولز بھی چل رہے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے حالتِ نیند میں جاسم نے تین خواب دیکھے تھے جن میں سے ایک خواب کے اندر وہ کسی سرکس کے رنگ ماسٹر کا کردار ادا کر رہا تھا۔ اس کے سر پر بلیک فیڈورا ٹاپ ہیڈ تھا۔ اس نے بلیک پینٹ کے اوپر سفید شرٹ پہن رکھی تھی۔ ویسٹ کوٹ کا رنگ پیلا تھا اور اس پر سفید بڑے بٹنوں والا سرخ کوٹ۔ بو بھی سرخ ہی تھی۔ اس کے پاؤں میں بلیک لانگ شوز تھے۔ یہ پہناوا کسی سرکس میں کام کرنے والے رنگ ماسٹر کا تھا جو مختلف جانوروں کو بہادری کے ساتھ ہینڈل کر کے تماشائیوں سے داد و تحسین وصول کرتا ہے۔ اپنے خواب میں جاسم نے بھی خود کو یہ سب کرتے دیکھا تھا۔

خواب اور حقیقت دو مختلف دنیائیں ہیں۔ خواب کے اندر انسان کے لیے ناممکن کو ممکن کر دکھانا بہت آسان ہوتا ہے بلکہ خواب دراصل کسی انسان کی ناآسودہ خواہشات کی تکمیل ہی کا میدان ہے مگر آنکھوں دیکھی حقیقت بڑی سفاک اور بے رحم ہوتی ہے۔ اس میدان میں انسان کو بہت کچھ کر کے خود کو منوانا پڑتا ہے اور وہ بھی اپنی جان کو جوکھم میں ڈال کر.....

جاسم ان لمحات میں جو کرنے جا رہا تھا، وہ صرف خطرناک ہی نہیں بلکہ جان لیوا بھی تھا مگر وہ ڈر اور خوف کو اپنے پاؤں کا جوتا بنا کر سبک خرامی سے دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا اور پھر..... اس نے بہ آہستگی ڈاک بنگلے کا داخلی دروازہ کھول دیا۔

رگ و ریشے کو کاٹ ڈالنے والی ٹھنڈی ٹھار برفیلی ہوا کا ایک جھونکا جاسم کے بدن سے ٹکرایا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ سرتاپا کانپ کر رہ جاتا لیکن ان لمحات میں وہ اپنے ماحول اور اس ماحول کے سرد و گرم سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ اس کی نگاہ ڈاک بنگلے کی دہلیز پر کھڑے اس معصوم صورت بھالو پر جمی ہوئی تھی اور دماغ کے اندر ایک رنگ ماسٹر اپنی تمام تر ہنرمندی کے ساتھ بیدار اور مستعد کھڑا تھا۔

سفید قطبی بھالو نے گردن اٹھا کر تشکرانہ انداز میں جاسم کی طرف دیکھا۔ جاسم نے پولر بیئر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بغیر لب ہلائے، سوچ کی زبان میں اس سے پوچھا۔

''یہ تو میں جانتا ہوں کہ اس سے دوگنا سردی بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ تمہیں پناہ کی نہیں بلکہ کسی اور شے کی ضرورت ہے۔ میں نے درست اندازہ لگایا ہے نا.....؟''

قطبی ریچھ نے بہ زبانِ خاموشی سر کی خفیف اثباتی جنبش سے جواب دیا۔ ''ماسٹر! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں.....!''

''تمہیں بھوک لگ رہی ہے نا.....؟''

''ہاں.....!''

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' جاسم نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں ابھی تمہارے لیے کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔''

قطبی ریچھ کچھ ممنونیت بھرے انداز میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

جاسم اور پولر بیئر کے درمیان ہونے والی اس مکالمت میں اس سفید بھالو نے اپنے حلق سے کسی قسم کی کوئی آواز نکالی تھی اور نہ ہی جاسم کی زبان سے ایک لفظ ادا ہوا تھا۔ اس گفتگو کو پُراسرار اور معنی خیز ٹیلی کیونی کیشن کا نام دینا مناسب ہوگا۔ دونوں نے اپنا اپنا مافی الضمیر اچھے سے کیونی کیٹ کر دیا تھا۔

پہاڑی پر بنے ہوئے اس ڈاک بنگلے میں قدم رکھنے کے بعد جاسم نے سب سے پہلے اس بنگلے کا اندرونی

سروے کیا تھا۔ ساکورا کے بیان کے مطابق، اس گیسٹ ہاؤس کو آسیب زدہ قرار دے دیا گیا تھا۔ جاسم کے تنقیدی جائزے نے اسے یہ تو باور کرا دیا تھا کہ سالہا سال سے وہاں کسی کی آمد نہیں ہوئی تھی مگر اس کی چھٹی حس نے کسی بھی مرحلے پر اسے ایسی کوئی وارننگ نہیں دی تھی کہ وہ ڈاک بنگلا کسی نادیدہ آسیب کے چنگل میں ہو۔ اس رہائشی عمارت کا ایک ایک حصہ اس بات کی گواہی دیتا تھا کہ عرصہ دراز سے کوئی وہاں آ کر ٹھہرا نہیں۔ ہارر موویز والے ماحول کے باوجود بھی جاسم کو ایک ذرا سا ڈر یا خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ آسیب کی کہانی اسے حقیقت سے زیادہ افسانہ لگی تھی۔

جاسم نے فریج کھولا اور وہاں سے دو بڑی، جمی ہوئی مچھلیاں نکال کر وہ گیسٹ ہاؤس کے داخلی دروازے کی جانب چل پڑا جہاں بہ قول کسے، قطبی ریچھ بڑی بے تابی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

آرکٹک اور انٹارکٹک ریجن میں بسنے میں انسان مچھلی اور شراب کا بے تحاشا استعمال کرتے ہیں۔ رگوں میں لہو کو منجمد کر دینے والی سردی کا سب سے مؤثر توڑ بھی یہی ہے بلکہ بعض لوگ تو اس سے بھی کئی ہاتھ آگے چلے جاتے ہیں۔ پولر بیئر صرف نارتھ پول (آرکٹک ریجن) اور پینگوئن صرف ساؤتھ پول (انٹارکٹک ریجن) ہی میں پائے جاتے ہیں۔ جب زندگی کی بقا کا مسئلہ درپیش ہو تو انسان ان قطبی جانوروں کو بھی بلا تامل اپنی خوراک کا حصہ بنا لیتا ہے۔

فربہ سفید بھالو کسی بھوکے فقیر کے مانند ڈاک بنگلے کی چوکھٹ پکڑے بیٹھا منتظر نگاہ سے اندر دیکھ رہا تھا اور ساکورا اس قطبی ریچھ کو ایسے تک رہی تھی جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے کوئی معجزہ رونما ہو گیا ہو۔ اس کی بے یقینی اور استعجاب دیدنی تھا۔ پولر بیئر نے ڈاک بنگلے کی دہلیز کو لانگنے کی جرأت نہیں کی تھی اس لیے بھی ساکورا کو قدرے اطمینان ہو گیا تھا کہ بہرحال اس خوں خوار درندے سے اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں تھا تاہم قطبی ریچھ کا خلافِ فطرت رویہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ کبھی ریچھ کو اور کبھی جاسم کو دیکھ رہی تھی۔ یکایک جاسم اس کی نگاہ میں ایک دیوتا کا روپ دھار چکا تھا۔ اس کا دماغ مسلسل اسے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''جیفری اور اس کی ٹیم میں شامل دوسرے لوگ ثوبان کے حوالے سے کسی قسم کی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لے رہے تھے۔ یہ بندہ واقعی پُراسرار قوتوں کا مالک ہے۔ اس نے تو ایک وحشی درندے کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنا لیا ہے۔ مجھے مان لینا چاہیے کہ ثوبان کوئی عام انسان نہیں ہے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ بکتا گا ساما (لارڈ بڈھا) کی روحانی شکتیاں ثوبان کا ساتھ دے رہی ہیں۔ یہ کسی جادوگر سے زیادہ پہنچا ہوا شخص ہے.....!''

جاسم نے وہ دونوں فروزن فش قطبی ریچھ کے سامنے، برفیلی زمین پر رکھ دیں۔ سفید ریچھ نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس مرغوب غذا کو اپنے معدے میں اتار لیا۔

اس دوران میں ساکورا بھی ہمت کر کے جاسم کے نزدیک آ گئی تھی۔ پچھلے دو، تین منٹ میں ساکورا نے جو تعجب خیز منظر دیکھا تھا، اس نے اسے بے حد حوصلہ دیا تھا۔ جاسم کی معیت میں وہ خود کو کلی طور پر محفوظ محسوس کرنے لگی تھی۔ پلک جھپکتے میں اس کے سارے خدشات ہوا ہو گئے تھے۔

کم و بیش تین کلوگرام وزن کی مچھلی اپنے پیٹ میں اتارنے کے بعد پولر بیئر نے احسان مندانہ نظر سے جاسم کی طرف دیکھا۔ ساکورا نے اضطراری انداز میں کہا۔

''ثوبان! وہ تمہارا شکریہ ادا کر رہا ہے.....!''

''جانور انسان سے زیادہ شکرگزار مخلوق ہے۔'' جاسم نے ساکورا کی طرف دیکھے بغیر خوش گوار انداز میں کہا۔ ''یہ اپنے محسن اور اس کے احسان کو ہمیشہ یاد رکھتا ہے۔''

قطبی ریچھ نے اپنی موٹی فر والی گردن گھما کر ادھر اُدھر دیکھا اور وہاں سے جانے کے لیے مڑا تو جاسم نے بہ آواز بلند کہا۔

''سنو.....!''

بھالو رک گیا اور ایسی نظر سے جاسم کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ''یس ماسٹر.....!''

''ہم دوست ہیں.....!'' جاسم نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک دوسرے کا خیال رکھنا ہم سب کی ذمے داری ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا.....؟''

قطبی ریچھ نے اپنا ایک پاؤں کسی سولجر کے انداز میں، زور سے برفیلی زمین پر مارا پھر گردن جھکا کر ایک سمت چل پڑا.....!

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی یعنی اٹھائیس اکتوبر، بہ روز ہفتہ کی تاریخ آغاز ہو گئی تھی لیکن ابھی تک ثوبان (جاسم) اور ساکورا کی تلاش والی مہم کامیابی کے قدموں تک رسائی حاصل کرنے میں قطعی ناکام ثابت ہوئی تھی۔ ٹیم لیڈر رابرٹ عرف روب اور اس کا معتمدِ خاص سیموئل عرف سیم کانیج نمبر آر۔ تھرٹی میں سر جوڑے بیٹھے اسی گمبھیر صورتِ حال پر غور و فکر کر رہے تھے۔

سیڈ بینک سے پون کلومیٹر مغرب میں، دو پہاڑیوں کے بیچوں بیچ ایک چھوٹی سی وادی ہے جہاں رہائشی بستی آباد کی گئی ہے۔ اس وادی میں کم و بیش چھ سو کاٹیجز تعمیر کیے گئے ہیں۔ ان کاٹیجز کی چھتیں مخروطی ہیں اور ہر کاٹیج پر الگ چمک دار پینٹ کیا گیا ہے تاکہ دور ہی سے نگاہ میں آجائے جیسا کہ بھورا، نیلا، سرخ، پیلا رنگ ـــــ وغیرہ۔ یہ تمام کاٹیجز لکڑی سے بنائے گئے ہیں۔ مخروطی وضع کی چھتیں ان کاٹیجز کے اوپر برف کو جمنے سے روکتی ہیں مگر ایک حد تک۔ برف باری آرکٹک ریجن کے معمول میں شامل ہے۔ پورا سال ہلکی پھلکی برف باری کا عمل جاری رہتا ہے لیکن موسم سرما میں اس کی شدت عروج پر ہوتی ہے۔ اس دوران میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہاں کی ہر شے نے برف کی سفید چادر اوڑھ لی ہو۔

مذکورہ رہائشی علاقے کا کاٹیج نمبر ''آر۔تھرٹی'' رابرٹ اور اس کی دس رکنی ٹیم کے استعمال میں تھا۔ ان میں سے چند افراد کی ڈیوٹی سیڈ بینک والے ڈین میں تھی۔ باقی لوگ بھی حسبِ ضرورت وہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے رابرٹ بھی ڈین کا چکر لگا کر آیا تھا۔

''سیم! ڈین کے اندر میں نے جو کچھ دیکھا ہے، اسے بیان کرنا آسان نہیں۔'' رابرٹ نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔ ''ثوبان نے ہمیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ اس نے اینڈی، ایڈ اور جیف کو جس سفاکی اور بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا ہے، وہ منظر رونگٹے کھڑے کر دینے والا ہے۔ مجھے یقین نہیں آرہا کہ وہ کمینہ فلسطینی موساد کے تربیت یافتہ ایجنٹس کو یوں آسانی سے ختم کرسکتا ہے ـــ جیسے کتوں اور بلیوں کو قتل کیا جاتا ہے۔''

''روب! اس صورتِ حال نے تمہارے حافظے کو بُری طرح متاثر کیا ہے۔'' سیم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' رابرٹ نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

قبل اس کے کہ سیم اسے اپنی بات کا مطلب بتاتا، رابرٹ کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ڈسپلے پر الیکس کا نام چمک رہا تھا۔ رابرٹ نے فوراً کال پک کرتے ہوئے خشک لہجے میں کہا۔

''ہاں، بولو ـــ!''

''باس! اس شیطان کا کچھ پتا نہیں چل رہا ـــ!'' الیکس نے شکست خوردہ لہجے میں بتایا۔ ''نک اور کرس ابھی واپس آئے ہیں۔ انہوں نے یہاں کے تمام ہوٹلز، ریسٹورنٹس، گیسٹ ہاؤسز، شاپنگ مالز، ائرپورٹ، میوزیم، آپ والا رہائشی علاقہ اچھی طرح چھان مارا ہے، حتیٰ کہ وہ لوگ معروف شاپنگ مال ''لومین سینٹر'' تک بھی ہو آئے ہیں مگر ثوبان اور ساکورا کا کوئی نام پتا یا سراغ ان کے ہاتھ نہیں لگا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زمین نے انہیں نگل لیا ہے یا پھر آسمان کھا گیا ہے۔''

''لومین سینٹر'' کی وجہِ شہرت اس کی منفرد وقوع پذیری ہے۔ یہ خوب صورت اور دلکش عمارت اس دنیا کا انتہائی شمالی شاپنگ سینٹر ہے۔

الیکس کی تازہ ترین رپورٹ نے رابرٹ کی فکرمندی میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ گزشتہ روز سہ پہر کے بعد سے الیکس وقفے وقفے سے اپنے باس کو تازہ ترین حالات سے آگاہ کرتا تھا اور رابرٹ کی امید جوان تھی کہ وہ لوگ ثوبان اور ساکورا کو کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ نکالیں گے مگر اس رپورٹ نے رابرٹ کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی۔ تاہم اس نے اپنی پریشانی کو الیکس پر ظاہر نہیں ہونے دیا اور مضبوط لہجے میں پوچھا۔

''کیا نک اور کرس اس ہانٹڈ ہاؤس کی طرف بھی گئے تھے؟''

رابرٹ کا واضح اشارہ پہاڑی پر بنے ہوئے اس ڈاک بنگلے کی جانب تھا جسے پچھلے چند سال سے آسیب زدہ سمجھ لیا گیا تھا۔ وہاں رہنے والے تمام لوگ اس گیسٹ ہاؤس کی خطرناکی اور ہلاکت خیزی سے بہ خوبی واقف تھے لہٰذا کوئی بھی اس طرف جانے کا تصور نہیں کرسکتا تھا۔ سوالبار کے گورنر نے باقاعدہ یہ قانون بنا رکھا تھا کہ کسی بھی انسان کو اس ڈاک بنگلے کی طرف جانے کی اجازت نہیں۔ اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والا اپنے جانی و مالی نقصان کا خود ذمے دار ہوگا۔

جاسم اور ساکورا نے اسی آسیب زدہ ڈاک بنگلے کو اپنا ہنگامی اور عارضی مسکن بنا لیا تھا۔

''نہیں باس ـــ!'' الیکس نے نفی میں رابرٹ کے سوال کا جواب دیا۔

رابرٹ نے جھنجلے بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیوں؟''

''موجودہ حالات سے یہی پتا چلتا ہے اس جاپانی شیف ساکورا نے ثوبان کی مدد کی ہے اسی لیے وہ ہمارے ساتھیوں کو ہلاک کرنے کے بعد ڈین سے فرار ہونے میں کامیاب ہوا ہے۔'' الیکس نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''یقیناً ساکورا اس وقت بھی ثوبان کے ساتھ ہوگی۔ وہ کسی بھی حال میں اسے ڈاک بنگلے کی طرف نہیں لے کر

جائے گی کیونکہ وہ جانتی ہے، وہ گیسٹ ہاؤس موت کا مسکن ہے، جو بھی انسان اُدھر کا رخ کرتا ہے پھر وہ زندہ نہیں رہتا!"

"الیکس!" رابرٹ نے سپاٹ آواز میں کہا۔

الیکس جلدی سے بولا۔ "یس باس ——!"

"موساد کا فیلڈ ایجنٹ بننے کے لیے تمہیں کڑی ٹریننگ سے گزرنا پڑا تھا۔" رابرٹ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس دوران میں کیا کسی سینئر نے تمہیں بزدلی کا درس بھی دیا تھا؟"

الیکس نے اُلجھن زدہ لہجے میں جواب دیا۔ "نو سر!"

"پھر آسیب، بھوت، جن اور مختلف بلاؤں سے تمہیں ڈر کیوں محسوس ہو رہا ہے؟" رابرٹ نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ "موساد کے ایجنٹس تو موت سے بھی خوف زدہ نہیں ہوتے اور تم ایک آسیب زدہ ڈاک بنگلے سے اس قدر خائف نظر آ رہے ہو..... ایسا کیوں؟"

"نو سر!" الیکس نے توانا لہجے میں جواب دیا۔ "میں اپنے یا دیگر ساتھیوں کے ڈرنے کی بات نہیں کر رہا۔ وہ سب میں نے ساکورا کے حوالے سے کہا تھا۔"

"ساکورا کا حوالہ دیتے ہوئے تم یہ کیسے بھول گئے کہ اس پدی سی جاپانی دوشیزہ کے ہمراہ ایک خطرناک فلسطینی دہشت گرد ٹوبان بھی ہے ——" رابرٹ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "جس نے پچھلے چوبیس گھنٹے میں موساد کے پانچ تربیت یافتہ ایجنٹس کو اس طرح شکار کیا ہے کہ ابھی تک ہم اس کے پاؤں کی گرد تک کو نہیں پا سکے۔"

بحرِ منجمد شمالی (آرکٹک اوشین) ایک جما ہوا سمندر ہے جس کے لوے فیصد حصے پر موٹی برف موجود ہے اور اس برف کی تہ کی موٹائی بعض مقامات پر بیس پچیس کلومیٹرز سے بھی زیادہ ہے۔ لہٰذا اس جمے ہوئے سمندر کے حوالے سے جب زمین، پہاڑ وغیرہ —— کا ذکر ہوگا تو اس کا سیدھا سیدھا مطلب ہے، جمے ہوئے پانی یعنی برف کی زمین اور برف کا پہاڑ۔ اس خطے کا درجہ حرارت اس قدر کم ہوتا ہے کہ اس برف کو پگھلنے کا کبھی موقع نہیں ملتا ——

"میں سمجھ گیا باس!" الیکس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "بتائیں، ہمارے لیے کیا حکم ہے؟"

"رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔" رابرٹ نے معتدل مگر تحکم آمیز انداز میں کہا۔ "تم لوگ پچھلے آٹھ گھنٹے سے مصروفِ عمل ہو اور وہ بھی اس ٹھنڈے یخ بستہ موسم میں۔ تمہیں کچھ دیر کے لیے آرام کرنا چاہیے۔ کل صبح تم تینوں پوری طرح مسلح ہو کر اس ڈاک بنگلے کی طرف جاؤ گے۔ اگر وہ دونوں بھگوڑے اس پہاڑی گیسٹ ہاؤس میں موجود ہوں تو کوئی سوال جواب کیے بغیر انہیں بے دریغ بھون ڈالنا۔" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"یو گاٹ مائی پوائنٹ ——؟"

"گاٹ اِٹ باس!" الیکس نے جواب دیا۔

"کوئی سوال ——؟"

"نو سر ——!"

"ہونا بھی نہیں چاہیے ——" رابرٹ نے نخوت بھرے لہجے میں کہا اور دریافت کیا۔ "بینی اور انتھونی کی لاشوں والا معاملہ ٹھیک کر دیا نا؟"

بیبن عرف بینی، ایڈورڈ یعنی ایڈ کا چھوٹا بھائی تھا۔ بیبن اور انتھونی کو پچھلی رات جاسم نے چوبی کیبن کے اندر بڑی بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ خیر، اب تو ایڈ، اینڈی اور جیف بھی اپنے ان ساتھیوں کے پاس پہنچ چکے تھے۔

"یس باس!" الیکس نے جواب دیا۔ "بیبن اور انتھونی کی لاشوں کو آپ کے حکم کے مطابق، نہایت ہی احتیاط اور رازداری کے ساتھ کیبن سے نکال کر ڈین کے اندر پہنچا دیا گیا ہے۔ اب پانچوں لاشیں ایک ہی جگہ پڑی ہیں۔"

"ٹھیک ہے، ہم اپنے ساتھیوں کی باڈیز کے حوالے سے حتمی فیصلہ کل کریں گے۔" رابرٹ نے کہا۔ "تم لوگ صبح جب ڈاک بنگلے کی طرف جانے لگو تو مجھے ضرور انفارم کر دینا۔ میں جاگ رہا ہوں۔"

"او کے باس ——!"

اس کے ساتھ ہی رابرٹ نے سیٹلائٹ رابطہ برخاست کر دیا۔ سیم نے فکرمند لہجے میں کہا۔ "روب! ان باڈیز کا معاملہ خاصا سنگین ہے۔ ہم انہیں کہیں بھی دفنا نہیں سکتے اور اگر سوالبار سے باہر لے جانا چاہیں گے تو اس بات کو گورنمنٹ کے علم میں لانا ہوگا اور —— پھر یہ سوال اٹھ کھڑا ہوگا کہ ان کی موت کیسے واقع ہوئی اور ان کا قاتل کون ہے —— کہاں ہے؟"

سیم نے ایک نہایت ہی اہم پہلو کی جانب اشارہ کر دیا تھا۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ سوالبار حکام کو بتائے بغیر ان پانچ لاشوں کو کہیں بھی لے جانا ممکن نہیں تھا اور جہاں تک لاشوں کی تدفین کا معاملہ تھا گورنمنٹ کی طرف سے اس کی اجازت نہیں تھی اسی لیے رابرٹ نے فی الحال اس ایشو کو کل پر ٹال دیا تھا۔

یہ سن کر آپ کو حیرت ہوگی کہ سوالبار کی سرزمین پر بچہ پیدا کرنے کی اجازت ہے اور نہ ہی کسی لاش کو گاڑنے کی

منظوری۔ اول تو وہاں رہنے والی عورتیں بچے جننے کی خواہش ہی نہیں رکھتیں لہٰذا وہ داغ حسن اور استقاطِ حمل کی مخصوص ادویہ پابندی سے استعمال کرتی ہیں۔ اگر کوئی عورت اولاد پیدا کرنے کا ارادہ کر ہی لے تو پھر اسے حکومت سے باقاعدہ اس کی اجازت لینا پڑتی ہے۔ ایسی عورت کو زچگی سے ایک ماہ پہلے سوالبار، چھوڑ کر ناروے یا کسی اور قریبی ملک میں شفٹ ہونا پڑتا ہے اور یہ کوئی آسان یا سستا مرحلہ نہیں ہے، چنانچہ عورتیں اس جھنجھٹ سے دور ہی رہتی ہیں۔ سوالبار کی آبادی نہ بڑھنے کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ باقی جہاں تک کسی مُردے کی تدفین کا معاملہ ہے اس سرکاری ممانعت کے پیچھے ایک تکنیکی وجہ ہے اور وہ یہ کہ اس خطے میں زمین یعنی مٹی نام کی کوئی چیز سرے سے موجود ہی نہیں۔ اگر برف میں گڑھا کھود کر کسی مردہ جسم کو اس کے اندر دفن کریں گے تو لاش کی ڈی کمپوزیشن (بوسیدگی) کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ موسمی تبدیلیوں کے باعث برف زیادہ عرصے تک لاش کو اپنے پیٹ میں چھپا نہیں سکے گی۔ نتیجے کے طور پر وہ مردہ برف سے باہر نکل آئے گا۔ وہ بھی اپنی اصلی صحیح و سلامت حالت میں۔ اسی لیے حکومت سوالبار، شدید بیمار اور موت کے قریب لوگوں کو صدائے اجل سے پہلے ہی ناروے یا کسی دوسرے ملک.... پہنچا دیتی ہے۔

سیم کی تشویش کو سنی اَن سنی کرتے ہوئے رابرٹ نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔ ''الیکس کی کال سے پہلے تم میرے حافظے کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے.....؟''

''ہاں، میں نے کہا تھا کہ موجودہ حالات نے تمہاری یادداشت کو بُری طرح دھندلا دیا ہے۔'' سیم نے کہا۔ ''اسی لیے تم ثوبان کو بہت ہلکا لے رہے ہو۔ وہ کوئی عام فلسطینی مجاہد نہیں ہے روب.....!''

رابرٹ نے دلچسپی بھرے لہجے میں کہا۔ ''ذرا کھل کر بتاؤ سیم.....!''

''یہ پہلی دفعہ نہیں ہے کہ ثوبان نے موساد کے ایجنٹس کو شکار کیا ہو۔'' سیم نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ مشن ہمارے سپرد کرنے سے پہلے ہمیں ثوبان کی ہسٹری سے بھی آگاہ کیا گیا تھا۔ چند روز پہلے اس مردود نے اسرائیلی سب میرین ''ڈولفن کلاس۔ ٹو'' پر جو تباہی مچائی تھی، وہ افسوس ناک واقعہ ہم سب کے علم میں ہے۔ موساد کے ایجنٹس اور اس سب میرین کے عملے کے علاوہ ثوبان نے قوم یہود کے فخر اور عظیم سرمائے میڈم براخا کو بھی نشانِ عبرت بنا دیا تھا۔''

''وہ تمام تر اندوہناک سانحات میری یادداشت میں محفوظ ہیں۔'' رابرٹ نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''اسرائیلی نیوی کی اس جدید سب میرین پر جو کچھ ہوا تھا، میں بھلا اسے کیسے فراموش کر سکتا ہوں اور ایسا بھی نہ سمجھو کہ میں ثوبان کو ہلکا لے رہا ہوں.....'' اس نے لمحاتی توقف کیا پھر ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کر دی۔

''حقیقت یہ ہے کہ اس کم بخت نے موساد کو ہلکا لے لیا ہے۔ ایک، دو ابتدائی اور جزوی کامیابیوں کے بعد وہ یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ موساد کے تمام ایجنٹس کو چٹکیوں میں مسل کر رکھ دے گا۔ میں اس بدمعاش کی یہ غلط فہمی نکال کر ہی دم لوں گا۔''

''یہ سب تو اُس وقت ممکن ہو پائے گا جب ثوبان ہمارے ہاتھ لگے گا۔'' سیم نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''ہم نے پچھلی رات کتنی مشکل سے اسے قابو کیا تھا۔ وہ حرامی چوبیس گھنٹے تک بھی ہماری کسٹڈی میں نہیں رہا۔ اس نے ڈین کے اندر ہمارے تین انتہائی قابل ایجنٹس کو دردناک موت دی اور ہماری شیف کو اپنا ہمنوا بنا کر ڈین سے فرار ہو گیا۔ روب! میں تو کسی اور ہی زاویے سے سوچ رہا ہوں۔''

رابرٹ نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''کس زاویے سے؟''

''ثوبان کے حوالے سے بریفنگ دیتے ہوئے ہمیں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ وہ پُراسرار علوم پر بھی دسترس رکھتا ہے اور کوئی روحانی ہستی گاہے بگاہے اس کی ماورائی مدد بھی کرتی رہتی ہے۔ اس تناظر میں وہ ہمارے لیے ایک ہارڈ ٹارگٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ میڈم براخا ہپناٹزم اور قبالہ کی ماہر تھیں لیکن ثوبان ان پر بھی بھاری پڑ گیا تھا اور.....!''

''آخر تم مجھے کیا بتانے کی کوشش کر رہے ہو سیم؟'' رابرٹ قطع کلامی کرتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''کیا ہم ثوبان کے خوف سے چوہے کی طرح کسی بل میں گھس کر بیٹھ جائیں.....''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا روب.....!'' سیم نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں تو آپ پر، حالات کی سنگینی کو واضح کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''حالات چاہے کتنے بھی سنگین اور دگرگوں کیوں نہ

ہوں، موساد کے ایجنٹس مارنا اور مرنا بہ خوبی جانتے ہیں۔" رابرٹ نے پُرعزم انداز میں کہا۔ "اس خوں ریز فلسطینی نے معاملات کو جس نہج پر پہنچا دیا ہے کہ ہمیں بھی اب یہی پالیسی اختیار کرنا پڑے گی..... یا آپ نہیں، یا گاہک نہیں۔"

"میں کب کہہ رہا ہوں کہ موساد کے ایجنٹس مرنے سے ڈرتے ہیں۔" سیم نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن یہاں، حاملہ مرنے کا نہیں، اپنا مضبوط دفاع کرنے کا ہے..... ایجنسی کی نظر میں خود کو قابلِ اعتبار ثابت کرنے کا ہے۔ اس نامراد ثوبان نے ہماری ساکھ کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ عزت بچانے کے لیے ہمیں کوئی راستہ نکالنا ہوگا، وہ بھی صبح سے پہلے۔ تم سمجھ رہے ہو نا، میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

رابرٹ چند لمحات تک گہری نظر سے سیموئل کو تکتا رہا پھر اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ہاں، میں سمجھ رہا ہوں مگر تمہاری زبان سے بھی سننا چاہتا ہوں۔ ذرا پتا تو چلے کہ آخر تمہارے دماغ میں چل کیا رہا ہے۔"

"ہمیں ثوبان کا انٹرویو دو مراحل میں کرنا تھا۔" سیم نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "پہلا مرحلہ دن میں مکمل ہو گیا تھا اور دوسرا مرحلہ رات میں طے ہونے والا تھا کہ حالات بدل گئے۔ تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد ثوبان کو موت کے گھاٹ اتارنے کا حکم دیا گیا تھا لیکن وہ اس سے پہلے ہی ہماری تحویل سے نکل گیا اور وہ بھی ہمارے تین ساتھیوں کی لاشوں کا تحفہ دے کر....."

"میں نے کہا ہے نا.....!" سیم کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی رابرٹ نے زہرخند لہجے میں کہا۔ "صبح ثوبان کی زندگی کا چراغ گل کر دیا جائے گا۔ پھر اس نے ہمیں جتنا بھی نقصان پہنچایا ہو، اس کی بھرپائی ہو جائے گی۔"

"لیکن صبح ہونے میں تو ابھی چند گھنٹے باقی ہیں!"

"سیم.....!" رابرٹ نے عجیب سے انداز میں کہا۔ "اشاروں کنایوں کا سہارا لینے کے بجائے مجھ سے سیدھی بات کرو۔ تم جانتے ہو، میں تمہاری زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو اہمیت دیتا ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"روب! تم نے ثوبان کے دن والے، انٹرویو کے پہلے حصے کے بارے میں اوپر اطلاع دے دی تھی۔" سیم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر ان لوگوں نے شام یا رات والے انٹرویو کے دوسرے حصے کے حوالے سے سوال کر دیا تو کیا جواب دو گے.....؟"

"دن میں، میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں اتنا بھی بے وقوف نہیں ہوں کہ اس گڑبڑ کے بارے میں اوپر والوں کو رپورٹ کروں۔" رابرٹ نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔ "یہ تو خود اپنے ہاتھوں سے منہ پر کالک ملنے کے مترادف ہوگا۔"

"روب! اگر چہرے پر کالک مل لینے سے بگڑی بن سکتی ہو تو یہ ہمارے لیے گھاٹے کا سودا نہیں ہوگا۔" سیم نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "مگر یہاں کی صورتِ حال سراسر ہماری مخالفت میں ہموار ہو چکی ہے۔ ہمیں جو بھی کرنا ہے، اوپر والوں کی کال آنے سے پہلے کرنا ہوگا۔"

"تمہارے ذہن میں کیا ہے؟" رابرٹ نے سوالیہ نظر سے سیم کی طرف دیکھا۔ "اس بحران سے نکلنے کے لیے کوئی مفید مشورہ....."

"میرے محتاط اندازے کے مطابق صبح سے پہلے اوپر والے تم سے رابطہ نہیں کریں گے۔ گویا اپنا بچاؤ کرنے کے لیے ہمارے پاس تین، چار گھنٹے ہیں۔" سیم نے گہری سنجیدگی سے کہا اور پوچھا۔ "ہمارے پاس آتش گیر اور دھماکا خیز مواد کی تو کوئی کمی نہیں ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

"سی فور، آر ڈی ایکس، میگنیشیم، ہیگزوجن، سائیکلونائٹ اور نائٹروگلیسرین..... سب طرح کا ایکسپلوسیو وافر مقدار میں ہے ہمارے پاس.....!" رابرٹ نے اُلجھن زدہ انداز میں کہا۔ "لیکن میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ تم مجھ سے یہ کیوں پوچھ رہے ہو۔"

"ثوبان ایک سخت جان فلسطینی دہشت گرد ہے اور وہ بعض ماورائی علوم میں بھی مہارت رکھتا ہے۔ یہ سب اوپر والوں ہی نے تو ہمیں بتایا ہے نا.....؟"

"ہاں..... تو.....؟" رابرٹ کی اُلجھن دو چند ہو گئی۔

"ثوبان نے ڈین کے اندر اپنی پُراسرار قوتوں کا سہارا لے کر ہمارے مزید تین ساتھیوں کو فنا کے گھاٹ اتارا اور شیف ساکورا کو اپنے ٹرانس میں لے کر وہ ڈین سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔" سیم نے ایک ہی سانس میں کہا۔ "وہ چونکہ ایک تخریب کار فلسطینی ہے اس لیے ڈین کو چھوڑنے سے پہلے وہاں ایک خوفناک دھماکا بھی کر دیا۔"

"اوہ.....!" رابرٹ نے تاسفانہ انداز میں کہا۔ "سیم! تمہارا دماغ بالکل شیطان کے انداز میں سوچتا ہے لیکن ڈین ہمارے لیے ایک محفوظ خفیہ اڈا ہے۔ اسے اپنے ہی ہاتھوں سے تباہ کر دینا عقل مندی نہیں ہوگی۔"

"ہم نہیں، ڈین کو ثوبان اُڑانے والا ہے.....!" سیم کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "اس دہشت گردی والے واقعے کا سارا ملبا ثوبان پر گرے گا اور جہاں

تک اس ڈین کی اہمیت اور افادیت کا معاملہ ہے تو.....''
اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر دو ٹوک الفاظ میں اضافہ کردیا۔
''روب! ہم دو میں سے کسی ایک ہی کو بچا سکتے ہیں۔ نمبر ایک، ڈین کو..... نمبر دو، اپنی ساکھ اور مستقبل کو۔ اس سمت میں پیش قدمی کرنے سے ہمارے پانچ ساتھیوں کی باڈیز کا مسئلہ بھی مستقل بنیاد پر حل ہو جائے گا۔ ثوبان اس سے پہلے یروشلم، غزہ، بیتھنز اور دیگر کئی مقامات پر بڑے بڑے جگادریوں کو جل دے کر ان کی مٹی پلید کر چکا ہے۔ ایک بار اور سہی..... کیا کہتے ہو روب؟''
''اسے ڈن ڈیل سمجھو سیم!'' رابرٹ نے پُرجوش انداز میں کہا۔ ''لیکن یہ راز صرف ہم دونوں کے درمیان رہنا چاہیے کہ ہم ڈین کو اپنے ہاتھوں سے اُڑا کر اس کا الزام ثوبان کے سر تھوپنے والے ہیں۔ اس بارے میں الیکس، نک اور کرس کو کانوں کان خبر نہیں ہونا چاہیے۔''
''ٹھیک ہو گیا.....'' سیم نے ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''صبح جب نک، کرس اور الیکس ڈین سے نکلتے وقت تم سے رابطہ کریں گے تو ہم تمام ایکسپلوسیوز کے ساتھ ڈین کی جانب روانہ ہو جائیں گے۔''
رابرٹ ستائشی نظر سے اپنے معتمدِ خاص کو تکنے لگا۔ زبان سے مان لینے سے، مان جاتا تھا لہٰذا اس نے بہ زبانِ خاموشی دل میں کہا۔ ''کاش! میری کھوپڑی میں بھی سیم کے جیسا شیطانی دماغ ہوتا۔''
صرف رابرٹ ہی نہیں، یہ ہر سینئر کا نفسیاتی معاملہ ہے کہ وہ کسی جونیئر خصوصاً اپنے نائب کے سامنے ایسی کسی خواہش کا اظہار نہیں کرتا جو کسی بھی حوالے سے اسے اپنے معاون کے مقابلے میں کم تر ثابت کرتی ہو۔

☆☆☆

فربہ پولر بیئر جاسم کو سیلیوٹ ٹھوک کر چپ چاپ ایک سمت چل پڑا تھا۔ جاسم اور ساکورا اس وقت تک ڈاک بنگلے کے داخلی دروازے پر کھڑے رہے جب تک قطبی ریچھ دُھند کا حصہ بن کر ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔
جاسم نے دروازہ بند کیا تو حرارت بخش فرحت کا احساس ہوا۔ دروازہ کھلا ہونے کے باعث یخ بستہ برفیلی ہوا براہِ راست ان دونوں کے چہروں اور جسم کے دیگر کھلے حصوں پر سرد قیامت ڈھا رہی تھی۔ دروازہ بند ہوا تو ان کے محسوسات نے بھی سکھ کا دم بھرا۔ گیسٹ ہاؤس کے اندر، رات سونے سے پہلے جاسم نے آتش دان روشن کر دیا تھا جس سے خارج ہونے والی حرارت، زندگی کو آسان اور آسودہ بنانے کی سعی میں مصروف تھی۔
''ثوبان! مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنا ہیں.....!''
بیڈ روم میں آنے کے بعد ساکورا نے ہیجان خیز لہجے میں کہا۔ ''وعدہ کرو کہ تم میرے ہر سوال کا جواب دو گے!''
''ہاں، دوں گا۔'' جاسم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور پوچھا۔ ''کیا تمہارے پاس سیل فون ہے؟''
''ہاں ہے.....!'' ساکورا نے اثبات میں جواب دیا۔ ''مگر میں نے اسے کھول رکھا ہے۔''
''کھول رکھا ہے؟'' جاسم نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔
''مطلب یہ کہ ڈین چھوڑنے سے پہلے میں نے اپنے سیل فون کی بیٹری اور سم کارڈ کو باڈی سے الگ کر کے اپنے بیگ میں رکھ لیا تھا۔'' وہ نیلے رنگ کے رک سیک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''تاکہ رابرٹ یا اس کا کوئی ساتھی میرے سیل فون کے ذریعے مجھے ٹریس یا ٹریک نہ کر سکے.....!''
''ساکورا! تم ایک ذہین لڑکی ہو۔'' جاسم نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر توصیفی انداز میں کہا۔ ''محتاط حکمتِ عملی اختیار کر کے تم نے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔''
ساکورا اپنی تعریف سن کر خوش ہو گئی۔
جاسم نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''تمہارے نام کا مطلب کیا ہے؟''
''ساکورا..... جپینیز (جاپانی) زبان کا لفظ ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اور اس کے معنی ہیں..... چیری بلاسم!''
''ساکورا! تم چیری بلاسم کے گلابی پھول کے مانند حسین و جمیل اور ایک دم تر و تازہ ہو.....!'' جاسم نے تہ دل سے اس کی تعریف کی۔
وہ شرما گئی پھر جاسم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے زیرِ لب مسکرا کر کہا۔ ''آری گاتو ثوبان.....!''
جاسم روزمرہ استعمال کے سادہ جاپانی جملوں کا مطلب سمجھنے لگا تھا۔ ساکورا کے ''تھینک یو'' کے جواب میں اس نے شائستگی آمیز لہجے میں کہا۔
''یو آر موسٹ ویلکم ساکورا.....!''
''ثوبان! تم نے مجھ سے سیل فون کے بارے میں کیوں پوچھا تھا!'' ساکورا نے استفسار کیا۔ ''کیا کسی کو کال کرنا چاہتے ہو؟''
''نہیں!'' جاسم نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں دراصل یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وقت کیا ہوا ہے اور.....

اس چھوٹے سے کام کے لیے تمہیں اپنا سیل فون آن کرنے کی غلطی ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ ہم جتنی زیادہ احتیاط سے کام لیں گے، اسی قدر محفوظ رہیں گے۔"

چار ماہ طوالت کی امین پولر نائٹ کے دوران میں سورج کے طلوع و غروب کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا لہٰذا ٹائم کے ذیل میں آرکٹک ریجن میں بسنے والے لوگ وقت کی جان کاری کے لیے گھڑیوں کی محتاجی پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس ڈاک بنگلے کی دو دیواروں پر وال کلاک تو آویزاں تھے مگر ان کے اندر موجود سیل ایک عرصے سے ختم ہو چکے تھے لہٰذا وہ اپنے ڈائل پر وقت دکھانے سے قاصر تھے۔

"درست ٹائم معلوم کرنے کا بندوبست ہے میرے پاس.....!" ساکورا اپنے سلیپنگ بیگ کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔

جاسم گہری توجہ سے پاکٹ سائز جاپانی حسینہ کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے لگا۔ ساکورا کا وہ بیگ گویا عمرو عیار کی زنبیل کے مانند تھا۔ وہ جب چاہتی، اس زنبیل کے اندر ہاتھ ڈال کر اپنی مرضی اور ضرورت کی چیز برآمد کر لیتی تھی۔

اب کی بار اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں فیلٹ کے سائز کی ایک ڈیجیٹل ڈائری موجود تھی۔ آئی ٹی کے میدان میں جاپان باقی دنیا سے پچاس سال آگے ہے۔ اس ذیل میں امریکا بہادر اس کا پاسنگ بھی نہیں.....

"اٹھائیس اکتوبر دو ہزار نائیس، بہ روز ہفتہ.....!" ساکورا کی باریک مگر سُریلی آواز جاسم کی سماعت سے ٹکرائی۔ "وقت تین بج کر پندرہ منٹ۔ اے ایم..... یعنی صبح!"

"ٹھیک ہو گیا....." جاسم نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ساکورا نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا ٹھیک ہو گیا.....؟"

"آتش دان کو روشن کیے لگ بھگ آٹھ گھنٹے ہو گئے ہیں۔" جاسم نے سرسری انداز میں کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "اس سے نکلنے والی تپش کافی کم ہو گئی ہے اسی لیے تمہیں اپنا بستر چھوڑ کر حرارت کی تلاش میں میرے پہلو کا سہارا لینا پڑا تھا۔" اس نے لمحاتی توقف کر کے معنی خیز نظر سے ساکورا کی آنکھوں میں دیکھا پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"میں آتش دان کی بھوک مٹانے کے لیے اس کے اندر ایندھن کے نام پر کچھ لکڑیاں ڈال دوں، پھر بات کرتے ہیں..... اوکے!"

ساکورا نے سر کی اثباتی جنبش کے ساتھ "اوکے" کے بعد اپنے بالائی ہونٹ کو دانتوں میں دبا لیا اور پُرتجسس انداز میں جاسم کو تکنے لگی۔

وہ دونوں اس وقت جس بیڈ روم میں تھے، وہ ڈاک بنگلے کے وسطی حصے میں واقع تھا اور وہاں پر دو ڈبل بیڈ لگے ہوئے تھے۔ موسم کی سختی کا مقابلہ کرنے کے لیے جاسم نے آتش دان کو تو روشن کر لیا تھا مگر گیسٹ ہاؤس کی کسی لائٹ کو آن کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ بنگلے کے اندر موجود بجلی کا نظام ابھی تک فعال بھی ہو گا یا نہیں۔ بس، وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ بنگلے کے اندر کسی لائٹ کو آن دیکھ کر کوئی بندہ بشر خصوصاً اس کے دشمن ادھر کا رخ نہ کریں اسی لیے وہ حفظِ ماتقدم کے قضیے کو فالو کر رہا تھا۔

جاسم آتش دان کو چوبی خوراک فراہم کرنے کے بعد ساکورا کے پاس آ گیا اور اس کے سامنے دوسرے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

"بتاؤ، تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتی ہو.....؟"

"میں پچھلے دس سال سے سوالبارد کی ہیومل سٹی "لانگ ائر بین" میں رہ رہی ہوں۔" ساکورا نے تجسس سے لب ریز لہجے میں بولنا شروع کیا۔ "میں یہاں کے ایک ایک اصول، قانون قاعدے، کلچر اور رسم و رواج کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ حکومت کی جانب سے یہاں بسنے والے ہر شخص کے لیے سخت احکامات ہیں کہ گھر سے باہر نکلتے وقت وہ کوئی گن یا رائفل اپنے ساتھ ضرور رکھیں تاکہ اگر کوئی پولر بیئر ان پر حملہ آور ہو تو وہ خاطر خواہ اپنا دفاع کر سکیں۔ یہاں جگہ جگہ ایسے بورڈز بھی نصب کیے گئے ہیں جن پر پولر بیئر کی ایک بڑی سی فوٹو بنی ہوئی ہے اور اس کے نیچے احتیاطی تدابیر درج ہیں۔ عام طور پر پولر بیئرز آبادی کا رخ نہیں کرتے لیکن یہ کوئی اصول نہیں ہے۔ قطبی ریچھ کی مرضی ہے کہ وہ جدھر بھی منہ اٹھا کر چل پڑے۔ یہ اپنی صورت سے جتنا معصوم اور بھولا بھالا، بے ضرر جانور نظر آتا ہے، اس کی اصلیت اس کے برعکس ہے۔ یہ ایک وحشی اور خونی درندہ ہے ٹوبان!" وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھمی پھر جاسم کے چہرے پر نگاہ گاڑ کر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"تم سے میرا پہلا سوال یہ ہے کہ تم تھوڑی دیر پہلے اس پولر بیئر کو دیکھ کر خوف زدہ کیوں نہیں ہوئے تھے اور پولر بیئر نے بھی تمہارے ساتھ دوستوں جیسا سلوک کیوں کیا ہے؟"

"اور کچھ.....!" جاسم نے کہا۔ "تم اپنے سوالات مکمل کر لو، پھر میں ایک ساتھ جواب دیتا ہوں۔"

"جب پچھلی شام ہم نے اس بنگلے میں قدم رکھا تو

تمہارے چہرے یا حرکات و سکنات سے، ایک ذرا سی بھی گھبراہٹ یا پریشانی نہیں جھلکتی تھی حالانکہ یہاں آنے سے پہلے میں نے تمہیں اس آسیب زدہ عمارت کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔'' ساکورا نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔ ''تم نے اندر آ کر اس ڈاک بنگلے کی تمام دیواروں اور کھڑکیوں، دروازوں پر پھونکیں ماریں اور مطمئن ہو گئے۔ تم سے میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ اس بنگلے کی خطرناکی جان لینے کے باوجود بھی تم اس قدر پُرسکون کیوں ہو؟''

''بس یا کوئی اور سوال.....؟''

''بس!'' ساکورا نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''مجھے بتاؤ کہ کیا تم کوئی جادوگر ہو یا کسی پُراسرار علم کے ماہر ہو۔ میں نے تمہارے بارے میں ان لوگوں کو ایسی باتیں کرتے سنا ہے جو میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں مگر اب.....!'' وہ ڈرامائی انداز میں رکی پھر سرسراتی ہوئی آواز میں اضافہ کر دیا۔

''اپنی آنکھوں سے دیکھ کر مجھے یقین آ گیا ہے کہ تم کوئی بہت ہی پہنچے ہوئے انسان ہو۔ لارڈ بُدھا کی تم پر خاص مہربانی ہے!''

ڈاک بنگلے کے داخلی دروازے پر غیر انسانی دستک دینے والے اس سفید قطبی بھالو کے لیے جاسم کے دل میں کب اور کیوں اتنی زیادہ نرمی اور ہمدردی جاگ اٹھی تھی، اس بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ اپنی فیلنگز کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ بس، اس سائل صورت قربہ بھالو پر نظر پڑتے ہی وہ اپنے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سرکس والا خواب بھی اس کے دماغ کے پردے پر کسی دستاویزی فلم کے مانند چل رہا تھا۔ ان لمحات میں جاسم کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ ایک منجھا ہوا اور تجربہ کار رنگ ماسٹر ہے۔ کوئی بھی جانور اس کے سامنے سرکشی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ وہ سب کو طریقے سلیقے سے ہینڈل کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ وہ اپنے ان غیر ارادی محسوسات کے بارے میں خود کچھ نہیں جانتا تھا، ساکورا کو بھلا کیا بتاتا لیکن جواب دینے کا وعدہ کر چکا تھا اس لیے ساکورا کی تسلی کی خاطر کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا۔

''میں کوئی جادوگر یا عامل کامل بابا نہیں ہوں اور شعبدہ بازی سے بھی میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ اگر میرے دشمن یا کوئی دوسرا، تیسرا میرے حوالے سے ایسا سوچتا یا سمجھتا ہے تو میں بھلا کیا کہہ اور کیا کر سکتا ہوں۔'' جاسم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''جس طرح تم لارڈ بُدھا یعنی سدھارتھ گوتم کے لیے اپنے دل و دماغ میں ایک خاص ادب و احترام رکھتے ہو بالکل ویسی ہی

مسلمانوں کی محبت اور عقیدت کا مرکز و محور اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے۔ ہم اسے اپنا خالق، مالک، رازق اور معبود سمجھتے ہیں اور اس کی نازل کردہ آسمانی کتاب قرآن کریم کو اپنے لیے مشعلِ راہ مانتے ہیں۔ میں نے اس بنگلے کے مختلف مقامات پر، اپنی حفاظت کی غرض سے جو پھونکیں ماری تھیں، وہ دراصل اسی آسمانی کتاب کی مختلف آیات تھیں۔ میرے عقیدے کے مطابق، کلام پاک کی برکت نے ہمیں اب تک محفوظ رکھا ہوا ہے اور آئندہ بھی وہی ہماری حفاظت فرمائے گا۔ باقی جہاں تک اس قطبی ریچھ کے رویے کی بات ہے تو.....!'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک طویل اور آسودہ سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس جانور کے حوالے سے میری نیت صاف تھی اس لیے اس نے بھی کسی درندگی یا وحشیانہ پن کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس کا وہ دوستانہ رویہ اس حصار کا اثر بھی ہو سکتا ہے جو میں نے اس بنگلے اور اس کے اندر رہنے والے انسانوں کے تحفظ کے خیال سے کھینچ رکھا ہے۔''

اپنا وضاحتی بیان مکمل کرنے کے بعد جاسم نے ایسی نظر سے ساکورا کو دیکھا جیسے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ ساکورا نے اس کی بات پر کس حد تک یقین کیا ہے۔

اس دوران میں ساکورا بھی ٹٹولتی ہوئی نگاہ سے یک ٹک اسی کو تک رہی تھی۔ اس نے معتدل انداز میں کہا۔

''ٹوبان! تم نے جو کہا، میں نے اس پر یقین کر لیا۔''

''آری گتو.....!'' اب کی باری جاسم نے جاپانی میں اس کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا۔ ''کیا میں جان سکتا ہوں کہ اس معاملے میں تم میری مدد کیوں کر رہی ہو؟ میری خاطر تم نے اسرائیلی سیکرٹ سروس موساد کو اپنا دشمن بنا لیا ہے۔''

''وہ لوگ کبھی بھی میرے دوست نہیں تھے۔ وہ تو میں جیف کی جھوٹی محبت کا دھوکا کھا کر ان بُرے انسانوں میں پھنس گئی تھی۔'' ساکورا نے زہر خند لہجے میں جواب دیا۔ ''ان کی اصلیت کھل جانے کے بعد میں کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھی کہ وہاں سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر منتقل ہو جاؤں اور تمہاری شکل میں لارڈ بدھا نے مجھے یہ موقع فراہم کر دیا اسی لیے میں نے تمہاری مدد کی اور اب میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''ساکورا! میں تم سے غلط بیانی نہیں کروں گا۔'' جاسم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں فوری طور پر نیویارک پہنچنا چاہتا ہوں۔ موساد کی ایک دوسری ٹیم نے میری ایک دوست

دلانے کا خواہاں ہوں۔"

"تم نے کیا کہا..... نیویارک؟" ساکورا نے پوچھا۔

جاسم نے اثبات میں جواب دیا۔ "ہاں..... نیویارک!"

گزشتہ روز جب جاسم کو موساد کے ایجنٹس نے ڈین کے اندر، چھت سے الٹا لٹکا رکھا تھا تو بند آنکھوں کے پیچھے اس نے خیال خوانی کی پُراسرار توسط سے، حرفہ یمانی سے ایک اہم "ملاقات" کی تھی۔ اس باکمال عورت نے دیگر معلومات اور ہدایات دینے کے ساتھ ہی جاسم کو یہ بھی بتایا تھا کہ جوئش کوارٹر میں حُسنیہ کا معاملہ اتنا زیادہ بگڑ چکا ہے کہ نیویارک ائرپورٹ پر لینڈ کرتے ہی اسے دھر لیا جائے گا۔ اسی لمحے سے جاسم حُسنیہ عرف بلوما کے لیے از حد فکرمند تھا۔

"ٹوبان! نیویارک یہاں سے پونے چھ ہزار کلومیٹرز کی دوری پر واقع ہے اور تمہارے پاس سفری ضروری کاغذات کے نام پر کچھ بھی نہیں ہے۔" ساکورا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم کیسے اپنی اس دوست کے پاس پہنچ پاؤ گے؟"

"میری اس دوست کا نام حُسنیہ ہے اور یہودیوں کے خلاف جاری اس مشن میں وہ میرے ساتھ ہے۔" حُسنیہ کا نام لیتے ہوئے ساکورا نے تھوڑا توقف کیا تھا لہٰذا جاسم نے اس کا تعارف کرانا ضروری جانا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تمہارے پاس سفری دستاویزات ہیں..... میرا مطلب ہے، پاسپورٹ، ویزا اور دوسرے پیپرز..... وغیرہ؟"

"ہاں بالکل!" ساکورا نے اثبات میں جواب دیا۔ "میں جاپان میں پیدا ہوئی تھی لہٰذا میرے پاس اس دنیا کا طاقتور ترین جینیز پاسپورٹ ہے۔ میں اس پاسپورٹ پر ایک سو نوے ممالک میں بغیر ویزا کے جا سکتی ہوں لیکن مجھے رش اور شور شرابا بالکل پسند نہیں ہے۔ طبعاً میں تنہائی پسند اور محدود تعلقات کے ساتھ زندگی گزارنے کی خواہاں ہوں اسی لیے دنیا کے ایک الگ تھلگ مقام پر رہ رہی ہوں۔ لانگ ائرمین میں بہت سکھ اور ذہنی سکون ہے۔"

جاسم نے پوری توجہ کے ساتھ اس کی بات سنی اور کہا۔ "اگر میں بیرونی دنیا سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو پھر پیسا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔ میں پلک جھپکتے میں اتنی رقم منگوا لوں گا کہ سفری کاغذات کی تیاری میں بہت آسانی ہو جائے گی۔"

"ایسا سوچنا بھی نہیں ٹوبان!" ساکورا نے واشگاف الفاظ میں کہا۔ "سوالبار کا کوئی پاسپورٹ ہے اور نہ ہی یہاں ویزا آنس کی سہولت موجود ہے۔ یہاں رہنے والے انسانوں کو ان ڈاکیومنٹس کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ہاں البتہ، یہاں آنے کے لیے ناروے کا ویزا حاصل کرنا بنیادی شرط ہے۔ میرا مطلب ہے.....!"

"ہاں ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔" جاسم نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے یہ بتاؤ کہ سوالبار سے باہر نکلنے کے کتنے راستے ہیں، باقی سب میں دیکھ لوں گا۔"

ساکورا سے یہ سوال کرتے ہوئے جاسم کو بڑا عجیب سا محسوس ہو رہا تھا کیونکہ تیس گھنٹے پہلے تک کہیں آنے جانے کے لیے اسے ویزا، پاسپورٹ اور ہوائی جہاز وغیرہ کی حاجت نہیں تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے ہزاروں کلومیٹرز کا فاصلہ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفے میں طے کر لیتا تھا مگر اب اس کے پاس ٹیلی پورٹیشن کی حیرت انگیز آسانی نہیں تھی۔ ڈینئل کارمی کی خواہش پر براخا کے بڑے بھائی ایمشل تھیوڈور نے قبالہ کا استعمال کر کے اسے آرکٹک ریجن میں پہنچا دیا تھا۔ حرفہ یمانی کے مطابق، ایمشل تھیوڈور، براخا کی بہ نسبت زیادہ خطرناک تھا اور قبالہ کے معاملے میں وہ اتھارٹی سمجھا جاتا تھا لیکن جاسم نے بھی ٹھان لی تھی کہ وہ ایمشل تھیوڈور کی ساری خطرناکی کو اس کے بدن کے ایک ایک سوراخ سے اس طرح خارج کرے گا کہ بادیُ النظر میں وہ دھواں چھوڑنے والا اسٹیم انجن دکھائی دے گا۔

"صرف ایک راستہ.....!" ساکورا کا سرسراتا ہوا جواب جاسم کی سماعت سے ٹکرایا۔ "یعنی بائی ائر اور وہ بھی انتہائی محدود ہفتے میں صرف دو فلائٹس ہی لانگ ائرمین کے ائرپورٹ پر لینڈ کرتی ہیں اور اگلے روز وہی جہاز یہاں سے اُڑان بھرتے ہیں۔ سوالبار کی ذاتی ائر لائن بھی نہیں ہے۔ کل انتیس اکتوبر کی دوپہر ناروے سے آنے والی ایک فلائٹ یہاں لینڈ کرنے والی ہے جو تیس اکتوبر کی صبح واپس چلی جائے گی۔"

"ساکورا! جیسا کہ تم بھی جانتی ہو، آرکٹک ریجن ایک سمندر ہے۔" جاسم نے کہا۔ "اس کی شپنگ سروس بھی تو ہو گی۔"

"ہاں، آرکٹک ایک سمندر ہی ہے مگر اس کا بیش تر حصہ برف سے ڈھکا ہوا ہے جہاں جہاز رانی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" ساکورا نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "باقی اس بحرِ اعظم کے پانی والے حصے میں بار بردار شپ چلتے تو ہیں مگر ان کا روٹ لانگ ائرمین سے سوالبار کے دیگر دور دراز علاقوں تک کا ہے جہاں نہایت ہی

قلیل آبادی ہے۔ سوالبار میں خورونوش کی تمام اشیا ناروے سے، لانگ ائر بین، بائی ائر پہنچائی جاتی ہیں اور پھر یہاں سے شپ کے ذریعے دوسرے علاقوں تک بھیج دی جاتی ہیں اور آج کل تو یہ شپ سروس بھی رکی ہوئی ہے۔ جب موسم تبدیل ہوگا تو تم زیادہ سے زیادہ یہاں سے نکل کر سوالبار کے دوسرے حصوں میں بہ ذریعہ بحری جہاز جا سکو گے مگر سوالبار سے باہر ہرگز نہیں۔''

''یہ تو خاصی گمبھیر صورتِ حال ہے۔'' جاسم نے تشویش بھری نظر سے ساکورا کی طرف دیکھا۔

''ہاں.....!'' ساکورا نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ ''اس سے بھی زیادہ خطرناک بات ایک اور بھی ہے ثوبان.....!''

''وہ کیا؟'' جاسم نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''تم نے پچھلے چوبیس گھنٹے میں رابرٹ کی ٹیم کے پانچ ارکان کو موت کے منہ میں دھکیلا ہے۔'' ساکورا نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ ان لوگوں کے لیے کسی بڑے چیلنج سے کم نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ رابرٹ اور اس کے باقی چار ساتھی اس وقت بھوکے شکاری کتوں کے مانند ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔ لانگ ائر بین محدود آبادی والا ایک چھوٹا سا شہر ہے اور میری معلومات کے مطابق، یہاں کے مختلف اداروں کے اعلیٰ آفیسرز سے رابرٹ کے دوستانہ تعلقات ہیں۔ وہ شیطان ہمیں پانے کے لیے اپنے تمام وسائل اور ذرائع کا پورا پورا استعمال کرے گا۔''

''تو سمجھو کہ مسئلہ حل ہوگیا۔'' جاسم نے بہ آواز بلند کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے اسے تکنے لگی۔

''تم یہ تو مانتی ہو نا کہ ہمارے سوالبار چھوڑنے کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ موساد کے یہ پانچ ایجنٹس ہی ہیں.....؟''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''اس میں کوئی شک نہیں۔''

''اس رکاوٹ کو دور کرنے کا طریقہ میں جانتا ہوں ساکورا!'' جاسم نے معتدل انداز میں کہا۔ ''تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''جب تم میرے ساتھ ہو تو پھر فکر کیسی.....؟'' ساکورا نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''مجھے بتاؤ، تمہارے ذہن میں کیا چل رہا ہے؟''

آئندہ دس منٹ میں جاسم نے اسے اپنے ہنگامی خیالات سے آگاہ کر دیا۔ وہ چھوئی موئی نازک سی لڑکی جاسم کی معیت میں یکایک ایک بہادر اور بلند حوصلہ ساتھی کی جون میں ڈھل گئی تھی

''تمہیں جو کرنا ہے، کر گزرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' ساکورا نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''بکتا گا آنا تا اور سکی مس یو نے.....!''

ساکورا کے آخری جملے کا مطلب تھا..... لارڈ بدھا تمہاری حفاظت کرے۔ گویا اس نے جاسم کو بدھا کے حوالے کر دیا تھا۔

انسان کی برسوں کی زندگی میں کوئی ایک لمحہ ایسا ہوتا ہے جو اس کے جیون کے دھارے کو بدل کر رکھ دیتا ہے، ساکورا کی زیست کا وہ لمحہ ابھی ابھی گزرا تھا۔

☆☆☆

صبح کے پانچ بجنے والے تھے۔ انہیں سفر کرتے ہوئے لگ بھگ ایک گھنٹا ہوگیا تھا اور ان کا رخ ڈاک بنگلے سے وادی کی سمت تھا۔ سیڈ بینک والے ڈین سے ڈاک بنگلا ایک کلومیٹر شمال میں واقع تھا اور مذکورہ وادی محض پون کلومیٹر کی دوری پر۔ اگر ان تینوں مقامات کو ڈرائنگ کی شکل میں کسی کاغذ پر اتارا جائے تو ایک قائمۃ الزاویہ مثلث تشکیل پاتا تھا اور جیومیٹری کا معروف ''ہیرن'' فارمولا بتاتا تھا کہ اس مثلث کے وتر کی لمبائی سوا کلومیٹر ہوگی۔ یعنی وہ ڈاک بنگلا، آبادی والی وادی سے سوا کلومیٹر شمال مشرق میں واقع تھا۔

ہموار زمین پر اگر نارمل رفتار سے سفر کیا جائے تو ایک گھنٹے میں اوسطاً پانچ کلومیٹرز کا فاصلہ بہ آسانی طے کیا جا سکتا ہے مگر وہ لوگ آرکٹک ریجن کی برف برف ''زمین'' پر محوِ سفر تھے لہٰذا نارمل انسانی رفتار کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ بھاری بھرکم جوتوں اور لباس کے ساتھ ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑ رہا تھا۔ جاسم کی خواہش تو یہی تھی کہ ساکورا ڈاک بنگلے کے اندر رک کر اس کی واپسی کا انتظار کرے مگر اس کی پُرعزم ضد کے سامنے وہ مجبور ہوگیا تھا۔

''ثوبان! تم یہ نہ سمجھنا کہ میں کسی آسیب کے خوف سے اس گیسٹ ہاؤس میں اکیلے ٹھہرنے سے انکار کر رہی ہوں.....!'' ساکورا نے واشگاف الفاظ میں کہا تھا۔ ''میں آنکھیں بند کر کے تم پر بھروسا کر سکتی ہوں۔ تم نے کہا کہ اس بنگلے کے اندر رہنے والوں کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے تو میں نے تمہاری بات کا یقین کر لیا۔''

''تو پھر کیا پرابلم ہے؟'' جاسم نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی پوچھ لیا تھا۔ ''مجھ پر اعتماد بھی کرتی ہو اور

میری بات ماننے کو بھی تیار نہیں ہو۔ میں سمجھتا ہوں، یہ بنگلا تمہارے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ ہے جبکہ میرے ساتھ جانے میں قدم قدم پر خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا اور میں تمہیں کسی نئی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا۔''

''اپنی ذات کے حوالے سے تمہارے جذبات کا میں دل سے احترام کرتی ہوں ثوبان ...!'' ساکورا نے گہری سنجیدگی سے کہا تھا۔ ''لیکن تمہارے ساتھ جانے کے اصرار کی بھی کئی ایک وجوہات ہیں۔''

''مثلاً کون سی وجوہات؟'' جاسم پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''میں دس سال سے لانگ ائر بین میں رہ رہی ہوں اور یہاں کے چپے چپے سے واقف ہوں جبکہ تم اس حوالے سے بالکل ناواقف ہو۔'' ساکورا نے دلیل کے ساتھ وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہاں قدم قدم پر تمہیں مناسب رہنمائی نہ ملی تو تمہارے بھٹکنے کے امکانات بہت زیادہ بڑھ جائیں گے۔ سو، تمہیں میری مدد کی ضرورت پڑے گی۔'' وہ لمحے بھر کے لیے رکی پھر مضبوط لہجے میں کہا۔

''اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ حالات چاہے کچھ بھی ہوں، میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔''

''مگر میرے پاؤں میں تو عجیب طرح کا چکر ہے جس کے بارے میں رات میں نے تمہیں مختصراً بتایا بھی تھا۔'' جاسم نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں کبھی یہاں اور کبھی وہاں ہوتا ہوں۔ تم میرے ساتھ کہاں کہاں خوار ہوتی پھرو گی؟''

وہ چند لمحات تک گہری نظر سے اسے تکتی رہی جیسے کچھ کہنے کے لیے مناسب الفاظ کی تلاش میں ہو۔ پھر اس نے ٹھوس انداز میں کہا۔

''ثوبان! تم جہاں جاؤ گے، میں بھی وہیں جاؤں گی۔''

''مگر تمہیں تو شور شرابے اور زندگی کے ہنگاموں سے دور رہنے کی چاہ ہے۔'' جاسم نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر کہا۔ ''اسی لیے دنیا کے الگ تھلگ مقام پر رہ رہی ہو۔ تمہارے بقول یہاں پر بہت زیادہ سکھ اور سکون ہے...؟''

''میں تمہاری خاطر ہر سکھ اور آرام و چین کو تج دینے کے لیے تیار ہوں ثوبان!'' وہ اٹل لہجے میں بولی۔ ''ہم جاپانی لوگ بہت ہی کھرے اور سچے ہوتے ہیں۔ ہم منافقت اور ریاکاری سے پاک، اپنے دل کی بات بے دھڑک کہہ دیتے ہیں۔'' لمحاتی توقف کے بعد اس نے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''ثوبان! تابن... ہائی، ماچی گائی ناکو... آئشیتی مس!''

''تابن... ہائی، ماچی گائی ناکو... آئشیتی مس...؟'' جاسم نے ساکورا کے الفاظ دہرانے کے بعد سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے فوراً انگریزی میں ترجمہ کر دیا جس کا اردو مفہوم کچھ اس طرح تھا۔

''ثوبان! شاید... نہیں، یقیناً... میں تم سے محبت کرتی ہوں!''

کوئی آپ سے اظہارِ محبت کرے تو جواب میں آپ اس پر کوئی روک نہیں لگا سکتے لہٰذا ساکورا کے اُجلے جذبات کی نفی یا مخالفت کرنے کے لیے جاسم کچھ بھی کہنے کا حق نہیں رکھتا تھا۔ سو، اس نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے بس اتنا کہا۔

''سو نائس... اِٹس اوکے... تم ایک دلیر اور آئینہ دل لڑکی ہو۔ محبت کرنا بزدل اور کم ظرف لوگوں کے بس کا کام نہیں ہے... یو آر موسٹ ویلکم ساکورا!''

ان لمحات میں ساکورا کی خوشی دیدنی تھی اور جاسم دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ ''مجھ سے الفت کا ناتا جوڑنے والیوں کو ہر روز ایک نئے امتحان سے گزرنا پڑتا ہے۔ ساکورا! اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے!'' پھر اس نے زبان سے بھی کہہ دیا۔

''ساکورا! پروردگار آناتا او سکی مس یو نے!''

''پروردگار...؟'' ساکورا نے سوالیہ نظر سے جاسم کی طرف دیکھا۔

اس ایک لفظ کے علاوہ وہ باقی کا جملہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ جاسم نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔

''پروردگار کا مطلب ہے، اللہ تعالیٰ 'پالنے والا' یعنی... گاڈ!''

''اوہ... آری گاتو ثوبان...!'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔

''جب کوئی مہم جُو اپنے کسی خاص الخاص مشن پر ہوتا ہے تو پڑاؤ اٹھانے سے پہلے وہ یہ ضرور چیک کر لیتا ہے کہ وہاں اس کی کوئی ایسی چیز نہ رہ جائے جو دشمن کو اس کا سراغ لگانے میں مدد دے۔ ان دونوں کے پاس سامان کے نام پر ساکورا والا ایک نیلا رک سیک ہی تھا جس میں اس نے اپنے استعمال کی چیزیں بھر رکھی تھیں۔ ہاں البتہ، ڈین سے نکلتے وقت جاسم نے بھی اس کے بیگ میں کچھ رکھوا دیا تھا اور وہ شے تھی ایڈ اور جیف کی گنز... دونوں گنز ایک ہی میک ایک ہی کیلیبر کی تھیں یعنی نائن ایم ایم گلاک۔ ''گلاک'' پسٹل موساد، ایف بی آئی اور سی آئی اے کا پسندیدہ ہتھیار ہے۔ ان دونوں ونڈ گنز کے کلپس آدھے سے زیادہ

بھرے ہوئے تھے۔

''کیا تم گن چلانا جانتی ہو؟'' جاسم نے روانہ ہونے سے پہلے ساکورا سے پوچھا۔

ساکورا نے اس کے ہاتھ سے گلاک لینے کے بعد اس کے کلپ کو ماہرانہ انداز میں آؤٹ اینڈ اِن کیا۔ اس کے بعد گن کو لوڈ کرنے اور نشانہ لگانے کا پروسیجر دہرا کر دکھا دیا۔

''اوہ.....!'' جاسم نے تعریفی انداز میں کہا۔ ''تم تو پکی شوٹر لگتی ہو۔''

''میں پکی شوٹر تو نہیں البتہ، ضرورت پڑنے پر گن چلانا جانتی ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''لانگ ائر بین میں، شوٹنگ کلب میں، میں نے چاند ماری کی اچھی خاصی پریکٹس کر رکھی ہے۔''

''سن کر اچھا لگا.....!''

''سوالبار میں رہنے والوں کو گن چلانا آنا چاہیے تاکہ..... کسی ہنگامی صورتِ حال میں وہ پولر بیئر سے نمٹ سکیں۔ یہ میرا نہیں، یہاں کی گورنمنٹ کا ماننا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اسی لیے یہاں کے شوٹنگ کلب میں اس کی مفت تربیت دی جاتی ہے اور از روئے قانون یہاں کے ہر شخص کو اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ بغیر ہتھیار کے اپنے گھر سے باہر نہیں نکلے گا۔ جو لوگ گن چلانے سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے یا اس کام کی ان کے اندر ہمت نہیں ہے، انہیں اپنے ساتھ مسلح سیکیورٹی گارڈ رکھنے کا حکم ہے۔ یہ سارا بندوبست لانگ ائر بین کے شہریوں کی حفاظت کے لیے ہے۔'' اس نے سانس ہموار کرنے کی غرض سے لمحاتی توقف کیا پھر ان الفاظ میں زیرِ لب مسکرا کر اپنی بات مکمل کر دی۔

''اب تو تمہیں بہ خوبی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ پولر بیئر کس قدر معصوم اور بھولا بھالا جانور ہے جس کے جان لیوا شر سے بچنے کے لیے یہاں کی حکومت نے باقاعدہ ایک قانون بنا رکھا ہے اور اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والے شخص کا چالان ہو جاتا ہے اور اس غفلت کی سزا کے طور پر اس قانون شکن کو جرمانہ بھی بھرنا پڑتا ہے۔''

جاسم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ساکورا کس میٹر ہینڈ پر بول رہی تھی۔ اس حوالے سے کوئی جواب دینے کے بجائے اس نے سیدھا سوال کر دیا۔

''پھر تو تمہارے پاس ایک اپنی گن بھی ہو گی؟''

''تھی.....!'' وہ بُرا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''لیکن میں جیف کے دھوکے کا شکار ہو کر ڈین میں آئی تو ان بدمعاشوں نے یہ کہہ کر وہ گن مجھ سے لے لی تھی کہ میری حفاظت کے لیے وہ ہیں نا..... بعد ازاں مجھے احساس ہو گیا کہ میری نہیں بلکہ اپنی حفاظت کے پیشِ نظر انہوں نے وہ گن میرے پاس نہیں رہنے دی تھی۔''

''ویسے تو تمہاری حفاظت کے لیے میں ہوں.....!'' جاسم نے ایک گلاک بمثل ساکورا کی جانب بڑھاتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''اسے تم رکھ لو۔ یہ تمہارا حق اور حالات کی ضرورت ہے۔''

ساکورا نے اس کے ہاتھ سے وہ گن لیتے ہوئے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ ''آری گاتو ثوبان.....!''

گیسٹ ہاؤس کے اندر ان دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی، اس کی بازگشت جاسم کے ساتھ محوِ سفر تھی۔ اچانک وہ چونک اٹھا۔ ساکورا نے اضطراری انداز میں ایک اہم اطلاع دی تھی۔

''ہم آخر پہنچ ہی گئے ثوبان!'' اس نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''پل کے اس پار وہ جو عالی شان عمارت تمہیں نظر آ رہی ہے نا، یہ دنیا کا انتہائی شمال میں واقع آخری شاپنگ مال ہے۔''

جاسم نے مذکورہ سمت میں دیکھا تو اسے ایک جدید طرزِ تعمیر کی مثال پُرشکوہ بڑی سی عمارت نظر آئی جس کے مخصوص نیون سائنز اور دیگر بیرونی لائٹس تو آن تھیں مگر تکنیکی اعتبار سے وہ شاپنگ مال بند ہو چکا تھا۔

''اس مال کا نام ''لومپن'' سینٹرٹ ہے۔'' ساکورا نے پُرجوش انداز میں بتایا۔ ''اس کے منیجر کا نام ناکاشی ہے۔ ناکاشی میرا بہت اچھا دوست ہے۔''

''اوہ..... یہ کہیں ''ناکاشی کاسل'' والا ناکاشی تو نہیں؟'' جاسم نے ازراہِ تفنن پوچھ لیا۔

''نہیں ثوبان.....!'' وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''ناکاشی کاسل تو بچوں کا ایک جاپانی ٹی وی سیریل ہے۔ میرے اس دوست کا اس ٹی وی پروگرام سے کوئی تعلق نہیں۔ ابھی تو مال کلوز ہے۔ جب ہم کامیابی سے اس مہم کو سر کر لیں گے تو میں تمہیں ناکاشی سے ملواؤں گی۔ وہ تمہارے معاملے میں کافی مددگار ثابت ہو سکتا ہے!''

''ناکاشی کاسل'' نامی بچوں کے اس جاپانی ٹی وی سیریل کو جب ڈبنگ کے مراحل سے گزارا گیا تو جاوید جعفری کی پُرتاثر آواز نے اسے چار نہیں، آٹھ چاند لگا دیے تھے۔

''اس شاپنگ مال کے پہلو میں، وہ نشیبی وادی ہے

جہاں پر رہائشی کاٹیجز بنے ہوئے ہیں جن میں "آر۔تھرٹی" نمبر کاٹیج ہمارا پرائم ٹارگٹ ہے" ساکورا نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ "اس پل کو عبور کرنے کے بعد ہم محض پانچ منٹ میں، اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔ آؤ میرے ساتھ.....!"

بے چون و چرا جاسم اس کے ساتھ ہولیا۔

وہ چوبی پل اپنی چوبی ریلنگ کے ساتھ گئے وقتوں کی یاد دلاتا تھا۔ اس کی خستہ حالی سے پتا چلتا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ اس کی ضرورت اور اہمیت رفتہ رفتہ کم ہوتی جارہی تھی۔ پولر سمر (مئی تا ستمبر) سوالبار کے نام نہاد موسم گرما میں اس پل کے نیچے سے ایک برفیلی ندی ضرور گزرتی ہے مگر اس وقت اس ندی کا پانی جم کر برف ہو چکا تھا۔

"تمہیں اپنا اسکرپٹ تو یاد ہے نا.....؟" جاسم نے پوچھا۔

"ہاں ٹوبان!" ساکورا نے اثبات میں جواب دیا۔ "میں نے بچپن میں، اسکول کے اسٹیج ڈراموں میں پرفارم کیا ہے۔ تم فکر نہیں کرو۔ میں تمہیں مایوس نہیں کروں گی۔ پھر تم تو میرے ساتھ ہو ہی..... ڈرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے..... تم میرے ساتھ ہوتا.....؟"

ساکورا نے آخری جملے میں معنی خیز استفسار کیا تھا جس کا جواب جاسم، نفی میں نہیں دے سکتا تھا چنانچہ اس نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں، ہاں..... کیوں نہیں..... میں بالکل تمہارے ساتھ ہوں۔"

وہ پاکٹ سائز جاپانی شیشہ بدن لڑکی بہت کم وقت میں جس تیزی سے جاسم کے نزدیک آرہی تھی، وہ بڑا الارمنگ تھا..... اور جاسم کو اس شنابی قربت کا پورا پورا احساس بھی تھا۔

☆☆☆

"آر۔تھرٹی" دو بیڈ رومز اور ایک، سٹنگ روم والا سرخ رنگ کا، ایک چھوٹا سا کاٹیج تھا جس کا ہیٹنگ سسٹم اچھے سے کام کررہا تھا۔ یہ کاٹیج موساد کی سوالبار والی ٹیم کے انچارج رابرٹ عرف روب کے استعمال میں تھا۔ ٹیم کے دیگر ارکان حسبِ ضرورت یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ سیڈ بینک والے ڈین میں موجود رہ کر اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ اس وقت رابرٹ کے ساتھ اس کا معاونِ خاص بھی وہاں موجود تھا۔ وہ دونوں جاگ رہے تھے حالانکہ گھڑی کے مطابق، صبح ہونے میں محض دو گھنٹے باقی تھے۔

بیوی کا مسئلہ

"جان مجھے دس ہزار روپے تو دو۔" بیوی نے شوہر کو مسکہ لگاتے ہوئے کہا۔

"کیا کرو گی اتنے سارے پیسے؟"

"مجھے شاپنگ کے لیے جانا ہے۔"

"تمہیں روپے کی نہیں عقل کی ضرورت ہے۔"

"مگر میں تو تم سے وہی چیز مانگ رہی ہوں جو تمہارے پاس ہے۔"

دولت اور غیرت

نپولین سے ایک بار کسی جرمن نے کہا۔ "آپ دولت کے لیے لڑتے ہیں اور ہم صرف عزت کے لیے لڑتے ہیں۔"

نپولین نے جواب دیا۔ "ہر شخص اس کے لیے لڑتا ہے جو اس کے پاس نہ ہو۔"

کراچی سے میمونہ نظامی کی حیرت

ایک منصوبہ انسان کا ہوتا ہے اور ایک منصوبہ اُس کے خالق کا۔ بے شک! پاک پروردگار کا منصوبہ ہی کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے، یہ الگ بات کہ اللہ تعالیٰ اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے انسان ہی سے کام لیتا ہے۔ رابرٹ اور اس کے معتمدِ خاص سیموئل نے ڈین کو خوفناک دھماکے سے اُڑانے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ انہیں کیا معلوم کہ قدرت نے ان کے پرزے اُڑانے کی منصوبہ بندی کر رکھی ہے۔

لگ بھگ ساڑھے پانچ بجے صبح رابرٹ کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ ایلکس کی کال تھی۔ رابرٹ نے فون کو اسپیکر پر ڈالنے کے بعد کال اٹینڈ کرتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔

"ہاں، بولو!"

"باس! ہم تھوڑی دیر کے بعد نکل رہے ہیں۔" ایلکس نے بتایا۔ "آپ نے کہا تھا، روانہ ہونے سے پہلے بتادوں اسی لیے فون کیا ہے۔"

"ابھی تو صبح ہونے میں کافی دیر ہے۔" رابرٹ نے کہا۔ "کیا تم لوگ سوئے نہیں ہو؟"

"باس! ہمیں نیند بالکل نہیں آرہی۔" ایلکس نے عجیب سے لہجے میں جواب دیا۔ "اپنے پانچ ساتھیوں کی

لاشوں کو دیکھ کر ہمارا خون کھول رہا ہے۔ جب تک ہم اس حرام زادے فلسطینی کے جسم کو گولیوں سے چھلنی نہیں کر دیتے، ہمیں سکون آئے گا اور نہ ہی آرام نصیب ہوگا۔''

''ثوبان کے لیے ہماری نفرت کا لیول بھی تم لوگوں کے جیسا ہی ہے۔'' رابرٹ نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''آج وہ ہمارے ہاتھ سے بچ نہیں پائے گا۔ ٹھیک ہے، تم لوگ نکلو اور ڈاک بنگلے کا رخ کرنے سے پہلے ہمیں میچ کر لینا۔ میں تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں۔''

''او کے باس..... جو آپ کا حکم!'' الیکس نے فرمانبرداری سے کہا۔

رابرٹ نے سیلولر رابطہ موقوف کرنے کے بعد سیم کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''سن لیا تم نے.....؟''

''ہاں..... مگر تم نے انہیں یہاں کیوں بلایا ہے؟''

''الیکس سے بات کرتے ہوئے میرے ذہن میں ایک نیا آئیڈیا آیا ہے.....!'' رابرٹ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''میں کچھ دھماکا خیز مواد ان لوگوں کو بھی دینا چاہتا ہوں۔ وہ ڈاک بنگلے پر ریڈ کرنے سے پہلے یہ ایکسپلوسیو اس کے بیرونی حصے میں نصب کر دیں گے تاکہ اگر وہ شیطان آسانی سے ان کے قابو میں نہ آسکے تو وہ پورے بنگلے ہی کو اُڑا دیں۔''

''آئیڈیا تو زبردست ہے روب.....!'' سیم نے ستائشی نظر سے اپنے باس کی طرف دیکھا۔ ''اس کمینے کو بچنے کا کوئی موقع نہیں دینا چاہیے۔ وہ اب تک ہمیں جس قدر نقصان پہنچا چکا ہے، اس کی بھرپائی ثوبان کے اذیت ناک خاتمے کے بغیر ہو نہیں سکتی لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ دونوں بھگوڑے اس ڈاک بنگلے کے اندر ہی چھپے بیٹھے ہیں۔ تم تو اتنے وثوق سے ان کی موت کی پلاننگ کر رہے ہو جیسے تمہیں یقین ہو کہ ثوبان اور ساکورا نے اسی ڈاک بنگلے میں پناہ لے رکھی ہے۔''

''میری گٹ فیلنگز، مجھے یہی بتا رہی ہیں سیم.....!''

''تب تو ٹھیک ہے۔'' سیم نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔ ''روب! میں تمہاری گٹ فیلنگز پر بھروسا کرتا ہوں۔ اگر تم ایسا محسوس کرتے ہو تو پھر یہی حقیقت ہوگی۔''

''گٹ فیلنگز اور گٹ ری ایکشن چاہے کسی بھی انسان کے ہوں، وہ دھوکا نہیں دیتے۔'' رابرٹ نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''یہ راز بارہا کے تجربے سے مجھ پر آشکار ہوا ہے۔ بہرکیف!.....'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''تم ایکسپلوسیو سے بھرا ہوا ایک باکس گاڑی میں رکھ دو۔ ہم ان لوگوں کے روانہ ہونے کے بعد ڈین کا رخ کریں گے اور ہاں..... گاڑی کی چارجنگ وغیرہ بھی چیک کر لینا۔ کسی قسم کی گڑبڑ ہم افورڈ نہیں کر سکتے۔''

آرکٹک ریجن کے تمام ممالک اور انہی کے جیسے دیگر انتہائی سرد ممالک میں گاڑی کے انجن کو بیدار اور چالو حالت میں رکھنے کے لیے مخصوص قسم کے چارجنگ پوائنٹس سے منسلک کر دیا جاتا ہے۔ بصورت دیگر انجن، بیٹری اور فیول ٹینک موسم کی سختی کے باعث کسی کام کے نہیں رہتے۔

''میں نے تین گھنٹے پہلے گاڑی کے انجن کو چارجنگ پر لگا دیا تھا۔'' سیم اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''دھماکا خیز مواد والا باکس میں ابھی گاڑی میں پہنچا دیتا ہوں۔ تم بھی ریڈی ہو جاؤ۔ ڈین والے ہمارے ساتھی چند منٹ میں یہاں پہنچ جائیں گے۔''

''آئی ایم ایور ریڈی.....!'' رابرٹ نے کہا۔

سیم اثبات میں گردن ہلا کر کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆

جاسم اور ساکورا ایک ہیوی ڈیوٹی گاڑی کی اوٹ میں موجود تھے اور ان کی نگاہیں سرخ رنگ کے کانچ نمبر ''آر۔ تھرٹی'' پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اس کانچ کے داخلی دروازے کے نزدیک ہی ایک وہائٹ لینڈ کروزر بھی کھڑی تھی۔ ایسے کانچز میں اِن ڈور پارکنگ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ وہاں سب کی گاڑیاں کانچز سے باہر ہی پارک کی گئی تھیں۔ وہ رات کا آخری پہر بلکہ صبح کی آمد کا وقت تھا۔ ہر طرف برف ہی برف اور برفیلی یخ بستہ ہوائیں تھیں۔ اس موت کا سناٹا لیے صورتِ حال کو ہُو کا عالم کہنا زیادہ مناسب تھا۔ اسٹریٹ لائٹس آن تھیں اور بعض کانچز کے اندر بھی جزوی روشنی دکھائی دے رہی تھی مگر مجموعی طور پر وہاں کا ماحول ساکت اور فضا منجمد نظر آتی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کسی آرکٹک جادوگرنی نے کوئی طلسماتی عمل کر کے گھاٹی کے اندر آباد اس رہائشی علاقے کو ابدی نیند سلا دیا ہو۔

''تو شروع کرتے ہیں.....'' جاسم نے ساکورا کے کان میں سرگوشی کی۔ ''تم فرنٹ سے کانچ کے اندر گھسو گی اور میں بیک سے آؤں گا۔ تم تیار ہو نا؟''

قبل اس کے کہ جاسم کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ ساکورا کی سماعت تک رسائی حاصل کر پاتے، وہ رازدارانہ انداز میں بولی۔

''کوئی کانچ سے باہر آ رہا ہے۔''

اگلے ہی لمحے وہ "کوئی" جاسم کی نگاہ کے فریم میں بھی آ گیا۔ وہ ایک دراز قامت شخص تھا اور اپنے لباس سے وہ اسکیمو لگتا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں ایک باکس اٹھا رکھا تھا۔ مذکورہ شخص لینڈ کروزر کی جانب بڑھا تو جاسم نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

"یہ کون ہے.....؟"

"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔" ساکورا نے متذبذب لہجے میں جواب دیا۔ "اس کم بخت نے اسکیموز والا مکمل لباس زیب تن کیا ہوا ہے اور پارکا نے اس کا چہرہ بھی چھپا رکھا ہے۔"

"پارکا" جانوروں کی کھال سے تیار کیا جانے والا ایک ہڈی والا فر کوٹ ہے جو سخت ترین سردی میں بھی انسانی جسم کو متحرک رکھتا ہے۔

"وہ جو کوئی بھی ہے، ہمارا دشمن ہے۔" جاسم نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "اچھا ہے، وہ خود ہی باہر نکل آیا ہے۔ اس نے تمہیں کانیج کا دروازہ ٹھلوانے کی زحمت سے بچا لیا ہے۔ تم سمجھ رہی ہو نا.....؟"

"ہاں!" ساکورا نے چٹانی لہجے میں جواب دیا۔ "اور یہ بازی ہم ہی جیتیں گے۔ موت ان شیطانوں کا مقدر ٹھہرے گی۔"

اس دوران میں وہ دراز قد اسکیمو باکس کو وہائٹ لینڈ کروزر میں رکھ چکا تھا۔ جاسم نے ساکورا کے عزم کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے دل میں کہا۔ "انشاء اللہ!" اور گاڑی کے پیچھے سے نکل کر دبے پاؤں "آر۔ تھرٹی" کی عقبی جانب بڑھ گیا۔

اسکیموز کے لباس میں دکھائی دینے والا موساد کا وہ ایجنٹ جیسے ہی کانیج کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہونے لگا، ساکورا دوڑ کر اس کے نزدیک پہنچ گئی پھر پھولی ہوئی وحشت زدہ سانس کے ساتھ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولی۔

"میں ساکورا ہوں، مجھے باس سے ملنا ہے..... ابھی!"

اگرچہ ساکورا نے بھی موسم کی مناسبت سے گرم لباس پہن رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کا چہرہ بھی خاصی حد تک چھپا ہوا تھا۔ لیکن اس کے قد کاٹھ اور آواز سے سیم نے اسے پہچان لیا۔ وہ حیرت اور اُلجھن کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ مستفسر ہوا۔

"تم ڈین سے کہاں غائب ہو گئی تھیں اور وہ نامراد ٹوبان کہاں ہے۔ کیا وہ بھی تمہارے ساتھ ہی ڈین سے نکلا تھا.....؟"

"ٹوبان کسی قسم کا جادو جانتا ہے۔" ساکورا نے دہشت زدہ لہجے میں جواب دیا۔ "اس نے مجھے اپنے ٹرانس میں لے لیا تھا۔ میں اس کے سامنے بے بس اور مجبور ہو گئی تھی اور مجھے پتا ہی نہیں چلا، وہ کب اور کیسے مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔"

سیم نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔ "وہ بدبخت اس وقت کہاں ہے؟"

"ڈاک بنگلے میں.....!" ساکورا نے اپنے اسکرپٹ کے مطابق جواب دیا اور ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "رات میں اس کے ساتھ سوئی تھی، پھر میری آنکھ کھل گئی اور میں ڈاک بنگلے سے فرار ہو کر یہاں آ گئی۔"

"یہاں کیوں.....؟" سیم نے کڑے لہجے میں استفسار کیا۔ "تمہیں تو ڈین کی طرف جانا چاہیے تھا۔"

"میں بہت زیادہ ڈری ہوئی تھی۔" ساکورا نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "ڈین میں ٹوبان نے ہمارے پانچ آدمیوں کو قتل کر دیا تھا۔ اُدھر جانے کی میری ہمت نہیں ہو رہی تھی اس لیے یہاں آئی ہوں۔ مجھے فوراً باس کے پاس لے چلو ورنہ میں سردی سے ٹھٹھر کر مر جاؤں گی۔"

"سیم! تم کس سے باتیں کر رہے ہو۔" کانیج کے اندر سے رابرٹ کی آواز آئی۔ "کیا ہمارے ساتھی یہاں پہنچ گئے ہیں؟"

ساکورا کا دایاں ہاتھ گرم کوٹ کی جیب میں تھا اور اس ہاتھ میں گلاک ایک دم ریڈی پوزیشن میں تھا۔ ساکورا کی انگلی ٹریگر پر تھی اور سیم، شوٹنگ رینج کے حوالے سے انتہائی آئیڈیل مقام پر کھڑا تھا۔ قبل اس کے کہ سیم، رابرٹ کے سوالات کا جواب دیتا..... ساکورا کی انگلی حرکت میں آ گئی۔

ساکورا نے ٹریگر دباتے ہوئے کوئی غلطی نہیں کی۔ اس کی چلائی ہوئی تین گولیوں میں سے دو سیم کے سینے میں اور ایک اس کی کھوپڑی میں جا گھسی تھی۔ ساکورا نے اپنے کوٹ کی جیب کے اندر سے گن چلائی تھی اور سیم کے سر کا نشانہ لیتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ کو اوپر اٹھا لیا تھا۔ ساکورا اور سیم کے لباس نے سائیلنسر کا کام کیا تھا جس کی وجہ سے فائرنگ کی آواز رابرٹ تک نہیں پہنچ پائی تھی۔

سیم برفیلی زمین پر کسی مردہ چھپکلی کے مانند بے حس و حرکت پڑا تھا۔ وہ سوال و جواب کی دنیا سے بہت دور جا چکا تھا۔ ساکورا کو اپنے آپ پر فخر محسوس ہوا۔ پچھلے دس سال میں کسی پولر بیئر کو شوٹ کرنے کا اسے موقع نہیں ملا تھا اور آج

اس نے ایک ایسے موذی انسان کا شکار کیا تھا جو وحشی درندوں سے کہیں بڑھ کر ظالم اور خوں خوار تھا۔

رابرٹ کی متوحش آواز نے ساکورا کو چونکا دیا۔

''ثوبان! تم یہاں کیسے پہنچ گئے.....؟''

ساکورا کے لیے یہ ایک گرین سگنل تھا۔ اس نے سیم کی لاش کو حقارت سے ایک غصیلا ٹھڈا رسید کیا اور گن بہ دست کاریج کے اندر داخل ہوگئی۔

جب ساکورا بیڈ روم میں پہنچی تو وہاں کا منظر خاصا ''دل خوش کن'' تھا۔ جاسم نے رابرٹ کو اپنی گن کے نشانے پر لے رکھا تھا اور رابرٹ کی آنکھوں سے بے یقینی بھری وحشت ٹپک رہی تھی۔ اس کاریج کے اندر اور کوئی بندہ بشر موجود نہیں تھا۔ ابھی چند سیکنڈ پہلے رابرٹ نے اپنے دستِ راست سیم سے الیکس، نک اور کرس کے بارے میں استفسار کیا تھا جو ڈین سے وہاں پہنچنے والے تھے۔ رابرٹ کا وہ سوال ساکورا اور جاسم دونوں نے بڑی وضاحت کے ساتھ سنا تھا۔ گویا اب انہیں صرف رابرٹ اور ڈین سے آنے والے تین افراد سے نمٹنا تھا۔

''ساکورا! موساد کے اس ہڈحرام اور نالائق ایجنٹ کو تم اپنے نشانے پر رکھو۔'' جاسم نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ''اگر یہ ذرا سی بھی کوئی ایسی ویسی حرکت کرے تو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس دھرتی کے بوجھ کو ٹھوک دینا۔''

ساکورا نے توانا آواز میں کہا۔ ''او کے باس۔''

آئندہ چند منٹ میں جاسم نے اس کاریج کی ہنگامی تلاشی لے کر اپنے مطلب کی ضروری چیزیں برآمد کرلیں۔ اس کے بعد جاسم نے رابرٹ کو ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ رابرٹ نے بلا تامل جاسم کے حکم کی تعمیل کردی۔

جاسم نے ایڈ ہیسو ٹیپ کی مدد سے رابرٹ کے بازوؤں، ٹانگوں، گردن اور کمر کو کرسی کے ساتھ اس طرح کس کر باندھ دیا کہ وہ اپنی مرضی سے ایک ذرا سی بھی حرکت نہیں کرسکتا تھا۔ جاسم نے اس پر بس نہیں کی بلکہ رابرٹ کی آنکھوں پر بھی ٹیپ کا پہرا بٹھا دیا۔ اس ''ارینج منٹ'' سے پہلے اس نے رابرٹ کے سیل فون کو بھی اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔

''ساکورا! اگرچہ یہ شیطان کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں رہا پھر بھی یہ اپنی سوچ کے ذریعے ہمیں مغلظات میں تول سکتا ہے۔'' جاسم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس کے چہرے کے تاثرات سے اگر تمہیں ایسا محسوس ہو کہ یہ دل میں ہمیں گالیاں دے رہا ہے تو.....!''

بات کو ادھورا چھوڑ کر جاسم نے معنی خیز انداز میں ساکورا کو آنکھ ماری تو وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولی۔

''سمجھ گئی باس.....!''

''رابرٹ.....!'' جاسم کرسی پر بندھے ہوئے، موساد کے ٹیم لیڈر کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ''تمہارے پاس زیادہ سانسیں بچی ہیں اور نہ ہی میرے پاس وافر مہلت ہے لہٰذا میں سیدھا پوائنٹ پر آتا ہوں۔ میں نے تمہارے کان اور منہ اس لیے کھلے چھوڑ دیے ہیں تاکہ تم اپنی منحوس ساعت سے میرے سوالات کو سن سکو اور اپنی ناپاک زبان سے ان کا جواب دے سکو اس لیے جو بھی بکنا، سوچ سمجھ کر بکنا.....!''

آج تک کسی فلسطینی نے اس لہجے میں رابرٹ سے بات نہیں کی تھی۔ اس غیر متوقع ہزیمت پر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے اپنے غصے کو قابو میں رکھتے ہوئے، نقاہت بھری آواز میں پوچھا۔

''ثوبان! تم سے میری کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ میں نے اوپر سے ملنے والے احکامات کی تعمیل کی ہے۔ بتاؤ، تمہیں مجھ سے کیا چاہیے؟''

''کیا تم مجھے کچھ دینے کی پوزیشن میں ہو؟'' جاسم نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''ہاں، بہت کچھ.....!'' رابرٹ نے کہا۔ ''میں تمہیں ایسی اہم معلومات فراہم کرسکتا ہوں جو آنے والے دنوں میں تمہارے بہت کام آئیں گی مگر میری ایک ہی شرط ہے کہ مجھے یہاں سے زندہ جانے دو۔''

''رابرٹ! اس وقت تم موساد کے کسی ایجنٹ کے بجائے مجھے کوئی ریئل اسٹیٹ بروکر لگ رہے ہو۔'' جاسم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میں نے تو موساد کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا مگر تمہاری تنظیم انتہائی بودی اور تم مریل چوہے ثابت ہو رہے ہو۔ خیر.....'' وہ لمحے بھر کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''سودے بازی بعد میں کریں گے۔ پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے تین ساتھی الیکس، کرس اور نک کب تک یہاں پہنچ جائیں گے؟''

''بیس سے پچیس منٹ میں.....'' رابرٹ نے جواب دیا۔

''میں مان لیتا ہوں کہ مجھے چکر دینے کے لیے تم نے ٹائم کے معاملے میں تھوڑی سی مبالغہ آرائی کی ہوگی۔'' جاسم نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''میں نے اس وقت کو اپنے دماغ میں بارہ منٹ فکس کرلیا ہے۔ مجھے بتاؤ، سیم نے وہائٹ لینڈ

کروزر کے اندر جو باکس رکھا ہے، اس میں کیا ہے؟"

"سیم کہاں ہے.....؟" رابرٹ نے جواب دینے کے بجائے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ "اس نے میری بات کا جواب کیوں نہیں دیا تھا۔"

"سیم اس وقت اپنے ٹیم ممبرز بیٹن، انتھونی، ایڈ، اینڈی اور جیف کے ساتھ عالم بالا میں چھپن چھپائی کھیل رہا ہے۔" جاسم نے سفاک لہجے میں کہا۔ "اگر تمہیں اس کھیل میں شامل نہیں ہونا تو میرے سوال کا سیدھا جواب دو، اس باکس کے اندر کیا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھنا کہ میں تمہارے جواب کی تصدیق کے لیے اس باکس کو چیک ضرور کروں گا۔"

رابرٹ کے چہرے پر زلزلے کے آثار پیدا ہوئے۔ وہ خواب میں بھی یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی فلسطینی اس کا یوں ٹرائل کرے گا مگر یہ سب حقیقت میں ہو رہا تھا۔ بے بسی اور لاچاری کے عالم میں اس کے لب تھرتھرائے۔

"اس باکس کے اندر دھماکا خیز مواد کا ذخیرہ ہے۔"

"گڈ بوائے۔" جاسم نے طنز آمیز ستائشی لہجے میں کہا۔ "مجھ سے تعاون کر کے تم عقل مندی کا ثبوت دے رہے ہو۔ میرے حساب سے تمہارے ساتھیوں کی آمد میں نو منٹ رہ گئے ہیں۔ اب جلدی سے یہ بھی بتا دو کہ میرے لیے تمہارے پاس کیا ہے۔ میں کوئی ایک ایسی وجہ جاننا چاہوں گا جس کی بنا پر میں تمہاری جان بخشی کے بارے میں سوچ سکوں۔"

رابرٹ کی ہوشیاری، مکاری، طاقت اور اختیار کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا مگر سیانے کہہ گئے ہیں کہ جب آپ کی گاڑی کیچڑ زدہ کھیت میں پھنس جائے تو پھر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کتنی قیمتی اور کتنی نامور کمپنی کی گاڑی ہے۔ اس "مصیبت" سے نکالنے کے لیے ہیوی کرین کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔

رابرٹ کی نجات دہندہ کرین اس کی ایجنسی موساد تھی لیکن وہ اس سے مدد مانگنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ سو، چار و ناچار اس نے جواب دیا۔

"ٹوبان میرے پاس تمہارے لیے نہایت ہی کارآمد معلومات ہیں۔"

"کیسی معلومات؟" جاسم نے پوچھا۔

"تمہیں اس حال کو پہنچانے والا کوئی اور نہیں، میڈم براخا کا بڑا بھائی ایشل تھیوڈور ہے۔" رابرٹ نے بتایا۔ "وہ کل کسی وقت یہاں پہنچنے والا ہے....."

رابرٹ کے آخری جملے نے جاسم کو چونکا دیا تھا تاہم بند آنکھوں کے باعث رابرٹ، جاسم کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے سپاٹ آواز میں کہا۔

"رابرٹ! رکو نہیں، بولتے جاؤ۔"

"تمہاری دوست بلوما آج شام میں نیویارک سے روانہ ہونے والی ہے۔" اس نے بتایا۔ "اسے بھی لانگ ائرمین لایا جا رہا ہے۔" رابرٹ اپنی جان بخشی کے لیے ایجنسی سے کھلی غداری کا مرتکب ہو رہا تھا۔ "وہ موساد کے شاطر ایجنٹس کی نگرانی میں پرسوں یہاں پہنچے گی۔"

"کیا وہ ایجنٹس تمہارے ہی جتنے شاطر اور چالاک ہیں؟" جاسم نے اس کی سوچ پر ایک کاری چوٹ لگائی۔

رابرٹ کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ آج زندگی میں پہلی بار کسی سوا سیر سے اس کا پالا پڑا تھا۔ وہ اپنی اس ذلت کو بڑی مشکل سے پی گیا اور منت ریز لہجے میں کہا۔

"ٹوبان! میں تمہاری جتنی مدد کر سکتا تھا، وہ میں نے کر دی۔ مجھے امید ہے کہ اس تعاون کے بعد تم مجھے گولی نہیں مارو گے۔"

"رابرٹ! تم نے اپنی دانست میں مجھے جو بیش قیمت معلومات فراہم کی ہیں، اس میں میرے لیے کچھ بھی نیا نہیں۔ یہ ساری باتیں میں پہلے سے جانتا ہوں۔" جاسم نے جھوٹ اور سچ کی کاک ٹیل بناتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ "لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں گولی نہیں ماروں گا کیونکہ....."

"کیوں کہ..... کیا؟" وہ وحشت زدہ لہجے میں مستفسر ہوا۔

"گولی سے اُڑا دینا تمہارے لیے بہت آسان موت ثابت ہوگی۔" جاسم نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "دراصل، میں نے تمہارے لیے کچھ اور ہی سوچ رکھا ہے۔"

"کک..... کیا.....؟" رابرٹ نے لکنت زدہ لہجے میں پوچھا۔

قبل اس کے کہ جاسم کوئی جواب دیتا، کاٹیج کے باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ جاسم نے ساکورا کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا اور وہ دونوں رابرٹ کو کرسی پر بندھا چھوڑ کر کاٹیج کے بیرونی حصے میں آ گئے۔

جاسم نے تھوڑی دیر پہلے اس کاٹیج کی خانہ تلاشی کے نتیجے میں جو چیزیں حاصل کی تھیں، ان میں دو بڑے سائز کی اسپرے بوتلیں بھی شامل تھیں جیسا کہ ائر فریشنر یا پھر حشرات

الارض کو تلف کرنے والے اسپرے ہوتے ہیں مگر ان دو بوتلوں کے اندر ایک خطرناک گیس بھری ہوئی تھی۔ اگر وہ گیس کسی انسان کے چہرے پر اسپرے کی جائے تو وہ وقتی طور پر کچھ بھی دیکھنے کے قابل نہیں رہتا تھا۔ جاسم نے وہاں پہنچنے والے تین افراد کو عارضی اندھا بنانے کے بعد شکار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

جاسم نے وہ ایک خطرناک اسپرے ساکورا کو تھما دیا اور دوسرا خود اپنے پاس رکھ لیا اور وہ دونوں بند دروازے کے دونوں جانب جم کر کھڑے ہو گئے۔ جاسم نے ساکورا کو اشاروں کی زبان میں سمجھا دیا تھا کہ کرنا کیا ہے۔ وہ جاسم کی معیت میں سودوزیاں کی فکر سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ ان لمحات میں اس کا اعتماد اور جرأت دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔

گاڑی سے نکلنے والوں نے کانیج کا رخ کیا تو جاسم ریڈ الرٹ ہو گیا۔ وہ ان سفاک بھیڑیوں سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ بس اس کے ذہن کے کسی گوشے میں ایک ہی خدشہ کلبلا رہا تھا اور اس کی یہ تشویش سیم کی لاش کے حوالے سے تھی جو وہائٹ لینڈ کروزر کے پہلو میں پڑی ہوئی تھی۔ اگر بنک، کرس اور الیکس میں سے کسی کی نگاہ اس لاش پر پڑ جاتی تو ایک نئی مشکل کھڑی ہو سکتی تھی تاہم خیریت گزری اور دروازے پر ہونے والی دستک کو سن کر جاسم نے سکون کی سانس لی۔

دوسری دستک پر جاسم نے اس طرح دروازہ کھول دیا کہ اندر آنے والے ساکورا اور اسے دیکھ نہ سکیں اور انہوں نے بھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ ان کے لیے دروازہ کس نے کھولا تھا۔ وہ لوگ ثوبان (جاسم) کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے اس قدر باؤلے ہو رہے تھے کہ ان کا دھیان اِدھر اُدھر ہٹ ہی نہیں رہا تھا۔

یہی بے دھیانی انہیں بڑی مہنگی پڑی۔ وہ تینوں جیسے ہی کانیج کے اندر داخل ہوئے، جاسم اور ساکورا نے اسپرے والی بوتلوں کو ان کے چہروں پر اس طرح "کھول" دیا جیسے اپنے کسی دشمن پر شکاری کتے "چھوڑے" جاتے ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے ان کی حالت بُری ہو گئی۔ آنکھوں کے اندر محسوس ہونے والی مرچیلی اذیت نے انہیں اپنے ہتھیار نکالنے کا بھی موقع نہیں دیا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ باس کے مسکن میں ان کا ایسا "فقید المثال" استقبال کیا جائے گا۔

جاسم وقت کی نزاکت کو اچھی طرح جانتا تھا لہٰذا اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر الیکس، بنک اور کرس کے سنبھلنے سے پہلے ہی ان کی گردنوں کے منکے توڑ کر انہیں جہنم رسید کر دیا۔ آنکھوں کی تکلیف اس قدر زیادہ تھی کہ موساد کے وہ تینوں ایجنٹس اپنا دفاع کیے بغیر موت کے منہ میں چلے گئے تھے۔ اچانک نازل ہو جانے والی کسی آفت کا مقابلہ کرنا کوئی آسان نہیں ہوتا اور اگر اس آفت کا نام جاسم ہو تو پھر اس کا سامنا کرنا بھی ممکن نہیں رہتا۔

آئندہ دس منٹ میں جاسم نے ساکورا کی مدد سے سیم، کرس، بنک اور الیکس کی لاشوں کو گھسیٹ کر رابرٹ کے "پڑوس" میں پہنچا دیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خوں خوار لہجے میں کہا۔

"تم جاننا چاہتے تھے نا کہ میں تمہیں کس قسم کی موت دینا چاہتا ہوں تو سن لو کہ میں نے تم سب کے پرخچے اُڑانے کا فیصلہ کیا ہے۔"

جواب میں رابرٹ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا تو جاسم نے اس کی گویائی پر ایڈہیسو ٹیپ کا قفل ڈال دیا۔

وہ تمام کاٹیجز ایک دوسرے سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بنے ہوئے تھے اسی لیے وہاں بسنے والے لوگوں کو رابرٹ کے کانیج میں ہونے والی اس ہنگامی کارروائی کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ ویسے بھی وہ گہری نیند کا وقت تھا۔

جاسم اس کانیج میں مزید رک کر کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا لہٰذا وہ لینڈ کروزر کے اندر رکھا ہوا دھماکا خیز مواد والا باکس اٹھا لایا اور اس تمام تر ہلاکت خیز میٹریل کو چار اصلی لاشوں اور ایک زندہ لاش پر پلانٹ کرنے کے بعد اس کانیج سے باہر نکل آیا۔ ڈیونیٹر وہ ساتھ لانا نہیں بھولا تھا۔

کانیج آر۔تھرٹی سے محفوظ فاصلے پر آنے کے بعد جاسم نے بٹن دبا کر اس آتش گیر اور دھماکا خیز مواد کو ڈیونیٹ کر دیا۔ اگلے ہی لمحے مذکورہ کانیج میں ایک خوفناک قیامت برپا ہو گئی۔

ساکورا نے سہمی ہوئی نظر سے جاسم کی طرف دیکھا۔ جاسم کے چہرے پر ایک عجیب قسم کا سکون اور آسودگی جھلک رہی تھی۔ ساکورا اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن اس کے بولنے سے پہلے ہی رک سیک بول اٹھا۔ مذکورہ رک سیک کے اندر فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔

ساکورا بے یقینی سے کبھی جاسم کو اور کبھی اپنے بیگ کو تکنے لگی۔

حیرت و تجسس کی تہ میں چھپی اس داستان کے باقی واقعات اگلے ماہ پڑھیے

بدلہ

عمران قریشی

متحمل مزاجی کو کامیاب ازدواجی زندگی کی کنجی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا... بڑے سے بڑا مسئلہ ٹھنڈے دل و دماغ سے کیا جائے تو آگے کا سفر ہموار ہی گزرتا ہے... گرم مزاجی سے صرف خسارے کے سودے ہی نصیب میں آتے ہیں... بات بے بات آگ بگولہ ہو جانے والے میاں بیوی کی بے اعتدالیاں...

ایک ہی وقت میں زندگی کی سمتیں بدل لینے والوں کا فسانۂ آزار.....

طیبہ نے بدزبانی کی اور طیش میں آکر حمزہ نے اُسے تھپڑ دے مارا۔ اس کے بعد گھمسان کی جنگ شروع ہوگئی۔ فلیٹ میں یک دم بھونچال آگیا۔ انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ حمزہ نے لاتیں اور گھونسے چلائے۔ طیبہ نے اپنے لمبے ناخنوں سے اس کے چہرے کو تختۂ مشق بنایا۔ وہ اونچی آواز میں چیخ چلّا رہی تھی۔ تاکہ فلیٹ کے لوگ جمع ہو جائیں۔ حمزہ اس کی شرپسندی سے واقف تھا۔ اس لیے اس نے طیبہ کا منہ دبوچ لیا۔ اس کی آواز حلق میں دب کر رہ گئی۔ چند لمحے گھٹی

ہوئی آواز میں غوں غاں کرنے کے بعد اس نے اپنے دانت حمزہ کی انگلیوں میں جکڑ دیے اور اتنی زور کا کاٹا کہ انگلیوں سے خون نکل آیا۔ اب حمزہ کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں اور اس نے طیبہ کو پرے دھکیل دیا۔ پھر اپنا ہاتھ بغل میں دبا کر اچھلنے کودنے لگا۔ طیبہ نے قریب ہی رکھا ہوا لوہے کا گلدان اٹھایا اور اس کے سر پر دے مارا۔ لیکن وار نشانے پر نہیں لگا۔ کیونکہ حمزہ نے بروقت سر کو دائیں جانب کرلیا۔ گلدان سر کے بجائے اس کے کندھے پر لگا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کندھا یک دم سن ہو گیا ہو۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر آگئیں اور وہ ہاتھ کی تکلیف بھول کر کندھا پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ طیبہ کسی چڑیل کے مانند آگے بڑھی۔ اس کے سیاہ بال چہرے پر بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں خون اترا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ایک دفعہ پھر گلدان کو اوپر اٹھایا اور حمزہ کے سر پر مارنے کی کوشش کی لیکن حمزہ نے اچانک ہی گلدان کو پکڑ لیا۔ اب طیبہ کا چہرہ اس کے چہرے کے بالکل سامنے تھا۔ اس نے اپنا سر طیبہ کی ناک پر دے مارا۔ اس کے منہ سے درد بھری چیخ نکلی اور اس نے گلدان کو چھوڑ دیا۔ حمزہ کے متاثر ہونے والا کندھا سن ہو چکا تھا اور ہاتھ اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔ لیکن بایاں بازو ٹھیک تھا۔ اس نے اسی سے ہی گلدان کو پکڑا ہوا تھا۔ طیبہ کی ناک سے خون نکل کر ٹھوڑی سے ہوتا ہوا نیچے گرنے لگا اور وہ چڑیل سے ڈریکولا دکھائی دینے لگی۔ حمزہ اب لڑائی سے بیزار ہو گیا تھا اور اس کا اختتام چاہتا تھا۔ اس اثنا میں فلیٹ کا دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ قریبی فلیٹ والے ان کے دروازے کے سامنے جمع ہو گئے تھے۔ وہ بھی کسی وقت اندر داخل ہو سکتے تھے۔ اس سے پہلے حمزہ کو اپنا بدلہ لینا تھا۔ اس لیے اس نے گلدان کو اوپر اٹھایا اور پوری قوت سے طیبہ کے سر پر دے مارا۔ وہ تیورا کر زمین پر گر گئی۔ اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ اسی وقت دروازہ دھماکے کے ساتھ کھلا اور ہمسائے اندر داخل ہوئے۔ ان کی پہلی نگاہ حمزہ کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے خون آلود گلدان پر پڑی اور دوسری نگاہ زمین پر بے سدھ لیٹی ہوئی طیبہ پر۔ انہیں حالات کی سنگینی کے متعلق اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ انہیں جو بھی نظر آیا، وہ کسی ظلم سے کم نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے حمزہ کے ہاتھوں سے گلدان چھینا اور اسے زمین پر لٹا کر گھونسے اور مکے مارنے لگے۔ وہ تعداد میں زیادہ تھے۔ اس لیے حمزہ پر چھا گئے اور وہ ان کے نیچے دب کر رہ گیا۔ اسے اپنا سانس سینے میں اٹکتا ہوا محسوس ہوا اور اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔ کچھ ہی دیر میں پولیس فلیٹ میں داخل ہوئی۔ فلیٹ والوں نے انہیں معاملے سے آگاہ کیا اور وہ ان دونوں کو اٹھا کر اسپتال لے گئے۔ وہاں ان کی مرہم پٹی ہوئی۔ پھر طیبہ سے لڑائی کی وجہ دریافت کی گئی۔ اس نے روتے ہوئے بتایا کہ اس کے شوہر نے اس کی جان لینے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے اسے حوالات میں بند کر دیا جائے۔

حمزہ نے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ پولیس اہلکار نے اس کے چہرے پر تھپڑ دے مارا۔ اسے دن میں تارے دکھائی دینے لگے اور اس نے دوبارہ بے ہوش ہو جانے میں بہتری جانی۔ اب کی دفعہ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ حوالات میں زمین پر چاروں شانے چت لیٹا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر جا بجا پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور کندھے میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ سسکاری لے کر رہ گیا۔ زمین بہت ٹھنڈی تھی۔ وہ بمشکل تمام اٹھ کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

اس کی ازدواجی زندگی ایسی ہی تھی۔ طیبہ نے کبھی بھی اس سے ہنس کر بات نہیں کی تھی۔ وہ تو ہمیشہ لڑنے مارنے کے لیے تیار بیٹھی رہتی تھی۔ کچن کا کوئی کام نہیں کرتی تھی۔ حمزہ جب اسے کام کرنے کے لیے کہتا تو وہ دوپٹا سر پر باندھ کر بیڈ پر لیٹ جایا کرتی تھی۔ مجبوراً وہ باہر سے کھانا لے آتا تھا اور طیبہ ماتھے سے دوپٹا اتار کر کھانا کھانے کے لیے بیٹھ جایا کرتی تھی۔ حمزہ بھی اس سے کچھ کم نہیں تھا۔ وہ اسے لگا بندھا خرچہ دیا کرتا تھا۔ جب اس نے کام کرنا بند کیا۔ تب حمزہ نے اسے خرچہ دینا بند کر دیا اور کام کرنے کے لیے نوکرانی رکھ دی۔ جو نہ صرف فلیٹ کا کام کرتی تھی بلکہ ہانڈی بھی بنا دیا کرتی تھی۔ طیبہ کی انہی باتوں کی وجہ سے اس نے اپنی کالج فیلو نشا سے ملنا شروع کر دیا۔ وہ دونوں کالج کے دنوں میں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لیکن پھر نشا کے گھر والے بیرون ملک منتقل ہو گئے۔ تب نشا کو بھی ساتھ جانا پڑا۔ حمزہ نے کئی سالوں تک اس کا انتظار کیا اور پھر ادھیڑ عمری کے دوران اس نے اپنی ہمسائی طیبہ سے شادی کر لی۔ شادی کے پہلے مہینے میں ہی ان دونوں کی لڑائی ہوئی۔ حمزہ سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے تمام تنخواہ طیبہ کے ہاتھوں میں رکھ دی تھی اور طیبہ نے پندرہ دنوں کے اندر تمام پیسے..... اُڑا دیے پھر حمزہ کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے معصومیت کے ساتھ بولی۔

"تم جہاں سے تنخواہ لاتے ہو وہاں سے اور لے آنا

پہلے والی ختم ہوگئی ہے۔''

حمزہ نے نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔ ''کہاں سے تنخواہ لے آؤں۔ وہ جو میں نے تمہیں دی تھی اس کا تم نے کیا کیا؟''

طیبہ نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ ''وہ بہت کم تھی۔ انہیں بتاؤ کہ اس میں مہینے کا خرچہ پورا نہیں ہوتا ہے۔''

حمزہ کا دماغ گھوم گیا۔ اسے فلیٹ والوں نے بتایا تھا کہ وہ فقیروں کو پانچ سو کے نوٹ بھیک میں دے رہی ہے۔ اس لیے اس کے فلیٹ کے سامنے فقیروں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے اور پھر جب چند دن پہلے حمزہ فلیٹ کی طرف آیا تو اس نے اپنی آنکھوں سے فقیروں کو دیکھا۔ انہیں فلیٹ والے دس روپے دے رہے تھے لیکن وہ انکاری تھے اور اصرار کر رہے تھے کہ انہیں پانچ سو کا نوٹ دیا جائے۔ جیسے کہ آخری فلیٹ والی عورت انہیں دیتی ہے۔ آخری فلیٹ حمزہ کا تھا۔ اس کے علاوہ قریبی فلیٹ کی عورتوں نے اسے بتایا کہ طیبہ جب بھی خریداری کے لیے ان کے ساتھ باہر جاتی ہے تو چیزیں خریدنے کے بعد بچ جانے والی رقم دکان داروں سے واپس نہیں لیتی تھی۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ رقم دو تین سو سے بھی زیادہ بچی اور دکان دار اسے دینے پر اصرار بھی کر رہا تھا لیکن اس نے رقم واپس نہیں لی۔ اس کے کہنے کے مطابق اس سے برکت ہوتی ہے اور پھر بعد میں دکان داروں نے اسے بقایا رقم دینا ہی چھوڑ دی۔ اس کے بعد برکت کا یہ عالم ہوا کہ پندرہ دنوں کے دوران تمام تنخواہ ختم ہوگئی۔ اس دن پہلی دفعہ ان دونوں کے درمیان لڑائی ہوئی۔ حمزہ نے اسے برا بھلا کہا اور طیبہ نے گالم گلوچ کی۔ جس کے بعد ہاتھا پائی ہوئی۔ ہمسایوں نے بروقت بیچ بچاؤ کروا دیا اور حمزہ نے طیبہ کے ہاتھوں پر تنخواہ رکھنے سے توبہ کر لی۔ اس کے علاوہ اسے ایک مزید گلہ بھی تھا۔ طیبہ تمام دن موبائل پر بات چیت کیا کرتی تھی اور جب حمزہ نے اسے تنبیہہ کی تو وہ پھٹ پڑنے والے لہجے میں بولی۔

''تم بھی تو لڑکیوں سے بات چیت کرتے ہو، میں نے کتنی دفعہ اپنے کانوں سے سنا ہے۔ تم ان کی تعریفوں کے پل باندھ رہے تھے۔ انہیں لطیفے سنا رہے تھے۔ اگر میں نے لڑکوں سے بات چیت کر لی تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟''

حمزہ کا دماغ گھوم کر رہ گیا۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ فون پر لڑکیوں سے بات چیت کرتا تھا۔ انہیں لطیفے بھی سنایا کرتا تھا لیکن وہ مرد ہونے کے ناتے یہ سب کر سکتا تھا۔ طیبہ ایک عورت ہو کر بھلا ایسا کیسے کر سکتی تھی۔ اس نے طیبہ کو منع کیا۔

طیبہ نے بدکلامی کی اور نتیجہ لڑائی کے طور پر سامنے آیا۔ صبح وہ دونوں اپنے زخموں کو گرم کپڑے سے سینک رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود بھی انہوں نے اپنے بڑوں کا لحاظ رکھنے کے لیے علیحدگی اختیار نہیں کی۔ جتنی خامیاں طیبہ میں تھیں۔ اتنی ہی حمزہ میں بھی تھیں جو کچھ حمزہ کرتا تھا، وہی سب طیبہ بھی کرنے کی پوری کوشش کرتی تھی۔ شادی کے بعد جب حمزہ نے سگریٹ پینا شروع کی تو اس کی سگریٹ چرا کر طیبہ نے بھی پی اور جب حمزہ نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑنے کے بعد منع کیا تو وہ غصے سے چلاتے ہوئے بولی۔

''اچھے مردوں کے لیے اچھی عورتیں اور برے مردوں کے لیے بری ہوتی ہیں۔ چونکہ تم برے ہو تو پھر میں کیوں اچھی بنوں؟''

اس دن زیادہ لڑائی تو نہیں ہوئی۔ تاہم تلخ کلامی ضرور ہوئی۔ جس کے بعد حمزہ نے باہر سگریٹ نوشی کرنا شروع کر دی۔ لیکن لڑائیوں کا یہ سلسلہ رک نہیں سکا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ہم پلہ تھے اور دونوں ہی جھکنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس عرصے کے دوران حمزہ کو بلڈ پریشر کا عارضہ لاحق ہوگیا اور ڈاکٹر نے اسے تمام عمر کے لیے گولیاں کھانے کے لیے کہہ دیا۔ اس کا بلڈ پریشر اچانک ہی ہائی ہو جاتا تھا۔ اس لیے جب طیبہ اس کے ساتھ بدتمیزی کرتی تھی تو وہ برداشت نہیں کر پاتا تھا اور پھر تلخ کلامی کے بعد ہاتھا پائی پر نوبت آجاتی تھی۔ ناراض ہونے کے بعد وہ ہفتوں ایک دوسرے سے بات چیت نہیں کرتے تھے اور پھر کوئی نہ کوئی ہمسایہ بیچ میں پڑ کر ان دونوں کے معاملے کو سلجھا دیا کرتا تھا۔ ورنہ دونوں جھکتے نہیں تھے۔ اب بھی یہی ہوا تھا۔ طیبہ نے حمزہ سے پوچھے بغیر اس کے قیمتی کپڑے بھکاری کو دے دیے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اپنے بھی دے دیے تھے اور پھر حمزہ کے سامنے کھڑے ہو کر نئے کپڑے سلوانے کا تقاضا کرنے لگی۔ حمزہ نے جب اس سے چند دن پہلے سلوانے والے کپڑوں کے متعلق دریافت کیا تب اس نے بتایا کہ وہ کپڑے اس نے بھکاری کو دے دیے ہیں کیونکہ ان کی دعائیں بہت کام آتی ہیں۔

حمزہ کا بلڈ پریشر یک دم ہائی ہوگیا۔ طیبہ نے جو کپڑے بھکاری کی بھینٹ چڑھائے تھے۔ ان میں وہ تھری پیس جوڑا بھی تھا جسے پہن کر وہ اپنے دوستوں کی پارٹیاں اٹینڈ کیا کرتا تھا۔ اس جوڑے کا بھکاری نے بھلا کیا کرنا تھا۔ یقیناً وہ اسے اونے پونے داموں فروخت کر دیتا اور اب حمزہ کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ دوبارہ تھری

پیس سوٹ سلوا سکتا۔ اس لیے دماغ گھومنے پر اس نے طیبہ پر ہاتھ اٹھا لیا اور پھر معاملہ آگے بڑھتا چلا گیا جو ہاتھا پائی کے بعد تشدد کی صورت اختیار کرنے لگا۔ تب ہمسائیوں کو مجبوراً دخل اندازی کرنا پڑی۔ لیکن طیبہ کی حالت دیکھنے کے بعد وہ بھی آپے سے باہر ہو گئے اور اپنے ہاتھوں پر قابو نہ رکھ پائے جس کے بدلے میں حمزہ کی اچھی خاصی درگت بن گئی۔

حوالات کے قریب سے گزرتے ہوئے پولیس اہلکار کو آواز دے کر بلانے کے بعد حمزہ نے اسے بتایا کہ اس کی طبیعت بہت خراب ہے۔ جسم درد کے مارے ٹوٹ رہا ہے۔ اس لیے اسے فوراً سے پیشتر اسپتال منتقل کر دیا جائے۔

اہلکار نے سرد لہجے میں بتایا۔ ''جب تک پرچہ نہیں کٹ جاتا تب تک یہ ممکن نہیں۔ دوسری پارٹی جلد ہی آنے والی ہے۔ ان کی آمد کے بعد بیان کو مدِنظر رکھتے ہوئے فیصلہ کیا جائے گا کہ کیا، کیا جائے۔''

☆☆☆

طیبہ کے والدین کی آمد رات کو گیارہ بجے کے بعد ہوئی۔ طیبہ ان کے ساتھ تھی۔ تنویر صاحب سمجھ دار اور جہاندیدہ انسان تھے۔ بیگم تنویر بھی پڑھی لکھی اور سنجیدہ خاتون تھیں۔ طیبہ نہ جانے کس پر گئی تھی۔

انسپکٹر ثناء اللہ نے انہیں کمرے میں بٹھانے کے بعد معاملے کو آپس میں طے کرنے کے لیے کہا اور خود باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد تنویر صاحب زخم خوردہ لہجے میں بولے۔

''مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ تم دونوں نہ صرف پڑھے لکھے ہو بلکہ سمجھ دار بھی ہو، مجھے تم دونوں سے یہ امید نہیں تھی اور تم سے تو بالکل بھی نہیں تھی۔ میں مانتا ہوں کہ طیبہ بے وقوف ہے لیکن تم تو نہیں ہو، تمہیں تھوڑا تحمل سے کام لینا چاہیے تھا۔''

بیگم تنویر بولیں۔ ''طیبہ ضدی اور خودسر ہے۔ میں اندازہ لگا سکتی ہوں کہ اس نے کچھ غلط کیا ہوگا جس کی وجہ سے تم نے اشتعال میں آکر ہاتھ اٹھایا ہوگا لیکن اگر تم ہمارے پاس چلے آتے تو یہ نوبت نہیں آتی۔''

حمزہ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔ ''غصے کی حالت میں کسی کو کیا پتا چلتا ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے اور آپ اس بات سے بہ خوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تمام معاملے میں غلطی میری نہیں ہے۔ میرے جسم پر زخم طیبہ سے زیادہ ہیں۔ میں فلیٹ میں اس کے ساتھ تین چار گھنٹے رہتا ہوں۔ اس سے یہ چند گھنٹے برداشت نہیں ہوتے ہیں۔ آگے آپ خود اندازہ لگا لیں کہ وہ میرے ساتھ کیا کیا کرتی ہے۔''

اس دفعہ تنویر صاحب سرد لہجے میں بولے۔ ''برخوردار تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ کچھ تو تم نے بھی کیا ہوگا۔ میں مانتا ہوں کہ وہ بے وقوف اور ضدی ہے لیکن تم بھی کچھ کم نہیں ہو۔ اس نے چند دن پہلے مجھے بتایا تھا کہ تم نے اسے خرچہ دینا بند کر دیا ہے اور اس کے پاس ہمارے گھر تک آنے کے لیے بھی رقم نہیں ہے۔ یہ کہاں کی عقل مندی ہے؟ تمہیں اسے معقول جیب خرچ دینا چاہیے تاکہ تمہاری غیر موجودگی میں ضرورت پڑے تو اسے ہاتھ نہ پھیلانا پڑیں۔''

حمزہ نے غصیلے لہجے میں جواب دیا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ وہ آپ سے میری شکایتیں کرتی رہتی ہے۔ لیکن اس نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ جب میں نے تمام تنخواہ اس کے ہاتھوں پر رکھی تو اس نے نہایت بیدردی کے ساتھ پندرہ دنوں کے اندر اڑا دی اور اگلے مہینے جب میں نے اسے جیب خرچ دیا تو اس نے بھکاریوں میں بانٹ دیا۔ میرے خیال میں اسے جیب خرچ سے زیادہ بھکاریوں کی دعاؤں کی ضرورت ہے جو اسے جیب خرچ کے بغیر بھی مل سکتی ہیں۔''

بیگم تنویر بولیں۔ ''اس کا کہنا ہے کہ جیب خرچ اتنا کم تھا کہ اسے بھکاریوں میں بانٹ دینا ہی بہتر تھا۔ تم اسے لگی بندھی رقم کیوں نہیں دیتے ہو؟''

حمزہ کی قوتِ برداشت نے جواب دے دیا اور وہ پھٹ پڑنے والے لہجے میں بولا۔ ''میری تنخواہ اسّی ہزار ہے جس میں سے تیس ہزار فلیٹ کا کرایہ اور بجلی گیس کے بل دس سے پندرہ ہزار۔ نیٹ کی فیس اور اوپر تلے انسانی خرچ ملا کر رقم پچاس ہزار کو چھونے لگتی ہے۔ اس کے بعد تیس ہزار میں گھر کا راشن یا پھر موٹر سائیکل کا خرچہ اور بچ جانے والی رقم سے بیماری کے دوران علاج کروانا۔ آپ خود سوچ سکتے ہیں ان اخراجات کے بعد کتنی رقم باقی بچتی ہے۔ بس اتنا بتا دوں کہ میں فضولیات کا متحمل نہیں ہوں۔ مجھے کھینچ تان کر گزارا کرنا پڑتا ہے جبکہ طیبہ کھلے ہاتھ کی مالک ہے۔ اس نے آج صبح میرا تھری پیس سوٹ بھکاری کو دے دیا۔ میں نے بچت کر کے بہت مشکلوں سے سلوایا تھا۔ اسے اس کا بالکل بھی احساس نہیں۔''

بیگم تنویر سرد لہجے میں بولیں۔ ''بہت افسوس کی بات ہے کہ تم نے بچت کر کے اپنا سوٹ بنوا لیا لیکن بیوی کو نظرانداز کر دیا۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ اپنا سوٹ بنوانے سے

پہلے تم طیبہ کا سوٹ بنواتے۔ اس کے پاس پہننے کے لیے ڈھنگ کے کپڑے نہیں ہیں۔"

حمزہ نے تلخ لہجے میں بتایا۔ "میں نے اپنے سوٹ کے ساتھ اس کا سوٹ بھی بنوایا تھا۔ میرے خیال میں اس نے آپ کو یہ نہیں بتایا۔ تمام سوٹ اس نے بھکاریوں کی بھینٹ چڑھا دیے۔ ہماری لڑائی اس واقعے کے بعد ہوئی اور اس میں آپ دونوں کا بھی کافی حد تک قصور ہے۔ شادی کے بعد آپ نے پلٹ کر کبھی معلوم نہیں کیا کہ آپ کی لڑکی کس حال میں ہے۔ وہ اپنی زندگی سے مطمئن ہے یا نہیں۔ اس کے مسائل کیا ہیں۔ فون پر آپ کی اس سے جو بات چیت ہوتی ہے، اس میں آدھے سے زیادہ آپ کو جھوٹ بتاتی ہے اور سچائی معلوم کرنے کے لیے آپ کو چند دن ہمارے فلیٹ میں رہنا چاہیے تب آپ کو معلوم ہوگا کہ غلط کون ہے اور کون ٹھیک ہے۔"

تنویر صاحب بیزار لہجے میں بولے۔ "شادی سے پہلے کیا تم ایسے تھے جیسے اب دکھائی دے رہے ہو۔ یہ تو تصویر کا دوسرا رخ ہے جو عام حالات میں دکھائی نہیں دیتا۔ ہم اگر تمہارے فلیٹ پر رہنے کے لیے آئیں تو کیا تم طیبہ سے وہ برتاؤ کرو گے جو عام حالات میں کرتے ہو یا پھر طیبہ تمہارے ساتھ سختی سے پیش آئے گی جس طرح وہ ہماری غیر موجودگی میں آتی ہے۔ بہرحال یہ سب فضول باتیں ہیں اور ہم مدعے سے بہت ہٹ چکے ہیں۔"

بیگم تنویر بولیں۔ "تو پھر انسپکٹر ثناء اللہ کو کمرے میں بلا لیجیے تاکہ وہ اپنے انداز میں اسے وہ کچھ سمجھا دے جو ہم اسے نرم لہجے میں نہیں سمجھا سکے ہیں۔"

حمزہ کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات اُبھرے اور وہ کرسی پر پہلو بدل کر بیٹھ گیا۔

تنویر صاحب اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف چلے گئے۔ انہوں نے انسپکٹر ثناء اللہ کو اونچی آواز میں پکارا۔ وہ الہ دین کے جن کی طرح نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر تجسس تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کبھی سیدھی انگلی سے نکلنے والا نہیں تھا لیکن تنویر صاحب کا کہنا تھا کہ حمزہ پر سختی نہیں کی جا سکتی ہے کیونکہ اس صورت میں نزلہ ان سب پر گر سکتا ہے۔

انسپکٹر کمرے میں آنے کے بعد آہستہ قدموں کے ساتھ چلتا ہوا اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور تیکھی نگاہوں سے تنویر صاحب کی جانب دیکھنے لگا۔

ان کے کچھ کہنے سے پہلے بیگم تنویر بولیں۔ "ہم نے بات چیت کر لی ہے لیکن میرے خیال میں اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جلد یہ واقعہ دوبارہ وقوع پذیر ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غصے کے عالم میں یہ دونوں ایک دوسرے کو مار ہی ڈالیں تو پھر بہتر یہ ہے کہ ہماری چند شرائط جن پر آپ سے بات چیت ہو چکی ہے۔ وہ آپ اپنی زبان میں اس کے سامنے بیان کر دیجیے۔"

انسپکٹر ثناء اللہ نے سرد نگاہوں سے اپنے سامنے بیٹھے حمزہ کی جانب دیکھا پھر طنزیہ لہجے میں بولا۔ "شرائط ہے ہی کتنی جسے میں بیان کروں۔ میرے خیال میں صرف تنبیہہ ہے کہ اگر آئندہ اس نے طیبہ پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی تو اس کے خلاف پرچہ کاٹنے کے بعد قانونی کارروائی کی جائے گی۔ جس میں اسے سزا بھی ہو سکتی ہے۔ شرط صرف ایک ہے کہ اسے مہینے کے بیس ہزار روپے طیبہ کے ہاتھوں پر رکھنے ہوں گے اور نہ دینے کی صورت میں اس سے جواب طلبی ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ میں مہینے میں ایک دفعہ فون کر کے طیبہ سے بات چیت کروں گا اگر اس نے کوئی گلہ شکوہ کیا تو حمزہ سے پوچھ گچھ ہو گی۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً تنویر صاحب اپنی اہلیہ کے ساتھ طیبہ کے فلیٹ کا چکر لگایا کریں گے۔ تاکہ حالات کے متعلق انہیں آگاہی حاصل ہو سکے۔ میں بہرحال بدمزگی نہیں چاہتا ہوں۔ حالانکہ مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں سختی سے بات چیت کروں۔ لیکن ایسا کرنے سے اثر دونوں فریقین کی ذاتی زندگیوں پر براہِ راست پڑے گا۔ اس لیے افہام و تفہیم کے دائرے میں رہتے ہوئے بات چیت کر رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آئندہ تھانے آنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ اس لیے آپ سب غلطیوں کو درگزر کرتے ہوئے معاملے کو یہیں ختم کر دیجیے اور ایک دوسرے کو گلے لگا کر گلے شکووں کو ختم کرنے کے بعد یہاں سے رخصت ہو جائیے۔"

حمزہ نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور ساس، سسر کو گلے لگا کر معاملے سے جان چھڑائی۔

☆☆☆

تھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ اسپتال منتقل ہو گیا۔ اس کی حالت بہتر نہیں تھی۔ دایاں کندھا اتر چکا تھا۔ چند پسلیاں بھی متاثر ہوئی تھیں۔ طیبہ کی حالت بھی خراب تھی۔ ان دونوں کے درمیان کوئی رابطہ نہیں تھا اور نہ ہی سسر نے بھی اس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے اسپتال کا رخ نہیں کیا۔ لیکن ایک دو ہمسائے وہاں ضرور آئے جن کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ طیبہ اسپتال میں ہے اور اس کی حالت تشویشناک ہے۔ ایک ہفتے کے بعد زخم مندمل ہو گئے

لیکن دل پر اثر چھوڑ گئے۔ وہ طیبہ سے بدظن ہو گیا تھا اور اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ اسے طلاق دے دے گا لیکن بدلہ لینے کے بعد ۔۔۔ اب اسے سوجھا تھا کہ وہ بدلہ لے کیسے۔ حالات بہت گمبھیر تھے۔ انسپکٹر کے درمیان میں آنے کے بعد اب وہ طیبہ کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا تھا ورنہ اسے جیل جانے سے کوئی بچا نہیں سکتا تھا۔

جب اس نے فلیٹ میں قدم رکھا تو طیبہ کو اپنا منتظر پایا۔ اس کے رویے میں تحکمانہ پن آچکا تھا اور اس کی شخصیت رعب دار ہو گئی تھی۔ اس دن کے بعد اس نے ہر کام میں روک ٹوک کرنا شروع کر دی۔ رات کو جلدی سوؤ اور صبح دیر سے اٹھو۔ موبائل نہ دیکھو۔ ٹوائلٹ میں زیادہ وقت نہ لگاؤ۔ ان سب باتوں کے علاوہ جب مہینے کے شروع میں حمزہ کو اس کے ہاتھوں پر بیس ہزار کی رقم رکھنا پڑتی تو وہ جل بھن کر رہ جاتا تھا لیکن مجبور تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو مہینے کے آخر میں جب انسپکٹر ثناء اللہ اسے فون کرتا تو وہ شکایت لگا سکتی تھی۔ اس کے بعد جو بھی حمزہ کے ساتھ ہوتا، اس کے متعلق سوچ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے لیکن وہ دل میں بہت کچھ سوچ چکا تھا۔ اسے نشا بہت پسند تھی۔ وہ دھیمے لہجے میں بات کرنے کی عادی تھی۔ اس کی آنکھوں سے محبت چھلکتی تھی اور شخصیت دل موہ لینے والی تھی۔ حمزہ آفس سے چھٹی کے بعد اس سے ملنے لگا۔ نشا کے پاس گاڑی تھی جس کے شیشے سیاہ تھے۔ حمزہ کو طیبہ کی جانب سے اتنا خوف نہیں تھا جتنا کہ انسپکٹر ثناء اللہ سے تھا۔ اس لیے وہ بہت احتیاط کر رہا تھا۔ آفس سے باہر نکلنے کے بعد وہ چہرے پر ماسک لگا لیا کرتا تھا اور جب گاڑی میں بیٹھ جاتا تھا تب اسے اتار دیا کرتا تھا۔ نشا اسے خوف زدہ دیکھ کر بہت ہنستی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ حالات نے حمزہ کو خوف زدہ کر دیا تھا۔ ورنہ وہ بزدل نہیں تھا۔ نشا اسے دل و جان سے چاہتی تھی اور اسے اپنے ساتھ امریکا لے جانا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے لیے پہلے حمزہ کا طیبہ سے علیحدہ ہونا ضروری تھا۔ ایسی ہی ایک ملاقات کے دوران جب وہ دونوں ہوٹل کے پرائیویٹ روم میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ تب چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد حمزہ سنجیدہ لہجے میں گویا ہوا۔

"میرا بس چلے تو میں اس کا خون پی جاؤں۔ اس نے میری زندگی کو جہنم بنا کر رکھ دیا ہے۔ تم سوچ نہیں سکتی ہو کہ میں اس کے ساتھ کیا کرنے والا ہوں۔"

نشا نے کہا۔ "جو بھی کرنا، قانون کے دائرے میں رہ کر کرنا ورنہ بیرونِ ملک جانے کا پروگرام کھٹائی میں پڑ جائے گا۔"

حمزہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے تلخ لہجے میں بولا۔ "میں اس کے ساتھ وہ کرنے والا ہوں جو کسی نے اپنی بیوی کے ساتھ نہیں کیا ہوگا۔ یوں سمجھ لو کہ میں بھڑ اس ٹالنے والا ہوں۔ وہ نہ زندوں میں رہے گی اور نہ ہی مُردوں میں۔"

اس دفعہ نشا پریشان ہو گئی۔ وہ جلد از جلد امریکا واپس جانا چاہتی تھی اور حمزہ بہت آگے کی سوچ رہا تھا۔ جس میں زیادہ وقت لگ سکتا تھا اس لیے نرم لہجے میں بولی۔

"میری مانو تو اب اُسے بھول جاؤ۔ وہ ہے ہی اسی قابل ۔۔۔ ہم باہر جا کر نئی زندگی کی ابتدا کریں گے۔ اگر طیبہ کو معلوم بھی ہو گیا تو وہ تم سے رابطہ نہیں کر سکے گی۔"

حمزہ نے پوچھا۔ "واپسی کا پروگرام کب ہے۔ کچھ تیاریاں تو مجھے بھی کرنی ہیں۔ جن کے لیے کچھ وقت درکار ہوگا۔"

نشا نے مختصر الفاظ میں بتایا۔ "جیسے ہی تمہیں ویزا ملا، میں ٹکٹیں کروا لوں گی۔ ہو سکتا ہے کہ ہم اگلے مہینے کی تین تاریخ تک روانہ ہو جائیں۔"

حمزہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے۔ اتنا وقت میرے لیے کافی ہے۔ پاسپورٹ میں نے تمہیں دے دیا ہے۔ میڈیکل چیک اپ جلد ہو جائے گا۔ رہ گئی طیبہ۔ تو اس سے بدلہ میں ضرور لوں گا۔"

نشا چپ ہو گئی۔ وہ اس سے زیادہ بحث نہیں کر سکتی تھی۔ حمزہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ امریکا جانے کے بعد طیبہ کو طلاق دے دے گا۔ اس لیے وہ مطمئن ہو گئی تھی۔ اسے صرف شادی سے مطلب تھا۔ وہ طیبہ کے ساتھ کیا کرنے والا تھا، اس سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا۔

☆☆☆

اس ملاقات کے بعد تمام کام بہت تیزی کے ساتھ سرانجام پائے۔ میڈیکل چیک اپ کے بعد اسے امریکن ایمبیسی جانا پڑا اور پھر بہ آسانی ویزا لگ گیا۔ کیونکہ نشا اسے اسپانسر کر رہی تھی اور اس کے پاس امریکا کی نیشنلٹی تھی۔ اس لیے سب کام جلد ہی بہ احسن و خوبی انجام پا گئے اور یہ کام حمزہ کو طیبہ سے چھپ کر انجام دینا پڑے۔ چونکہ اس کے آفس کی ٹائمنگ بہت زیادہ تھی۔ اس لیے اس نے نوکری کو خیرباد کہہ دیا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں طیبہ کو بھنک نہ پڑ جائے۔ اگر وہ انسپکٹر ثناء اللہ سے شکایت کر دیتی تو پھر تمام معاملہ بگڑ سکتا تھا لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا اور ان دونوں کی ٹکٹیں ریزرو ہو گئیں۔ حمزہ نے اپنے کپڑے اور ضروری سامان نشا کی کوٹھی پر منتقل کر دیا۔ بلکہ نشا نے اس کے لیے مزید شاپنگ

بھی کی اور یہ شاپنگ اس نے تنہا کی تھی۔ وہ دونوں ملاقات نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ حمزہ نے کئی دفعہ محسوس کیا کہ سادہ لباس میں پولیس اہلکار اس کا تعاقب کر رہا ہے لیکن وہ جو بھی سوچ رہا تھا، ایسا کچھ بھی نہیں ہوا اور مہینہ بخیر و خوبی گزر گیا۔ اس دوران طیبہ نے اس کی ناک میں دم کر کے رکھ دیا۔ وہ اس پر بُری طرح دماغی تشدد کر رہی تھی اور چند دن پہلے اس نے حمزہ سے تقاضا کیا کہ وہ اسے بیس ہزار روپے مزید دے دے۔ کیونکہ اس کے پاس رقم ختم ہو گئی ہے۔

حمزہ غصیلے لہجے میں بولا۔ ''خدا کا خوف کرو۔ بیس ہزار کی رقم جو غالباً میں نے تمہیں دو دن پہلے دی تھی۔ تم نے اتنی جلدی اڑا دی۔ میرے پاس تو اب پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔''

طیبہ ڈھٹائی کے ساتھ بولی۔ ''تو اپنے کسی دوست سے ادھار لے لو۔ اگلے مہینے تنخواہ ملنے کے بعد اسے واپس کر دینا۔ میرے کزن کی شادی اگلے مہینے ہونے والی ہے اور میرے پاس کپڑے نہیں ہیں۔۔۔۔ اب بیس ہزار میں کچھ نہیں آتا ہے لیکن میں کھینچ تان کر گزارہ کر لوں گی۔''

حمزہ نے انکار میں سر ہلایا۔ ''میں ادھار نہیں لینا چاہتا۔ ایسا کرو تم اپنی کسی سہیلی سے لے لو۔ اگلے مہینے جب میں تمہیں بیس ہزار دوں گا تو اسے دے دینا۔''

طیبہ نے سرد لہجے میں بتایا۔ ''کل انسپکٹر ثناء اللہ کا فون آیا تھا۔ وہ تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے اسے مطمئن کر دیا کہ سب ٹھیک ہے۔ اگر تم یونہی چلتے رہے تو انسپکٹر کو فون کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ فون بند کرنے سے پہلے اس نے تنبیہہ کی کہ اگر میری کوئی بھی بات ماننے سے انکار کیا تو میں اسے فون کر کے بتا دوں۔ وہ تنبیہہ ایک دفعہ پھر سمجھانے کی کوشش کرے گا۔''

حمزہ پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وقت سے پہلے کوئی گڑبڑ ہو اور چونکہ وہ نوکری چھوڑ چکا تھا، اس لیے اس کے پاس رقم بھی تیزی کے ساتھ ختم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ مجبوراً اس نے بیس ہزار کی رقم نشا سے لے کر طیبہ کو دے دی۔ اس نے وہ رقم چند دنوں کے اندر برباد کر دی۔ نہ ہی اس کی کزن کی شادی ہوئی اور نہ ہی اس نے شاپنگ کی۔ اس نے تمام رقم اپنی سہیلیوں پر اُڑا دی۔ حمزہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

تین تاریخ کو ان کی فلائٹ رات بارہ بجے تھی۔ نشا نے اسے تاکید کی کہ وہ گیارہ بجے اس کی کوٹھی آ جائے۔ تیاری مکمل تھی۔ انہیں بس ائرپورٹ کے لیے نکلنا تھا۔ اس رات کا حمزہ کو بے چینی کے ساتھ انتظار تھا۔ وہ آٹھ بجے فلیٹ آ گیا۔ طیبہ کچن میں کھانا بنانے گئی ہوئی تھی۔ حمزہ نے بیڈ روم میں جا کر سائڈ ٹیبل پر پڑا ہوا اس کا موبائل اٹھایا اور اسے آف کر دیا۔ پھر سٹنگ روم میں آ گیا۔ وہ پانی کا گلاس لیے باہر آ رہی تھی۔ حمزہ کو سامنے دیکھتے ہی بولی۔

''تم مجھ سے بہت کچھ چھپا رہے ہو۔ میں نے تمہارے آفس فون کیا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ تم نے نوکری چھوڑ دی ہے۔ کہیں تمہارا فرار ہونے کا ارادہ تو نہیں ہے۔ میں نے انسپکٹر ثناء اللہ کو فون کر دیا ہے۔ اس لیے کوئی بھی غلط حرکت کرنے کے متعلق نہیں سوچنا۔''

حمزہ کا خون کھولنے لگا۔ اس نے دو دنوں سے بلڈ پریشر کی گولی نہیں کھائی تھی۔ اس لیے اس کا چہرہ خون کے مانند سرخ ہو گیا اور وہ تلخ لہجے میں بولا۔

''میں ملک چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ انسپکٹر ثناء اللہ یا پھر تمہارا باپ مجھے روک نہیں سکتا ہے۔ میں نے نوکری چھوڑ دی ہے اور جلد ہی تمہیں میری شادی کی اطلاع مل جائے گی۔ تب تم ہاتھ ملتی رہ جاؤ گی۔''

طیبہ نے حیرت بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا اور پھر اچانک ہی ہاتھ میں پکڑا ہوا پانی کا گلاس اس کے منہ پر اچھال دیا۔

حمزہ کو اس کی توقع نہیں تھی۔ اس کی طبیعت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ جسم میں موجود فشارِ خون اچانک ہی بڑھنے لگا۔ اس لیے وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ وہ فلیٹ آنے سے پہلے تہیہ کر چکا تھا کہ جو بھی کرے گا، وہ بیڈ روم کی دیواروں کے پیچھے کرے گا۔ ورنہ اس دفعہ اگر ہمسایوں کو پتا چل گیا تو فرار ہونے والا معاملہ کھٹائی میں پڑ سکتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر طیبہ کو بالوں سے پکڑا اور کھینچتا ہوا بیڈ روم کے اندر لے گیا۔ اس نے چیخنے چلانے کی کوشش کی۔ حمزہ نے فوراً دروازہ بند کر کے اسے کنڈی لگا دی۔ اب اس کی آواز بیڈ روم سے نکل کر سٹنگ روم سے ہوتی ہوئی فلیٹ سے باہر نہیں جا سکتی تھی اور اگر چلی بھی جاتی تو ساتھ والا فلیٹ خالی ہو چکا تھا اور چونکہ ان کا فلیٹ آخری تھا۔ اس لیے دوسری طرف آواز جانے کا خدشہ نہیں تھا۔ طیبہ نے کچھ دیر چیخنے چلانے کے بعد اپنے موبائل کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں اور پھر تیر کی طرح سائڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے موبائل کی طرف بڑھی لیکن حمزہ نے ایک دفعہ پھر اسے بالوں سے پکڑا اور اس کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ طیبہ نے گندی گندی گالیاں دیتے ہوئے اپنے لمبے ناخنوں کے ذریعے حمزہ کے چہرے کو اُدھیڑ کر رکھ دیا۔ اس اثنا میں حمزہ نے تھپڑوں کے ذریعے اس کا چہرہ لال کر دیا

اور پھر بیڈ کے نیچے چھپایا ہوا ڈنڈا نکال لیا۔ پھر بیدردی کے ساتھ طیبہ کے جسم پر برسانا شروع کر دیا۔ وہ گلا پھاڑ کر چیخنے لگی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ انسپکٹر ثناء اللہ کے ہوتے ہوئے حمزہ دوبارہ تشدد کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس لیے چیختے چلاتے ہوئے اپنے آپ کو بچانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ لیکن بیڈ روم میں اتنی جگہ نہیں تھی کہ وہ حمزہ کے ڈنڈے سے بچ کر اپنے آپ کو کہیں چھپا سکتی اور پھر اچانک ہی اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا لوہے کا گلدان آ گیا۔ یہ ڈیکوریشن پیس تھا۔ جس کے اندر سبز پتیوں والی لمبی بیل لگی ہوئی تھی۔ طیبہ نے وہ گلدان اٹھا کر حمزہ کے سر پر دے مارا۔ گلدان نشانے پر لگا اور اس کا سر پھٹ گیا۔ ڈنڈا اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گرا اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔

طیبہ نے پھرتی کے ساتھ ڈنڈا اٹھایا اور پوری طاقت کے ساتھ حمزہ کے جسم پر برسانا شروع کر دیا۔ معاملہ تیزی کے ساتھ بگڑتا چلا جا رہا تھا۔ حمزہ نے جو سوچا تھا، سب کچھ اس کے برعکس ہو رہا تھا۔ وہ بھڑاس نکالنے کے بعد فلیٹ سے فرار ہو جانا چاہتا تھا اور بارہ بجے والی فلائٹ کے ذریعے ملک سے باہر نکلنے کے بعد طیبہ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینا چاہتا تھا لیکن اب اس کا سر پھٹ گیا تھا اور چونکہ اس نے بلڈ پریشر کی گولی نہیں کھائی تھی اس لیے اس کا دماغ بھی سن ہوتا چلا جا رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی مفقود ہونے لگی تھی اور اس کی آنکھوں میں خون اترنے لگا تھا۔ طیبہ جسم کی پوری طاقت صرف کرتے ہوئے اس کے جسم پر ڈنڈے برسا رہی تھی۔ لیکن حمزہ کو کسی بھی قسم کی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس لیے اس نے زمین پر گرا لوہے کا گلدان اٹھایا اور اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے طیبہ کے سر پر دے مارا۔ وہ چیختی ہوئی پیچھے موجود بیڈ پر گر گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ جس میں سے خون نکلنے لگا تھا۔ حمزہ نے نیچے گرے ہوئے ڈنڈے کو اٹھایا اور وحشی درندے کی طرح بیڈ پر گری ہوئی طیبہ کے جسم پر مارنا شروع کر دیا۔ اس نے چیخنا چلانا بند کر دیا اور بے سدھ ہو گئی۔ گلدان نے اپنا کام کر دکھایا تھا۔ اس کا سر بُری طرح پھٹ گیا تھا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ لیکن حمزہ نے ڈنڈا برسانا ترک نہ کیا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا تھا اور آنکھوں میں وحشت سما چکی تھی۔ وہ پاگل ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے منہ سے جانوروں کی طرح کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ پھر اس کے دماغ میں ٹیسیں اٹھنے لگیں اور جس طرح اچانک ہی چلتے ہوئے ٹی وی کی رنگین اسکرین سفید ہو جاتی ہے بالکل اسی طرح حمزہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں کے آگے سفید بادل چھائے ہوں اور وہ تیورا کر زمین پر گر گیا۔ اب وہ سوچ سکتا تھا۔ لیکن حرکت کرنا اس کے اختیار سے باہر ہو چکا تھا۔ اسے فوراً سمجھ آ گئی کہ بلڈ پریشر بری طرح متاثر ہونے کی وجہ سے فالج کا اٹیک ہوا تھا اور وہ بے جان لاشہ بن کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر ثناء اللہ نے حسب معمول طیبہ کو متعدد بار فون کرنے کی کوشش کی اور جب رابطہ نہیں ہوا تو خیریت معلوم کرنے کے لیے فلیٹ پر آ گیا۔ لیکن کافی دیر دروازے پر دستک دینے کے بعد بھی جب اس نے دروازہ نہیں کھولا تو انسپکٹر نے دروازے کو توڑ دیا۔ پھر جب وہ بیڈ روم میں داخل ہوا تو اس نے حمزہ کو زمین پر لیٹے ہوئے پایا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ لیکن وہ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے سر سے خون نکل کر فرش کو رنگین کر رہا تھا اور طیبہ بھی خون میں نہائی ہوئی بیڈ پر بے سدھ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے کپڑے تار تار ہو رہے تھے اور فرش پر لوہے کے گلدان کے علاوہ مضبوط ڈنڈا بھی پڑا ہوا تھا۔ جس پر خون کے نشانات تھے۔ انسپکٹر نے فوراً اپنے ماتحتوں کو فون کیا اور انہیں ایمبولینس کے ساتھ فلیٹ کی طرف آنے کے لیے کہا پھر خود سر تھام کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ سب کچھ ہو گا۔ ہر معاملہ سختی سے حل نہیں کیا جا سکتا... لیکن تنویر صاحب کا اصرار تھا کہ ان کے داماد پر کچھ نہ کچھ سختی ضرور ہونی چاہیے۔ انسپکٹر ثناء اللہ نے انہیں سمجھایا تھا کہ لڑکی کا معاملہ ہے۔ اگر زیادہ سختی کی گئی... تو ان کا داماد آپے سے باہر بھی ہو سکتا ہے لیکن تنویر صاحب بضد رہے اور مجبوراً انسپکٹر ثناء اللہ کو وہ سب کچھ کرنا پڑا جس کا نتیجہ اب ان کے سامنے تھا۔

کچھ ہی دیر میں پولیس کے اہلکار بمع ایمبولینس آ گئے اور حمزہ کے ساتھ طیبہ کو بھی اسپتال منتقل کر دیا گیا۔ جہاں طبی معائنے کے بعد ڈاکٹروں نے بتایا کہ حمزہ کے دماغ کی رگ پھٹتے پھٹتے رہ گئی ہے۔ تاہم اسے فالج ہو گیا ہے اور طیبہ کے سر پر لوہے کا گلدان لگنے کی وجہ سے دماغ شدید متاثر ہوا ہے اور توقع یہ ہے کہ وہ اگر یادداشت نہ بھی کھو سکی تو پاگل ضرور ہو جائے گی۔ اس حادثے کے متعلق جب نشا کو معلوم ہوا تو وہ حمزہ کی خیریت معلوم کرنے کے بجائے فلائٹ پکڑ کر امریکا چلی گئی اور پیچھے حمزہ کا گھر تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔

❖❖❖

عزت کی زندگی

خلیل جبار

قابلِ قدر اور عزت کی زندگی گزارنا ہر شخص چاہتا ہے... مگر نصیب کسی کسی کو ہوتی ہے... وہ جرائم پیشہ تھا... وقت کے سادھ اس کی سوچ نے بھی رنگ بدل لیا تھا... وہ ایک آسان... سادہ اور عزت و وقار کی زندگی جینا چاہتا تھا... جہاں کوئی خوف... ڈر اسے پریشان نہ کرے...

ایک مجرم کی خواہش کا پایۂ تکمیل تک کا سفر.....

ڈیوڈ اس وقت بار میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اب مجھے جرائم سے تائب ہو کر شریفانہ زندگی گزارنا چاہیے۔ جرائم کے پیشے میں ہر وقت خوف لگا رہتا ہے کہ نہ جانے کب پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہو جاؤں گا۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے، شہر میں کوئی واردات ہو جائے تو پولیس کا شک مجھ پر ہی جاتا ہے۔ شہر میں اور بھی جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ پولیس ان پر کیوں شک نہیں کرتی۔ میں ہی نظر آتا ہوں.....

شریفانہ زندگی گزارنے کا خیال آتے ہی ڈیوڈ کے

ذہن میں یہ بات آئی کہ میں نے زندگی میں کوئی ڈھنگ کا کام ہی نہیں کیا اور نہ ہی کوئی ہنر سیکھا ہے، تعلیم بھی واجبی سی ہے۔ اس بات نے ڈیوڈ کو رنجیدہ کر دیا کہ وہ کیسے شریفانہ زندگی کا آغاز کرے گا

ڈیوڈ بار میں پہنچا تو وہاں جارج بیٹھا تھا، اسے دیکھ کر ڈیوڈ کو تشویش ہوئی کہ وہ یہاں کیا کرنے آیا ہے۔ وہ بے مقصد کہیں نہیں جاتا۔ اس کی طرح وہ بھی جرائم کے پیشے سے وابستہ تھا اور اپنا کام ایسی مہارت سے کرتا تھا کہ آج تک پولیس کی گرفت میں نہیں آسکا۔ جارج کی جب ڈیوڈ پر نظر پڑی وہ اس کے پاس آگیا۔

''ہیلو ڈیوڈ کیسے ہو؟''

''اچھا ہوں۔'' ڈیوڈ نے مختصر جواب دیا۔

''کیا تم بھی یہاں کسی خاص مقصد سے آئے ہو؟''

''نہیں میں ویسے ہی وقت گزاری کے لیے آیا ہوں، تم سناؤ یہاں کیسے آئے؟''

''تمہیں پتا ہے کہ میں بغیر کسی فائدے کے کہیں نہیں جاتا۔'' وہ بولا۔

''جانتا ہوں تبھی، تمہیں دیکھ کر چونک گیا۔''

''آنٹی سیلی نے مجھے بار میں بلایا ہے، اس سے کام کے معاملات پر گفتگو کر کے ہی پتا چلے گا، وہ مجھ سے کیا کام لینا چاہتی ہے۔''

''آنٹی سیلی کوئی قتل وغیرہ تو نہیں کرانا چاہتی.....''

''آنٹی جو بھی کام دے گی، وہ کر دوں گا، انکار کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔'' وہ بولا۔

''ایسی کیا مجبوری ہے کہ جو انکار نہیں کر سکتے؟''

''گھر کی تجوری بالکل خالی ہو چکی ہے، گزارے کے لیے رقم کی ضرورت ہے۔'' جارج نے کہا۔

''ایسے کام کی ہامی نہیں بھر لینا، جسے انجام دیتے ہی جیل جانا پڑ جائے۔''

''زندگی میں کبھی جیل نہیں گیا، اس بات سے اندازہ لگا سکتے ہو کہ میں کس قدر محتاط انداز سے اپنا کام سرانجام دیتا ہوں۔''

''اس بات کی داد دینا پڑے گی، تم واقعی بڑی مہارت سے اپنا کام کرتے ہو، میری ضرورت پڑے تو ضرور یاد کر لینا۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

''ضرور.....'' جارج نے کہا۔

اسی اثنا میں ایک فیشن ایبل بوڑھی خاتون بار میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر جارج نے اپنی سیٹ چھوڑ دی۔ وہ سیلی ہی تھی، جو جارج کو دیکھ کر مسکرائی تھی۔

وہ دونوں ایک خالی میز پر جا کر بیٹھ گئے۔ وہ میز ڈیوڈ سے زیادہ دور نہ تھی، وہ بہت محتاط ہو کر باتیں کر رہے تھے لیکن ڈیوڈ ان کی گفتگو آسانی سے سن رہا تھا۔ اسے دونوں کی باتیں واضح طور پر سنائی دے رہی تھیں، لیکن وہ ایسے بن گیا تھا کہ اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے۔ آنٹی سیلی کہہ رہی تھی۔

''جارج تمہیں یہ کام ہر حالت میں کرنا ہے۔''

''میں نے کب انکار کیا ہے لیکن میری محنت کا معاوضہ کچھ بڑھا دو۔''

''جو معاوضہ میں دے رہی ہوں، وہ کیا کم ہے؟''

''ہاں کم ہے، تم ایک انسان کو میرے ہاتھوں قتل کرانا چاہ رہی ہو، میں ایسے کام کرتا نہیں ہوں لیکن تمہاری خاطر کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔''

''میں نے تمہاری بہت تعریف سنی ہے اس لیے تم سے رابطہ کیا ہے۔''

''لوگ اگر میری تعریف کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ میں جس کام کا ذمہ لیتا ہوں، اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر دم لیتا ہوں، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ قتل کی وارداتوں میں بھی ملوث ہوں۔''

''جب تم نے پہلے کسی کا قتل نہیں کیا، پھر اسمتھ کو کیسے قتل کر دو گے؟'' وہ چونکی۔

''قتل کی وارداتیں کرنے والے ملزم کبھی بھی قتل کرنے کا اقرار نہیں کرتے، میری مثال بھی ایسی ہی ہے۔'' جارج نے کہا۔

اس کی بات پر آنٹی سیلی مسکرائی اور کہا کہ اسمتھ کو ایسے قتل کرنا ہے کہ یہ موت حادثاتی لگے۔ کسی پلاننگ کا نتیجہ نہیں۔

''ہر کام میں پیسے کے لیے کرتا ہوں، قتل کی واردات بھی ایسے ہی کروں گا کہ کوئی نہیں جان سکے گا کہ اسمتھ کا قتل ہوا ہے بلکہ لوگ اسے حادثہ ہی تصور کریں گے۔''

''بالکل میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ لوگ اسمتھ کی موت کو حادثہ ہی جانیں۔''

''معاوضہ میری مرضی کا ہوگا۔''

''تم کتنا معاوضہ لینا چاہتے ہو؟''

''ڈبل۔''

''ڈبل معاوضہ ایک قتل کے لیے؟'' وہ چونکی۔

''یہ قتل تمہاری قسمت بدل دے گا اور تم مجھے معمولی

معاوضے پر ٹرخا دینا چاہتی ہو۔"

"میرے مرحوم شوہر اینڈریو کی دولت تو ملنی ہے، اس میں تمہاری محنت کہاں سے آ گئی۔" آنٹی سیلی غصے سے بولی۔

"اچھا..... مان لیتا ہوں کہ جو دولت تمہیں ملے گی، وہ تمہارے شوہر کی ہے، لیکن وہ دولت تمہیں اسی صورت میں ملے گی، جب تمہارا بھتیجا اسمتھ راستے سے ہٹ جائے گا۔"

"میرے شوہر نے اپنے بھتیجے کو اپنی جائداد میں قانونی طور پر شریک کر دیا ہے۔"

"اسے تم پر اعتماد نہیں ہوگا۔"

"اعتماد تو اسے تھا، لیکن وہ میری فضول خرچی کی عادت سے پریشان رہتا تھا، وہ چاہتا تھا کہ میں اپنی فضول خرچی کی عادت پر قابو پالوں، لیکن میں کنجوسی کس کے لیے کروں، شوہر سے مجھے کوئی اولاد نہیں ہے، اس کا ایک بھتیجا ہے جو اس کے کاروبار میں ہاتھ بٹاتا ہے، میں کنجوسی کروں گی، اور وہ میرے مرنے پر میرے شوہر کی چھوڑی دولت پر اسمتھ اور اس کی ہونے والی بیوی گولڈی عیش کریں، ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ اگر وہ میری بھتیجی ادا سے شادی پر رضامند ہو جاتا تو بھی ٹھیک تھا۔" وہ بولی۔

"تم چاہتی ہو کہ شوہر کی دولت پر اکیلے عیش کرو؟" جارج نے کہا۔

"نہیں کوئی اور بھی ہے۔" آنٹی سیلی مسکرائی۔

"اور کون؟" جارج نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"نکولس..... وہ میری زندگی میں اگر نہ آتا تو میری زندگی پھیکی، پھیکی گزرتی، لیکن اب ایسا نہیں ہوگا، ہم دونوں عیش و عشرت کی زندگی گزاریں گے۔"

"اسمتھ کے مرنے پر جو اس کے نام بیمہ پالیسی ہے، اس کی رقم بھی تو تمہارے پاس آئے گی۔" جارج نے کہا۔

"تم بہت تیز آدمی ہو۔" وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔

"جرائم کی دنیا میں سیدھے بھولے بھالے لوگوں کا کوئی کام نہیں ہوتا، وہ اناڑی پن کی وجہ سے پہلی واردات میں پکڑے جاتے ہیں اور ساتھ ہی جس کے کہنے پر وہ واردات کی ہوتی ہے، اسے بھی پھنسا دیتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، میں تمہیں ڈبل معاوضہ دے دوں گی۔" وہ بولی۔

"میری طرف سے ڈن ہے۔" جارج نے کہا۔

امارت کے نشے میں چور..... کمزوروں پر ظلم اور اپنے زیردست لوگوں کی عزتوں کو پامال کرنے والے ظالموں کی خودسری و دیدہ دلیری.....!

اسے اپنی محبت کو حاصل کرنے کا جنون بھی تھا اور مجرموں سے ٹکرانے کا حوصلہ بھی۔

تہلکہ خیز واقعات کا سلسلہ.....

سسپنس کے صفحات پر جلد آرہا ہے

سیلی کچھ دیر جارج کے پاس بیٹھ کر وہاں سے چلی گئی لیکن ڈیوڈ کی سمجھ میں ساری کہانی آ گئی کہ آنٹی سیلی اس عمر میں کسی نکولس نامی شخص کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے اور وہ اسمتھ سے اپنی بھتیجی لارا سے شادی نہ کرنے پر اسے شوہر کی دولت سے دور کرنے کے لیے مروانا چاہتی ہے۔

آنٹی سیلی کے جانے پر جارج اس کے پاس آ گیا۔

''کیا معاملات ہیں، میرا مطلب ہے کہ وہ تم سے کیا کام لینا چاہتی ہے؟''

''ہم دونوں کے درمیان جو معاملات طے ہو گئے ہیں وہ میں بتا نہیں سکتا۔''

''جانتا ہوں، یہ تمہارے کام کا حصہ ہے کہ کسی کو کچھ نہ بتایا جائے۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

''ہمارے کام میں سب سے زیادہ رازداری چلتی ہے، اگر میں تم سے تمہارے کام کے حوالے سے پوچھوں تو کیا تم مجھے بتاؤ گے؟''

''نہیں۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

''بس پھر تم سمجھ جاؤ۔'' جارج نے کہا۔

ڈیوڈ بار میں زیادہ دیر بیٹھنا نہیں چاہتا تھا اس لیے وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے فلیٹ پر آ گیا۔ گھر آ کر بھی اس کے ذہن میں یہی بات گردش کر رہی تھی، مجھے کچھ ایسا کرنا چاہیے کہ عزت کی زندگی بسر کر سکوں۔

صبح ڈیوڈ ناشتے سے فارغ ہو کر قریبی اسٹور چلا گیا۔ وہاں سے اسے کھانے پینے کا سامان لینا تھا۔ اچانک اس کی نظر سیلی پر پڑی، جو رات جارج سے ملنے آئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان غالباً وہ اس کا بھتیجا ہی تھا، اس کے ساتھ تھا۔ وہ کیش کاؤنٹر پر تھے۔ کاؤنٹر پر رقم دے کر وہ جنرل اسٹور سے باہر نکل گئے۔ انہوں نے ڈیوڈ کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ سامان لینے کے بجائے ان کے پیچھے لپکا۔ جب ڈیوڈ باہر آیا۔ وہ اپنی کار میں بیٹھ چکے تھے۔ ڈیوڈ نے بھی اپنی کار اسٹارٹ کی اور ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ ایک پلازا آجانے پر انہوں نے کار پارکنگ میں پارک کی اور پلازا کے اندر داخل ہو گئے۔ ڈیوڈ نے بھی کار پارک کی اور ان کے پیچھے لپکا۔

یہ اتفاق ہی ہے کہ ان دونوں نے ڈیوڈ کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ لفٹ میں داخل ہوئے، وہ بھی ان کے ساتھ لفٹ میں سوار ہو گیا۔ چوتھے فلور پر وہ لفٹ سے باہر آئے تو ڈیوڈ بھی باہر نکل آیا۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے فلیٹ نمبر 155 کے اندر چلے گئے۔ ڈیوڈ نے کچھ دیر رک کر اپنی تسلی کر لی کہ وہ فلیٹ سے باہر نہیں آئیں گے۔ اس کا مطلب ہے، انہی کا ہی فلیٹ ہے۔ یہ تسلی ہو جانے پر ڈیوڈ واپس لفٹ میں سوار ہو کر نیچے چلا آیا۔ پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے ڈیوڈ سوچ رہا تھا کہ وہ کیوں ان کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آیا ہے۔ ڈیوڈ کے ذہن میں کوئی پلاننگ بھی نہیں تھی۔ وہ بغیر کسی مقصد کے ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ ڈیوڈ کو یہ خود بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ بس ایک تجسس یہاں تک لے آیا تھا۔ جب اس نے اپنی کار کا دروازہ کھولنا چاہا، پستول کی نال اس کی پیٹھ پر لگ گئی۔ اس نے جب پلٹ کر دیکھا تو اسمتھ کھڑا تھا۔

''پستول لگانے کا مقصد؟'' ڈیوڈ نے کہا۔

''تم جنرل اسٹور سے ہمارا تعاقب کر رہے ہو، کیوں؟'' وہ غصے سے بولا۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے میں بھلا کیوں تمہارا تعاقب کروں گا؟''

''تم نے مجھے بے وقوف سمجھا ہے، صاف صاف بتاؤ، کیوں میرا تعاقب کر رہے ہو؟'' وہ غصے سے بولا۔

ڈیوڈ سوچ میں پڑ گیا۔ اسے اصل بات بتائے یا نہیں۔ اسے سوچتا دیکھ کر اس نے غصے سے ڈیوڈ کو دیکھا۔

''دیکھو کسی قسم کی کوئی ہوشیاری مت کرنا، ورنہ میں گولی چلانے میں کسی قسم کی تاخیر نہیں کروں گا۔''

''میرا خیال ہے، تمہیں ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دینا چاہیے۔''

''میں بھی تم سے یہی چاہ رہا ہوں۔''

''کیوں نا ہم کسی اچھی جگہ بیٹھ کر پُرسکون ماحول میں بات چیت کر لیں۔''

''یہاں پُرسکون جگہ قریبی پارک ہی ہو سکتا ہے۔'' اس نے کہا۔

وہ دونوں پارک میں آ گئے۔ اس وقت پارک میں لوگ کم ہی تھے۔ وہ ایک جگہ کا انتخاب کر کے، وہاں بیٹھ گئے۔

''اب جلدی سے شروع ہو جاؤ، کہ تم ہمارا تعاقب کیوں کر رہے تھے اور کسی قسم کی ہوشیاری مت کرنا ورنہ پستول نکالنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔'' اس نے کہا۔

''پستول میرے پاس بھی ہے، لیکن میں پُرامن ماحول میں بات بتانا چاہتا ہوں کہ تمہاری جان کو خطرہ ہے۔'' ڈیوڈ نے اپنا پستول دکھایا۔

''کون میری جان لینا چاہتا ہے؟'' اس نے ڈیوڈ کی

آنکھوں میں انکھیں ڈال کر پوچھا۔

''تمہاری آنٹی سیلی جسے تم بہت اچھا سمجھتے ہو جس کے کہنے پر تم نے بیمہ پالیسی لی ہے۔''

''بیمہ پالیسی میں نے اپنی مرضی سے لی ہے۔'' اس نے کہا۔

''لیکن تمہاری حادثاتی موت پر بیمہ پالیسی کی رقم آنٹی سیلی کو ہی ملے گی۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

اسمتھ اس کی بات پر چونکا۔

''یہ حادثاتی موت کیسے ہوگی؟''

''پیر کے دن تم ایک خاص میٹنگ میں جاؤ گے، اس میٹنگ میں شرکت کرنے سے پہلے تم پر حملہ ہوگا جسے ڈکیتی کا رنگ دیا جائے گا۔'' ڈیوڈ نے بتایا۔

''پیر کے دن واقعی مجھے ایک کاروباری میٹنگ میں شرکت کرنی ہے۔'' اسمتھ نے کہا۔

''تمہاری موت سے آنٹی سیلی کو ہی فائدہ ہوگا۔''

''تمہاری بات پر میں کیسے یقین کرلوں؟'' اس نے پوچھا۔

میری بات پر یقین کر لینے میں ہی تمہارا فائدہ ہے بات نہ ماننے پر کسی اور کا نہیں تمہارا ہی نقصان ہوگا۔'' ڈیوڈ نے یہ کہتے ہوئے آنٹی سیلی اور جارج کی ہونے والی بات چیت دُہرا دی۔

وہ سوچ میں پڑ گیا، اور کچھ دیر سوچ کر بولا۔

''آنٹی سیلی کو جب مجھے قتل کرنا ہی ہے تو انہیں کسی بندے کی کیا ضرورت پڑ گئی، وہ مجھے زہر دے کر قتل کر سکتی ہیں نا؟''

''گھر میں تمہارے قتل ہو جانے پر پولیس آنٹی سیلی کو پکڑ لے گی اور وہ ساری دولت اور بیمے کی رقم سے بھی محروم ہو جائے گی۔''

''اچھا یہ وجہ ہے مجھے دوسرے بندے سے قتل کرانے کی، تم نے اسی لیے ہمارا تعاقب کیا کہ دیکھ سکو گے ہم کہاں رہتے ہیں۔''

''بالکل یہی بات ہے۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

''پیر کے دن مجھے واقعی ایک میٹنگ میں جانا ہے، میں محتاط رہوں گا۔ تم میرے ایور گرین پلازا پہنچنے سے پہلے وہاں پہنچ جانا، تاکہ تم موقع واردات کی جگہ پر نظر رکھ سکو۔ میٹنگ میں ابھی ایک ہفتہ باقی ہے، تم اس دوران مجھ سے رابطے میں رہنا۔'' اسمتھ نے اسے اپنا موبائل نمبر دیتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

اگلے دن ڈیوڈ بار میں بیٹھا تھا کہ آنٹی سیلی آ گئی۔ وہ ایک ٹیبل پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر گزرنے پر جارج بھی آ گیا۔ وہ بھی خوش دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سیدھا آنٹی سیلی کے پاس گیا اور اس کی ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ آنٹی سیلی کے ہاتھ میں بریف کیس دیکھ کر بولا۔

''تم آج میری پوری ڈیمانڈ کرنے آئی ہو؟''

''پوری نہیں آدھی۔'' وہ بولی۔ ''آدھی کام ہو جانے پر ہوگی۔''

''کیا مجھ پر یقین نہیں ہے۔''

''یقین ہے تبھی آدھی رقم دے رہی ہوں۔'' اس نے بریف کیس جارج کی طرف بڑھا دیا۔

جارج نے بریف کیس کھول کر دیکھا۔ اس میں نوٹوں کی گڈیاں واضح طور پر دکھائی دے رہی تھیں۔

''قتل کی واردات کو میں خود بھی دور سے دیکھوں گی۔'' آنٹی سیلی نے کہا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' جارج نے کہا۔

آنٹی سیلی اور جارج قتل کی واردات کے باریک پہلوؤں پر غور کرتے رہے۔ ان کی بات چیت مکمل ہونے پر جارج ایک جھٹکے سے اٹھا اور بریف کیس کو اپنے ہاتھوں میں لیے بار سے باہر نکل گیا۔ آنٹی سیلی اور جارج اس بات سے بے خبر تھے کہ ڈیوڈ نے ان دونوں کی موبائل میں وڈیو بنا لی ہے۔ وہ وڈیو ڈیوڈ نے اسی وقت اسمتھ کو بھیج دی۔ وڈیو بھیجنے کے چند لمحوں کے بعد ہی اسمتھ کی کال آ گئی۔

''تمہاری باتوں پر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا، لیکن ان پر یقین کر لینے پر میرا ہی فائدہ تھا، اب وڈیو دیکھ کر پکا یقین ہو گیا ہے کہ تمہاری بات سو فیصد درست ہے۔''

''قسمت تمہیں بچانا چاہ رہی ہے۔ اسی لیے ہماری ملاقات ہو گئی۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

''یہ بہت اچھا ہو گیا۔'' وہ بولا۔

''ہاں بالکل یہی بات ہے۔''

''مجھے بھی اپنے ذرائع سے یہ بات معلوم ہو گئی ہے کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہیں۔'' اس نے کہا۔

''کیا معلوم ہوا ہے؟'' ڈیوڈ نے پوچھا۔

''گولڈی کو میں پسند کرتا ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں، یہ بات ان کو پسند نہیں ہے، آنٹی سیلی اپنی بھتیجی لارا سے میری شادی کرانا چاہتی ہیں، میرے انکار پر وہ خاموش ہو گئی تھیں لیکن جب انہیں پتا چلا کہ میں گولڈی سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو وہ غصے سے آگ بگولا ہو گئی تھیں،

کیونکہ گولڈی کے والد نکولس سے جوانی میں آنٹی شادی کرنا چاہتی تھیں لیکن انہوں نے آنٹی کو لفٹ نہیں کرائی۔ اس بات کا انہیں بہت صدمہ تھا۔ جب میں نے ان کی بیٹی سے شادی کرنا چاہا تو سب سے زیادہ تکلیف آنٹی سیلی کو ہی ہوئی۔ انہوں نے مجھے سمجھایا کہ میں گولڈی سے شادی نہ کروں، میں وقتی طور پر چپ رہا۔ وہ بھی خاموش رہیں، میرا خیال تھا۔ وہ شادی کے لیے مان جائیں گی لیکن میری سوچ غلط تھی، وہ کچھ وقت کے لیے خاموش ہوگئی تھیں۔''

''جب تم میٹنگ میں شرکت کرنے جاؤ گے، جارج تم پر حملہ کرے گا، اور حملہ کرنے سے پہلے واقعے کو ڈکیتی کا رنگ دینے کے لیے جارج پستول نکال کر موبائل مانگے گا، اس سے پہلے تم جارج پر فائر کر دینا، اس طرح تم قتل ہونے سے بچ جاؤ گے۔''

''بے فکر رہو، وہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔''

''میں آنٹی سیلی پر نظر رکھوں گا اگر انہوں نے کوئی حرکت کی میں ان پر فائر کرنے میں دیر نہیں کروں گا۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

''ٹھیک ہے تم آنٹی پر بھرپور نظر رکھنا۔'' اس نے کہا۔

''ایسا ہی ہوگا۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

☆☆☆

میٹنگ والے دن ڈیوڈ مطلوبہ مقام پر پہنچ گیا اور قریبی ایک پارک میں تھا۔ جہاں سے وہ علاقے پر بھرپور نظر رکھ سکے اچانک ڈیوڈ کی نظر ایک کار پر پڑی۔ وہ کار آنٹی کی نہ تھی جس میں سے آنٹی برآمد ہوئی، اس کار کے پچھلے دروازے سے جارج بھی باہر آگیا۔ وہ دونوں ساتھ آئے تھے۔ آنٹی سیلی نے اِدھر، اُدھر دیکھا اور واپس کار میں بیٹھ گئی۔ آنٹی سیلی ضرورت سے زیادہ ہی ہوشیاری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس لیے اس نے رینٹ کی کار استعمال کی تھی، تاکہ وہ فرار ہوں تو کسی کو پتا نہیں چلے کہ وہ واردات کے وقت وہاں موجود تھی۔ جارج کار پارکنگ میں لے گیا۔ وہ چوکس نظر آرہا تھا۔ کچھ دیر گزرنے پر اسمتھ کی کار بھی آگئی، وہ جیسے ہی کار سے باہر نکلا، جارج تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔ ڈیوڈ بھی اس وقت پارک سے باہر آچکا تھا اور آنٹی سیلی کی کار کے نزدیک ہی تھا۔ اچانک آنٹی سیلی کی کار کا دروازہ کھلا اور آنٹی سیلی کار سے باہر آگئی۔ اس نے اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا اور ہاتھ میں پستول بھی تھا۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ آئی تھی۔ وہ اسمتھ کو زندہ چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جارج کے ہاتھوں بچ بھی گیا تو آنٹی سیلی اسے زندہ نہ چھوڑتی۔ گولی چاہے آنٹی کے پستول سے نکلے، اسمتھ کے قتل ہونے پر قتل کا الزام جارج پر ہی آئے گا۔ ڈیوڈ نے بھی اپنا پستول نکال لیا۔ دور سے بظاہر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جارج اس سے موبائل اور پرس مانگ رہا ہے، اس کے ہاتھ میں پستول بھی تھا۔ اسمتھ نے جارج پر گولی چلا دی۔ جارج گولی لگتے ہی، زمین پر گر گیا۔ اسمتھ نے دو تین فائر کر کے جارج کو اس قابل نہیں چھوڑا کہ وہ اسمتھ پر حملہ کر سکے۔ آنٹی سیلی نے جارج کو زمین پر گرتا دیکھ کر چیرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فائر کر دیا۔ اس کا نشانہ خطا گیا۔ اس سے پہلے کہ آنٹی سیلی دوسرا فائر کرتی، ڈیوڈ نے ان پر فائر کر دیا۔ گولی انٹی سیلی کے ہاتھ پر لگی اور پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔ گولی لگنے پر آنٹی سیلی بوکھلا گئی، اسے اندازہ نہیں تھا، کوئی ان پر بھی نظر رکھے ہوئے ہے۔ وہ تیزی سے کار کی طرف لپکی۔ ڈیوڈ نے دوسرا فائر کر دیا۔ گولی اس کی دائیں ران میں لگی اور وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑی۔ ڈیوڈ آنٹی سیلی کے قریب گیا اور جس پستول سے اس نے فائر کیا تھا وہ اپنے قبضے میں لے لیا۔

''کون ہو تم.....؟''

''مجھے ڈیوڈ کہتے ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی، تم نے میرا سارا منصوبہ خاک میں ملا دیا۔'' وہ غصے سے غرائی۔

''دیکھا جائے گا فی الحال تو تمہیں جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔''

فائرنگ کی آواز سن کر پولیس موبائل فوراً ہی وہاں پہنچ گئی۔ دونوں زخمیوں کو پولیس نے حراست میں لے لیا۔ ان دونوں کو بھی پولیس کے ساتھ تھانے جانا پڑا۔ کاغذی کارروائی مکمل ہو جانے پر اسمتھ اور ڈیوڈ کو چھوڑ دیا گیا۔ وہ دونوں گولیاں نہ چلاتے تو جارج اور آنٹی سیلی اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے۔ عدالت میں مقدمہ چلنے پر یہ بات ثابت ہوگئی کہ آنٹی سیلی اور جارج مل کر اسمتھ کو قتل کر دینا چاہتے تھے۔ اس لیے دونوں کو عدالت سے سزا ہوگئی۔

اسمتھ نے اپنی جان بچ جانے پر ڈیوڈ کو اپنی فرم میں نوکری دے کر عزت کی زندگی گزارنے کا موقع دے دیا جو وہ چاہ رہا تھا، وہ ہو گیا تھا۔

❖❖❖

اُلّو نے جھیل کے کنارے صنوبر کے جھنڈ میں پرواز کرتے ہوئے ایسی کرخت چیخ بلند کی کہ تاریکی کا سینہ چاک ہوگیا۔ رات کی خاموشی یکا یک ٹوٹ کر بکھر گئی اور پہاڑوں کے سیاہ سائے اس چیخ کی گونج کو پلٹا کر لوٹاتے رہے۔

ڈاکٹر پال لیفنگ وہیں سڑک کے کنارے گاڑی کے پاس ساکت کھڑا خاموشی سے لرز اٹھا۔

وہ بے حرکت وہیں کھڑا تھا جہاں اُس نے تنگ سیاہ سڑک سے کافی ہٹ کر گاڑی روک رکھی تھی، اس آواز کو سنتا

قاتل ڈاکٹر

مظہر حسین

مصیبت میں گھبرا جانا گویا بڑی مصیبت کو دعوت دینا ہے... فون کال سنتے ہی وہ بھی حواس کھو بیٹھا اور گھبراہٹ میں وہ کر بیٹھا، جو کسی طور مناسب نہ تھا...

ایک ڈاکٹر کی کامیاب منصوبہ بندی کا سنسنی خیز انجام.....

ہوا جو جھیل کے پار دور جا رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ صرف اُلو کی عام رات والی پکار ہے جو شکار ڈھونڈتے ہوئے لگاتا ہے لیکن پھر بھی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتی کپکپی کو وہ روک نہ سکا جو گردن کے پچھلے حصے تک سرک آئی تھی۔

ڈاکٹر لیننگ لمبا، دُبلا اور سیدھا سادہ شہری آدمی تھا۔ اسے سان برنارڈینو کے پہاڑی علاقے میں اس جنگلی جھیل کا ماحول ہمیشہ عجیب لگتا تھا۔ دن کے وقت یہ جگہ خوبصورت لگتی تھی۔ جھیل، کھیل، اور ایک مشہور سیاحتی مقام کی سہولیات سب کچھ اچھا نظر آتا تھا لیکن رات ہوتے ہی ماحول بدل جاتا تھا۔ اندھیرے میں لگتا جیسے درختوں کے پیچھے کوئی چھپی ہوئی چیزیں حرکت کر رہی ہوں اور جھیل کے اوپر کی ہوا میں کوئی انجانی بے چینی پھیلی ہو۔ اسے رات کے وقت پہاڑوں کی گہری تاریکی پسند نہ تھی۔ وہ اس سے نفرت کرتا تھا۔

وہ گاڑی کے پاس ہی تقریباً سمٹ کر اس انتظار میں کھڑا رہا کہ اُلو کی چیخ پھر سنائی دے مگر آواز پھر نہ آئی لیکن وہ پھر بھی دم بخود تھا جیسے بچ پنجوں والے چوہے اس کی ننگی کمر پر دوڑ گئے ہوں۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر قصاب کے چھرے کے دستے کو مضبوطی سے تھام لیا؛ عجیب بات ہے، اس سے کچھ ڈھارس بندھی۔

خود کو سنبھالنا ہوگا، اس نے دل میں کہا۔ یہاں باہر ڈرنے کی کوئی چیز نہیں۔

یہ بات درست تھی۔ اس پہاڑی مقام کی وحشت میں خوف کی کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ اگر ریچھ یا پہاڑی شیر کہیں ہوں بھی تو اس سلسلہ کوہ کے صحرا والی سمت میں ہوں گے، اس گنجان آباد تفریحی حصے سے دور۔

اگر ڈاکٹر پال لیننگ کو کسی چیز سے ڈرنا تھا تو وہ اس کیبن میں تھا جو جھیل کے کنارے سے سو قدم پیچھے، درختوں کے پردوں کے بیچ چھنی ہوئی روشنی دکھا رہا تھا۔ اسی چھوٹے ریڈ وڈ کے کیبن میں ڈاکٹر لیننگ کا واحد خطرہ موجود تھا..... اسٹیو تھورن۔ مگر یہ خطرہ اب زیادہ دیر تک باقی رہنے والا نہ تھا۔ لمبے بلیڈ والے چاقو پر گرفت سخت کرتے ہوئے ڈاکٹر لیننگ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ آج رات تھورن مرنے والا تھا۔

منصوبے کے عین مطابق اس نے چابی اگنیشن میں ہی چھوڑ دی۔ یہ سارا معاملہ اس نے ایک نازک جراحی عمل کے نقشے کی طرح ایسی باریک بینی سے سوچ رکھا تھا کہ کوئی گرہ باقی نہ رہے۔ اسے گمان تھا کہ اسٹیو تھورن کو قتل کرنے کے بعد تیزی سے فرار کی نوبت شاید نہ آئے مگر وہ اس معمولی امکان کو بھی قسمت کے حوالے کرنے والا نہیں تھا۔ چنانچہ جب وہ گاڑی سے اترا تو چابی اسی اگنیشن ہی میں رہنے دی۔

وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھانے لگا۔ درختوں کے نیچے پھیلی صنوبر کی جھاڑیوں کی گھنی تہ ایسی دبیز تھی کہ قدموں کی سرسراہٹ بھی سانس بن کر دب گئی۔ ایک کشادہ میدان پر پہنچ کر رکا، پلٹ کر نگاہ ڈالی اور ذہن میں گاڑی تک واپسی کے راستے کی سمتیں نہایت احتیاط سے مرتب کرنے لگا۔ اسے اندیشہ تھا کہ تھورن کے جسم میں چاقو پیوست کرنے کے بعد خوف غالب آ سکتا ہے یا اپنے کیے ہوئے قتل کے صدمے سے ذہن اُلجھ کر گھبراہٹ میں مبتلا ہو جائے۔ وہ تاریکی میں بھٹکنا نہیں چاہتا تھا، سو اس نے واپسی کے اپنے نشان واضح کر لیے۔ اس خاکستری گرینائٹ کی اُبھری ہوئی چٹان کے پہلو سے گزرتا ہوا، پھر اس درخت کے قریب سے جس کی چوٹی آسمانی بجلی کی نذر ہو چکی تھی۔ اور ایک سیدھی لکیر جو اسے اوٹ میں چھپی گاڑی تک واپس پہنچا دے۔

وہ اطمینان سے سر ہلاتا ہوا میدان عبور کر کے کیبن کی سمت بڑھ گیا۔ اب گھڑی آن پہنچی تھی، دل پر خوف کی کوئی دُھند نہ تھی گمان تو تھا کہ لرزہ طاری ہوگا مگر ایسا نہ ہوا۔ وہ زینے چڑھ کر دروازے پر دستک دینے لگا۔ اندر کسی کے ہلنے کی صاف آواز آئی..... جیسے کرسی کھسکائی جا رہی ہو..... اور ایک آواز گونجی۔

''کون ہے؟''

ڈاکٹر لیننگ نے جواب نہ دیتے ہوئے پھر سے دستک دی۔

کیبن کے اندر سے ایک بے صبری بڑبڑاہٹ سنائی دی اور فرش پر قدموں کی ٹھک ٹھک۔ دروازہ کھلا، سامنے اسٹیو تھورن تھا..... یوں جیسے قتل ہونے کے لیے منتظر ہو۔

تھورن نے جھنجلا کر پلکیں سکیڑیں..... چھوٹے قد کا، ڈھیلا ڈھالا پُرگوشت والا آدمی، سبز مائل آنکھیں اور سرخ ہونٹ۔ ''تم جانتے تھے ڈاکٹر، میں پڑھنے بیٹھا ہوں گا۔ اپنا نام اونچی آواز سے پکار کر اندر کیوں نہیں آ گئے؟''

لیننگ نے سوچا کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی دوسرے کیبن والا اس کا نام سن لے؟ نہیں، وہ خوشگوار انداز میں مسکرا دیا۔ ''تمہیں چلنے پھرنے کی ضرورت تھی، اسٹیو۔''

''مجھے جتنی ورزش چاہیے، میں وہ چاقو اور کانٹے کی مدد سے کر لیتا ہوں۔''

تھورن تیزی سے بولا۔ ''یا اپنے بینک میں چیک جمع

کرا کے؟" اس کے سرخ ہونٹ طنزیہ مسکراہٹ میں ڈھل گئے۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔

"اپنی ماہانہ ادائیگی ساتھ لائے ہو، ڈاکٹر؟"

ڈاکٹر لینگ نے فوراً جواب نہ دیا۔ اس نے تھورن کو دیکھا جو آہستہ قدموں سے چلتا ہوا کمرے کے پار اپنی آرام دہ کرسی تک گیا۔ تھورن وہاں بیٹھ گیا اور تیز آہ بھری۔ لینگ نے دیکھا کہ کھڑکیوں پر پڑے پردوں سے روشنی اندر نہیں آ رہی تھی۔ سوائے اس کے اور تھورن کے، کیبن خالی تھا۔

تھورن کی مسکراہٹ خباثت بھری تھی۔ "تمہاری ماہانہ ادائیگی کا کیا بنا، ڈاکٹر؟ اسے ساتھ لائے ہو؟"

لینگ کمرے کے اندر ٹہلنے لگا اور موٹے تھورن کی کرسی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ وہ نیچے جھکا اور اپنے مطمئن ہونے پر ہلکا سا حیران ہوا مگر فوراً ہی اسے اس کی وجہ سمجھ آ گئی۔ جب آدمی کافی عرصے تک کسی قتل کا منصوبہ بناتا رہے تو اصل عمل، جب وہ انجام پاتا ہے، بہت آسان ہو جاتا ہے، ذہن پہلے ہی بازو کے تیز وار اور موت کی جھٹکے بھری اذیت کے لیے تیار ہو چکا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ آخری قسط ہے، اسٹیو۔"

تھورن کی مسکراہٹ ایک آہستہ سی طنزیہ ہنسی میں بدل گئی۔

"یہ جملہ تم پہلے بھی دہرا چکے ہو، ڈاکٹر ..... مگر میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا ہے۔ جب تک میرے پاس یہ ثبوت محفوظ ہے کہ تم بیورلی ہلز کی نشے کی عادی خواتین کو ادویات فروخت کرتے ہو، تم اپنی 'آخری قسط' کبھی ادا نہیں کر سکو گے۔ فلمی دنیا اور سماجی اشرافیہ کی جو عورتیں نشے کے لیے تمہیں بھاری رقم دیتی ہیں، ان میں سے میرا ماہانہ حصہ بنتا ہے۔ اگر تم نے کوئی چالاکی دکھائی تو وہ آڈیو ریکارڈنگ جو میرے پاس ہے، اسے میں پولیس کے حوالے کر دوں گا بلکہ شاید یہ بھی بتا دوں کہ پچھلے برس جس اداکارہ نے نیند کی گولیوں سے اپنی جان لی تھی، اسے وہ گولیاں کس نے مہیا کی تھیں۔"

تھورن کی آواز سپاٹ ہو گئی۔ "ڈاکٹر، میرے ساتھ کبھی ہوشیاری دکھانے کی کوشش نہ کرنا اور ادائیگی روکنے کا سوچنا بھی مت۔ ادائیگی کرو اور یہاں سے نکل جاؤ۔"

"ٹھیک ہے۔" لینگ نے کہا۔ یہ بہت آسان تھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور چاقو تھام لیا۔ اس کی نگاہ تھورن کی قمیص کے کالر سے نیچے تیسرے بٹن پر جم گئی۔ اس نے چاقو باہر نکالا اور سیدھا اس کے سینے میں پیوست کر دیا۔ کوئی چیخ نہیں نکلی، خون بھی زیادہ نہیں نکلا۔ اس نے

تھورن کے چہرے پر پھیلتی اذیت کی جھلک دیکھی مگر وہ کئی شکلوں اور کئی صورتوں میں موت دیکھ چکا تھا اس لیے اسے کوئی خلش محسوس نہ ہوئی۔ تھورن اپنی کرسی میں ڈھے سا گیا، وہ اکڑتے ہوئے یوں مڑا جیسے گھٹنے ٹیکنے کی کوشش کر رہا ہو، اور پھر فرش پر لیٹ گیا۔

وہ ابھی مرا نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں فرش سے اوپر لینگ کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں، درد سے دھندلائی ہوئی۔ اس کا ہاتھ سینے سے اٹھا، جس پر خون لگا ہوا تھا۔ وہ سرگوشی میں بولا۔ "ڈاکٹر خدا کے لیے..... ڈاکٹر!"

مشورہ

کسان نے ایک بیل اور ایک گدھا پال رکھا تھا۔ ایک دن بیل نے گدھے سے کہا۔ "بھائی میں اپنی زندگی سے بہت تنگ آ گیا ہوں۔ صبح سے رات گئے تک کام سے لگا رہتا ہوں، ڈنڈے الگ کھانے پڑتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح نجات حاصل کروں؟"

گدھے نے جواب دیا۔ "میری سمجھ میں ایک ترکیب آئی ہے۔ اس پر عمل کرو، شاید کچھ آرام مل جائے۔"

بیل نے بے چینی سے پوچھا۔ "وہ کیا، بھائی جلدی سے بتاؤ۔"

گدھے نے کہا۔ "کل صبح تم سر جھکا کر آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاؤ۔ کسان تمہیں چارا دے، اسے مت کھاؤ۔ وہ تمہیں بیمار سمجھ کر چھوڑ جائے گا، سارا دن آرام کر لینا۔"

بیل نے دوسرے دن گدھے کے مشورے پر عمل کیا۔ کسان نے اس کی یہ حالت جو دیکھی تو اس نے بیل کو تو باڑے ہی میں رہنے دیا اور اس کی جگہ گدھے کو پکڑ لیا۔ اسے دن بھر کام میں لگائے رکھا اور اتنی پٹائی کی کہ گدھے کی عقل ٹھکانے آ گئی، وہ اپنے مشورے پر بہت پچھتایا۔

رات کو جب یہ دونوں پھر اکٹھے ہوئے تو بیل نے خوش ہو کر کہا۔ "تمہارے مشورے کا بہت بہت شکریہ۔ میرا کل پھر آرام کرنے کا ارادہ ہے۔"

گدھے کی جان ہی تو نکل گئی، جل کر بولا۔ "لیکن آج جو تمہاری بابت باتیں ہوئی ہیں، وہ بھی تو سن لو۔"

بیل نے پوچھا۔ "وہ کیا؟"

گدھے نے جواب دیا۔ "آج کسان اپنے دوستوں سے کہہ رہا تھا کہ بیل اگر کل تک اچھا نہ ہوا تو اسے قسائی کے ہاتھ بیچ دوں گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم گھاس کھانا شروع کر دو، ورنہ اب تم ہو گے، قسائی ہوگا اور اس کی چھری ہوگی۔"

بیل گھبرا کر صحت مند اور گدھا ایک دن کی مار کھا کر نڈھال ہو گیا۔

کراچی سے کاشف عمران کا مشاہدہ

لیتگ کی مسکراہٹ رعونیت بھری تھی۔ نہ ترس، نہ پشیمانی۔

"آخری قسط، اسٹیو۔ میں نے کہا تھا نا یہی آخری تھی۔"

اس نے رخ موڑا، اسے معلوم تھا کہ کہاں دیکھنا ہے۔ اسٹیو تھورن جب بھی لاس اینجلس سے باہر جاتا کیمرے کا بیگ ساتھ لے کر جاتا تھا۔ وہ اتنا مست انسان تھا کہ کبھی کیمرے میں دل چسپی نہیں لے سکتا تھا اور اس کا واحد شوق پیسہ تھا۔ اس لیے آڈیو ریکارڈنگ کا ریکارڈ صرف لیتگ کو معلوم تھا، وہ اسی کیمرا کیس میں ہوگا۔

اس نے کیمرا کیس کھولا اور مسکراتے ہوئے کالا سلنڈری تکے جیسا خول باہر نکالا، اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ چمڑے پر انگلیوں کے نشان نہ رہ جائیں۔

وہ پلٹا، اور فرش پر پڑے آدمی کی طرف دیکھا۔

"انسانی ذہن بڑی عجب کروٹیں لیتا ہے، اسٹیو..... کبھی زر کی چمک میں، کبھی اختیار کے فریب میں۔ تمہاری زندگی کی اصل سرمستی زر نہیں تھی بلکہ مجھ پر قابو رکھنے کا موہوم احساس..... یہی تمہاری زندگی کی اصل لذت تھی۔ تم مجھ سے رقم بٹورتے رہے اور اس آڈیو ریکارڈ کو اپنے قریب رکھنا تمہیں سکون دیتا تھا۔ بس یہی تمہاری غلطی تھی، اسٹیو۔ اب تم جانتے ہو، نہیں؟ میں یہ ریکارڈ بہت پہلے چرا سکتا تھا، مگر تم بولنے سے باز نہ آتے۔"

وہ فرش پر پڑے آدمی کے قریب جھکا اور اپنے رومال سے چاقو کے دستے پر رگڑ دی۔ اس کی نگاہیں مسلسل تھورن کی مدھم پڑتی آنکھوں میں جمی رہیں۔ "اب آڈیو ریکارڈ میرے پاس ہے..... اور تم بول بھی نہیں سکتے۔"

وہ چہرے پر طمانیت سجائے خوشی سے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ نہ کوئی دہشت، نہ کوئی تذبذب، نہ کیے ہوئے کام پر کوئی گھبراہٹ۔ تھورن کی مرتی ہوئی آنکھوں میں شعور جب بجھ جائے گا تو اسٹیو تھورن بھی ختم ہو جائے گا۔ پولیس اس کا تعلق مردہ آدمی سے جوڑ نہ سکے گی اور لاس اینجلس کے بارڈویئر اسٹور سے خریدا ہوا یہ سستا چاقو نشان زد بھی نہ ہوگا۔ مرتے ہوئے آدمی کی آنکھیں بند ہوئیں، پھر آہستہ سے پھڑپھڑائیں اور دوبارہ کھلیں۔ اس کی انگلیاں اپنے ہی خون سے لال اس کے سامنے فرش پر رینگنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر لیتگ دروازے کے پاس کھڑا اس آدمی کو دیکھتا اور اس کے مرنے کا انتظار کرتا رہا۔ آنکھیں کھلی رہیں مگر خون آلود انگلیوں کی جنبش تھم گئی.....

☆☆☆

پال لیتگ کے کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی ایک بار بجی، رکی، پھر، پھر زور سے بجی۔ وہ بستر پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا..... نیند ابھی تک غالب تھی..... اس نے ریسیور اٹھا لیا۔

"آپ ہیں، ڈاکٹر؟"

"ہاں۔" اس کی آواز رات گئے کمرے میں پہنچنے کے بعد بھاری نیند سے دبی ہوئی تھی۔

آدمی کی آواز ریسیور سے اچھل کر آئی..... تیز اور بیتاب۔ "میں پولیس افسر بول رہا ہوں..... جم کین۔ مجھے آپ کی مدد چاہیے، ڈاکٹر۔ ایک آدمی کو چھرا مارا گیا ہے۔ جتنا جلدی ہو سکے یہاں آ جائیں۔" اور فون کٹ گیا۔

پال لیتگ کا ذہن چونک کر جاگ اٹھا..... خوف کی ایک تیز لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی، دل نے سینے کی دیواروں پر مکے برسانا شروع کر دیے، ماتھے اور ہاتھوں پر ٹھنڈے پسینے کی نمی ابھر آئی۔

تو اسٹیو تھورن آخر کار مرا نہیں تھا۔ وہ کسی طرح زندہ رہ گیا تھا..... اور اب بھی زندہ تھا۔ اسے سینے میں پیوست چاقو کے ساتھ زندہ پایا گیا تھا اور اب پولیس افسر طبی مدد مانگ رہا تھا تاکہ اسے اتنی دیر تک زندہ رکھا جا سکے کہ وہ بول سکے۔

گھبراہٹ نے پال لیتگ پر یلغار کر دی۔ وہ بستر سے چھلانگ مار کر اٹھا اور کپڑوں کی طرف لپکا لیکن اگلے ہی لمحے رک گیا..... اچانک سمجھ گیا کہ ابھی بھاگنے کی کوشش کرنا گویا اپنے جرم کا ثبوت دینا ہوگا۔ یہ ایک جبلی خیال تھا..... جرم اور بے بسی میں جڑا ہوا۔

وہ ہوٹل کے کمرے میں تناؤ کی حالت میں ہی کھڑا رہا..... اور اپنے ذہن کی بے قابو ہڑبونگ کو تھامنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے سوچا، اگر تھورن ہوش میں ہوتا اور بات کرنے کے قابل ہوتا تو افسر مجھے فون نہ کرتا۔

یہ سوچ اس کی گھبراہٹ کا کچھ بوجھ اتار گئی۔ اگر تھورن بے ہوش ہے تو پھر خطرہ نہیں۔ یہ تو معجزہ ہے کہ وہ اب تک زندہ ہے، مگر جلد مر جائے گا۔ جس جگہ لیتگ نے نوک دار چاقو پیوست کیا ہے، وہاں سینے میں چاقو کے ساتھ کوئی زیادہ دیر تک نہیں جیتا۔ لیتگ نے چالاکی سے سوچا۔ مجھے بس اتنا کرنا ہے کہ وہاں پہنچنے میں اتنی دیر لگا دوں کہ وہ مر چکا ہو.....

مگر یہ خیال اتنا اچھا بھی نہ تھا۔ اس میں بے یقینی بہت تھی، خطرہ بہت۔ پولیس افسر اپنا سارا انحصار ایک ہی ڈاکٹر پر ہرگز نہ رکھتا۔ اس نے یقینی طور پر تفریحی مقام کے

ہر ہوٹل میں فون کیا ہوگا، یہ پوچھتے ہوئے کہ کوئی ڈاکٹر جھیل پر چھٹیاں گزار رہا ہے یا نہیں، اور سب کو ایک ہی درخواست دی ہوگی۔

اگر میں اس کی کال کا جواب نہ دوں، لینگ نے خود سے کہا، تو انہیں شبہ ہوگا۔ اگر میں وہاں نہ گیا تو کوئی دوسرا ڈاکٹر چلا جائے گا۔ مجھے پہلے پہنچنا ہے۔ اگر میں پہلا ڈاکٹر بن کر پہنچ گیا تو میں تھورن کو ایسی چیز دے سکتا ہوں جو اسے موت تک بے ہوش رکھے۔

اس نے پاجامہ اتار پھینکا اور کپڑے پہننے لگا، خوف سے اکڑی ہوئی انگلیاں بٹنوں پر لڑکھڑا رہی تھیں۔ اس نے کوٹ کی آستینوں میں بازو ٹھونس دیے ـــــ استر پھٹ گیا اور اسے خبر بھی نہ ہوئی۔ اس نے اپنا سیاہ چمڑے کا بیگ اٹھایا اور کمرے سے نکل گیا، ہوٹل کی راہداری میں تیزی سے دوڑتا ہوا۔ باہر دیکھا تو سورج جھیل کے پار صنوبر کے اونچے نکیلے پیڑوں سے اوپر نکل آیا تھا، اسے تعجب سا ہوا کہ وہ اتنی دیر سویا رہا اور یہ بھی کہ اسٹیو تھورن سینے میں چاقو پیوست ہونے کے باوجود اتنی دیر زندہ رہ سکا۔

سڑک جھیل کے نیلگوں کنارے کے ساتھ ساتھ سانپ کی طرح بل کھاتی چلی جا رہی تھی۔ دونوں جانب صنوبر کے درختوں کی قطاریں اور اس لمحے کی خنکی فضا میں رس گھول رہی تھی۔ وہ مایوسی کے بوجھ تلے تیز رفتاری سے گاڑی دوڑاتا رہا، کبھی ٹیلوں پر چڑھتا، کبھی سبز سایہ دار وادیوں میں اترتا۔ اچانک سڑک دو حصوں میں بٹ گئی، اور پکی سڑک شمالی کنارے کی سمت مڑ کر ایک سفید ساحل کے ساتھ ساتھ چلنے لگی، جہاں چھوٹی چھوٹی لہریں آ کر پھیل جاتیں، پھر پلٹ کر غائب ہو جاتیں۔

ڈاکٹر لینگ نے تھورن کے کیبن کے پہلو میں ڈرائیو پر گاڑی آہستہ سے روکی اور جیسے ہی اس نے دیکھا کہ اس سے پہلے صرف پولیس کی ایک گاڑی موجود ہے تو لمحے بھر کے لیے اس کے دل پر سکون و اطمینان چھا گیا۔

پولیس افسر نے اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔ وہ آدمی لمبا اور دبلا پتلا تھا۔ ''آیئے اندر، ڈاکٹر ـــــ آپ اچھے وقت پر پہنچے ہیں۔''

بس اتنا ہی کہا مگر اس کے لہجے میں کچھ تھا ـــــ سختی اور ایک طرح کا مطمئن سا رنگ ـــــ جس پر لینگ نے لمحہ بھر کو خیال کیا مگر یہ سوچ اس کے ذہن کی سطح ہی پر رگڑ کھا کر رہ گئی؛ کوئی نشان نہ چھوڑ سکی۔

وہ اسٹیو تھورن کی لاش کو گھور رہا تھا ـــــ تھیلن کے ہاتھ پر خون کے خشک بھورے پن کو، اور ننگے فرش پر اس کے کھینچے ہوئے مبہم نقوش کو۔ D.O.C تھورن نے اپنے پیچھے ایک پیغام چھوڑنے کی کوشش کی تھی ـــــ اپنے قاتل کا نام لکھتے ہوئے ـــــ مگر ہوش جاتے جاتے وہ صرف یہی تین حروف کھینچ سکا۔

لینگ جھکا اور اپنا طبی بیگ جھٹکے سے کھول دیا۔ اس نے اسٹیو تھورن کا ہاتھ اٹھایا اور فوراً چھوڑ دیا ـــــ اس ہاتھ میں نبض نہیں تھی۔ اس کے لمس پر گوشت ٹھنڈا تھا، اور موت کے بعد کی اکڑن شروع ہو چکی تھی۔

لینگ سنبھل کر کھڑا ہوا اور فرش پر پڑی لاش کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''کیوں ـــــ'' اس کی آواز دھیمی اور بھدی تھی۔ ''کیوں بھلا، یہ آدمی تو کئی گھنٹوں پہلے مر چکا ہے۔''

''بالکل ٹھیک۔'' پولیس افسر نے کہا۔ ''ٹھیک کہا، ڈاکٹر۔''

پال لینگ کو یہ بات سمجھنے میں وقت لگا۔ اس کا ذہن خوف اور دہشت سے بھیگا ہوا ایک اسپنج تھا، پولیس افسر کی کہی بات دماغ میں اترنے میں دیر لگ رہی تھی..... بالآخر وہم نے اس کے ذہن میں ایک بے رحم خاکہ بنا لیا ـــــ اور وہ کانپ کر رہ گیا۔ وہ پلٹا اور ترچھی نگاہوں سے افسر کو دیکھنے لگا۔

افسر مسکرا رہا تھا مگر اس کا ہاتھ پستول پر تھا۔ ''خیال ہے تمہیں سمجھ آ گئی ہے کہ معاملہ کیا ہے، ہے نا؟''

لینگ بس اُسے بدحواسی میں گھورتا رہ گیا۔ ہاں، وہ جانتا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں بنائے ہوئے اس سیاہ جہنم میں جھانک کر اپنے مستقبل کی ہولناکی کو اپنے سامنے آنکھیں جلا کر سسکتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا۔

''میں نے جھیل کے کنارے جس جس ڈاکٹر کا پتا چل سکا، سب کو فون کیا۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ تھورن نے فرش پر کیا لکھنے کی کوشش کی تھی، تو میں نے سب کو وہی بات کہی جو تمہیں کہی ـــــ جتنا جلدی ہو سکے یہاں پہنچ جاؤ۔ مگر میں نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ کہاں آنا ہے! آنے کی جگہ صرف تمہیں معلوم تھی، لینگ۔ اب تم خود سمجھ سکتے ہو کہ تمہارے لیے اس کا مطلب کیا بنتا ہے۔ اچھا نہیں ہے، ہے نا؟ اور بعد میں یہ تمہارے لیے اور بھی بُرا ہوگا۔''

..... لینگ نے آنکھیں بند کر لیں، مگر کچھ فرق نہ پڑا۔ اس کے ذہن کے پردے پر..... تقدیر اب بھی نقش تھی ـــــ ایسی تقدیر جو تیزاب سے کھینچی گئی تصویر کی طرح تھی، سیاہ اور بے رحم۔ آنکھیں سختی سے بند رکھنے پر بھی وہ منظر اس کے سامنے تھا، اور فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

❖❖❖

نیلگری

یعقوب بھٹی

خاموش اور پُرسکون مقامات ہر ایک کو مرغوب نہیں ہوتے۔ سیر و سیاحت... اچھی آب و ہوا اور کوہ نوردی کا جنون کچھ لوگوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ ایسے ہی سرپھرے کوہ نوردوں کے دشوار ترین سفر کی سنسنی خیز روداد... ہر قدم پر موت منتظر کھڑی تھی... جرم اور کھوج ان کے قدموں کو تیز تر کر رہے تھے۔ ایک انوکھی دنیا کے باسیوں نے انہیں حیران و پریشان کر دیا تھا۔

نانگا پربت کے برفانی پہاڑوں پر گامزن مہم جوؤں کی سنسنی خیز روداد

مطلع صاف تھا اور شفاف دن کی روشنی میں نانگا پربت کا ''دیامر فیس'' اپنی پوری ہیبت اور شان و شوکت کے ساتھ نمایاں نظر آ رہا تھا۔ گلیشیئرز کو چھو کر آنے والی ہواؤں نے خنکی کا احساس مزید بڑھا دیا تھا۔ موسم سرما دادی کے دروازے پر دستک دے رہا تھا، ایسے میں ان علاقوں میں چلنے والے مخصوص اور طاقتور پرانے ماڈل کی جیپ بازار میں داخل ہوئی تو مختصر سے بازار کا جیسے سکوت ٹوٹ گیا۔ جیپ بازار میں داخل ہوتے ہی ایک چائے خانے کے سامنے رکی۔ جیپ ڈرائیور نے سر باہر نکال کر بلتی زبان میں چائے خانے والے سے پوچھا۔

''شجاع سد پارہ کہاں ملے گا؟''

ہوٹل والے نے کہا۔ ''یہاں دو شجاع سد پارہ ہیں۔ ایک ڈرائی فروٹ والا اور دوسرا مشہور پورٹر جو آب بارڈویئر اسٹور چلا رہا ہے۔'' اس دوران ہوٹل والا اٹھ کر جیپ کے قریب آ گیا تھا۔ اس کی چندھی چندھی آنکھوں میں دلچسپی تھی۔ جیپ میں ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر دُبلا پتلا اور سانولا سا دھیز عمر شخص بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کی مخصوص خشکی اور بے رونقی سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی زندگی پہاڑوں پر گزری ہے۔ عقبی نشست پر جیکٹ میں ملبوس ایک نوجوان لڑکی تھی۔ خدوخال سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ یورپ کے کسی ملک کی باسی ہے۔ اس کے چہرے اور شفاف آنکھوں میں بڑی معصومیت تھی۔ وہ دلچسپی سے ڈرائیور اور ہوٹل والے کا مکالمہ سن رہی تھی۔

ہوٹل والے نے جیپ کے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔ ''یقیناً تمہیں شجاع سد پارہ پورٹر کے پاس جانا ہے؟ ڈرائی فروٹ والے میں بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔''

ڈرائیور نے سر اندر کر کے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اس بارے میں سانولی رنگت والے سے استفسار کیا تو ہوٹل والے کے اندازے کے عین مطابق سانولی رنگت والے نے فیصلہ سنایا۔

ڈرائیور نے دوبارہ سر نکال کر ہوٹل والے کو اس بارے میں بتایا تو اس نے کہا۔ ''سیدھا چلے جاؤ، بازار کے اختتام پر سدپارہ ہارڈ ویئر اسٹور تمہاری منزل ہے۔''

ڈرائیور نے بلتی میں ہوٹل والے کا شکریہ ادا کیا اور پھر جیپ آگے بڑھادی۔ بازار کا اختتام جلد ہی ہوگیا اور ڈرائیور نے جیپ سدپارہ ہارڈ ویئر اسٹور کارنگ کھایا اور بے رنگ سائن بورڈ دیکھتے ہی اس کے سامنے روک دی۔ ہارڈ ویئر اسٹور سے زیادہ یہ کباڑ خانہ لگتا تھا۔

اسٹور کے باہر ایک نوجوان پرانے ماڈل کی ایک اسکوٹر کے ساتھ نبرد آزما تھا۔ نوجوان کی رنگت اور چہرے کی خشکی آنے والے ادھیڑ عمر شخص جیسی ہی تھی مگر جوانی کی سرخی اور تروتازگی سلامت تھی۔

نوجوان کا رخ جیپ کی طرف ہی تھا۔ لحظہ بھر کو رک کر اس نے سر اٹھایا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

مرد نے جیپ سے دو عدد ریک سیک (کمر پر باندھے جانے والے مخصوص قسم کے تھیلے) اتارے اور ڈرائیور کو ادائیگی کی۔ اس دوران لڑکی دلچسپی سے اسکوٹر سے نبرد آزما نوجوان کو دیکھنے لگی، حالانکہ وہ خود مرکزِ نگاہ تھی۔ آس پاس کے دکاندار اسے دیکھتے ہوئے ایک دوسرے کو ذومعنی اشارے کررہے تھے، راہ چلتے لوگوں کی نگاہیں اس پر تھیں۔ ڈرائیور جیپ کو واپس گھمانے کے بجائے سیدھا لیتا چلا گیا۔

ادھیڑ عمر نے دونوں ریک سیک اٹھا کر ہارڈ ویئر اسٹور کی میلی سی سیڑھیوں پر رکھے تو نوجوان ان کی طرف متوجہ ہوا۔ ادھیڑ عمر نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا اندازہ غلط نہیں تو تم یقیناً شجاع ہو۔ تم میں وارث سدپارہ کی شباہت بڑی واضح ہے۔''

نوجوان نے ایک کپڑے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے انگریزی ہی میں جواب دیا۔

''تمہارا اندازہ درست ہے مگر تم میرے باپ کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟''

ادھیڑ عمر نے اس کا سوال نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ہوں یادو شرپا اور میرے ساتھ ہے کیرولینا ہاڈوولف — اس کا تعلق جرمنی سے ہے۔''

شجاع کی نظریں یادو پر جمی تھیں، اس نے دخل اندازی کی۔ ''اور تمہارا تعلق یقیناً نیپال سے ہے۔ نیپالی شرپا اور جرمن کوہ پیما ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور تم دونوں یقیناً یہاں میری بطور پورٹر خدمات کے حصول کے لیے آئے ہو؟'' اس کا لہجہ روکھا ہوگیا تھا۔ ''ایسا ہی ہے نا؟''

یادو کے ہونٹ مسکرانے کے انداز میں کھنچ گئے۔ اس نے حسبِ سابق شجاع کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں ہمیں کہیں بیٹھ کر بات کرنی چاہیے۔ ہم تمہارے پاس بطور مہمان آئے ہیں اور تمہاری

روایات سے میں بھی کسی حد تک واقف ہوں۔"

شجاع قدرے ڈھیلا پڑ گیا۔ "اندر آجاؤ۔" ساتھ ہی اس کا انداز وارننگ دینے والا ہوا۔ "اگر تمہارا ارادہ مجھے اپنے ساتھ کسی مہم پر لے جانے کا ہے تو قہوہ پی کر واپس چلے جاؤ۔ واپسی کے لیے جیپ کا انتظام میں کردوں گا۔"

دکان کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کیرولینا نے کہا۔ "ہم نے تمہاری قہوے کی دعوت فی الحال قبول کرلی ہے۔" اس کی جرمن زدہ انگریزی بمشکل ہی شجاع سمجھ پایا۔ جواب میں اس نے شستہ جرمن زبان میں کہا۔

"اس سے بہتر تھا تم جرمن میں ہی بات کرلیتیں۔"

کیرولینا کو خوشگوار حیرت ہوئی۔ "زبان سے زیادہ مخصوص لہجے نے مجھے حیران کردیا ہے۔ لگتا ہے تم نے جرمنی میں خاصا وقت گزارا ہے؟"

اس دوران وہ دکان کے اندرونی حصے میں پہنچ گئے تھے۔ پرانے صوفے پر رکھا سامان ہٹاتے ہوئے شجاع نے کہا۔

"جرمنی میں تو نہیں مگر ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک زیادہ واسطہ جرمن کوہ پیماؤں سے ہی پڑا ہے۔ قاتل پہاڑ (نانگا پربت) پر سر پہنچنے کے لیے زیادہ دیوانگی تمہارے لوگوں میں پائی جاتی ہے..... تم دونوں یہاں بیٹھ سکتے ہو۔"

وہ دونوں صوفے پر ایک ساتھ بیٹھ گئے۔ شجاع دکان سے باہر نکل گیا۔

کیرولینا نے دکان پر نگاہ دوڑائی۔ "اس کی مالی حالت تو پتلی لگ رہی ہے۔ میرے خیال میں راضی کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ تم آفر ڈبل کردینا۔"

یادو نے ٹوٹی پھوٹی جرمن میں جواب دیا۔ "اس کا راضی ہونا آسان نہیں ہے، خیر میرے پاس اور بھی منتر ہیں۔"

شجاع کو آتے دیکھ کر دونوں خاموش ہوگئے۔

شجاع ان کے مقابل ایک لکڑی کے اسٹول پر بیٹھ گیا اور بغلوں میں ہاتھ دیتے ہوئے بولا۔ "ہم بیٹھ چکے..... کرو کیا بات کرنی ہے؟"

یادو نے اس کے چہرے پر نگاہ رکھی۔ "نیلگری..... ہم اس کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔"

شجاع کی رنگت پل بھر کے لیے متغیر ہوئی مگر اگلے لمحے وہ ہنسی کے ساتھ بولا۔ "ایک افسانوی مخلوق جسے مقامی لوگ نیلگری پری کہتے ہیں..... جس کی دید لوگوں سے ہوش وحواس ہمیشہ کے لیے چھین لیتی ہے اور وہ برف زاروں میں اسے پکارتے پکارتے کسی دن ہمیشہ کے لیے اس برف میں دفن ہوجاتے ہیں..... تم اس افسانوی مخلوق کے بارے میں گفتگو کرنے کے لیے میرے پاس آئے ہو؟ مجھے یقین نہیں آرہا۔"

یادو کی سنجیدگی دوچند ہوگئی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں..... بلکہ اس نیلگری کے بارے میں جس کا ذکر تمہارے باپ کی ملنے والی ڈائری میں ہے اور تمہیں ایک پیشگی خطرے سے آگاہ کردوں..... کچھ خطرناک لوگ اس ڈائری کے حصول کے لیے سرگرم ہوچکے ہیں۔"

لمحے بھر کو شجاع سکتے میں رہ گیا۔ اس دوران ایک گول مٹول، سرخ وسفید مگر میلا میلا سا دس، بارہ سال کا لڑکا دکان میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جس میں خشک خوبانیاں اور سمور سے ڈھکی قہوے دانی تھی۔

ماحول کی گمبھیرتا پل بھر میں غائب ہوگئی۔ شجاع نے بڑھ کر لڑکے سے ٹرے سنبھالی۔ لڑکے نے چور نظروں سے کیرولینا کی طرف دیکھا۔ اتفاق سے کیرولینا بھی اسی کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کی چوری پکڑتے ہوئے وہ مسکرائی تو لڑکے کی کانوں کی لوئیں تک سرخ ہوگئیں۔ وہ بڑی تیزی سے واپس پلٹ گیا۔

شجاع نے درمیان میں ایک اور اسٹول رکھ کر ٹرے اس پر رکھ دی۔ دونوں کی نظریں اس پر تھیں جو سنبھالا لے چکا تھا۔ وہ بولا۔

"میرے باپ کی ڈائری کوئی انہونی چیز نہیں ہے۔ اس کے مندرجات کا عکس ملکی وغیر ملکی میڈیا میں خوب اودھم مچا چکا ہے۔ وہیں سے تو مقامی نیلگری کو بین الاقوامی شہرت ملی ہے۔ میں خطرناک لوگوں کو ہاتھ باندھ کر وہ ڈائری پیش کردوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے قہوہ دانی سے سمور ہٹایا اور پیالیوں میں بھاپ اڑاتا قہوہ انڈیلنے لگا۔ اس نے اپنے لیے بھی قہوہ انڈیلا تھا۔

دونوں کی توجہ قہوہ کی طرف نہ پاکر شجاع نے کہا۔ "اس موسم میں ہر چیز جلدی ٹھنڈی ہوجاتی ہے، خاص طور پر قہوہ۔" ساتھ ہی اس نے اپنی پیالی اٹھالی۔

کیرولینا نے جلدی سے اس کی پیروی کی جبکہ یادو بدستور اس کے چہرے پر نظریں جمائے رہا۔ شجاع نے چسکی لیتے ہوئے کیرولینا سے کہا۔ "قہوے کے ساتھ خشک خوبانی بھی لو۔ یہ ذائقہ تمہارے لیے یادگار رہے گا۔" پھر وہ یادو کی طرف متوجہ ہوا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہیں کیا میری فکر یہاں تک لائی ہے؟"

یادو نے طویل سانس لیا۔ "کسی حد تک۔ چار سال پہلے انہی پہاڑوں میں ایک مہم کے دوران وارث سد پارہ

نے میری جان بچائی تھی۔ میرے ساتھی مجھے مردہ سمجھ چکے تھے مگر وہی تھا جو میری موت کی تصدیق کے بغیر آگے بڑھنے سے انکاری تھا۔ باقی پورٹر بھی اس کے ہمنوا ہو گئے اور مجبوراً میرے ساتھیوں کو رکنا پڑا۔" یادو کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی اور اس نم آلود اسکرین پر جیسے مناظر تیزی سے ابھر رہے تھے۔

"وہ میری خاطر دیوانہ وار برف سے لڑا اور جب میری سانسیں ٹوٹنے لگی تھیں، وہ زندگی بخش ہوا کے ساتھ مجھ تک پہنچ گیا۔ وارث ہیرو تھا، ایک گمنام ہیرو ـــــ جسے ستائش کی ذرا بھی پروا یا ضرورت نہیں تھی۔" یہ کہتے ہوئے یادو نے اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک جدید قسم کا موبائل فون نکالا۔

شجاع کا یہ سنتے ہوئے اپنے باپ پر فخر اور زیادہ ہونے لگا اور اس کے نقوش میں نرمی اور گداز دھیرے دھیرے اترنے لگے۔ یادو نے موبائل اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ اس موقع کی کچھ تصاویر ہیں۔ میں نے البم پلے کر دیا ہے۔"

شجاع نے موبائل لے لیا۔ مخصوص لباس اور چشمے میں اس کا باپ مسکرا رہا تھا۔ داڑھی کے بالوں میں برف پھنسی تھی اور اس منظر میں ہولناک برفانی ویرانہ تھا۔ دوسری تصویر میں یادو نے بڑی محبت اور عقیدت سے اس کے باپ کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ ایک اور تصویر میں پورٹرز کراس کے باپ کو ہوا میں اچھال رہے تھے۔ وہ بھی خوش تھے ـــ بے انتہا خوش۔ شجاع اس خوشی کا سبب جانتا تھا۔ جب پورٹر کسی مہم سے صحیح سلامت بیس کیمپ واپس پہنچ جاتے تھے، جیبوں میں معقول رقم ہوتی تھی اور کوہ پیماؤں کا بچا ہوا سامان ان کے درمیان تقسیم ہو جاتا تھا تو وہ اپنی خوشی کا اظہار "سردار پورٹر" کو یونہی ہوا میں اچھال کر کرتے تھے۔ اپنے اہل و عیال میں سلامت لوٹنے کی خوشی کم نہیں ہوتی تھی ورنہ یہ جان جوکھم میں ڈالنے والا کام تھا۔ موت ہر قدم پر منہ پھاڑے ہڑپ کرنے کو تیار ہوتی تھی۔

تصویریں دیکھتے ہوئے شجاع کی آنکھوں سے بے آواز آنسو گرنے لگے۔ قہوے کی پیالی اس نے ٹرے میں رکھ دی۔ یادو نے اٹھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"تم نے باپ کھویا ہے ـــ تمہارا درد میں سمجھ سکتا ہوں۔"

شجاع نے آنکھیں مسلیں۔ "میں نے باپ کو کھویا ہے مگر دل نہیں مانتا۔ دلِ خوش فہم کو اس کے اچانک لوٹ آنے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ دروازے پر دستک ہو تو لگتا ہے وہ لوٹ آیا ہے ـــ اس کا لاشہ مل جاتا تو کم از کم دل کو یہ تسلی تو مل جاتی کہ وہ مر گیا ہے اور مرنے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔" اس کا لہجہ آنسوؤں سے بھیگنے لگا۔

"میری ماں نے دروازے کی طرف دیکھتے دیکھتے اپنی جان دی ہے۔ اسے بھی میرے باپ کا دکھ کھا گیا اور یہی دکھ مجھے بھی چاٹ رہا ہے۔" یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

یادو نے اس کے گرد بانہیں پھیلا دیں۔ کیرولینا نے آج تک کسی مرد کو اس طرح روتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ پریشان ہو گئی اور قہوہ چھوڑ کر ان کے قریب چلی آئی۔

یادو نے کہا۔ "ہمت سے کام لو۔ تمہارے پاس آنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا۔ ہم ایک سفر کی تیاری کر رہے ہیں۔ منزل وہی مقام ہے جہاں تمہارے باپ اور دیگر ٹیم ممبران کے ساتھ کوئی انہونی ہوئی تھی۔ عین ممکن ہے تمہارے باپ کی کوئی خبر وہاں مل جائے۔ ہماری خواہش تھی کہ اس سفر میں تم ہمارے ساتھ چلو۔"

شجاع نے اس کے بازوؤں کا گھیرا توڑا اور آنکھیں ہتھیلیوں سے صاف کرتے ہوئے تیزی سے اپنے خول میں سمٹنے لگا۔ "تمہاری پیشکش کا شکریہ۔ میں جذباتی ہو گیا تھا۔ میرا باپ یقیناً سیکڑوں ٹن برف کے نیچے دبا ہے اور اس کی ڈیڈ باڈی ڈھونڈنا بھوسے کے ڈھیر سے سوئی ڈھونڈنے سے زیادہ مشکل ہے۔ اوہ! تمہارا قہوہ ٹھنڈا ہو گیا ہے، میں اور منگواتا ہوں۔"

یادو نے اس کے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ ڈالتے ہوئے اٹھنے سے باز رکھا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم سفر سے آئے ہیں اور بھوک سے برا حال ہے۔ ہمیں کسی ریستوران وغیرہ کی طرف راہنمائی کر دو۔" ساتھ ہی اس نے کیرولینا کو مخصوص اشارہ کیا تو اس نے فوراً پیٹ پر ہاتھ رکھا۔

"اُف ـــ کھانا کھائے مجھے دس گھنٹے سے زائد ہو گئے ہیں۔" ساتھ ہی اس نے خشک خوبانی اٹھا کر منہ میں ڈالی۔

"آؤ میرے ساتھ۔"

یادو کا ہاتھ تھامتے ہی شجاع اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

منظر شجاع کے گھر کا تھا۔ اس علاقے میں بیشتر گھر ایک ہی کمرے پر مشتمل ہوتے ہیں۔ درمیان میں آگ جلتی رہتی ہے، دھواں ایک چمنی کے راستے باہر نکلتا رہتا ہے۔ آگ کھانا وغیرہ بنانے کے علاوہ کمرے کو بھی گرم رکھتی ہے اور اس آگ کے اطراف بستر وغیرہ لگے ہوتے ہیں۔ مہمان آنے کی صورت میں گھر کی خواتین کے لیے ایک پردہ

کھینچ کر اسی کمرے میں علیحدہ "پورشن" بنا دیا جاتا ہے۔

شجاع کی بڑی بہن کی بیٹی مہمانوں کی تواضع کے لیے آموجود ہوئی تھی۔ تیرہ، چودہ سالہ وہ لڑکی امور خانہ داری میں خوب ماہر تھی۔ مہمانوں کو کھانا وغیرہ کھلا کر وہ اب پردے کے عقب میں موجود تھی۔ شجاع مہمانوں کو لاتے ہوئے بھانجی کو بھی قریبی گھر سے لے آیا تھا۔

یادو اور کیرولینا اطمینان سے گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز تھے۔ نیم گرم کمرا ہونے کے سبب دونوں نے بھاری کپڑے اتار دیے تھے۔ جینز اور شرٹ میں کیرولینا کے وجود کی تمام تر رعنائیاں نمایاں تھیں۔ شجاع کی زندگی یورپی ہائیکرز اور کلائمبرز (کوہ پیماؤں) کے ساتھ گزری تھی۔ گوریوں کی بے باکی سے اس کا سامنا رہتا تھا مگر اس وقت ایک ٹانگ دوسری پر چڑھائے نیم دراز اس گوری کے سامنے وہ قدرے غیر آرام دہ محسوس کر رہا تھا۔ شاید اس کا سبب پردے کے دوسری جانب موجود اس کی بھانجی تھی۔ اسی کیفیت میں اس نے قدرے بلند آواز میں گفتگو کا آغاز کیا۔

"تم لوگوں کی اس مہم کا مقصد کیا ہے؟"

جواب کیرولینا کی طرف سے آیا۔ "مقصد کی طرف آتے ہوئے ذرا تمہیں اپنا تفصیلی تعارف کروا دوں۔"

شجاع نے اتفاق کیا۔ "یہ تو بہت اچھی بات ہے۔"

کیرولینا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "سب سے پہلے تو یہ غلط فہمی دور کر لو کہ میں کوئی کوہ پیما ہوں اور یادو میرا گائیڈ یا پورٹر وغیرہ ہے۔"

شجاع کو حیرت ہوئی مگر وہ خاموشی سے سنتا رہا۔

"میرا تعلق مشہور زمانہ "ڈسکوری" چینل سے ہے اور میں بنیادی طور پر وائلڈ لائف فوٹوگرافر ہوں۔" ساتھ وہ دھیمے سے مسکرائی۔ "قدرے مہم جو قسم کی فوٹوگرافر۔ یادو نے حال ہی میں اپنا قدیمی پیشہ "پورٹر" کو خیرباد کہتے ہوئے ہمارا چینل جوائن کیا ہے اور میرے ساتھ دو پروگرام کر چکا ہے جو تم ہمارے آفیشل چینل پر "یوٹیوب" پر دیکھ سکتے ہو۔ امید ہے اب تمہیں اس مہم کے مقصد کا بہتر اندازہ ہو جائے گا۔"

شجاع نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسے پہلی دفعہ قدرے دلچسپی محسوس ہوئی۔ کیرولینا نے مزید کہا۔

"پچھلے سال تقریباً انہی دنوں میں "فاتح نانگا پربت" ہرس بوہل کے پچاس سالہ بیٹے اینڈی بوہل کے سر میں نانگا پربت کے ایک اور "نیس" کی دریافت کا سودا سمایا۔ اسے یقین تھا کہ بیکال کیمپ سے گزر کر رائے کوٹ گلیشیئر کے اس پار ہمالیائی ترائی سے جو نانگا پربت کا نیس نظر آتا ہوگا، وہ ابھی تک ناقابل دریافت ہے اور وہ ایک چار رکنی ٹیم کے ساتھ اس نیس کو دریافت کرنے نکل کھڑا ہوا۔"

کیرولینا کے سانس لینے کے لمحاتی وقفے نے شجاع کو بے چین کر دیا۔ وہ بھلا اس مہم کو کیسے بھول سکتا تھا۔ اس کا باپ انہی لوگوں کے ساتھ بطور پورٹر روانہ ہوا تھا اور پھر لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ کیرولینا کہہ رہی تھی۔

"وارث سدپارہ اسی نیم کے ساتھ تھا اور پھر لوٹ کو نہیں آیا۔"

شجاع نے سر تھام لیا۔ "میرے لیے یہ سب دوبارہ سے جاننا تکلیف دہ ہے۔ میں یہ سب جانتا ہوں۔"

کیرولینا نے کہا۔ "مجھے احساس ہے مگر اس بارے میں بات کرنا بھی ضروری ہے۔ سفر کے بارھویں روز ان لوگوں کا اپنے بیس کیمپ سے رابطہ ٹوٹ گیا۔ اینڈی بوہل کے آخری الفاظ آج بھی ریکارڈ ہیں..... "اوہ! یہ کس قدر حیرت انگیز ہے۔" یہ الفاظ ایک اَن کہی کہانی کا بے ربط ٹکڑا ہے۔" کیرولینا کا لہجہ رفتہ رفتہ سنسنی خیز ہوتا جا رہا تھا۔

"ذرا سوچو، محض تین ہزار میٹر بلندی پر جب موسم بھی موزوں ہو، کسی طوفان وغیرہ کی وارننگ بھی نہیں تھی..... ان لوگوں کا اچانک سے رابطہ کیسے منقطع ہو گیا؟"

شجاع نے کہا۔ "میں اس کا سبب "ایولانچ" کہہ سکتا تھا مگر ٹھیک بارہ دن بعد یہ لوگ برفانی ویرانے میں بھٹکتے ہوئے ملے مگر میرا باپ ان لوگوں میں شامل نہیں تھا۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں دوبارہ بھیگنے لگیں۔

کیرولینا نے پُرجوش انداز میں کہا۔ "بالکل درست — مگر یہ لوگ اپنے ہوش و حواس کھو چکے تھے، بہکی بہکی باتیں کر رہے تھے۔ سب کی زبانوں پر ایک ہی مشترک نام تھا — "ہیلگری"..... جس کے ملکوتی حسن کی بے ربط تعریفیں تھیں۔ جانور جس کے تابع فرمان تھے اور اس کے ساتھ دو عدد برفانی تیندوے محافظ کے طور پر چلتے ہیں۔ ان لوگوں کی بے ربط گفتگو اور خود کلامی کو یکجا کیا جائے تو یہی تصویر نکل کر سامنے آتی ہے۔"

شجاع نے ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ان بلندیوں پر یہ عام بیماری ہے۔ دماغ کو جب آکسیجن کی فراہمی کم ہو جائے تو اس کی کا شکار دماغی خلجان کا شکار ہو جاتے ہیں اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ یہاں ایسے مریض اور بھی تمہیں ملیں گے۔ ان میں سے اکثر وقت کے ساتھ اور ادویات کے سہارے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ حال ہی میں ماؤنٹ ایورسٹ پر علی سدپارہ کے ساتھ بھی تو

یہی ہوا ہے۔ مقامی افراد علی کی کسی اور نسل در نسل منتقل ہونے والے خوف اور قصے کہانیوں کے سبب ایسے افراد کو جن اور پریوں سے منسوب کرتے ہیں جو ان پہاڑوں کی بلندیوں کو پُراسرار رنگ دیتے ہیں..... اس کے علاوہ یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ میرے خیال میں تم ان قصے کہانیوں کو لے کر اپنا وقت کھوٹا کر رہی ہو۔ قصے کہانیوں پر ہی تمہیں پروگرام کرنا ہے تو یہیں کرلو۔ نیلگری نامی پری کے گزیدہ یہاں بھی مل جائیں گے اور ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کی باقاعدہ اس پری سے دوستی ہے اور وہ انہیں ملنے بھی آتی ہے۔ تھوڑے ڈالرز خرچ کر کے ان سے مرضی کے اسکرپٹ پر بھی کام لیا جاسکتا ہے۔''

وہ خاموش ہوا تو کیرولینا کے تاثرات برقرار تھے۔

''آکسیجن کی کمی کا مسئلہ چھ ہزار میٹرز کے آس پاس شروع ہوتا ہے اور یہ بات تم بہتر جانتے ہو۔ علی سدپارہ بنا آکسیجن کے ماؤنٹ ایورسٹ کی بلندیوں کو سر کرنے کی کوشش میں اس کا شکار ہوا تھا۔ تین ہزار میٹرز کے آس پاس اس کیفیت کا شکار ہونا سمجھ سے بالاتر ہے۔ ہمالیہ کی اترائی میں ضرور ان لوگوں کے ساتھ کچھ انوکھا ہوا ہے اور میں جان کر رہوں گی کہ ان کے ساتھ کیا ہوا ہے؟'' اس کا عزم اس کے لہجے کو مضبوط تر بنا رہا تھا۔

شجاع نے کندھے اُچکائے تو کیرولینا نے قدرے تپ کر کہا۔

''تم میرے سوالوں کے جواب دے دو تو میں اس مہم سے دستبردار ہونے کے لیے تیار ہوں۔'' اس کا انداز چیلنج بھرا تھا۔

شجاع نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''مجھے مہم سے تو کوئی لینا دینا نہیں ہے مگر بطور مہمان تمہارے سوالوں کے جواب دینے کی کوشش کرسکتا ہوں۔''

کیرولینا قدرے فاتحانہ انداز میں مسکرائی۔ ''پہلا سوال..... تین ہزار میٹر پر وہ لوگ آکسیجن کی کمی کا شکار کیوں کر ہوسکتے ہیں؟''

''ممکن ہے انہوں نے زیادہ بلندیوں کا رخ کرلیا ہو؟''

کیرولینا نے کہا۔ ''مان لیتے ہیں مگر اس بارے میں انہوں نے بیس کیمپ کو اطلاع دے کر موسم کا حال جاننے کی کوشش کیوں نہیں کی؟''

''انسان غلط فیصلے بھی تو کرتا ہے۔''

اس دوران یادو ہونقوں کے مانند تابڑتوڑ جرمن میں ہونے والی گفتگو سن رہا تھا۔ کچھ اس کے پلے پڑ رہا تھا اور کچھ سر کے اوپر سے گزر رہا تھا۔

''دوسرا سوال..... وہ لوگ بارہ دنوں کے لیے کہاں غائب ہوگئے تھے؟''

''ممکن ہے کہیں بھٹکتے رہے ہوں۔''

''نہیں مسٹر! وہ لوگ خود کھانے پینے کا ہوش بھی گنوا چکے تھے۔ انہیں آج بھی لیکوڈ خوراک دی جارہی ہے۔ بہترین ڈاکٹرز اور طبی سہولیات میسر ہونے کے باوجود ان کی حالت میں چنداں فرق نہیں آیا۔ اس کی کوئی توجیہہ پیش کرسکتے ہو؟ ڈاکٹرز اور ذہنی بیماریوں کے ماہر ترین سمجھے جانے والے پروفیسرز ان کی بیماری کی تشخیص تک نہیں کرپارہے۔ آخر کیا وجہ ہے؟''

شجاع نے ہاتھ کھڑے کردیے۔ ''میرے پاس ان سوالوں کے جواب تو نہیں ہیں۔ یہ ماننا پڑے گا تم نے اس مہم کو لے کر زبردست ہوم ورک کیا ہے۔''

کیرولینا نے تسلیم کیا۔ ''بے شک میں پہلے دن سے ان سوالوں کے تعاقب میں ہوں۔ مہم کی تیاریاں کب کی مکمل ہیں، صرف اس موسم کا انتظار تھا جب قاتل گزھوں میں پڑی برف سخت ہوچکی ہو۔ برف باری کسی بھی وقت شروع ہوسکتی ہو اور موسم کی شدت ابھی قابلِ برداشت ہو..... کیوں کیا کہتے ہو؟''

''میں دوبارہ سے تمہارے ہوم ورک کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوں۔''

اس دفعہ کیرولینا مسکرائی۔ ''میرے سوالوں کے جواب تو نہیں دے سکے..... ایک ذاتی سوال کرلوں؟''

شجاع چونکا۔ ''تم نے متاثر کیا ہے، کیا پوچھنا چاہتی ہو؟''

''تم نے اچانک سے پورٹر کا پیشہ کیوں ترک کردیا؟ حالانکہ وہ پُرکشش آمدنی کا ذریعہ تھا؟''

جواب میں شجاع نے ایک طویل اور ٹھنڈی سانس لی اور دھیمی آواز میں کہا۔ ''میں ڈر گیا ہوں۔ میں کسی برفانی تودے یا کھائی میں دب کر مرنا نہیں چاہتا۔ ایک ایسی موت کہ میرا لاشہ تک دفنانے کے لیے دستیاب نہ ہو۔ مجھے روکھی سوکھی منظور ہے۔''

کیرولینا لحظہ بھر خاموش رہی پھر بولی۔ ''تمہارا یہ فیصلہ اچانک سے اور باپ کی ڈائری کے ملنے کے بعد سامنے آیا تھا۔ میری صاف گوئی کو معاف کردینا..... میرا اندازہ ہے اس فیصلے کے پیچھے کوئی اور وجہ ہے۔ اس وجہ کو جاننے اور اپنے ساتھ مہم کا حصہ بننے کے لیے میں اور یادو منہ مانگا معاوضہ دینے کو تیار ہیں۔'' وہ اچانک ہی کھل کر

سامنے آئی تو شجاع یک ٹک اُسے دیکھے گیا۔ اس نے بھی نگاہ نہیں چرائی اور بولی۔

''کوئی جذباتی فیصلہ کرنے سے پہلے یاد رکھنا..... منہ مانگا معاوضہ جو تمہاری قسمت بدل سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس ڈائری میں ضرور ایسا کچھ تھا جو تم نے ابھی تک چھپا رکھا ہے اور وہی تمہارے اس فیصلے کی وجہ ہے۔''

شجاع نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تمہاری پیشکش میں ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے۔ جو وجہ تھی میں نے بتادی ہے، باقی تم اندازے لگانے میں آزاد ہو۔''

اس موقع پر یادو نے دخل اندازی کی۔ ''تمہارے باپ کا مجھ پر احسان ہے۔ میری خواہش تھی تم ضرور اس مہم میں ہمارے ساتھ ہوتے۔ عین ممکن تھا تمہارے باپ کا کوئی سراغ ہی مل جاتا۔ حالات و واقعات کی روشنی میں ہم نے اسے مردہ تسلیم کرلیا ہے مگر میں ایک ایسی بات جانتا ہوں جو کوئی نہیں جانتا۔ اس لیے ممکن ہے کہ تمہارا باپ زندہ ہو۔ امید کی ایک کرن باقی ہے۔'' اس نے سنسنی خیز انداز میں اپنی پٹاری کا آخری منتر پھونک دیا۔ اس کے اندازے کے عین مطابق شجاع بے چین ہوگیا اور پوچھا۔

''کون سی بات ہے؟ خدا کے لیے یہ کوئی بلف ہے تو میرے جذبات سے مت کھیلو۔''

یادو کا لہجہ مضبوط تر ہوگیا۔ ''معذرت کے ساتھ، یہاں سودے بازی ہوگی۔ باپ کی زندگی کی امید کی کرن کے بارے میں جاننا ہے تو کچھ بتانا بھی ہوگا..... ڈائری میں ایسا کیا تھا کہ تم نے اچانک ہی بلندیوں پر جانے سے توبہ کرلی۔ تمہیں یہ راز بتانا ہی ہوگا۔''

شجاع کے چہرے پر شدید قسم کی کشمکش دیکھ کر یادو نے آخری ضرب لگائی۔ ''میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کے لیے تیار ہوں کہ میرے پاس جو معلومات ہیں، وہ سو فیصد سچ پر مبنی ہیں۔''

شجاع طویل سانس لے کر جیسے کسی فیصلے پر پہنچ گیا۔ ''ٹھیک ہے، مگر پہلے تمہیں اس ''امید کی کرن'' کے بارے میں بات کرنا ہوگی۔''

یادو پُرجوش ہوگیا۔ کیرولینا کا چہرہ بھی خوشی سے دمکنے لگا۔

''ٹھیک ہے۔ باہمی اعتماد کو بڑھانے کے لیے پہل میں کردیتا ہوں۔''

شجاع پوری توجہ سے اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ سنسنی خیز انداز میں بولا۔ ''باپ کی آخری نشانی کے طور پر وہ ڈائری تم تک پہنچی تھی مگر تمہارے حوالے کرنے سے پہلے کچھ طالع آزما اس کا بغور جائزہ لیتے رہے تھے اور پھر تمہارے حوالے کرنے کا فیصلہ ہوا۔ ڈائری میں تمہارے باپ کا لین دین اور ماہانہ خرچ کی تفصیل کے علاوہ جو توجہ کا مرکز تھا، وہ بے ربط جملے اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ تحریر میں تھے جو اینڈی بوہل وغیرہ عالم دیوانگی میں ادا کرتے تھے۔''

اس تمہید نے شجاع کو بے چین کردیا جسے محسوس کرتے ہوئے یادو نے فوراً کہا۔

''وہ ڈائری ان دیوانوں کے پاس سے ملی نہیں تھی بلکہ اسے اینڈی بوہل کی جیکٹ میں پشت کی طرف چھپایا گیا تھا۔'' اس کا لہجہ دھماکا خیز ہوا۔ ''چھپانے والا کون ہوسکتا ہے؟ ضرور اس ڈائری میں ایسا کچھ تھا جسے چھپا کر بھیجنے والا کسی خاص فرد تک پہنچانا چاہتا تھا..... نتیجہ اب تم بڑی آسانی سے اخذ کرسکتے ہو۔ چھپانے والا یقیناً وارث سد پارہ تھا۔ ایسا ہے تو اس کی زندگی کی امید باقی ہے اور یقیناً وہ اپنے ہوش و حواس میں بھی ہے۔ اب ڈائری میں ایسا کیا خاص تھا جو طالع آزما کے ہاتھ نہیں لگا یا پھر وہ سمجھ نہیں پایا؟ ڈائری ''خاص فرد'' کے پاس پہنچی..... یقیناً اس نے پیغام یا پھر اس چیز کو پالیا اور بلندیوں پر جانے سے کنارہ کش ہوگیا۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ کوئی خاص پیغام ہی تھا..... کیوں مسٹر شجاع سد پارہ! کیا کہتے ہو؟''

شجاع نے پل بھر کو آنکھیں موندلیں۔ ''آہ..... یہ تم نے کیا بتادیا ہے۔ میرا اندازہ تھا کہ میرے باپ نے ہوش و حواس کھونے سے پہلے وہ پیغام میرے لیے بھیجا تھا۔ واقعی میں اس واقعے پر زیادہ غور نہیں کرپایا۔ تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں مگر میرا باپ زندہ ہے تو پھر کہاں ہے؟''

کیرولینا نے پُرجوش انداز میں کہا۔ ''اس کا ایک ممکنہ جواب ہے میرے پاس مگر پہلے تم اس پیغام کے بارے میں بتاؤ۔''

شجاع نے اٹھ کر ایک بٹن آن کیا۔ کمرے کے ایک حصے میں زردی روشنی پھیل گئی۔ اس روشنی میں ایک لکڑی کی الماری نظر آرہی تھی جو اس سے پہلے نیم تاریکی میں چھپی تھی۔

کیرولینا اور یادو دلچسپی سے دیکھنے لگے۔ شجاع نے تالا کھول کر الماری کے پٹ وا کیے تو پہلی نظر میں شیشے کے مختلف سائز کے مرتبان نظر آئے جن کے منہ سرخ ریشمی کپڑے سے ڈھکے تھے اور بھی کئی پُراسراری پوٹلیاں اور آتشیں شیشے کی بوتلیں نظر آرہی تھیں۔ کیرولینا تجسس اور دلچسپی سے مجبور ہوکر قریب چلی گئی۔

''یہ سب کیا ہے؟''

شجاع، الماری کے نچلے حصے میں کچھ ٹٹول رہا تھا۔

''میرے باپ کی کچھ یادگاریں۔ وہ ان برف پوش پہاڑیوں پر پائے جانے والی نایاب جڑی بوٹیوں کے ماہرین کی شاید آخری نسل سے تھا۔ ان جڑی بوٹیوں سے وہ کئی بیماریوں کا علاج کر لیتا تھا۔ یہاں کے لوگوں کے لیے وہ ''مسیحا'' تھا۔'' آخر میں وہ افسردہ ہو گیا۔

کیرولینا نے حوصلہ افزا انداز میں کہا۔ ''ممکن ہے مسیحا لوٹ آئے..... امید تو روشن ہو سکتی ہے۔''

شجاع نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے ہاتھ میں سرخ کور والی ایک پرانی اور چھوٹی سی ڈائری نظر آ رہی تھی۔ اس نے یادو سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''تم بھی ادھر روشنی میں آ جاؤ..... وہ پیغام جان لو۔''

یادو دھڑکتے دل کے ساتھ اٹھ کر قریب آ گیا۔

باہر شام اتر رہی تھی اور سورج کی الوداعی کرنوں کی روشنی میں ناگا پربت اور بھی پُراسرار نظر آ رہا تھا۔ اندر وہ تینوں اس ڈائری پر جھکے ہوئے تھے جس میں ایک خاص پیغام پوشیدہ تھا۔

شجاع نے ڈائری کے صفحے پلٹے، دونوں کے دل دھڑک اٹھے تھے۔ اس صفحے پر بلتی زبان میں کچھ تحریر تھا۔ شجاع نے بلند آواز میں پڑھا۔

''اس کا حسن ملکوتی ہے..... وہ جاوداں..... اس کی خوبصورتی اور جمال کو زوال نہیں..... خونخوار درندے بھی اس کے در حسن پر سر جھکاتے ہیں..... وہ نیلگری ہے..... ان ویران برف زاروں کی دیوی..... ہائے نیلگری کہاں ہو؟ مجھے اپنی آغوش میں لے لو۔''

شجاع کے خاموش ہوتے ہی یادو نے تیز لہجے میں کہا۔ ''یہی مندرجات تو ترجمے اور عکس کے ساتھ چھپ چکے ہیں۔ اینڈی بوہل وغیرہ بھی بے ربط انداز میں انہی فقروں کی تکرار کرتے رہتے ہیں۔ اس میں بھلا کیا پیغام ہے؟'' اس کی خشک پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ کیرولینا بھی ناراض نظروں سے شجاع کو دیکھنے لگی۔

شجاع دھیرے سے مسکرایا اور ڈائری بند کرتے ہوئے بولا۔ ''بدگمان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس پیغام سے تمہیں آگاہ کرتا ہوں مگر تم نے میری سوچ کو وسعت دی ہے۔ باپ کی اچانک جدائی نے ذہن کو جکڑ لیا تھا۔ تم لوگوں نے آ کر وہ بند حسن کھولے ہیں تو اچانک ہی خیال آیا ہے کہ جب میرے باپ نے خاص پیغام مجھے بھیجا تو اس کا مطلب ہے اس کے ہوش و حواس سلامت تھے تو پھر یہ لغو جملے لکھنے کی وجہ کیا تھی؟ میں الجھ سا گیا ہوں۔ تم دونوں کچھ خیال آرائی کرو؟''

کیرولینا نے چھت کی طرف نگاہ اٹھائی۔ ذہن میں کوندا سا لپکا اور وہ پُرجوش انداز میں بولی۔ ''میں اس کی وجہ جان گئی ہوں۔'' دونوں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ جلدی جلدی بولی۔

''یہ صرف ان لوگوں کو بھٹکانے کے لیے تھا جن کے ہاتھ پہلے یہ ڈائری لگنی تھی۔ یقیناً تمہارا باپ چاہتا تھا کہ اس ڈائری کو بے وقعت سمجھ کر تمہارے حوالے کر دیا جائے۔''

شجاع اچھل پڑا۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھری۔ ''تم ایک ذہین لڑکی ہو۔ واقعی ایسا ہی ہوا ہے۔''

یہی وقت تھا جب شجاع کے گول اور اکلوتے کمرے والے گھر کے لکڑی کے دروازے پر تیز دستک ہوئی۔ دستک کا انداز جارحانہ تھا۔ وہ تینوں چونک گئے۔ دوبارہ دستک ہوئی تو شجاع نے کیرولینا کو پردے کی دوسری جانب جانے کا اشارہ کیا اور خود دروازے کے قریب جا کر درشت انداز میں کہا۔

''کیا قیامت آ گئی ہے..... کون ہے؟''

دوسری طرف سے ایک بھاری مردانہ آواز نے کہا۔ ''قیامت ہی سمجھو! دروازہ کھولو۔ ہوم سیکیورٹی..... دو غیر ملکی بغیر این او سی کے تمہارے گھر میں موجود ہیں۔''

شجاع نے چونک کر یادو کی طرف دیکھا جس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ یہ حساس علاقہ تھا اور سیکیورٹی کلیئرنس سے سرٹیفکیٹ کے بعد ضلعی حکومت کے این او سی کے بعد ہی کوئی غیر ملکی یہاں داخل ہو سکتا تھا۔ شجاع نے دبی آواز میں یادو سے انگریزی میں پوچھا۔ ''تمہارے پاس ضلعی حکومت کا این او سی ہے؟''

یادو نے سر ہلایا اور اپنے ریک سیک کی طرف بڑھا۔ شجاع نے مطمئن ہو کر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی اس کی پیشانی پر پوری قوت سے رائفل کا بٹ لگا۔ وہ تیورا کر نیچے گرا۔ دماغ بُری طرح سے چکرا گیا تھا۔ اسی دوران کئی افراد بھڑاما کر اندر گھس آئے۔

شجاع نے اٹھنے کی کوشش کی تو دوسری ضرب نے جیسے زمین کی گردش کئی گنا بڑھا دی۔ ڈوبتے دماغ کے ساتھ اس نے اپنی بھانجی کی ہذیانی چیخ سنی اور پھر دماغ مکمل طور سے اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

شجاع کو ہوش آیا تو پہلا احساس گداز پن کا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں، اس کا سر کیرولینا کی گود میں تھا اور وہ اس پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کی شفاف آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

شجاع کو احساس ہوا کہ اس کا سر اور پیشانی پٹیوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ آنکھوں کے آس پاس سوجن کا احساس تھا اور دماغ سویا سویا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ یقیناً ادویات کے زیر اثر تھا۔ اچانک ہی بھائی کی بدیانی چیخ کا خیال آیا تو وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا۔ دماغ چکرایا۔ وہ گرنے لگا تو کیرولینا نے اسے سنبھالا۔ وہ بے اختیار چلایا۔

"میری بھانجی زرمینہ کہاں ہے؟"

[illegible]

[illegible] نگاہوں کے دائرے میں ایک پچاس سال کے لگ بھگ کا سفید فام آیا جو پتلی پتلی آنکھوں میں بڑے اسٹائل سے پسٹل گھما رہا تھا۔ اس کے پتلے ہونٹ اور ناک نے عجیب سی سفاکی اس کی مجموعی شخصیت کو دی تھی۔ وہ بڑے تحمل اور ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔

"آہا م سے مسٹر شجاع! پہلے تو تمہیں تکلیف پہنچانے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ زرمینہ کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔ اسے ہم نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ اس کی تصدیق تم اپنے ساتھیوں سے بھی کر سکتے ہو۔ اس عمل کو تم ہماری طرف سے جذبہ خیر سگالی بھی سمجھ سکتے ہو۔"

شجاع نے کیرولینا کی طرف دیکھا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی تصدیق کی تو شجاع نے اطمینان محسوس کرتے ہوئے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ وہ لوگ ایک وسیع خیمے میں بچھے قالین پر تھے اور دو کیروسین لیمپوں نے روشنی پھیلا رکھی تھی۔ یاد بھی پاس ہی پہلو کے بل لیٹا تھا۔ اس کے ہاتھ آگے کی طرف کر کے بندھے تھے اور وہ بے بسی کی تصویر نظر آتا تھا۔ کیرولینا کے رخساروں پر تمانچوں کے نشانات تھے۔ یقیناً اس پر تشدد ہوا تھا۔ خیمے میں پسٹل بردار سفید فام کے ساتھ ایک بڑی مونچھوں والا کثیل نوجوان بھی تھا جو رائفل کی نال کندھے پر ٹکائے بڑی بے باکی سے بے ترتیب سی کیرولینا کو گھورے جا رہا تھا۔ اس نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے شجاع کے جبڑے بھنچ گئے۔ اس نے بے رحمی سے اس کے سر کو نشانہ بنایا تھا۔ اس کے علاوہ بھی شجاع کو وہ دیکھا دیکھا لگا مگر یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس ناخوشگوار واقعے کے علاوہ اسے کہاں دیکھا تھا؟

سفید فام نے شجاع کی نگاہوں کا تعاقب کیا اور اپنے مخصوص ملامت بھرے انداز میں بولا۔ "میرے خیال میں تم لوگوں کو تعارف کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ تم لوگوں کے نام اور کام سے تو میں خوب واقف ہوں۔ تمہیں اپنا تعارف کروا دوں۔ میرا نام ہوگو شادیز ہے اور میرا کام معلومات فراہم کرنا ہے۔ مکمل اور جامع معلومات۔" پھر اس نے بڑی مونچھوں والے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ میرا دوست اور [illegible] آفندی ہے۔ اس کا نام زیادہ اہم ہے۔ یہ لوگوں کو ان کے [illegible] سے پہچانا جاتا ہے۔"

اس [illegible] تعارف [illegible] آفندی [illegible] نہایت کمال [illegible]۔ اسی [illegible] [illegible] میں [illegible] [illegible] [illegible]

میں ہوگوشاویز نے اسے باہر جانے کے لیے کہا۔ وہ چند لمحے خونی نظروں سے شجاع کو گھورتا رہا اور پھر ایک طرف تھوک کر تیز قدموں سے خیمے سے باہر نکل گیا۔

ہوگوشاویز اُن کی طرف متوجہ ہوا اور ساتھ ہی اس کے لہجے کی مخصوص ملائمت لوٹ آئی۔ ''تم لوگ کمبل اوڑھ لو۔ سردی کی شدت بڑھ رہی ہے۔''

شجاع کے کاسۂ سر میں اس معمولی جھڑپ کے باوجود جیسے بھونچال آ گیا تھا اور زمین گھومتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس آفر سے کیرولینا نے فوراً فائدہ اٹھایا۔ اس نے ایک دبیز تہ شدہ کمبل کھول کر یادو پر پھیلایا اور دوسرا تہ شدہ کمبل شجاع کے سر کے نیچے تکیے کے طور پر رکھ کر اسے لیٹنے میں مدد کی اور پہلے والے کمبل کا کونا شجاع پر پھیلاتے ہوئے خود بھی اندر سرک گئی (بعد میں معلوم ہوا کہ یادو نے خاصی مزاحمت کی تھی جس کی وجہ سے اس کے ہاتھ باندھ دیے گئے تھے)۔

ہوگوشاویز باریک بینی سے ان کی حرکات وسکنات پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ وہ ایک کائیاں اور ہوشیار شخص معلوم ہوتا تھا۔ کیرولینا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہمیں اغوا کرنے اور یہ سلوک کرنے کا آخر تمہارا مقصد کیا ہے؟''

ہوگوشاویز مسکرایا۔ ''اچھا سوال ہے..... میں اسی طرف آ رہا تھا۔ تم لوگ جس مہم کے لیے نکل رہے ہو، میں بھی اس کا حصہ ہوں۔''

کیرولینا نے حیرت سے کہا۔ ''یہ کس نے کہا؟''

ہوگوشاویز کے باریک دانت چمکے۔ ''یہ میں کہہ رہا ہوں۔ تم دونوں شجاع سد پارہ کو اس مہم کے لیے رضامند کرنے آئے تھے۔ یہ اب میری ذمے داری ہے۔ تم دونوں کے باقی ٹیم ممبر فیری میڈوز میں تمہاری واپسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ انہیں وہیں ''آرام'' کرنے دو۔ تم تینوں میرے ساتھ سائن شاٹ نامی گھاٹی کے ذریعے فیری میڈوز کو ''بائی پاس'' کرو گے اور اتریرو گاؤں سے ہوتے ہوئے ہم ہیال اور پھر رائے کوٹ گلیشیئر کراس کرتے ہوئے ہمالیائی اترائی کی طرف جائیں گے۔''

کیرولینا نے کہا۔ ''تمہیں اس مہم سے کیا دلچسپی ہے؟''

''بتایا نا کہ معلومات بیچنا میرا پیشہ ہے اور بہت سے لوگوں کو اس پُراسرار معاملے میں دلچسپی ہے۔ آخر، اینڈی بوہل اور اس کی ٹیم کے ساتھ اس ویرانے میں کیا ہوا تھا؟ اس کے علاوہ بھی بہت سے سوالات بہت سے لوگوں کی نیندیں اُڑاتے ہیں اور میں ان لوگوں کو جوابات دے کر پُرسکون کرنا چاہتا ہوں۔''

شجاع کو اس شخص سے نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے کہا۔ ''میں ان لوگوں کو بھی انکار کر چکا تھا اور تمہیں بھی انکار کر رہا ہوں۔ میں کہیں نہیں جا رہا۔''

ہوگوشاویز کی آنکھ میں بے پناہ سختی نمودار ہوئی۔ ''مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔ تمہاری بھانجی زیادہ دور نہیں ہے۔'' ساتھ ہی اس کا انداز معنی خیز ہوا۔ ''لالہ آفندی کی عورتوں کے معاملے میں شہرت اچھی نہیں ہے۔ اپنی جان اور عزت دونوں تمہارے ہاتھ میں ہیں۔''

طیش کے سبب خون تیزی سے شجاع کے سر کی طرف دوڑا تو سر میں آئے بھونچال شدت اختیار کر گئے۔ ہوگوشاویز کی تیز نظریں جیسے اس کی اندرونی کیفیت کو پڑھ رہی تھیں۔ اس نے دوبارہ پسٹل شجاع کے سر سے لگا دیا۔ شجاع نے آتشیں لہجے میں کہا۔

''بہتر ہے مجھے گولی مار دو۔''

اس لہجے کو ہوگوشاویز ذرا بھی خاطر میں نہیں لایا۔ ''ضرورت پڑی تو تمہاری خواہش ضرور پوری کر دی جائے گی مگر ابھی تمہاری ضرورت ہے۔''

شجاع نے بے بسی سے آنکھیں موند لیں۔

یہی وقت تھا جب پاس ہی کہیں گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے فوراً بعد شاٹ گن گونجی۔ ہوگوشاویز کے چہرے پر پریشانی چمکی۔ اس کے بعد تو جیسے طوفان آ گیا۔ اچانک ہی دوطرفہ فائرنگ شروع ہو گئی۔ ہوگوشاویز نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ ''خیمے میں ہی رہنا۔ باہر نکلنے کی کوشش کی تو پہلے گولی تم لوگوں کو ماری جائے گی۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

دوطرفہ فائرنگ کی آوازیں ان کے لیے امید افزا تھیں۔ یادو نے اٹھنے کی کوشش کی تو شجاع نے متنبہ انداز میں کہا۔ ''لیٹے رہو۔ خیمہ فولادی چادر کا نہیں ہے، کوئی اندھی گولی مزاج پوچھ سکتی ہے۔''

یادو فوراً واپس لیٹ گیا تو کیرولینا نے قدرے جوش سے کہا۔ ''لگتا ہے ان بدمعاشوں پر کسی نے حملہ کر دیا ہے۔ ہمیں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔''

شجاع کا سارا دھیان فائرنگ کی آواز پر تھا۔ اس نے کہا۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یقینی طور پر قانون نافذ کرنے والے ادارے ان پر چڑھ دوڑے ہیں۔ دھیان سے سنو، یہ جو سیٹی جیسی گولیوں کی آوازیں ہیں، یہ سیون ایم

ایم رائفل کی ہیں اور یہ رائفل پولیس کے استعمال میں ہیں اور زیادہ تر یہی رائفلیں گرج رہی ہیں۔''

کیرولینا نے دھیان لگا کر سنا تو وہ بھی مطمئن نظر آنے لگی۔

فائرنگ کی آوازیں اب قدرے قریب سے آنے لگی تھیں۔ واضح طور پر سیون ایم ایم والوں کا پلہ بھاری تھا۔ خیمے کے اطراف بھاگ دوڑ کی آوازیں سنائی دیں۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ کمزور حریف پسپا ہو رہا ہے۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ یہ بات صاف ہوگئی کہ ہوگوشاویز وغیرہ پر قانون نافذ کرنے والے کسی ادارے نے ہی چھاپا مارا ہے۔ لاؤڈ اسپیکر پر مجرموں کو ہتھیار ڈالنے کی وارننگ دی جارہی تھی مگر لگتا تھا کہ مجرموں نے ہتھیار ڈالنے کے بجائے راہِ فرار اختیار کی تھی۔ ان کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔

مزید کچھ دیر گزری تھی کہ خیمے کے اطراف وزنی قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور دو وردی پوش بھڑاما مار کر اندر داخل ہوئے۔ شجاع نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے سر نیچے ٹکا دیا۔

☆☆☆

منظر دوبارہ شجاع کے گھر کا تھا۔ کیرولینا، یادو اور شجاع ابھی ابھی کھانے سے فارغ ہوئے تھے اور اب قہوے کا دور چل رہا تھا۔ بہترین طبی امداد کے بعد شجاع خود کو کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔ آنکھوں اور ناک کے اطراف البتہ ابھی سوزش موجود تھی۔ شکر کا مقام تھا کہ ان تینوں کا اغوا چھپا نہیں رہ سکا تھا اور دو غیر ملکیوں کا معاملہ ہونے کی وجہ سے قانون پوری طاقت اور سرعت کے ساتھ حرکت میں آیا تھا اور بہت جلد ان کا سراغ لگا لیا گیا تھا۔

کیرولینا اور یادو تمام تر قانونی تقاضے پورے کرنے کے بعد ہی وہاں موجود تھے۔ ان کے بیان وغیرہ لے کر ان تینوں کو جانے کی اجازت دے دی گئی تھی اور محتاط رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ لالہ آفندی اور اس کے غیر ملکی ساتھی کی تلاش کے لیے محکمۂ پولیس پوری طرح سے متحرک تھا۔

قہوے کی چسکی لیتے ہوئے شجاع نے نرم سے انداز میں کہا۔ ''افسوس وہ ڈائری ہاتھ سے نکل گئی ہے۔''

کیرولینا نے قدرے شوخی سے کہا۔ ''اگر میں کہوں کہ ایسا نہیں ہے تو پھر؟''

شجاع کے چہرے پر امید چمکی تو کیرولینا نے کہا۔

''جب تم اٹھ کر دروازہ کھولنے گئے تو ڈائری ہمارے درمیان تھی۔ میری چھٹی حس نے کسی گڑبڑ کا احساس دلایا تو میں نے ڈائری یہاں قالین کے نیچے چھپا دی تھی اور یہ ابھی یہیں ہے۔'' اس نے قالین کا ایک سرا اٹھا کر ڈائری نیچے سے اٹھائی اور شجاع کی طرف بڑھا دی۔

شجاع نے ڈائری تھامتے ہوئے اطمینان کا طویل سانس لیا۔ ''یہ میرے باپ کی نشانی ہے اور میرے لیے بہت بڑا جذباتی اثاثہ ہے۔ اس کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔''

کیرولینا نے کافی جو چباتے ہوئے کہا۔ ''اس کی ضرورت نہیں۔ تمہارا اعتماد جیتنا ہمارے لیے بہت اہم ہے۔''

اسی جذباتی کیفیت میں ایک لہر سی اٹھی اور شجاع کو بہا کر لے گئی۔ اس نے بڑے جذب سے کہا۔ ''میں اس مہم میں تمہارے ساتھ ہوں۔ وہ حرامی آفندی اور ہوگوشاویز ضرور راہ میں روڑے اٹکائیں گے۔ ان سے بھی حساب برابر کرنا ہے۔''

کیرولینا کا چہرہ دمک اٹھا۔ اس نے بے اختیار شجاع کے گلے لگنے کی کوشش کی تو اس کا قہوہ چھلک اٹھا۔

''ارے یہ کیا کر رہی ہو بے وقوف لڑکی!'' شجاع اس نسوانی یلغار سے گھبرا سا گیا۔

کیرولینا نے سرشار سے انداز میں کہا۔ ''خوشی کو سنبھالنا میرے لیے ممکن نہیں رہا۔''

یادو نے بھی اس کا کندھا تھپکا۔ ''یہ تم نے اچھا فیصلہ کیا..... ہمارے پاس جو آفر تھی.....''

شجاع نے اس کی تیز انداز میں بات کاٹی۔ ''اپنی آفر اپنی جیب میں ہی رہنے دو۔ میں بس تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔''

یادو نے کن انکھیوں سے کیرولینا کی طرف دیکھا تو اس نے مخفیف سی آنکھ دبا کر جیسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

شجاع نے پیالی رکھی اور ڈائری کھولتے ہوئے کہا۔ ''ہم وہیں سے بات شروع کرتے ہیں جہاں مداخلت ہوئی تھی۔'' ساتھ ہی اس نے ڈائری قالین پر رکھتے ہوئے صفحات پلٹے۔

وہ دونوں ایک سربستہ راز کے کھلنے کی سنسنی محسوس کرتے ہوئے ڈائری پر جھک گئے۔

شجاع ایک صفحے پر ڈٹ گیا۔ یہاں کستوری اور دیگر کچھ اجناس اور جڑی بوٹیوں کا حساب لکھا ہوا تھا۔ وہیں ایک طرف چوکور خانہ بنا ہوا تھا اور چار خانوں میں تقسیم تھا۔ ہر خانے میں کچھ ہندسے لکھے ہوئے تھے۔ شجاع نے اس خانے پر ہاتھ رکھا۔

''یہ تمہیں کیا نظر آرہا ہے؟''

دونوں نے الجھی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر یادو نے کہا۔ ''کچھ الٹے سیدھے ہندسے ہیں۔

شاید کوئی حساب کتاب وغیرہ ہے۔"

شجاع نے نفی میں سر ہلایا اور پھر سنسنی خیز انداز میں بولا۔ "یہ قدیم ہندی زبان ہے جو متروک ہے اور ہمارے پُرکھوں میں صدیوں پہلے رائج تھی۔ میرے باپ کو اس زبان سے لگاؤ تھا۔ یہ لگاؤ تھوڑا سا مجھ میں بھی منتقل ہوا ہے۔ میرے باپ نے اس ہندی زبان میں لکھا ہے۔

"شجاع! میری لاش ڈھونڈنے کی کوشش بالکل بھی نہ کرنا۔ میں تم لوگوں کے لیے مر چکا ہوں اور بلندیوں پر جانے سے بھی کنارہ کش ہو جاؤ۔ مجھے تمہارے دادا کی لاش نہیں ملی — تمہیں میری نہیں ملنی اور میں نہیں چاہتا کہ میرا پوتا بھی یہ دکھ اٹھائے۔"

شجاع نے سر اٹھایا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے جبکہ یہ سنتے ہوئے یادو کے چہرے پر ہیجان اُبھر آیا تھا۔ شجاع نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب تم بتاؤ، تمہارے پاس میرے لیے اور کیا خاص ہے؟"

یادو خاموشی سے اٹھا اور اپنے ریک سیک میں سے ایک فائل نکال لایا۔ اس نے فائل کھولی تو اس میں کئی بوسیدہ اور قدیم اخبارات کے تراشے اور ایک دیسی ہی کتاب کے بوسیدہ سے اوراق تھے۔ اس نے وہ شجاع کی طرف بڑھائے تو شجاع نے قدرے مایوسی سے کہا۔

"یہ کیا ہے؟"

یادو نے جاندار آواز میں کہا۔ "1938ء میں برطانوی حکومت کی جانب سے اس سارے علاقے اور بالخصوص نانگا پربت کے اطراف کے سروے کے لیے سر جانسن جیسے مہم جو کی قیادت میں ایک ٹیم یہاں آئی تھی۔ بعد میں سر جانسن نے اس حوالے سے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ یہ اسی کتاب کے اوراق ہیں اور اس کے بیانات جو اخباروں میں چھپے تھے۔"

شجاع نے پیشانی پر ہاتھ رکھ لیا۔ "مجھے مختصراً بتاؤ۔"

یادو نے سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "میرے عزیز! سر جانسن کے بنائے نقشوں کی روشنی میں یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو کچھ اس نے کتاب میں لکھا اور اخبارات کو انٹرویو وغیرہ دیے، اس کے مطابق اس نے ہمالیائی اترائی ہی کا ذکر کیا ہے۔ سر جانسن لکھتا ہے۔

اسپتال کا بزنس چمکانے کا آسان طریقہ — فرش چمکانے کے بہانے ہر وقت گیلا رکھو، باؤس فل رہے گا

"یہ بالکل اَن چھوئی زمین ہے۔ فطرت یہاں اپنی تمام تر خوبصورتی اور ہولناکی کے ساتھ موجود ہے۔ یہ ایک حیرت انگیز جگہ ہے۔ یہاں کئی ایسی وادیاں ہیں بظاہر جن میں داخلے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ فطرت تو یہاں موجود ہے ہی مگر عین ممکن ہے یہاں جدید تمدن سے عاری کچھ آبادیاں بھی ہوں۔ جہاں انسان بستے ہوں اور آسمان سے گزرتے ہوئے جہاز کو دیکھ کر ڈر جاتے ہوں۔"

شجاع کو پہلی دفعہ دلچسپی محسوس ہوئی۔ یادو نے مزید کہا۔

"سر جانسن آگے جا کر لکھتا ہے — یہاں میری ملاقات ایک تنگ دھرنگ بھکشو یا جوگی سے ہوئی۔ وہ ایک حیرت انگیز شخص تھا۔ موسم کی سختیاں جیسے اسے چھو کر دور ہٹ جاتی تھیں۔ بظاہر اس کے پاس اسباب زندگی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ میں حیران تھا کہ وہ زندہ کیسے ہے؟ میں نے اسے سبل پیش کیا تو اس نے سبل دور پھینک کر آسمان کی طرف انگلی اٹھائی — "میلگری" — شاید یہ اُس کے دیوتا یا خدا کا نام تھا جس پر اسے اعتقاد تھا۔ کس قدر عجیب اور پُراسرار نام تھا — میلگری — آج بھی یہ نام لیتے ہوئے میں اسی اَن چھوئی اور پُراسرار دنیا میں پہنچ جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر یادو نے فائل بند کر دی۔

یادو کے خاموش ہوتے ہی جیسے شجاع کسی سحر سے آزاد ہو گیا۔ یادو نے فائل کور پر ہاتھ لگاتے ہوئے ٹھہرے انداز میں کہا۔

"میلگری محض کوئی افسانوی مخلوق نہیں ہے۔ کچھ نہ

کچھ ایسا ضرور ہے کہ جو تقریباً ایک صدی پہلے بھی موجود تھا اور شاید نامعلوم زمانوں سے موجود ہے اور آج بھی عقل و فہم سے بالاتر ہے۔ ہمیں اسی کی کھوج لگانی ہے۔'' ساتھ ہی اس نے شجاع کے کندھے پر ہاتھ پھیلایا۔

''تمہارے لیے امید کی کرن اور بھی توانا ہوگئی ہے۔ تم ابھی بچے ہو..... اپنے باپ کے الفاظ پر دھیان دو۔ وہ لکھ رہا ہے کہ میں تم لوگوں کے لیے مرگیا ہوں..... وہ یہ بھی تو لکھ سکتا تھا کہ جب تمہیں یہ پیغام ملے گا، میں مر چکا ہوں گا..... عین ممکن ہے وہ تمہارے لیے مرگیا ہو مگر کچھ اور لوگوں کے درمیان زندہ ہو..... کسی نامعلوم وادی میں نامعلوم اور تمدن سے عاری لوگوں کے درمیان اور ہماری راہ دیکھ رہا ہو..... ممکن ہے کہ ہمیں نیلگری کا راز اور تمہیں کھویا ہوا باپ مل جائے۔''

یادو خاموش ہوا تو شجاع کے دل کی دھڑکن بڑھ چکی تھی۔ یادو جو کہہ رہا تھا، وہ عین ممکن تھا۔ امید کی کرن باقی تھی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہم کب روانہ ہو رہے ہیں؟''

اس دفعہ کیرولینا نے چہکتی آواز میں جواب دیا۔

''بہت جلد۔''

☆☆☆

ٹھیک تین دن بعد یہ لوگ ایک مختصر سے قافلے کی صورت میں روانہ ہوگئے۔ کیرولینا، یادو اور شجاع کے علاوہ اس قافلے میں چار مقامی پورٹر اور اضافی بار برداری کے لیے دو پہاڑی خچر بھی شامل تھے۔

روانہ ہونے سے پہلے ان تینوں کے درمیان سنجیدہ گفتگو ہوئی تھی۔ موضوع ہوگوشادیز اور لالہ آفندی کا خطرہ تھا۔ شجاع کو یقین تھا کہ دونوں اپنی کمینگی کی دوبارہ جھلک ضرور دکھائیں گے مگر یادو اور کیرولینا نے قدرے بے پروائی سے اس معاملے کو دیکھا تھا۔ یادو کا کہنا تھا کہ برف زار و ویرانوں میں اُن کا کھوج میں رہنا آسان کام نہیں تھا۔ کیرولینا نے ہنستے ہوئے بڑی مہارت سے بیریٹا کو ری لوڈ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''تم فکرمند نہ ہو۔ میں نے باقاعدہ شوٹنگ کی تربیت لی ہے اور یہ طاقتور ہتھیار تو برفانی ریچھ کو بھی گرا سکتا ہے۔''

اسے مضبوط پا کر شجاع کی فکرمندی بھی کم ہوگئی تھی۔ ہتھیار ساتھ ہونے کے سبب حوصلہ مزید بلند تھا۔ وہ تر نوالہ ثابت ہونے والے نہیں تھے۔

شجاع کے کہنے پر یہ قافلہ رات کی تاریکی میں چپکے سے روانہ ہوا تھا۔ بیس کیمپ میں کیرولینا کے ساتھی موجود تھے اور رابطے کی غرض سے ایک طاقتور ٹرانسمیٹر ان کے سامان کا اہم ترین حصہ تھا۔

ان کی روانگی کے دو گھنٹوں بعد ہی ہلکے بادلوں کی اوٹ سے سورج نے اپنا چہرہ دکھایا۔ ابتدائی دو گھنٹوں میں انہوں نے آٹھ کلومیٹر سفر کیا تھا اور اب ان کے سامنے برف کا ایک دیو اپنی پوری ہیبت کے ساتھ براجمان تھا۔ یہ رائے کوٹ گلیشیئر تھا۔ ان کے مہماتی سفر کا اہم ترین مرحلہ اس گلیشیئر کو عبور کرنے کے بعد شروع ہونا تھا۔

آج سے تقریباً بیس دن پہلے یہ گلیشیئر ناقابلِ عبور تھا مگر درجہ حرارت گرتے ہی اس سے پھوٹنے والے چشمے دوبارہ منجمد ہوگئے تھے، دراڑیں بھر گئی تھیں اور نرم برف دوبارہ سخت ہوگئی تھی۔

شجاع سے زیادہ یادو کا تجربہ تھا۔ اس کے مطابق بظاہر گلیشیئر کو درمیان سے عبور کرنا آسان تھا مگر یادو نے قدرے ہموار درمیانی راستے کے بجائے کٹے پھٹے کنارے کو ترجیح دی اور اس کا یہ فیصلہ محض دو گھنٹے کے سفر میں ہی درست ثابت ہوا۔ ان کے سامنے ہی ایک زوردار تڑاخے سے گلیشیئر کے درمیان دراڑ نمودار ہوئی اور اس سے پانی کا بلند فوارہ نمودار ہوا۔ یہ مبہوت کر دینے والا نظارہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ فوارہ دم توڑ گیا۔ یادو نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''سردی کی ابتدا میں گلیشیئر کے درمیان سفر کرنا خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ برف کی مضبوطی کناروں پر زیادہ ہوتی ہے۔''

شجاع نے اثبات میں سر ہلایا جبکہ کیرولینا کا چھوٹا مگر جدید ترین کیمرا اس منظر کو قید کرنے میں مصروف تھا۔ پورٹر خچروں کو ہانک کر آگے لے گئے۔

شجاع سفر کے پہلے لمحے سے چوکس تھا۔ یہ چوکسی محض فطرت کے عفریت کے لیے نہیں تھی بلکہ انسانی عفریت کے لیے بھی تھی۔ اس کے دماغ کی اسکرین پر رہ رہ کر مکروہ لالہ آفندی اور ہوگوشادیز کی شبیہہ ابھرتی تھی۔ ہوگوشادیز کے بظاہر وجیہہ مگر سفاک نقوش، بھرا ہوا ہر آلود لہجہ اور آنکھوں میں تیرتی سفاکی یاد آتی تھی تو دماغ کا کوئی پُراسرار حصہ سرگوشی کرتا تھا کہ وہ محض لالہ آفندی سے زیادہ خطرناک ہے۔ ایسے میں شجاع کی مضطرب آنکھیں اطراف میں بھٹکنے لگتی تھیں مگر برفانی ویرانی میں حدِ نگاہ تک کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ البتہ کئی دفعہ برفانی بھیڑیں اور ایک دفعہ مارخور

ضرور نظر آیا تھا۔ کیرولینا بڑی ذہن لڑکی تھی۔ اس نے جلد ہی شجاع کا اضطراب بھانپ لیا اور اپنے ریک سیک سے ایک ننھی سی سوئس ساختہ دوربین نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔

''میرے خیال میں تمہیں اس کی زیادہ ضرورت ہے۔''

شجاع نے خوشگوار حیرت کے ساتھ دوربین تھام لی۔ اس عمل کے دوران لحظہ بھر کو اس کی انگلیاں کیرولینا کی دستانہ پوش انگلیوں سے مس ہوئیں۔ یہ ایک ٹھنڈا اور بے جان سا لمس تھا مگر نہ جانے کیوں شجاع کے جسم میں ارتعاش سا دوڑ گیا۔ اس نے چور نظروں سے کیرولینا کی طرف دیکھا مگر وہاں معصوم سی بے خبری تھی۔

شجاع نے خود کو سرزنش کرتے ہوئے دوربین کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر حیرت زدہ رہ گیا۔ یہ بے حد... قیمتی الیکٹرانک دوربین تھی جو تاریکی میں بھی اجسام سے نکلنے والی حرارت کو قالب کی شکل میں دکھانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ شجاع نے فوراً دوربین آنکھوں سے لگائی۔ کوہ دمن تیزی سے سمٹ آئے۔ اطراف سے مطمئن ہو کر [illegible] ماؤنٹین کی طرف دوربین گھمائی۔ چوٹی بادلوں میں چھپی تھی اور چوٹی پر ہوا کی شدت سے برف کے ذرات اڑتے پھرتے تھے۔ ہوا کی رفتار تشویشناک تھی۔ بلندیوں پر برفانی طوفان جنم لے رہا تھا۔ اس نے فوراً یادو کی توجہ اس طرف دلائی۔ یادو نے دوربین لے کر چند منٹ بلندیوں کا جائزہ لیا اور پھر اطمینان بھرے انداز میں بولا۔

''تم مقامی موسم کی بہتر پیش گوئی کر سکتے ہو مگر ہمارا ہیں کیمپ اس حوالے سے جدید آلات اور تازہ ترین اپ ڈیٹس رکھتا ہے۔ فی الحال تو اس کی طرف سے کوئی نئی موسم کی وارننگ نہیں ہے اور مجھے بھی کسی طوفانِ بلاخیز کے آثار نظر نہیں آرہے۔ تم کیوں پریشان ہو رہے ہو؟ ہم ویسے بھی خاصے نیچے ہیں۔''

شجاع نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''تم نے پہلی بات بالکل ٹھیک کی ہے۔ میں پیش گوئی کر رہا ہوں کہ اگر ہوا کی رفتار بڑھی تو ایک درمیانی شدت اور کم بلندی کا طوفان ہمیں آگھیرے گا اور ہمیں اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔''

یادو اب بھی زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا مگر کیرولینا نے مداخلت کی۔

''میرے خیال میں شجاع ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمیں اس کے کہے پر بھروسا کرنا چاہیے۔''

یادو نے بُرا سا منہ بنایا۔ شجاع نے شکر گزار نظروں سے کیرولینا کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

نگاہوں کا تصادم باہمی اعتماد کو بڑھا گیا۔ شجاع نے ماحول کی گمبھیرتا کو کم کرنے کے لیے کہا۔

''مجھ سے زیادہ تو یہ خچر موسم کی جانکاری رکھتے ہیں۔ ان کی بے چینی اور کانوں کی حرکات ہمارے لیے کسی سیٹلائٹ سے بڑھ کر ہے۔''

کیرولینا اور یادو نے بے اختیار خچروں کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی بے چین تھے ـــ کان اور دُم بار بار اضطرابی حرکات دے رہے تھے۔ یادو نے کندھے اچکائے۔

''ٹھیک ہے ..... سمجھو، ٹیم کو تم لیڈ کر رہے ہو، ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

شجاع کا انداز بدلا۔ ''ہمیں رفتار بڑھانی ہے۔ طوفان کا سامنا ہمیں گلیشیئر پر نہیں کرنا۔''

شجاع کی ہدایت پر عمل ہوا، ممکن حد تک [illegible] گئی۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی [illegible] کیمپ کی طرف سے بھی [illegible] آئی کہ مقامی کم بلندی کا ایک طوفان جنم لے چکا ہے اور شدت بڑھاتے ہوئے اس کا رخ انہی کی طرف ہے۔

ایسے غیر متوقع طوفان کبھی ابتدا میں ہی دم توڑ دیتے تھے اور کبھی طوفانی شدت اختیار کر لیتے تھے۔ مقامی افراد تو اس رنگ بدلتے طوفانوں کو بھوت پریت سے منسوب کرتے تھے اور اس سے پناہ مانگتے تھے۔

رفتہ رفتہ ہوا کی شدت بڑھنے لگی اور دُھندلا سورج مزید دُھندلاتا چلا گیا۔ وہ گلیشیئر سے اترے ہی تھے کہ طوفان نے شدت پکڑ لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہوا میں برف کے ذرّے سنسنانے لگے اور جیسے ہر طرف سے اندھیرے نے یلغار کر دی۔

شجاع نے چیخ کر مقامی پورٹرز سے کہا۔ ''گلیشیئر کے پہلو سے دور رہو اور خچروں کو دائرے میں بٹھاؤ۔''

مشاق پورٹرز نے بڑی ہنرمندی سے خچروں کو سامان سمیت بٹھا کر ان کے گھٹنے باندھے۔ بدکے جانوروں کو سنبھالنا بچوں کا کھیل نہیں تھا مگر پورٹرز کے لیے زیادہ مشکل نہیں ہوا۔

اچانک ہی شجاع کو محسوس ہوا کہ نہ جانے کب سے کیرولینا، اس کے بازو سے چپکی ہوئی تھی۔ شجاع نے نرمی سے اس کی گرفت سے بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔

''تم اور یادو وہاں خچروں کے درمیان دائرے میں رہو گے۔''

کیرولینا کے بولنے سے پہلے یادو نے بے پروائی سے کہا۔ ''میری فکر نہ کرو۔ یہ معمولی طوفان میرے قدم نہیں اکھیڑ

سکتے..... ہاں کیرولینا کے لیے درمیانی دائرہ محفوظ رہے گا۔"
کیرولینا نے یادو کو نظر انداز کرتے ہوئے شجاع سے کہا۔ "تم، میرے ساتھ رہو تو بہتر ہے۔"
شجاع کو اس کے لہجے نے چونکایا..... سنسناتے طوفان اور گہرے ہوتے اندھیرے میں اسے صرف کیرولینا کی سرخ ناک نظر آئی۔ اس کے بازو پر دوبارہ کیرولینا کی گرفت ہوگئی۔ ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں تھا..... طوفان بڑھ رہا تھا۔ شجاع نے غیر محسوس طور پر طویل سانس لیا اور کیرولینا کو لے کر دائرے میں آگیا۔ یہاں ہوا کی شدت کم تھی۔ چاروں طرف خچروں نے دیوار سی بنا دی تھی۔ پورٹرز ان کی رسیاں مضبوطی سے تھامے مخصوص ہنکاروں سے ان کی بے چینی کو کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔
طوفان نے زناٹا سا بھرا تو کیرولینا مکمل طور سے شجاع نے اس دھڑکتی قیامت کے کے سینے میں چھپ سی۔ جب طور سے گرد بازو لپیٹ دیے۔ طوفان نے انہیں ڈھانپ لیا۔ وہ جانوروں کے اتنے قریب تھے کہ ان کی مخصوص باس دماغ کو چڑھ رہی تھی۔
تھوڑی دیر بعد شجاع کے کان کے قریب کیرولینا کی شریر سرگوشی ابھری۔ "تمہارا دل اتنی شدت سے کیوں دھڑک رہا ہے؟"
"تم دور ہو جاؤ پھر بتاتا ہوں۔"
"ہا..... نہیں..... میں کچھ نہیں پوچھ رہی۔" وہ گھبرا کر مزید شجاع میں سمٹ آئی۔
طوفان اپنے عروج کو چھو گیا اور پھر کئی گھنٹوں کے بعد اس کی شدت گھٹنے لگی۔ اس دوران وہ تقریباً برف میں دفن ہو چکے تھے۔ طوفان اختتام پذیر ہوا تو اس کے بعد آج کے لیے وہیں پڑاؤ ڈالنے کا فیصلہ ہوا۔
شجاع کو رات بھر بے چینی کی سی کیفیت رہی۔ کئی دفعہ اس نے اپنے مختصر سے خیمے سے باہر نکل کر الیکٹرانک دوربین سے اطراف کا جائزہ لیا تھا۔ ہر طرف سکوت تھا مگر دل کو ہو گوشاویز کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔

☆☆☆

ہمالیائی، ترائی کا یہ سفر اگلے گیارہ دن تک خوش اسلوبی سے جاری رہا تھا۔ ان برفانی ویرانوں میں ان کے سوا کسی اور انسان کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ ہاں برفانی جنگلی حیات سے ضرور سامنا رہا تھا۔ نایاب برفانی تیندوے کی مادہ اور اس کے دو ننھے بچوں کی اٹھکیلیاں اپنے کیمرے میں مقید کرتے ہوئے کیرولینا بچوں کے مانند بے طرح خوش ہوئی تھی۔
سفر بھی انسان کی پہچان کا ایک ذریعہ تھا۔ شجاع نے اس دوران دیکھا اور محسوس کیا تھا کہ کیرولینا بے حد ملنسار اور حساس لڑکی ہے۔ وہ پورٹرز کے کھانے، پینے کا خصوصی دھیان رکھتی تھی اور ان کے ساتھ خوب گھلی ملی رہتی تھی جبکہ یادو ایک مخصوص فاصلہ رکھتا تھا۔ اس دوران پورٹرز کا وزن بھی خاصا ہلکا ہو گیا تھا۔ ان کے کندھوں پر موجود سامان پہلے استعمال ہو رہا تھا۔
شجاع غیر محسوس طور پر کیرولینا میں دلچسپی لینے لگا تھا اور کیرولینا کی دلچسپی تو بے حد واضح تھی۔ ایسے ہی کسی موقع پر پورٹرز، شجاع کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے تو اس کے کان سرخ ہونے لگتے تھے۔
شجاع کو سب سے زیادہ جس چیز نے متاثر کیا تھا، وہ کیرولینا کی فطرت اور فطری ماحول سے متعلق فکرمندی تھی۔ وہ ہر قسم کا پیدا ہونے والا کچرا اپنی نگرانی میں مخصوص قسم کے تھیلوں میں ڈلوا کر خچروں پر بار کرواتی تھی۔
آج صبح سے ہی یادو [illegible] خاصا پُرجوش تھا۔ وہ بار بار جیب سے ایک نقشہ سا نکال کر اس پر جھک جاتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے کیرولینا کو بھی بلایا تو شجاع بھی قریب چلا گیا اور استفسار کیا۔
"مسٹر یادو! یہ بار بار کیا دیکھنے لگ جاتے ہو؟ کیا کوئی خاص بات ہے اس نقشے میں؟"
یادو نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پُرجوش انداز میں کہا۔ "بہت خاص..... ہم نے بالکل درست سمت میں سفر کیا ہے اور اس جگہ کے آس پاس ہیں جہاں اینڈی بوہل وغیرہ کے ساتھ کوئی انہونی ہوئی تھی۔"
شجاع کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ اس نے بے اختیار برفانی ویرانے پر نظر دوڑائی اسے لگا ابھی باپ کہیں سے مسکراتا ہوا نکل کر آئے گا اور اپنے بازو پھیلا دے گا مگر نگاہ مایوس ہو کر لوٹ آئی۔ ٹانگوں نے جیسے اس کا وزن اٹھانے سے انکار کر دیا۔ وہ برف پر ڈھے سا گیا۔
یادو اور کیرولینا..... اس کی کیفیت سے بے خبر آپس کی گفتگو میں مگن تھے۔ ان کے چہروں پر بڑی گمبھیرتا تھی۔ شجاع کی دماغی رو اچانک ہی اپنے باپ سے ہو گوشاویز کی طرف گھوم گئی۔ اسے پورا یقین تھا کہ اس سفر کے دوران ہو گوشاویز اور لالہ آفندی کے مخصوص چہرے ضرور دیکھنے کو ملیں گے مگر ابھی تک ایسا نہیں ہوا تھا اور اب تو دل بھی مطمئن سا ہو گیا تھا۔ ممکن تھا وہ قانون نافذ کرنے والے اداروں

کے ہتھے چڑھ گئے ہوں یا پھر ان کے خوف سے بروقت تعاقب میں نہ نکل پائے ہوں، بہرحال جو بھی تھا، خوش آئند ہی تھا۔

شجاع نے ایک دفعہ پھر برف زاروں پر مایوس سی نظر ڈالی اور پھر یادو سے مخاطب ہوا۔ ''واپسی کا بھی دھیان میں رکھنا۔ جانوروں کی خوراک کم ہو رہی ہے اور یہ جانور ہمارے لیے بے حد قیمتی ہیں۔''

شجاع ساتھی پورٹرز کی طرف اٹھ آیا۔

☆☆☆

آج دن کے آغاز کے ساتھ ہی مطلع خاصا صاف تھا۔ سورج پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں تھا۔ ایسے میں برف کی خیرہ کن چمک سے آنکھوں کو محفوظ رکھنے کے لیے ان کے چہروں پر مخصوص چشمے تھے۔ اس وقت وہ ایک بلند برفانی درّے کی بلندی پر تھے۔ نیچے دور دور تک سفید شفاف برفانی چادر پھیلی تھی جو سورج کی تیز روشنی میں خوب چمک رہی تھی۔ یہ ایک یادگار نظارہ تھا۔ یہ اَن چھوا ویرانہ ایسا نظارہ تھا جو قسمت والے ہی دیکھ پاتے ہیں۔ واقعی کچھ مناظر قدرت نے آوارہ گردوں اور شاید پاگلوں کے لیے علیحدہ سے مخصوص کر دیے ہیں۔

بلند درّے پر ہوا خاصی تیز تھی اور شجاع جلد سے جلد نیچے اتر کر لے جانا چاہتا تھا مگر مخصوص یہاں سے قاصے دیر نظاروں سے دوربین آنکھوں سے لگائے کیرولینا کا ہٹ نہ بھر ہی نہیں رہا تھا۔ شجاع نے دوسری دفعہ قدرے سختی سے کہا تو کیرولینا چونکی ہوئی۔

''بس، دو منٹ اور..... میں یہ شاندار منظر اپنے وجود کی گہرائیوں میں اتار لوں۔''

شجاع طویل سانس لے کر رہ گیا۔ اس دوران اس کی نظریں کیرولینا پر تھیں۔ اس کی اونی ٹوپی سے نکلے سنہرے براؤن بالوں کی آوارہ لٹ اس کے سفید چہرے پر آ گئی تھی۔ فطرت کے دل فریب نظاروں کے درمیان اس پل وہ بھی ایک دلنشین ''نظارہ'' ہی تھی۔ شجاع بے اختیار اسے دیکھے گیا۔ اچانک ہی کیرولینا کا رنگ متغیر ہوا اور اس کے دہن سے تحیر زدہ آواز نکلی۔

''اوہ..... وہاں ایک لڑکی ہے..... حیرت انگیز.....''

یہ الفاظ نہیں جیسے کوئی جادوئی منتر تھا جس نے یادو کے وجود میں بجلی سی بھر دی تھی۔ وہ برق کے مانند جھپٹا اور کیرولینا کے ہاتھ سے دوربین جھپٹ لی۔

''کک..... کک کہاں ہے؟''

کیرولینا کو اس کا انداز پسند نہیں آیا تھا۔ اس نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے ہاتھ سے ایک سمت اشارہ کیا۔ شجاع کی نگاہیں بھی بے اختیار اسی طرف اٹھ گئی تھیں۔ تمام تر حسیات جیسے آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں مگر مطلوبہ سمت سوائے برفیلے ویرانے کے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کسی طرح کی کوئی حرکت یا انسانی وجود نگاہ کے دائرے میں نہیں آیا تھا۔

یادو دیوانوں کے مانند دوربین ادھر اُدھر گھما رہا تھا۔

''کہاں ہے لڑکی؟ مجھے تو نظر نہیں آ رہی.....''

کیرولینا نے ایک دفعہ پھر ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔ یادو کی دوربین وہاں کچھ کھوجنے لگی۔ شجاع نے بھی آنکھیں سکیڑ کر اس سمت دیکھا مگر اس دفعہ بھی اسے کامیابی نہیں ہوئی۔

یادو کے چہرے پر جھنجلاہٹ نمودار ہوئی۔ ''مجھے تو کچھ نظر نہیں آ رہا۔''

کیرولینا نے اس کے ہاتھ سے دوربین لے لی۔ چند لمحوں میں اس کے چہرے پر بھی اُلجھن نظر آنے لگی۔ شجاع، ان کے قریب چلا گیا۔ کیرولینا نے دوربین نیچے کی ''کچھ دیر پہلے وہ وہاں تھی۔ میں نے واضح طور پر اسے دیکھا تھا لیکن اب نظر نہیں آ رہی۔''

اس دفعہ شجاع نے دوربین تھام لی۔ یہ وہی دوربین تھی جو کیرولینا نے آغازِ سفر میں اسے دی تھی۔ آنکھوں سے دوربین لگاتے ہی دور کے مناظر سمٹ آئے۔ اس نے کیرولینا کی بتائی سمت میں دیکھا مگر ہر طرف برف ہی برف تھی۔ جس طرف کیرولینا اشارہ کر رہی تھی، وہ جگہ میدان کے مانند تھی۔ کوئی اوٹ بھی نہیں تھی کہ کوئی چھپ ہو رہے۔ شجاع کا ذہن پیچیدہ الجھن ہو گئی ہو۔ یادو نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''تمہیں واہمہ ہوا ہے۔ صحرا کی طرح برف زاروں میں بھی بصری دھوکے ہوتے ہیں۔''

کیرولینا نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''وہ ہرگز بصری دھوکا نہیں ہے۔ اس کے لمبے سنہرے بال میں نے لمحے بھر کو پوری جزئیات سے دیکھے تھے۔''

یادو کے چہرے پر بے یقینی سی دیکھ کر وہ، شجاع سے مخاطب ہوئی۔ ''میں کسی واہمے کا شکار نہیں ہوئی واقعی وہاں لڑکی تھی۔''

یادو نے دخل اندازی کی۔ ''مان لیتے ہیں مگر چند لمحوں میں کیا اُسے برف نے نگل لیا۔''

کیرولینا نے اسے نظر انداز کیا۔ اس کی آنکھیں شجاع پر تھیں۔ انداز بڑا پُریقین تھا کہ کم از کم شجاع اسے نہیں

جھٹلائے گا۔ شجاع نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

''تمہارے ہوش و حواس ان بلندیوں پر قطعی متاثر نہیں ہوئے۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے کسی لڑکی کو دیکھا ہے۔ مت بھولو کہ ہم لوگ اس جگہ کے آس پاس ہیں جہاں اینڈی بوہل اور میرے باپ دفیر کے ساتھ کوئی انہونی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ''نیلگری'' کے لمبے سنہرے بال اس کی شناخت ہیں۔ ہم نیلگری کے علاقے میں ہیں۔ ممکن ہے تم نے نیلگری کو ہی دیکھا ہو..... آخر کو وہ ایک ماورائی شخصیت ہے۔ پل بھر میں غائب ہو جانا اس کے لیے کون سی بڑی بات ہے۔''

یادو دبے دبے انداز میں ہنسا۔ کیرولینا ناراض نظروں سے شجاع کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''میرا مذاق اڑا رہے ہو؟''

''ہرگز نہیں..... ہمیں فوراً نیچے اترنا چاہیے اور اس جگہ کو دیکھتے ہیں جہاں نیلگری..... میرا مطلب ہے وہ لڑکی موجود تھی۔ ممکن ہے اس کے قدموں کے برف پر نشان یا کوئی اور سراغ مل جائے۔''

دو گھنٹے بعد وہ اندازے سے اس جگہ موجود تھے جہاں کیرولینا نے کسی لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہاں انسانی قدموں کے تو نشان نہیں تھے مگر برفانی تیندوے کے قدموں کے نشان ضرور ملے تھے۔ برف پر برائے نام سے یہ نشان ایک پورٹر نے دیکھے تھے۔ مزید کچھ دیر میں اندازہ ہوا کہ یہ نشان کم از کم دو تیندوں کے تھے۔

ادھیڑ عمر پورٹر [illegible] ایک جہاں دیدہ سا [illegible] سناتا کے قریب بیٹھا تھا۔ شجاع اس کے قریب گیا۔

''چاچا! اب اٹھ جاؤ! ان نشانوں پر ہی بیٹھے رہو گے کیا؟''

پورٹر کی نظریں ابھی تک نشانات پر تھیں، وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ''بچے! ان نشانوں کو غور سے دیکھ..... تو بھی انہی پہاڑوں کا بچا ہے۔ یہ نشان سو فیصد موٹی دُم والے تیندوے کے ہی ہیں مگر اتنے بڑے پنجے..... نہ کبھی دیکھے نہ کبھی سنے..... مجھے تو یہ ہوائی مخلوق لگتی ہے۔''

شجاع نے اسے دبی آواز میں گھرکا۔ ''چاچا! نیا شوشہ نہ چھوڑ۔ تیرے لڑکے خواہ مخواہ ڈر جائیں گے۔ کوئی پرانا بوڑھا تیندوا ہوگا جو تھوڑا وزنی ہو گیا ہے اور ہوائی مخلوق نشان نہیں چھوڑ کر جاتی۔''

جہاں دیدہ پورٹر کو مزید خاموش رہنے کی تنبیہ کر کے شجاع اٹھ گیا مگر وہ نشان اس کے دماغ میں کلبلی پیدا کر رہا تھا۔ واقعی وہ پنجہ غیر معمولی تھا۔

سفر دوبارہ شروع ہوا۔ ایک نامعلوم گلیشیر کے پہلو سے کٹ کر وہ جیسے ہی دوسری طرف گھومے ایک قطعی مختلف اور مبہوت کر دینے والا نظارہ ان کے سامنے تھا۔ یقین ایسے محسوس ہوتا تھا نامعلوم گلیشیر کے پہلو میں برف زار کے عین درمیان جیسے کسی فلم کا سیٹ لگا ہو یا پھر آسمان کی وسعتوں میں تیرتے ہوئے کسی سیارے کا ایک حصہ اس برف زار میں اتر آیا ہو۔

ان کی نگاہوں کے سامنے ایک وسیع کولنڈ ڈیزرٹ بچھا تھا۔ جس پر جا بجا مختلف اشکال کی چھوٹی بڑی عمودی چٹانیں پھیلی تھیں۔ چٹانوں کا سلسلہ دور تک پھیلا تھا۔ عمودی ہونے کے سبب ان پر برف تک نہیں پاتی ہوگی۔ اسی سبب وہ اپنے سیاہ جلے ہوئے وجود کے ساتھ نامعلوم زمانوں سے اس اَن چھوئی زمین پر ایستادہ تھیں۔

اس مبہوت کر دینے والے نظارے نے سبھی کو مسحور کر دیا تھا پھر کیرولینا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''اوہ..... یہ کس قدر حیرت انگیز کر دینے والا نظارہ ہے۔''

یادو چونک گیا۔ ساتھ ہی دماغ میں برق سی لہرائی۔ کچھ اس سے ملتے جلتے الفاظ اینڈی بوہل کے بھی سنائی دیے تھے اور پھر رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ کیا اس نے بھی یہ منظر دیکھا تھا؟ یا کچھ نامعلوم دیکھ کر وہ الفاظ ادا کیے تھے۔

کیرولینا اس سحر کے زیر اثر خود سے بولی۔ ''ہم نے ہمالیہ میں [illegible] سے بلائی۔ ''ہم نے یہ جگہ دیا اور ان چھوا کولنڈ ڈیزرٹ دریافت کر لیا ہے۔ اس مہم کے لیے صرف یہی دریافت کافی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ دوڑ کر اس نئی دنیا میں پہنچ گئی۔ باقی سب بھی اس ٹھنڈی ریت پر ڈھیر ہو گئے جو اس برف زار میں ایک قدرتی عجوبے سے کم نہیں تھی۔

کیرولینا تو جیسے دیوانی ہو گئی تھی۔ وہ بے تحاشا تصویریں بنا رہی تھی اور سیاہ چٹانوں کو چھو چھو کر بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔ دن کا اختتام قریب تھا۔ شجاع نے پورٹرز کو وہیں پڑاؤ ڈالنے کے لیے کہہ دیا۔

☆☆☆

غیر معمولی صاف اور روشن دن ایک شفاف رات میں ڈھل گیا۔ صاف آسمان اور چاندنی رات ان بلندیوں پر بیک وقت قسمت والوں کو ہی نصیب ہوتی ہے۔ اتفاق سے انسانی آبادیوں سے بہت دور اس کولنڈ ڈیزرٹ میں یہ رات اتری ہوئی تھی۔ چاندنی کے فسوں نے ان بدہیت چٹانوں کو اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ چاندنی میں نہایا ناقابل یقین منظر دیکھنے والی نگاہوں کو جہاں مسحور کرتا تھا وہیں دل قدرت کی ہیبت کے آگے جھک جاتا تھا۔

جادو بھری اس رات نے سب سے پہلے پورٹرز پر اثر دکھایا۔ انہوں نے آگ جلائی اور اس کے گرد بیٹھ کر ہنسی مذاق کرنے لگے پھر ایک نوجوان پورٹر خالد نے اپنا ننھا سا الغوزہ (مقامی ساز) نکال لیا۔ وہ اس الغوزہ کو جان سے عزیز اور سفر میں ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا۔ پھر اس خاموش، سرد اور جادو بھری رات میں الغوزہ کی مدھر آواز اُبھری اور سکوت میں سرایت کر گئی۔

شجاع، خالد اور اس کے الغوزہ سے بخوبی واقف تھا۔ وہ اپنے خیمے سے باہر نکل آیا۔ کیرولینا پہلے سے باہر موجود تھی اور ایک چھوٹی سی چٹان پر تکیہ رکھ کر اس کے اوپر بیٹھی ہوئی تھی۔ شجاع نے محسوس کیا تھا کہ صبح والے واقعے کے بعد سے وہ کھوئی کھوئی سی تھی۔ اس وقت بھی وہ اسی کیفیت میں تھی۔ بظاہر وہ پورٹرز کی طرف متوجہ تھی مگر صاف محسوس ہوتا تھا۔ وہ وہاں نہیں ہے۔

شجاع، اس کے نزدیک چلا گیا۔ یادو اپنے خیمے میں تھا اور اس کی پورٹیبل لائٹ آن تھی۔ نہ جانے وہ کیا کر رہا تھا۔ شجاع کو قریب پا کر کیرولینا مسکرائی اور ایک طرف کھسک کر اپنے پہلو میں جگہ بناتے ہوئے بولی۔

''آؤ..... اِدھر آجاؤ۔''

شجاع اس کے قریب بیٹھ گیا۔ الغوزہ کی رم جھم جیسی آواز بلند ہو گئی تھی۔ یہ ایک معروف مقامی دُھن تھی جسے بجانے پر خالد کو خوب عبور حاصل تھا۔ یہ دُھن دل کو چھوتی تھی اور خوابیدہ جذبات کو چھیڑ جاتی تھی۔

شجاع نے کہا۔ ''میں دیکھ رہا ہوں کہ صبح والے واقعے کو تم نے کچھ زیادہ سنجیدگی سے خود پر سوار کر لیا ہے اور مسلسل کھوئی کھوئی سی ہو۔ میرا مشورہ مانو تو صبح واپسی کا سفر شروع کرتے ہیں..... یہاں کچھ نہیں ہے۔''

وہ پُراسرار سے انداز میں مسکرائی۔ ''کچھ تو ضرور ہے..... سنہرے بالوں والی لڑکی اور تیندوے کے غیر معمولی قدموں کے نشان.....''

شجاع نے سر تھام لیا۔ کیرولینا نے اس کی طرف دیکھا اور مزید کہا۔

''سنہری بالوں والی لڑکی کو میرا ذہنی فتور مان لیا جائے تو پھر اچانک سے ہمارے طاقتور اور جدید ترین آپریٹس کو کیا ہوا ہے؟''

شجاع چونکا۔ یہ اُس کے لیے نئی اطلاع تھی۔

''کیوں، کیا ہوا آپریٹس کو؟''

وہ سرسراتے انداز میں بولی۔ ''مکمل طور سے ٹھیک ہونے کے باوجود وہ کام نہیں کر رہا۔ یادو اب بھی اس کے ساتھ سر کھپا رہا ہے۔ ہمارا بیس کیمپ سے رابطہ نہیں ہو رہا اور مزید حیرت انگیز بات یہ ہے کہ میرے پاس موجود کمپاس اور جی پی ایس ڈیوائس بھی کام نہیں کر رہے۔ ہم ضرور کسی پُراسرار جگہ پر ہیں۔''

شجاع بولا۔ ''یہ بالکل مختلف سی جگہ ہے۔ کمپاس وغیرہ کے کام نہ کرنے کی وجہ کوئی ارضیاتی چکر بھی ہو سکتا ہے۔ آپریٹس کا بتا کر تم نے پریشان کر دیا۔ بیس کیمپ میں کھلبلی مچ گئی ہوگی۔ ہمیں ہر صورت واپسی کا قصد کرنا چاہیے۔''

کیرولینا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''منزل کے اتنا قریب پہنچ کر تو ہرگز نہیں۔ میں اس نیلگری کے راز کو جان کر ہی رہوں گی۔'' اس کے لہجے کی قطعیت نے شجاع کو مزید پریشان کر دیا۔ وہ بولا۔

''یہ راز بہت سے لوگوں سے ہوش و حواس چھین چکا ہے۔ اس راز کی یہ قیمت ہے تو بہت بڑی قیمت ہے۔''

وہ دیوانے پن سے مسکرائی۔ ''میں یہ قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

اسی پل شجاع بُری طرح سے چونکا۔ اس نے ایک واضح غراہٹ سنی تھی۔ اس کا وجود سنسنا اٹھا۔ یہ غراہٹ برفانی تیندوے کی تھی۔ کیرولینا نے بھی اسے سنا تھا۔ اس کے چہرے پر ہراس چھا گیا اور وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

پھر شجاع کی نگاہوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ ایک چٹان کے پاس سے دو تیندوے برآمد ہوئے۔ دونوں غیر معمولی طور پر جسیم اور قد آور تھے۔ چاندنی میں قدرت کے وہ شاہکار جانور نمایاں نظر آ رہے تھے۔ ان کی موٹی دُمیں ہوا میں لہرا رہی تھیں اور حلق سے دھیمی مگر پُرہیبت غراہٹیں نکل رہی تھیں۔

کیرولینا نے بھی ان جانوروں کو دیکھا تھا اور اپنی جگہ بن ہو کر رہ گئی تھی۔

ان پہاڑوں پر... ان جانوروں کی موجودگی کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ یہ ان کا قدرتی مسکن تھے مگر نظر آنے والے جانوروں کی غیر معمولی جسامت حیران کن تھی۔ پرانے لوگوں سے روایت در روایت چلے آنے والے واقعات میں البتہ ان غیر معمولی جانوروں کا ذکر ضرور سنا تھا۔ وقت کے ساتھ صدیوں پہلے یہ نسل معدوم ہو چکی تھی مگر اس وقت، وقت کا پہیا الٹا گھوما تھا اور صدیوں پہلے کے جانوران کے سامنے تھے۔

اگلا لمحہ اور حیران کن تھا۔ اسی چٹان کے عقب سے

ایک سفید لبادے میں لپٹی لڑکی برآمد ہوئی۔ اس کے سر پر چھاج بھرے سنہرے اور چمک دار بالوں کا ٹوکرا تھا۔ شفاف تر جلد اور تھکوط سے خدوخال والی وہ لڑکی بے حد حسین تھی۔ اس نے بڑے اطمینان سے دونوں جانوروں کے سروں پر ہاتھ رکھا اور براہِ راست شجاع کی طرف دیکھا۔ لڑکی کے احمریں لبوں پر واضح مسکراہٹ ابھری۔ الفوزہ کی تان دم توڑ گئی تھی۔ پورٹرز نے بھی جانوروں کی غراہٹیں سنی تھیں اور اب ہراساں نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ شجاع کی سماعت سے کیرولینا کی کپکپاتی آواز ٹکرائی۔ ''صبح میں نے اسی کو دیکھا تھا۔''

پھر پورٹرز میں سے کسی نے لڑکی اور جانوروں کو دیکھ لیا۔ خاموش تر فضا میں ایک چیختی ہوئی آواز بلند ہوئی..... ''نیلگری'' اس آواز میں صدیوں کا خوف شامل تھا۔

عین اسی وقت شجاع اور کیرولینا پر وزنی اور بدبودار جال آگرا۔ دونوں جال میں اُلجھ کر نیچے گرے۔ پھر جیسے سیاہ چٹانوں نے درجنوں منڈے ہوئے سروں والے سفید پوشوں کو اُگل دیا تھا۔ ان میں سے کئی افراد شجاع اور کیرولینا پر جھپٹے۔ شجاع کے چہرے پر ایک وزنی ہاتھ آیا۔ اس ہاتھ میں کوئی کپڑا دبا ہوا تھا۔ ایک تیز تر خوشبو نے پل بھر میں اس سے حواس چھین لیے اور اس کا ذہن بڑی تیزی سے تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

شجاع کی دوبارہ آنکھ کھلی تو وہ آرام دہ بستر پر تھا اور خوشگوار حرارت کا احساس ہو رہا تھا۔ چکراتے سر کے ساتھ وہ بستر سے اٹھ بیٹھا۔ یہ ایک مختصر سا کھوہ نما کمرا تھا۔ پتھریلی دیواروں اور غیر معمولی اونچی چھت سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ جگہ کسی غار کا حصہ تھی۔ ایک کونے میں پتھروں کے دائرے میں لکڑیاں سلگ رہی تھیں اور ان سے کچھ فاصلے پر خشک لکڑیوں کا ڈھیر بھی موجود تھا۔ غار نما اس کمرے میں روشنی کا ماخذ بھی یہی آگ تھی۔

شجاع نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ ایک تقریباً چار فٹ قطر کا کٹا پھٹا داخلی راستہ نظر آیا۔ دوسری جانب سے ایک وزنی پتھر کے ذریعے اس داخلی راستے کو بند کیا گیا تھا۔ شجاع نے اٹھ کر اس پتھر کو دھکیلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوا۔ تھک ہار کر اس نے آواز دی مگر یہ آواز اس بلند چھت والے قید خانے میں گونج کر رہ گئی۔ مایوس ہو کر وہ واپس اپنے بستر میں آگیا۔ رات کے واقعات اس کے ذہن میں تازہ تھے۔ نیلگری ایک حقیقت بن کر سامنے آچکی تھی اور وہ عملی طور پر اس کی قید میں تھا۔ اسے اپنے ساتھیوں کی فکر ستانے لگی۔ کیرولینا نہ جانے کس حال میں تھی۔ ساتھ ہی اسے بھوک کا احساس ہوا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا اور وہ نامعلوم وقت کے لیے بے ہوش بھی رہا تھا۔ بھوک سے لڑتے ہوئے وہ دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا۔ خود کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

شجاع کو دو گھنٹے سے زائد بھوک سے مزید لڑنا پڑا پھر گڑگڑاہٹ سی اُبھری اور اس کے قید خانے کا پتھر اپنی جگہ سے ہٹایا جانے لگا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا ہی تھا کہ اس کی سماعت سے تیندوے کی غراہٹ کی آواز ٹکرائی۔ وہ دوبارہ سے بستر پر بیٹھ گیا۔ قید خانے کا پتھر ہٹایا جا چکا تھا۔ پھر دو سفید پوش سر جھکا کر اس چار فٹ کے راستے سے اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک سنہری بالوں والی عورت تھی۔ لحظہ بھر کو شجاع کو لگا کہ وہ نیلگری ہے مگر شعلوں کے انعکاس میں اس عورت کا چہرہ نمایاں ہو گیا۔ بلاشبہ وہ حسین تھی اور اس کے نقوش میں نیلگری کی مشابہت بھی تھی مگر اس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔ دوسرا ایک نوعمر لڑکا تھا جس کے ہاتھوں میں وزنی کپڑے سے ڈھکی کوئی ٹرے وغیرہ تھی۔

تیندوے کی غراہٹ دوبارہ اُبھری اور شجاع کو اس کی مخصوص حیوانی باس بھی محسوس ہوئی۔ یقینی طور پر وہ غار کے باہر موجود تھا۔

بلند چھت والے اس قید خانے میں اس باوقار عورت کی آواز بلند ہوئی۔ ''نیلگری کی وادی میں خوش آمدید اجنبی! معافی چاہتی ہوں تمہیں یہاں لانے کے لیے ہمیں ناخوشگوار طریقہ اختیار کرنا پڑا۔''

یہ بلتی سے ملتی جلتی زبان تھی۔ شجاع کو مفہوم سمجھنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ اس نے کہا۔

''محترم خاتون! ہمیں یہاں لانے کی آپ کو کیا ضرورت پیش آئی۔ ہم سیاح لوگ ہیں اور کسی کے لیے پریشانی کا باعث نہیں بنے۔ اپنے ساتھیوں کی فکر مجھے پریشان کر رہی ہے۔''

خاتون کے ہونٹوں پر بے نام سی مسکراہٹ نمودار ہو کر غائب ہو گئی۔ ''بہت سی باتیں تم بہت جلد جان جاؤ گے۔ تمہارے ساتھی بھی خیریت اور آرام سے ہیں۔ پہلے تم کچھ کھا لو۔'' اس نے نوعمر لڑکے کو اشارہ کیا۔ اس نے جلدی سے ڈھکی ہوئی ٹرے شجاع کے قریب رکھی اور پیچھے ہٹ گیا۔

شجاع نے کہا۔ ''خوفناک جانور کی موجودگی کے خوف سے کہاں کچھ کھایا جائے گا۔''

خاتون بولی۔ ''اس کی طرف سے قطعی فکر نہ کرو۔ وہ شریر لوگوں کے لیے ہے۔ تم مجھے شریف لڑکے لگتے ہو۔ اطمینان سے کھاؤ۔ میں کچھ دیر میں دوبارہ آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ لڑکے سمیت باہر نکل گئی۔ پتھر نے دوبارہ خلا کو پُر کر دیا۔

شجاع بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر فوراً ٹرے کی طرف متوجہ ہوا۔ کپڑے کے نیچے ایک کھردری سی لکڑی کی ٹرے تھی جس میں لکڑی کے دو پیالوں میں سے ایک میں خوبانی اور اخراٹ کا ملغوبا سا تھا جس میں شہد ڈالا گیا تھا۔ دوسرے میں دودھ سے بنی کوئی نمکین کھیر جیسی چیز تھی۔ شجاع نے دونوں پیالے خالی کر دیے۔ اسے چائے کی طلب ہو رہی تھی مگر اس طلب کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

شجاع کا دماغ تیزی سے گھومنے لگا۔ یقیناً اس کے باپ اور اینڈی بوہل وغیرہ کو بھی یہاں لایا گیا تھا۔ پھر نامعلوم وجہ سے اینڈی بوہل وغیرہ نے اپنے حواس کھو دیے تھے۔ ان لوگوں میں شجاع کا باپ نہیں تھا۔ تو کیا وہ اسی نامعلوم دیس میں ہی رہ گیا تھا۔ اس خیال نے شجاع کے دل کی دھڑکن بڑھا دی۔ اگر ایسا تھا تو وہ اپنے باپ کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس دفعہ شجاع کو انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پتھر ہٹا اور وہی باوقار اور حسین خاتون دوبارہ نمودار ہوئی۔ حسبِ معمول اس کے عقب میں دوبارہ تیندوا غرایا اور اس کی مخصوص باس حس شامہ سے ٹکرائی۔

خاتون شجاع سے مخاطب ہوئی۔ تمہیں باہر لے جایا جا رہا ہے۔ ہمارے مذہب میں انسانی جان کی بڑی قدر و منزلت ہے اور ہم کسی بھی صورت میں انسان یا کسی جاندار کی زندگی نہیں چھینتے مگر ہمارے پالتو جانور کسی انسان دوست مذہب سے تعلق نہیں رکھتے۔ تعاون کرو گے تو زندہ رہو گے اور بہت جلد تمہیں یہاں سے رخصت بھی کر دیا جائے گا۔ امید کرتی ہوں تمہیں میری بات سمجھ میں آ گئی ہو گی۔''

شجاع نے تیزی سے اثبات میں سر ہلایا تو وہ مسکرائی۔

''تمہاری سوجھ بوجھ متاثر کن ہے..... آؤ میرے ساتھ۔''

شجاع اس کے عقب میں سر جھکا کر اپنے قید خانے سے باہر آ گیا۔ یہ سیاہ پتھریلی دیواروں والے غار کا کوئی اور حصہ تھا۔ ایک طویل راہداری سی تھی جس میں مخصوص فاصلے پر دیواروں میں نصب مشعلیں جل رہی تھیں۔ باہر دو مُنڈے سروں والے سفید پوش اور ایک جسیم تیندوا شجاع کے منتظر تھے۔ خاتون نے مخصوص آواز نکالی تو تیندوا دور ہٹ گیا۔

خاتون تحکمانہ انداز میں سفید پوش سے مخاطب ہوئی۔ ''اسے تیار کر کے لے آؤ۔'' یہ کہہ کر وہ راہداری کے دوسرے کونے سے مڑ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

سفید پوش شجاع کو لے کر دوسرے کونے کی جانب چل پڑے۔ تیندوا کسی بلی کے مانند ان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا مگر اس کی موجودگی کا احساس بے حد طاقتور اور دباؤ کا باعث تھا۔

راہداری گھومتے ہی شجاع پر حیرت کا ایک اور در وا ہوا۔ یہ ایک وسیع و عریض پتھریلا چیمبر تھا جہاں کسی نامعلوم جگہ سے ہوا فراٹے بھرتی داخل ہو رہی تھی۔ اس چیمبر سے کئی راہداری نما شاخیں پھوٹ رہی تھیں۔ یقیناً یہ کوئی وسیع و عریض غار تھا جو نہ جانے کہاں تک پھیلا ہوا تھا۔ یہاں کئی مُنڈے سروں والے سفید پوشوں نے دلچسپی آمیز نظروں سے شجاع کو دیکھا تھا۔

شجاع کو ایک اور شاخ میں لایا گیا۔ یہاں کہیں قریب ہی پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں اس نے خود کو ایک چشمے پر پایا۔ بخارات سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ گرم پانی کا چشمہ ہے۔

شجاع کو باقاعدہ یہاں غسل دیا گیا اور پھر اسے سفید لبادہ پہنا دیا گیا۔ واپسی کے سفر میں اس نے پورٹر خالد کو دیکھا، جب چشمے کی طرف لے جایا جا رہا تھا اور وہ بے حد سہما نظر آتا تھا۔

اس دفعہ شجاع کو جس شاخ میں لے جایا گیا، وہاں مشعلوں کی روشنی زیادہ تھی۔ دیواروں کو بھی رگڑ کر ملائم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یقیناً یہ اس غار کا کوئی خاص حصہ تھا۔

تھوڑا مزید آگے گئے تو وہی باوقار خاتون اُن کی منتظر تھی۔ دونوں سفید پوش واپس چلے گئے مگر تیندوا موجود رہا تھا۔ شجاع کی بار بار نظر اس شاندار جانور پر جا رہی تھی جس کی خوب صورتی اور ہیبت ناکی مثالی تھی۔

یہاں ایک باقاعدہ لکڑی کا دروازہ تھا۔ خاتون نے دروازہ کھولا اور شجاع کو اندر جانے کے لیے کہا۔ شجاع اندر داخل ہوا تو یہ ایک مشعلوں سے خوب منور بڑا سا پتھریلا کمرا تھا جس کی دیواریں یقیناً رگڑ رگڑ کر ملائم کی گئی تھیں۔ اس کمرے کے وسط میں چار کرسیاں پڑی تھیں اور چاروں کرسیوں پر سنہری بالوں والی بڑی بڑی جسیم براجمان تھیں، سب سے بڑی کی عمر کا اندازہ نوے سال سے اوپر کا تھا۔

ان کی شکلوں میں خاصی مشابہت پائی جاتی تھی۔ وہ چاروں تنقیدی نظروں سے شجاع کا جائزہ لیتے ہوئے آپس میں کھسر پھسر کرنے لگیں۔

اچانک ہی شجاع کا دل دہل گیا، وہ نامعلوم مذہب کے پیروکاروں کے درمیان ایک قطعی اجنبی جگہ پر تھا۔ انسانی قربانی اور اس سے متعلق خرافات کا خیال آیا تو اس کا دل لرزنے لگا۔ پھر باوقار خاتون کے الفاظ یاد آئے کہ اس کے مذہب میں انسانی جان کی بڑی قدر و منزلت ہے تو دل کو ڈھارس بندھی۔

بڑی بیبیوں کا جائزہ آخر مکمل ہوا اور شجاع کو واپسی کی اجازت ملی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے قید خانے میں تھا۔

☆☆☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ خفیف گڑگڑاہٹ کے سبب شجاع کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے بستر سے منہ نکالا۔ اس کے قید خانے کا پتھر ہٹایا جارہا تھا پھر جیسے اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ سفید لبادے اور منڈے ہوئے سر کے باوجود شعلوں کی روشنی میں اس نے اندر داخل ہونے والے شخص کو پہچان لیا۔ وہ کوئی اور نہیں، اس کا باپ وارث سد پارہ تھا۔

شجاع تڑپ کر بستر سے نکلا۔ وارث کی آنکھ سے بے آواز آنسو بہہ نکلے تھے۔ اس نے بازو پھیلائے۔ شجاع ٹوٹی ہوئی شاخ کے مانند باپ کے سینے سے جالگا۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ وارث نے رُندھی آواز میں کہا۔

"میرا پیغام تم تک نہیں پہنچا تھا؟"

شجاع نے بمشکل کہا۔ "پہنچ گیا تھا۔"

وارث کرلایا۔ "تو پھر کیوں اپنی جان عذاب میں ڈالی ہے۔"

شجاع کے پاس رونے کے سوا کوئی جواب نہیں تھا۔

چند لمحوں بعد وارث نے پوچھا۔ "تیری بہن اور ماں کیسی ہے؟" اس کی آواز میں صدیوں کی تھکن تھی۔

"ماں نہیں رہی بابا! وہ آپ کی راہ دیکھتے دیکھتے....." شجاع بے طرح رونے لگا۔ اس کی آواز بلند ہوئی تو وارث نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔

"آواز قابو میں رکھ بیٹے! جو قسمت میں لکھا تھا، ہو کر رہا اور میری بات توجہ سے سن۔"

تھوڑی دیر بعد دونوں باپ، بیٹا جذبات کو سنبھالے بستر پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ وارث نے گمبھیر آواز میں کہا۔

"یہ بدھ مت کے کسی نامعلوم فرقے سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں اور نامعلوم وقت سے اس وادی اور غار کو اپنا مسکن بنائے ہیں۔ یہاں عورتوں کی سرداری ہے اور ان کا ماننا ہے کہ اس وادی سے باہر کی دنیا "شیطانی دنیا" ہے اور یہ وادی ان کی پناہ گاہ ہے۔"

شجاع نے کہا۔ "یہ نیلگری کا کیا قصہ ہے اور لوگوں کا حواس کھودینا یہ کیا چکر ہے؟"

وارث نے طویل سانس لی۔ "جن بڑی بیبیوں کے ملاحظے سے ابھی تم واپس آئے ہو، یہ بھی اپنے اپنے وقت کی نیلگریاں ہی تھیں۔"

شجاع اُچھلا۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب بڑا واضح ہے۔ صدیوں سے یہ لوگ نسل در نسل یہاں آباد ہیں۔ اعزازی بادشاہت کی طرح ایک "اعزازی نیلگری" ہوتی ہے۔ باقی انتظامی و دیگر معاملات بڑی بیبیاں ہی دیکھتی ہیں۔ وقتِ مقرر پر نیلگری کے لیے "بر" دیکھا جاتا ہے اور اس کی شادی کے ساتھ ہی مخصوص جڑی بوٹیاں دی جاتی ہیں جس کے سبب زیادہ تر لڑکیاں ہی پیدا ہوتی ہیں۔ پیدا ہونے والی لڑکی کی عمر جب سولہ سال ہوتی ہے تو اسے نیلگری بنادیا جاتا ہے۔" وارث کا لہجہ سنسنایا۔ "موجودہ نیلگری کی عمر چوبیس سال ہوچکی ہے اور اس کے لیے "بر" دیکھا جارہا ہے۔"

شجاع کی نگاہوں میں کچھ دیر پہلے کے مناظر تازہ ہوگئے۔ اسے گرم چشمے پر غسل دینا اور پھر بڑی بیبیوں کے سامنے ملاحظہ..... اس نے گنگ نظروں سے باپ کی طرف دیکھا جس کے ہونٹوں پر شریر سی مسکراہٹ تھی۔

"یہ لوگ نسلی تنوع اور صحت مند و خوبصورت نیلگری کے حصول کے لیے "شیطانی دنیا" کے مردوں پر بھروسا کرتے ہیں۔ اطراف میں بھٹکنے والوں کو یہاں لایا جاتا ہے۔ "مقصد" کے حصول کے بعد نیلگری کے شوہر سمیت سبھی کو "پاگل" کرکے واپس بھیج دیا جاتا ہے۔ ہم لوگوں میں سے کوئی بھی مطلوبہ معیار پر پورا نہیں اتر پایا تھا۔ اسی سبب دس بارہ دنوں میں نیلگری کے راز کو راز رکھنے کے لیے سبھی کو پاگل کرکے واپس بھیج دیا گیا۔"

شجاع کو ساری کہانی سمجھ آرہی تھی، وہ بولا۔ "ان میں آپ کیوں نہیں تھے؟"

وارث کے وجود پر جیسے دبیز افسردگی اُتر آئی۔

"میری خوش قسمتی یا بدقسمتی..... ایک بڑی بی کی آنکھوں میں سفید موتیا اترا ہوا تھا۔ تم جانتے ہو میں جڑی بوٹیوں کو سمجھتا ہوں۔ میں نے ایک تیر بہدف نسخے سے بڑی بی کا موتیا اتار دیا اور اس نے کارآمد جان کر مجھے وادی میں روک لیا

ورنہ میں بھی "نیلگری..... نیلگری" چلاتا پھر رہا ہوتا۔"

شجاع کو بہت سی باتوں کے جواب مل گئے تھے۔ اس نے مزید پوچھا۔ "لوگوں کو یہ پاگل کیسے کرتے ہیں؟"

"اس وادی میں ایک بوٹی اگتی ہے "ترچھلی" اسے صرف تین دن پکا کھانے میں دیتے ہیں اور انسان پاگل ہو جاتا ہے۔ انسانی جان کی حرمت کے عقیدے کے سبب یہ جان لینے کے بجائے صرف پاگل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ نیلگری کی کہانی شاید اس وادی سے کبھی باہر نہ نکل پاتی۔"

تجسس ختم ہوا تو شجاع کو نئے خیال نے آگھیرا۔ "ہم ..... ہمارے ساتھ بھی یہی ہوگا؟"

وارث نے جیسے تکلیف کے عالم میں دل کو دبایا۔ "اس ذکر سے میں ممکن حد تک فرار چاہ رہا تھا۔ تمہیں اور تمہارے ساتھ آنے والے ایک لڑکے کو نیلگری کے "بر" کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ کسی ایک کا فیصلہ ابھی نہیں ہوا۔"

شجاع لرزا۔ "بابا! میں پاگل نہیں ہونا چاہتا۔"

وارث کی آنکھوں میں دوبارہ آنسو چمکنے لگے۔ "تیرا باپ ابھی زندہ ہے۔" ساتھ ہی اس نے اپنے لبادے کے اندرونی حصے میں ہاتھ ڈالا۔ لوہے کی ایک گول ڈبیا نکال کر قیمتی متاع کی طرح شجاع کو تھمائی اور رازدارانہ انداز میں بولا۔

"جب تمہیں بڑے اہتمام سے راتوں کو دودھ پلایا جائے تو دودھ پینے کے بعد اس ڈبیا میں سے ایک گولی لے لینا۔ یہ ترچھلی کا تریاق ہے جو میں نے تیار کیا ہے۔ یہ بھی صرف اس صورت میں کارآمد ہے جب ترچھلی کی خوراک لیے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ نہ ہوئے ہوں ورنہ یہ بیکار ہے۔"

شجاع کی گرفت اس ڈبی پر مضبوط ہو گئی۔

وارث نے خصوصی تاکید کی کہ دودھ بڑے اہتمام سے پلایا جائے گا اور یقینی بنایا جائے گا کہ تم لوگ دودھ پی لو! اس سب بے دھڑک دودھ پی لینا۔ معمولی سا بھی شک بڑے مسائل پیدا کر دے گا۔"

شجاع نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "بابا! یہاں سے بھاگ نہیں سکتے ہم؟"

وارث نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "یہ ممکن ہوتا تو نہ جانے کب کا تیرا باپ بھاگ کر گھر آ چکا ہوتا۔ اس وادی کی ڈھلانوں کے محافظ تیندوے ہیں جو اس وادی میں خصوصی طور پر نسل در نسل پالے جا رہے ہیں۔ ایسی کوشش کرنے والوں کی موت بڑی دردناک ہوتی ہے۔"

اس دوران باہر سے ہلکی سی کھانسی کی آواز نے وارث کو چونکا دیا۔ شجاع کے چہرے پر ہراس دیکھتے ہوئے وارث نے کہا۔

"فکر کی ضرورت نہیں ..... میرا آزمودہ قابلِ اعتماد شاگرد ہے ..... میں اب چلتا ہوں کل پھر آؤں گا۔" بیٹے کو گلے سے لگا کر وارث باہر نکل گیا۔ پتھر دوبارہ برابر ہو گیا۔

ابا بیٹے سے جدا ہوئے کب شجاع نیند کی آغوش میں ڈوب گیا۔

اگلے دن اسے دوبارہ غسل کے لیے لے جایا گیا اور پھر سے بڑی بیبیوں نے جائزہ لیا..... تو ایک بی بی نے اسے باقاعدہ سے ہٹول کر دیکھا تو شجاع کے کان سرخ ہو گئے۔

واپسی پر وہ بے طرح سے اچھل پڑا۔ سفید پوش اور مُنڈھے ہوئے سروں والے مرد چند بے ہوش افراد کو اٹھا کر لا رہے تھے۔ ان میں سے کئی پورٹر تھے۔ ایک بڑی بڑی مونچھوں اور سرخ چہرے والا لالہ آفندی تھا اور پھر ہوگوشاویز کا بھی دیدار ہو گیا جو بالکل حقیر کیچوے کے مانند نظر آ رہا تھا۔

شجاع کو ایک کمینی سی خوشی کا احساس ہوا..... ان لوگوں کے متوقع انجام نے شجاع کو سرشار کر دیا۔ رات کو وارث دوبارہ آیا تو اس کے چہرے پر دبا دبا سا جوش تھا۔ بستر پر بیٹھتے ہی اس نے کہا۔

"نیلگری کے بر کا فیصلہ ہو گیا ہے۔"

شجاع کو آج کا ملاحظہ یاد آیا تو اس کے کان سرخ ہونے لگے۔ وارث اپنی دھن میں رواں تھا۔

"تمہاری قسمت کہ یہ اعزاز آج ایک نئے لائے جانے والے قیدی کے حصے میں آیا تھا۔ وہ یورپین ہے اور بڑے پتلے پتلے دلا آویز نقوش کا مالک ہے۔"

شجاع کی نگاہوں کے سامنے ہوگوشاویز کی صورت آ گئی اور محسوس ہوا جیسے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔

☆☆☆

کیرولینا وغیرہ کا بیس کیمپ سے رابطہ منقطع ہوتے ہی امدادی ٹیم نکل پڑی تھی مگر اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ پھر دو مہینے بعد ایک شکاری کو برف زار میں بھٹکتے ہوئے دیوانوں کا ایک گروپ ملا جو بھی "نیلگری" کے گزیدہ تھے۔ ان میں ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔

شجاع بھی دیوانے پن کی اداکاری کرتا رہا اور پھر رفتہ رفتہ اس نے دیوانگی میں ہی پناہ ڈھونڈ لی۔ وہ آج بھی نیلگری کے دیس کی جانب نگاہ جمائے پہروں بیٹھا رہتا ہے۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ اس دیس میں آج بھی اس کا باپ زندہ سلامت ہے۔

❖❖❖

تلاشِ راہ

عبدالرب بھٹی

سائنس کا علم اپنی جائز حدود و قیود میں بہت مفید ہے اور مسئلہ یہ بھی... اگر سائنس اپنی جائز حد سے تجاوز نہ کرے تو انسان کے لیے باعث راحت ہے... سائنسی تحقیق اور جستجو نے بتایا کہ زمین کے اندر بھی ایک الگ دنیا دفن ہے... ایک ایسے ہی پروفیسر کی تلاش کا حیرت انگیز ماجرا... وہ صدیوں پرانی تہذیب کی تلاش میں تھا... جس کے آثار وطن عزیز کے ایک خاص علاقے میں مل چکے تھے... قدم بہ قدم سنسنی اور تجسس نے ان کے سفر کو دشوار بنا دیا تھا... مگر ایک ان دیکھی دنیا کی دریافت انہیں مسلسل گامزن رکھے ہوئے تھی...

پہاڑوں کے حبس زدہ ماحول میں پُراسرار خزانے کی تلاش و جستجو کا احوال

رات کے اس ٹھٹھرتے سناٹے میں وہ چیخ کسی آسیب کی طرح اُبھری اور خنجر کی طرح تاریکی کے سینے میں پیوست ہوگئی۔

شہر کے دامن میں واقع ڈاک بنگلے تک یہ چیخ پہنچی تو پروفیسر حامد ہمدانی بُری طرح چونک گیا۔ پہلا پریشان کن خیال اس کے دل میں یہی آیا کہ کسی مزدور کو یا تو سانپ نے ڈس لیا ہے یا پھر وہ کالے پہاڑی بچھو کا شکار ہوگیا ہے.....''

وہ ابھی ابھی سائٹ سے اپنے ساتھی نوید انور کے ساتھ ڈاک بنگلے میں تھکا ہارا لوٹا تھا۔ فوراً الٹے پاؤں سخت سردی میں باہر نکلا اور ٹارچ سنبھالے اندھا دھند دوڑتا ہوا مذکورہ مقام تک پہنچا، جو زیادہ دور نہ تھا۔ نوید بھی اس کے پیچھے تھا۔

کیا دیکھتا ہے، جنوبی خندق کے گرد مزدور اکٹھے تھے۔ چند کے ہاتھوں میں گیس کے ہنڈولے تھے اور ان کے درمیان انہی کا ایک ساتھی مزدور خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ یوں جیسے اس نے سنگلاخ ویرانے میں کوئی بھوت..... یا اس سے بھی زیادہ خوف ناک چیز دیکھ لی ہو، کیونکہ اس کے جسم پر کہیں بھی کسی سانپ یا بچھو کے کاٹے کی نشانی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

''کیا ہوا اسے دل مراد؟'' پروفیسر ہمدانی نے قریب آکر ٹھیکے دار سے پوچھا مگر اس کے جواب دینے سے پہلے ہی وہ خوف زدہ مزدور جنوبی خندق کی طرف اشارہ کر کے لرزیدہ آواز میں کہنے لگا۔

''صص..... صاحب! وہ..... وہ..... وہاں..... وہاں.....'' مارے دہشت کے اس کا جملہ ہی نہیں مکمل ہو پا رہا تھا۔

''ہاں..... ہاں، بولو کیا ہے وہاں؟'' پروفیسر نے کہا۔

''ایک ایک..... عورت، سر کٹی، اس نے اپنا کٹا ہوا سر اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ رکھا ہے اور..... اور کٹے ہوئے سر کا چہرہ ہنس رہا تھا۔'' مزدور دہشت ناک لہجے میں بولا مگر پروفیسر حامد کو ہی نہیں اس کے ساتھی نوید کو بھی یہ لغویات کے سوا کچھ نہ لگا۔ دونوں چند مزدوروں کے ساتھ جنوبی خندق کی طرف گئے مگر وہاں کوئی نہ تھا۔

سارے مزدور اپنے ساتھی مزدور کا مذاق اُڑاتے ہوئے ہنسنے لگے۔

☆☆☆

وہی منظر، وہی مقام اور وقت بھی وہی رات کا تھا.....''

فرق صرف اتنا تھا کہ اس ہراس زدہ مجمع سے چند قدموں کے فاصلے پر ایک خشک پہاڑی نگر کے عقب میں دبکا ہوا ایک پُراسرار سایہ بہ غور ان کی طرف متوجہ تھا۔ کوئی اس کی وہاں موجودگی سے واقف نہ تھا۔ مزدور کی دہشت زدہ چیخ اس نے بھی سنی اور اس کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ بھی ابھری تھی۔ شاید اسے ذرا دیر پہلے اسی بات کی توقع تھی یا پھر وہ یہ دیکھنے کا ہی منتظر تھا، کیونکہ جیسے ہی پروفیسر حامد یہاں پہنچا تو وہ سایہ الٹے پاؤں پلٹ گیا۔

اب وہ تیز تیز قدموں سے ٹھٹھرتے تاریک اور خشک چٹانوں کے درمیان بنے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر چلا جا رہا تھا۔ اس کا انداز بتاتا تھا کہ وہ ان پہاڑی بھول بھلیوں جیسے تنگ اور پُرخطر راستوں سے خوب واقف ہے۔ اس نے گرم چادر کی بُکل مار رکھی تھی اور ہاتھ میں ایک بوری نما تھیلا تھا، جسے بہ آسانی ایک ہی ہاتھ میں اٹھانے سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ زیادہ وزنی نہ تھا۔ اس بوری کے اندر ایک بھس بھرا عورت کا پُتلا تھا جس کا سر کٹا ہوا تھا۔ اسے

نہایت خوبی کے ساتھ بنایا گیا تھا اور کچھ تاریکی اور ماحول کی کارستانی تھی کہ اسے اس سائے نے تیار کر کے خندق کے باہر ایستادہ کر دیا تھا کہ دیکھنے والا اسے کوئی بھوت یا چڑیل ہی سمجھتا۔ لہٰذا جیسے ہی وہ مزدور اس نقلی پُتلے سے ڈر کے بھاگا، اس سائے نے جلدی سے پُتلے کو سمیٹا اور چشم زدن میں بھاگ کر اس پہاڑی پر آ گیا اور جلدی جلدی اس پُتلے کی ہوا نکال کر اسے تھیلے میں ڈال دیا۔

دفعتاً اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے تعاقب میں ہے۔ کسی خیال کے تحت وہ لرز گیا لیکن پھر اگلے ہی لمحے اپنی بزدلی پر ہی نہیں بلکہ ایک خیال پر آپ ہی ہنس دیا کہ وہ تو خود ایک ڈراما کر کے ان غریب مزدوروں میں خوف و ہراس پھیلا کر واپس لوٹ رہا ہے، اب ایک ذرا سے واہمے پر خود ہی ڈر گیا لیکن..... جلد ہی اس پر یہ عقدہ کھل گیا کہ یہ اس کا واہمہ نہیں تھا..... کوئی واقعی اس کے تعاقب میں تھا، پہلا خیال اس کے ذہن میں یہی ابھرا کہ کہیں ان مزدوروں میں کسی ایک کی نگاہ اس پر تو نہیں پڑ گئی تھی اور وہ اس کے تعاقب میں چلا آیا ہو۔ یہ سوچ کر وہ وہیں ایک پہاڑی ٹیلے کی آڑ میں ہو گیا۔

رات اندھیری اور سرد تھی، آسمان صاف اور تاروں کے جھرمٹ میں پورے چاند کی روشنی پہاڑیوں پر طلسم کی طرح بکھر رہی تھی۔

اسے لگا جیسے اس کے رکتے ہی تعاقب میں آنے والا بھی رک گیا ہو اور اگلے ہی لمحے اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے کھڑا ہے۔ ڈرتے ڈرتے اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔

براق چاندنی میں اسے جو بھی شے کھڑی نظر آئی، اسے دیکھتے ہی وہ سر تا پا دہل کر رہ گیا۔ اس کے اوسان خطا ہونے سے پہلے اسے یہی آخری خیال آیا تھا کہ وہ جس خوف ناک مگر ''کامیاب'' ڈرامے کی خفیہ طور پر ''ہدایت کاری'' کر کے لوٹ رہا تھا، وہ جیسے واقعی ایک خوف ناک حقیقت بن کر اس کے سامنے آ گیا تھا۔

پھر اس کے دو تین سیکنڈوں بعد ہی یہاں سے کچھ

فاصلے پر پروفیسر ہمدانی سمیت موجود، ہراساں مزدوروں نے ایک اور خوف ناک چیخ سنی جس کی بازگشت پہاڑیوں میں دیر تک گونجتی رہی۔ پروفیسر نے نوید اور ٹھیکے دار کو ساتھ لیا اور آواز کے مرکز کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

وہی منظر، وہی مقام اور وقت بھی رات کا آخری پہر تھا..... اب کے فرق صرف اتنا تھا کہ دونوں مقام کچھ فاصلے پر تھے۔ قریب ہی یہاں دیہاتی طرز کا کبھی ایک چھوٹا ریلوے اسٹیشن ہوتا تھا مگر اب کافی عرصے سے بیکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں اب ویرانی کے سوا کچھ نہیں نظر آتا، نظر آتا ہے تو اسٹیشن کی بوسیدہ ٹوٹی پھوٹی عمارت، امتدادِ زمانہ کے سبب اکھڑے ہوئے پلستر کا دھنسا ہوا پلیٹ فارم، وہیں ایک زنگ آلود مال بوگی کھڑی تھی، جس کے اندر سے روشنی آرہی تھی۔ اندر شاید کچھ لوگ موجود تھے۔

ان کی تعداد تین تھی۔ صورت سے ہی بیہودے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔ بوگی اندر سے بھی بوسیدہ تھی، اس کا لوہے کی چادر کا فرش بھی کونے سے اکھڑا ہوا تھا اور وہاں لکڑی کا تختہ بچھا رکھا تھا تاکہ بے خیالی میں کوئی نیچے نہ جا گرے۔ اندر ایک بڑی موم بتی روشن تھی۔ درمیان میں انگیٹھی رکھی تھی، جس کی تپش سے بوگی کی محدود فضا گرم تھی۔ انگیٹھی پر قہوے کی کیتلی رکھی تھی۔ یہ ان تینوں کی عارضی پناہ گاہ معلوم ہوتی تھی۔ ان تینوں نے گرم لباس پہن رکھا تھا۔ دو آدمی سگریٹ پی رہے تھے اور ایک کے ہاتھ میں جست کا مگ تھا۔ وہ ان دونوں سے زیادہ تگڑا معلوم ہوتا تھا۔ وہ شاید ان کا سرغنہ بھی تھا۔ وہ بولا۔

''ابھی تک یہ شانو نہیں آیا، کہیں گیم الٹی تو نہیں کر دی اس بے وقوف نے.....''

''حوصلہ سائیں وڈا! ایسی بدفال منہ سے مت نکالو۔'' انگیٹھی کے قریب بیٹھے دو میں سے ایک ساتھی بولا۔ ''شانو نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ وہ اپنا کام کامیابی سے کر کے آتا ہی ہوگا۔''

''ہاں سائیں! شانو کے کارنامے ہم سے ڈھکے چھپے تھوڑا ہی ہیں۔'' دوسرا ساتھی بھی سرغنہ سے اسی لہجے میں بولا۔

''ہم.....'' سرغنہ نے ہنکارا بھری۔ پھر کالی چائے کا گھونٹ لیا جسے مقامی زبان میں ''سلیمانی'' کہا جاتا تھا۔

باہر سرد ہواؤں کی سرسراہٹ جاری رہی اور ان تینوں کا انتظار بھی..... ''پھر چند لمحے کی خاموشی کے بعد پہلے والا سرغنہ سے بولا۔

''سائیں وڈا! کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ لوگ کسی خزانے کی تلاش میں ہیں؟''

اس کی بات پر سرغنہ نے گھور کر اسے دیکھا اور تڑ سے بولا۔ ''تم کیا مجھے گھاس کھایا سمجھتے ہو؟ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ حاکم شاہ کے مہمان خانے کے ایک ملازم سے مجھے یہ بات پتا چلی تھی کہ کوئی ٹیم ان کے ہاں مہمان بنی ہے جو یہاں کھدائی کرنے آئی ہے۔''

''لیکن سائیں!'' دوسرا ساتھی اس کے اکھڑ لہجے کی پروا کیے بغیر بولا۔ ''آپ کو کیسے اس بات کا یقین ہے کہ وہ اصل میں خزانے کی تلاش میں یہاں آئے ہیں؟''

''بکواس پھیلائی گئی ہے جان بوجھ کر کہ وہ کسی آثارِ قدیمہ کی کھدائی کے لیے آئے ہیں.....'' سرغنہ غصے سے اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ''تاکہ ان کا منصوبہ آشکار نہ ہو جائے۔ وہ لوگ کسی خزانے کی تلاش میں ہیں، انہیں سب پتا ہے مگر اصل بات چھپا رہے ہیں۔ اب اس خزانے والی جگہ کی نشاندہی ہو چکی ہے تو انہیں وہاں مزید کھدائی سے روکنا ضروری ہے، ورنہ خزانہ ان کے ہاتھ لگ جائے گا تو حاصل کرنا مشکل ہوگا، میں انہیں اب یہاں سے بدروحوں کا ڈراما رچا کر خوف زدہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ لوگ ڈر کے بھاگ جائیں اور بعد میں ہم اس جگہ کی خفیہ طور پر کھدائی کر کے وہ خزانہ آسانی سے حاصل کر لیں۔''

دونوں ساتھی خاموش رہے۔ باہر خاموشی اور ویرانی میں کہیں دور کسی جانور کے چلّانے کی آواز آئی پھر سناٹا چھا گیا۔ مزید کافی دیر تک اپنے ساتھی شانو کا انتظار کرتے رہنے کے بعد انہیں تشویش لاحق ہوئی تو بالآخر سرغنہ نے اپنے ان دونوں ساتھیوں کو شانو کی تلاش کے لیے روانہ ہونے کا حکم دے دیا۔

☆☆☆

فرعونِ مصر طوتن خامن کے مقبرے کی دریافت کے باون سال بعد یہ انکشاف ہوا کہ اس کے نواح میں طوتن خامن کے ایک معتبر امیر راعوسس کا مقبرہ بھی ریت کی تہوں میں دفن ہے۔

یہ انکشاف آثارِ قدیمہ کے ایک برطانوی ماہر پروفیسر والس میل..... نے کیا تھا۔ پروفیسر والس میل کی عمر اس وقت ساٹھ کے ہندسے سے تجاوز کر چکی تھی۔ اس کی زندگی کا بیشتر حصہ ماضی کی باقیات پر ریسرچ کرتے ہوئے گزرا تھا۔ اگرچہ وہ ذاتی طور پر زمین کے سینے میں دفن ماضی کا کوئی راز دریافت نہیں کر سکا تھا لیکن اس موضوع پر

اس کی رائے کو خاصی اہمیت دی جاتی۔ خصوصاً مصری آثارِ قدیمہ پر اسے اتھارٹی سمجھا جاتا تھا۔

قدیم تحریریں سمجھنے میں پوری دنیا میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اس معاملے میں اس کی رائے کو حتمی سمجھا جاتا۔

طوتن خامن کے مقبرے سے کچھ ایسی چیزیں بھی برآمد ہوئی تھیں جن کے بارے میں ابھی تک کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکی تھی اور نہ ہی کوئی نتیجہ اخذ کیا گیا تھا۔

پروفیسر وائس میل طویل عرصے سے اس سلسلے میں ریسرچ کر رہا تھا۔ بالآخر اٹھائیس سال تک طوتن خامن کے مقبرے اور برٹش میوزیم میں موجود مقبرے سے برآمد ہونے والی چیزوں کے مطالعے کے بعد پروفیسر وائس میل اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس مقبرے کے نواح میں طوتن خامن کے ایک معتمد امیر راعوسس کا مقبرہ بھی موجود ہے۔ یہ دونوں مقبرے ایک زیرِ زمین سرنگ کے ذریعے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے لیکن ان چیزوں کے مطالعے سے پروفیسر کو یہ جان کر حیرت ہوئی تھی کہ ان دونوں مقبروں کے درمیان تقریباً ساٹھ میل کا فاصلہ حائل تھا۔

قدیم زمانے میں اس قدر طویل سرنگ کا تصور محال تھا لیکن حقائق سے چشم پوشی بھی نہیں برتی جا سکتی تھی۔

پروفیسر وائس میل کو یقین تھا کہ اس کی تحقیقات غلط نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا جب اس کی رپورٹ منظرِ عام پر آئی تو ایک تہلکہ مچ گیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ پروفیسر کی تحقیق سے اختلاف کیا گیا اور یہ اختلاف ان ماہرین کی طرف سے کیا گیا تھا جو خود بھی طویل عرصے سے طوتن خامن کے مقبرے اور اس کے باقیات پر ریسرچ کر رہے تھے، لیکن اُدھر پروفیسر نے ان اختلافات کی پروا کیے بغیر اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کرتے ہوئے درخواست کی کہ اسے راعوسس کے مقبرے اور اس طویل سرنگ کی تلاش کی اجازت دی جائے جو دونوں مقبروں کے درمیان رابطے کا کام دیتی تھی۔

ماہرین کے شدید اختلافِ رائے کے سبب برطانوی حکومت پروفیسر وائس میل کو اجازت دینے پر ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کر رہی تھی جس پر پروفیسر نے پیشکش کی کہ اگر اسے اجازت دے دی جائے تو اس مہم کے تمام اخراجات وہ خود برداشت کرے گا۔ اس پر بھی کچھ لوگوں نے اعتراض اٹھایا کہ زرِ مبادلہ تو حکومت کا ہی خرچ ہوگا لیکن کچھ درآمد کے بعد حکومت نے پروفیسر وائس میل کی درخواست منظور کرتے ہوئے اسے اپنی تحقیقات جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔

اجازت ملتے ہی پروفیسر وائس میل نے ابتدائی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس کی تحقیقات کے مطابق راعوسس کا مقبرہ طوتن خامن کے مقبرے کے جنوب میں ہونا چاہیے تھا۔ نقشوں کی مدد سے پروفیسر نے اس طویل سرنگ کے راستے کا تعین کیا۔ طوتن خامن کے مقبرے سے تقریباً اڑتیس میل کے فاصلے پر دریائے نیل اس راستے کو کاٹتا ہوا گزر گیا تھا۔ اب غور طلب بات یہ تھی کہ کیا صدیوں پہلے بھی دریا اسی جگہ بہہ رہا تھا یا راستہ بدل کر موجودہ پٹی پر پہنچا تھا۔ تاریخ کے اوراق شاہد تھے کہ نیل بار بار اپنے راستے بدلتا رہا ہے۔ اس لیے یہ امکان زیادہ قرینِ قیاس تھا کہ جب ان دونوں مقبروں کے درمیان وہ سرنگ تعمیر کی گئی تھی تو دریا وہاں موجود نہ ہو اور صدیوں کے ردِعمل میں راستہ بدل کر اس جگہ پہنچا ہو، جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ سرنگ دریا کے نیچے سے گزر رہی تھی۔

پروفیسر وائس میل نے ایک اور رخ پر بھی سوچا تھا کہ ممکن ہے دریا کا راستہ بدل لینے سے نمی کے باعث سرنگ کا اتنا حصہ دب چکا ہو یا بہہ گیا ہو، لیکن یہ خیال زیادہ قوی نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو کبھی نہ کبھی سرنگ کا راز کھل جاتا مگر آج تک ان اطراف میں کسی سرنگ کے بارے میں نہیں سنا گیا تھا جس کا مطلب یہی تھا کہ دریا کے نیچے وہ سرنگ اب بھی جوں کی توں موجود ہے۔

سب سے پہلے پروفیسر وائس میل نے ان لوگوں سے رابطہ کیا جو اس مہم میں اس کا ساتھ دے سکتے تھے۔ یہ سب کے سب آثارِ قدیمہ کے ماہرین تھے جن کا تعلق مختلف ممالک سے تھا اور اس سے پہلے بھی ایسی کئی مہمات پر پروفیسر کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ ان میں سرفہرست پروفیسر حامد ہمدانی کا نام تھا۔

پروفیسر حامد کا تعلق پاکستان سے تھا۔ اپنے ملک میں اگرچہ اسے کوئی سرکاری حیثیت حاصل نہ تھی مگر آثارِ قدیمہ کے اس نوجوان ماہر کو حکومت کی نظروں میں اہم مقام حاصل تھا۔ موہنجوداڑو، ہڑپہ اور ٹیکسلا کے آثارِ قدیمہ کے... بارے میں اس کی کئی تحقیقاتی رپورٹس اخبارات میں شائع ہو چکی تھیں۔

مصریات کے بارے میں بھی پروفیسر حامد کا مطالعہ وسیع تھا۔ برطانیہ کے پروفیسر وائس میل سے اس کی ملاقات پاکستان میں موہنجوداڑو کے موضوع پر ہونے والے سیمینار کے موقع پر ہوئی تھی۔

اس سیمینار میں پروفیسر حامد کی رپورٹ کو بھی خاصا سراہا گیا تھا۔ اس پہلی ملاقات پر پروفیسر وائس میل نے اسے برطانیہ آنے کی دعوت دی۔ اس طرح پروفیسر حامد، طوتن خامن کے مقبرے کی ریسرچ میں پروفیسر وائس میل کے معاون کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔

''لہٰذا.....'' اب جبکہ پروفیسر وائس میل کو برطانوی حکومت سے تحقیقات جاری رکھنے کی اجازت مل گئی تھی تو اس نے دوسرے ماہرین کے علاوہ پروفیسر حامد کو بھی بلا بھیجا۔

تقریباً دو ماہ تک نقشوں پر کام ہوتا رہا اور جب کاغذی تیاریاں مکمل ہو گئیں تو یہ طے پایا کہ ماہرین کو دو پارٹیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک پارٹی پروفیسر وائس میل کی نگرانی میں طوتن خامن کے مقبرے کے اندر جنوبی رخ پر سرنگ کی تلاش کا کام کرے گی اور دوسری پارٹی ساٹھ میل جنوب میں دریا کے دوسری طرف پروفیسر حامد ہمدانی کی سربراہی میں راعوسس کے مقبرے کی تلاش کے لیے کھدائی کا کام کرے گی۔

یہ سب کچھ طے ہو جانے کے بعد وہ لوگ مصر پہنچ گئے۔ مصری حکومت سے کھدائی کا اجازت نامہ حاصل کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ پروفیسر وائس میل اپنی پارٹی کے ہمراہ طوتن خامن کے مقبرے کی طرف روانہ ہوا اور پروفیسر حامد نے دریا کے دوسری طرف مقررہ مقام پر کیمپ لگا دیا۔

پروفیسر حامد کی ہدایت پر ایک وسیع علاقے میں تین مختلف مقامات پر کھدائی کا کام شروع کر دیا گیا۔ لیکن دو جگہوں پر جلد ہی کھدائی بند کر دینی پڑی، تیسری جگہ البتہ کام جاری رہا۔

پروفیسر وائس میل سے ان کا رابطہ قائم تھا۔ کام کا جائزہ لینے کے لیے پروفیسر وائس میل بھی ہفتے میں ایک مرتبہ ان کے پاس آجاتا۔ پروفیسر وائس میل اپنے اس معاون کی کارکردگی سے خاصا مطمئن نظر آرہا تھا۔ اسی دوران پروفیسر حامد ہمدانی ایک روز ایک ضروری کام کے سلسلے میں قاہرہ چلا گیا۔ قاہرہ کے ہوٹل میں اپنے کمرے میں بیٹھا ناشتے کے دوران اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا کہ اندرونی صفحے پر ایک چھوٹی سی خبر میں بھی خاصی کشش تھی۔ اے پی پی کے حوالے سے شائع ہونے والی ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ بلوچستان (پاکستان) میں ایک چھوٹے سے قصبے مستونگ کے قریب کھدائی کے دوران کچھ کھنڈرات دریافت ہوئے ہیں جن کے بارے میں شبہ ہے کہ ان کا تعلق صدیوں پرانی تہذیب سے ہے۔

اس مختصر سی خبر میں اگرچہ زیادہ تفصیل کا پتا نہیں چل سکا لیکن پروفیسر حامد ہمدانی ناشتا کرنا بھول گیا۔ اس نے اسی روز پاکستان میں اپنے ایک دوست نوید انور کو فون کیا کہ وہ پہلی فرصت میں بلوچستان جا کر اس سلسلے میں معلومات حاصل کر کے اسے آگاہ کرے۔

نوید انور تاریخ کا اسکالر تھا۔ اسے آثارِ قدیمہ سے بھی بہت دلچسپی تھی لیکن صرف اس حد تک کہ پروفیسر ہمدانی کے ساتھ بحث کر سکے۔ وہ پروفیسر کے ساتھ ایک دو ایسی مہمات پر بھی کام کر چکا تھا۔ وہ فطرتاً خسیس پرست اور لالچی انسان تھا۔ اپنی اسی فطرت کے ہاتھوں وہ کئی مرتبہ موت کے منہ میں جاتے جاتے بچا تھا لیکن ان واقعات سے اس نے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ اس کے ساتھ اس میں یہ خاصیت بھی تھی کہ اس نے پروفیسر ہمدانی کی کسی بات کو کبھی رد نہیں کیا تھا اس لیے پروفیسر کو یقین تھا کہ نوید انور اس کے ایما پر ضرور اور فوری طور پر بلوچستان کا رخ کرے گا۔

قاہرہ میں اپنا کام نمٹانے کے بعد پروفیسر ہمدانی اپنے کیمپ میں پہنچ گیا۔ شام کا اندھیرا پھیل جانے کی وجہ سے کام بند ہو چکا تھا۔ اگلے روز جب کام دوبارہ شروع ہوا تو پروفیسر ہمدانی یہ دیکھ کر مسکرا دیا کہ اس کے ماتحت خاصے تیز رفتار ثابت ہوئے تھے۔ اس کی غیر حاضری کے گزشتہ تین روز میں ریگزار کا ایک لمبا چوڑا حصہ کھدائی میں شامل ہو چکا تھا۔

اسی روز غروبِ آفتاب کے کچھ دیر بعد پروفیسر وائس میل بھی پہنچ گیا۔ حامد کے خیمے میں بیٹھا وہ اس طرح گہری نظروں سے اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا جیسے اسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔

''کیا بات ہے پروفیسر! تم مجھے اس طرح گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو؟'' پروفیسر حامد ہمدانی نے پوچھ ہی لیا۔

''کوئی خاص بات نہیں۔ بائی دے وے، تم نے کتنے عرصے سے اخبار نہیں دیکھا۔'' پروفیسر وائس میل نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹائے بغیر پوچھا۔

''اوہ، اب سمجھا۔'' پروفیسر ہمدانی مسکرا دیا۔ ''شاید تم اُس خبر کے بارے میں میرے تاثرات جاننا چاہتے ہو جو بلوچستان میں کھنڈرات کی دریافت کے بارے میں شائع ہوئی ہے۔''

''ہاں، تم ٹھیک سمجھے۔ وہ خبر میں نے بھی پڑھی تھی اور

اسی روز سے تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

''کیوں؟ میرے بارے میں کیوں سوچ رہے ہو؟'' پروفیسر نے اُلجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''بات تمہارے ملک کی ہے، ظاہر ہے تمہارے دل میں یہ خواہش ضرور ہوگی کہ اپنے وطن جا کر ان کھنڈرات کی تحقیقات میں حصہ لو۔''

''تمہارا خیال غلط نہیں ہے پروفیسر! لیکن میری ایک عادت یہ بھی ہے کہ جب تک پہلا کام مکمل نہ کرلوں کسی دوسرے کام میں ہاتھ نہیں ڈالتا۔''

پروفیسر ہمدانی کے اس جواب پر پروفیسر وائس میل کے چہرے پر طمانیت سی پھیل گئی۔ پیڑومیکس کی روشنی میں اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ چند لمحے بھرپور نظروں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا پھر پُرسکون لہجے میں بولا۔

''مجھے تمہارے خیالات جان کر خوشی ہوئی۔ لیکن اگر تم جانا بھی چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

''سرِدست واپسی کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔ میں نے مزید تفصیلات معلوم کرنے کے لیے پاکستان میں اپنے ایک دوست سے اس سلسلے میں رابطہ کیا ہے، اگر اس میں مجھے کوئی دلچسپی محسوس ہوئی تو اسے اگلے پروگرام کے طور پر ذہن میں رکھوں گا۔'' پروفیسر ہمدانی نے جواب میں کہا۔

اس کے بعد تقریباً دو گھنٹے تک وہ اپنے کام کی موجودہ صورتِ حال پر گفتگو کرتے رہے تھے۔ پھر پروفیسر میل رخصت ہوگیا۔

کھدائی کا کام تین ماہ تک جاری رہا۔ وہ ایک وسیع رقبے پر تقریباً سوفٹ کی گہرائی تک کھدائی کر چکے تھے۔ اس کھدائی کے دوران کچھ ایسی چیزیں برآمد ہوئی تھیں جو اگرچہ زیادہ اہم نہیں تھیں لیکن انہیں امید بندھ گئی کہ اگر وہ اسی جگہ کھدائی کرتے رہیں تو کامیابی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں لیکن چند روز کی مزید کھدائی کے بعد ایک بہت بڑی چٹان حائل ہوگئی۔ سیکڑوں فٹ لمبی چوڑی اس چٹان کو توڑنا آسان کام نہیں تھا۔

پروفیسر حامد کے لیے کھدائی کا کام جاری رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اب تک جتنی کھدائی کر چکے تھے وہاں دوبارہ ریت بھر رہی تھی، کئی ماہ کی کھدائی کے بعد برآمد ہونے والی وہ چٹان بھی ریت کی تہوں میں دفن ہونے لگی۔ موسم شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اب تو ان کے لیے وہاں ٹکنا بالکل ناممکن ہوگیا تھا۔ کئی دیوپیکر مشینیں ریت میں دفن ہو چکی تھیں۔

پروفیسر حامد کو خدشہ تھا کہ اگر انہوں نے کام جاری رکھا تو کسی وقت وہ بھی ریت کی تہوں میں دب جائیں گے۔ چنانچہ پروفیسر وائس میل سے مشورہ کرنے کے بعد کم سے کم تین ماہ کے لیے کام بند کر دیا گیا۔ اس فیصلے کے ساتھ ہی کیمپ اٹھا دیا گیا اور وہ قاہرہ پہنچ گئے۔

یہ بات طے تھی کہ کم سے کم تین ماہ تک دوبارہ کھدائی کا کام شروع نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا چند روز قاہرہ میں قیام کرنے کے بعد پروفیسر کراچی روانہ ہوگیا۔

پروفیسر وائس میل سے یہ طے ہوا تھا کہ اسے اگر بلوچستان میں دریافت ہونے والے کھنڈرات میں زیادہ دلچسپی نظر نہ آئی تو تین ماہ بعد وہ دوبارہ قاہرہ پہنچ جائے گا۔

قاہرہ میں قیام کے دوران اسے نوید انور کی طرف سے کوئی پیغام موصول نہیں ہوا۔ کراچی پہنچ کر بھی اس سلسلے میں اسے سخت مایوسی ہوئی۔ نوید کے ملازم سے معلوم ہوا کہ وہ ایک بین الاقوامی کانفرنس کے سلسلے میں گزشتہ دو ماہ سے امریکا گیا ہوا ہے اور اب شاید ایک ہفتے تک واپس آجائے۔

پروفیسر حامد نے نوید سے فون پر رابطہ کیا مگر بات نہ ہو سکی، دوبارہ اس نے بھی کوشش نہ کی اور ایک مختصر سا پیغام وائس ایپ کے ذریعے اسے بھیج کر خود کوئٹہ (بلوچستان) کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس نے نیٹ پر ''بکنگ ایپس'' کے ذریعے سریاب ہوٹل میں کمرا بک کروالیا تھا۔ گرمیوں کے موسم میں سارے ہی ہوٹل بک ہوتے تھے لیکن سردیوں میں یہاں اُلّو بولا کرتے تھے۔ یوں اپریل کا مہینہ شروع ہوتے ہی میدانی علاقوں سے لوگ یہاں آنا شروع ہو جاتے تھے۔ پُربہار اور نکھرے موسم میں کوئٹہ کی آبادی میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہاں ہنہ جھیل اور اوڑک دیکھنے کے لائق ہے۔

ہوٹل سریاب میں اپنے قیام کے دوران پروفیسر ہمدانی متعلقہ حکام سے ان کھنڈرات کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا جس کی خبر اس نے قاہرہ کے ایک اخبار میں پڑھی تھی۔ یہ کھنڈرات کوئٹہ سے بتیس میل دور مستونگ..... کے قصبے سے چند میل کے فاصلے پر دریافت ہوئے تھے۔ وہ علاقہ چونکہ قلات ڈویژن میں تھا اس لیے پروفیسر ہمدانی کو کمشنر قلات سے بھی رجوع کرنا پڑا۔

پروفیسر ہمدانی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مقامی حکام نے اس کے ساتھ مکمل تعاون کیا اور ان کھنڈرات پر ریسرچ کرنے کی اجازت دے دی گئی۔

جس دن ہمدانی ہوٹل سریاب سے رخصت ہو رہا تھا، اس روز نوید انور بھی پہنچ گیا۔ اتفاق سے وہ بھی ہوٹل سریاب

ہی میں آیا تھا۔ اس وقت ہمدانی خوب صورت لان میں بیٹھا چند غیر ملکی سیاحوں سے باتیں کر رہا تھا۔ اگر وہ اپنے کمرے میں یا ہوٹل سے باہر ہوتا تو یقیناً نوید انور کو نہ دیکھ پاتا۔ نوید کے آجانے کی وجہ سے اسے مزید کوئٹہ میں رکنا پڑا۔ اگلے روز صبح ہی وہ مستونگ کی طرف روانہ ہو گئے۔

مستونگ میں مختلف افسران سے طویل ملاقاتوں کے بعد انہیں مستونگ کے تحصیل دار حاکم شاہ کے پاس پہنچا دیا گیا۔ حاکم شاہ بتیس تیس سال کی عمر کا ایک سلجھا ہوا اور پُروقار شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے بڑے سکون سے پروفیسر حامد کی باتیں سنیں اور پھر اس سے ہر طرح کا تعاون کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

''میں کچھ دیر بعد کوئٹہ روانہ ہو رہا ہوں تاکہ ابتدائی تیاریوں کے علاوہ کچھ ضروری سامان فراہم کر سکوں۔ کھدائی کے لیے سردست ہمیں کم سے کم بیس ایسے مزدوروں کی ضرورت پڑے گی جو صحت مند، توانا اور جفاکش ہونے کے علاوہ دیانت دار بھی ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ مزدوروں کا انتظام یہیں سے کیا جائے اور یہ کام آپ کو کرنا ہوگا۔ کیونکہ یہاں کے لوگوں کو آپ سے بہتر اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ ان کے معاوضے کے بارے میں بھی وضاحت کر دوں کہ وہ جتنا ایک دن میں کماتے ہیں، میں انہیں اس سے پانچ گنا زیادہ دوں گا۔ کھانے وغیرہ کا انتظام میرے ذمے ہوگا۔ اگر یہ معاوضہ کم محسوس ہوا تو اس میں اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔'' پروفیسر ہمدانی نے کہا۔

''کم۔'' حاکم شاہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''آپ کی پیشکش سے میرے منہ میں بھی پانی بھر آیا ہے۔ جی چاہتا ہے آج ہی یہ تحصیل داری چھوڑ کر فرہاد کی طرح کدال اٹھا لوں۔''

''فرہاد کے ہاتھ میں تیشہ تھا۔'' پروفیسر ہمدانی نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

''اسے آج کل کدال کہتے ہیں۔ تیشہ پرانے زمانے کی بات ہے۔ بہرحال آپ مطمئن رہیں، مزدوروں کا انتظام ہو جائے گا۔'' حاکم شاہ نے جواب میں کہا۔ ''لیکن آپ کب تک کوئٹہ سے واپس آ جائیں گے؟''

''میں پرسوں سہ پہر تک پہنچ جاؤں گا اور اس سے اگلے روز صبح ہی ہم سفید چٹان کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔'' پروفیسر ہمدانی نے اٹھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

''ٹھیک ہے۔ میں رات گزارنے کے لیے ڈاک بنگلے میں انتظام کر دوں گا۔'' حاکم نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

تحصیل دار حاکم شاہ سے رخصت ہو کر وہ دونوں باہر آ گئے۔ نوید پر بوریت سی طاری تھی۔ حاکم شاہ کی گفتگو کم سے کم نوید انور کے لیے انتہائی مایوس کن تھی۔ وہ تو اس امید پر پروفیسر کے ساتھ چلا آیا تھا کہ اس مہم میں بھی کوئی بڑا خزانہ ہاتھ لگ جائے گا، لیکن حاکم شاہ کی باتوں نے اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ کوئٹہ پہنچتے ہی پروفیسر سے معذرت کر کے کراچی لوٹ جائے لیکن اس کے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ ممکن ہے پروفیسر اپنی اس مہم میں کامیاب ہو جائے اور کسی قدیم تہذیب کو بے نقاب کرنے کے علاوہ کوئی قیمتی خزانہ بھی ہاتھ لگ جائے۔ ماضی کے تجربات اس بات کے شاہد تھے کہ پروفیسر حامد نے جس کام میں بھی ہاتھ ڈالا تھا، کامیابی نے اس کے قدم چومے تھے۔

لہٰذا کوئٹہ پہنچتے ہی وہ دونوں ضروری سامان کی خریداری میں مصروف ہو گئے۔ پروفیسر نے کوئٹہ کے ایک ٹھیکیدار سے ایک ٹرک اور ایک جیپ طویل مدت کے لیے کرائے پر حاصل کر لی تھی۔ تیسرے روز یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ اب کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی، وہ مستونگ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب مستونگ پہنچے تو سورج غروب ہو رہا تھا۔

ڈاک بنگلے کے لان میں ایک طرف چند مقامی باشندے بیٹھے تھے۔ ان کے چہروں اور پیوند لگے لباس سے ان کی غربت حالی کا اظہار ہو رہا تھا۔ پروفیسر کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ مزدور ہیں جن کا انتظام تحصیل دار حاکم شاہ نے کیا ہوگا۔ وہ برآمدے میں کھڑا گہری نظروں سے ایک ایک کا جائزہ لینے لگا۔ وہ سب تنومند و توانا تھے، جفاکشی ان کے چہروں سے عیاں تھی۔

ان کی آمد کی اطلاع پا کر حاکم شاہ بھی پہنچ گیا۔ اس نے مزدوروں سے ان کا تعارف کرایا اور کچھ دیر بعد ان دونوں کو اپنے گھر لے گیا جہاں اس نے رات کے کھانے کا انتظام کیا ہوا تھا۔

روایتی انداز میں پیش کیا جانے والے کھانا خاصا لذیذ تھا۔ چند مقامی ڈشیں تو بہت ہی پُرذائقہ تھیں۔ کھانے کے بعد بہت دیر تک وہ لوگ باتیں کرتے رہے۔ موضوع آثارِ قدیمہ ہی تھا۔ پروفیسر ہمدانی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج تو تھی نہیں۔ اخبارات وقتاً فوقتاً اس کے کارناموں کے بارے میں مضامین شائع کرتے رہے تھے۔ حاکم شاہ اس سے آثارِ قدیمہ کی مختلف مہمات کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

رات گیارہ بجے کے قریب وہ لوگ ڈاک بنگلے پہنچ گئے۔ سردی زوروں پر تھی۔ آتش دان دہک رہا تھا۔ صبح انتہائی عجلت کا مظاہرہ کرنے کے باوجود کھنڈرات کی طرف کوچ

کرتے ہوئے آٹھ بج گئے۔ شکر تھا کہ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ قصبے کی حدود سے نکلتے ہی انہوں نے رفتار بڑھا دی۔ آگے پروفیسر کی جیپ تھی جسے رسول بخش نامی ایک مقامی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ نوید انور بھی اس کے ساتھ جیپ میں تھا۔ ان سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر سامان سے لدا ہوا ٹرک تھا۔

ڈھلوان پتھریلے راستے پر جیپ کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ سردیوں کی دھوپ سنگلاخ چٹانوں پر سونا بکھیر رہی تھی۔ آسمان صاف تھا۔ سردی تو تھی، اسی مناسبت سے ان لوگوں نے گرم کپڑے بھی پہن رکھے تھے۔ نوید کو زیادہ ہی سردی لگ رہی تھی۔ وہ بے چینی سی محسوس کر رہا تھا اور دل ہی دل میں اس وقت کو کوس رہا تھا جب اس نے پروفیسر کے ساتھ آنے کی ہامی بھری تھی۔ اس کا بس چلتا تو یہیں سے واپس ہو لیتا لیکن حریص فطرت اسے پروفیسر کا ساتھ دینے پر مجبور کر رہی تھی کہ ممکن ہے ان کھنڈرات سے کوئی ایسا خزانہ دریافت ہو جائے جو اس کی ان تمام تکلیفوں کا ازالہ کر دے۔

سڑک کے دونوں طرف بلند ٹیلے تھے۔ اس طرح ایک درّہ سا بن گیا تھا۔ جس میں وہ اس وقت سفر کر رہے تھے۔ پینتالیس کے زاویے کی طرح درّہ نما اس ڈھلواں راستے کے اختتام پر ایک پتھریلا میدان تھا۔ یہ جگہ شاید کسی زمانے میں کسی دریا کی گزرگاہ رہی ہو گی۔ وادی میں پانی سے کٹاؤ کے نشان بھی نظر آ رہے تھے۔ میدان کے دوسری طرف سڑک بلندی پر چلی گئی تھی۔ یہ کوئی باقاعدہ سڑک نہیں تھی، بس پتھروں میں بنا ہوا غیر ہموار راستہ سا تھا، جس پر جیپ کو اچھے خاصے دھچکے لگ رہے تھے۔

سڑک کی بلندی ختم ہوتے ہی سامنے ایک وسیع پتھریلا میدان نظر آیا جس کے دوسری طرف بلند چٹانیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ چٹانیں اب بھی تقریباً پانچ چھ کلومیٹر دور تھیں۔

معاً ہی جیپ کا انجن گڑگڑانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی رفتار خود بخود کم ہوتی چلی گئی۔ پروفیسر اور نوید انور بیک وقت سوالیہ نظروں سے ڈرائیور رسول بخش کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ چند لمحوں تک گیئر بدل بدل کر رفتار کو متوازن رکھنے کی کوشش کرتا رہا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

''شاید ریڈی ایٹر میں پانی ختم ہو گیا ہے۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے جیپ روک لی اور نیچے اتر آیا۔ پروفیسر اور نوید بھی نیچے اتر آئے۔ رسول بخش نے جیپ کے ہُڈ سے بندھا ہوا چھاگل کھولا اور منہ سے لگا کر پانی پینے لگا۔ سردیوں کے موسم میں بھی خشکی کے سبب پیاس لگ رہی تھی

پروفیسر حمدانی اور نوید نے بھی چند گھونٹ بھرے اور منہ کی خشکی اور پیاس کو ختم کیا۔ ڈرائیور اب ریڈی ایٹر کا ڈھکنا کھول کر اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اتنی دیر میں پیچھے آنے والا ٹرک بھی ان کے قریب آ کر رک گیا۔

پروفیسر جیپ سے ٹیک لگائے کھڑا ان چٹانوں کی طرف دیکھنے لگا۔ سردیوں کی خوش گوار دھوپ میں یہ سنگلاخ وادی بھلی محسوس ہو رہی تھی لیکن گرمیوں کے موسم میں ضرور یہاں جہنم دہکتا ہو گا۔

اچانک پروفیسر حامد چونک گیا۔ اس کی نظریں ان چٹانوں کے دامن میں دائیں طرف ایک نقطے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ اسے جو کچھ بھی دکھائی دیا تھا، پہلے تو وہ اسے اپنا واہمہ ہی سمجھا لیکن غور سے دیکھنے پر اس کا شبہ یقین میں بدل گیا۔ وہ کوئی عمارت تھی جس کا اسٹوپا کی طرز پر بنا ہوا ایک حصہ کسی مینار کی طرح اوپر کو نکلا ہوا تھا۔ سردیوں کی سنہری دھوپ میں یہ مینار بھی جھلملاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

''نوید! تم دائیں طرف کی چٹان کے دامن میں وہ عمارت دیکھ رہے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ یہاں ہم اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گے۔'' وہ نوید کو متوجہ کرتے ہوئے بولا۔

''کون سی عمارت'' نوید نے چٹانوں کی طرف دیکھا۔

''وہ، دائیں طرف آخری چٹان کے دامن میں.....'' پروفیسر نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

''مجھے وہاں کوئی عمارت نظر نہیں آ رہی۔'' نوید بڑبڑایا۔

''شاید تمہاری بینائی کمزور ہے، لیکن مجھے حیرت ہے کہ ماہرین کی رپورٹ اور نقشوں میں اس عمارت کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا۔'' پروفیسر نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میری بینائی ٹھیک ہے۔ ماہرین کی رپورٹس اور نقشے بھی غلط نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ تم فریبِ نظر کا شکار ہو رہے ہو۔'' نوید بولا۔

''فریبِ نظر نہیں۔ مجھے اسٹوپا طرز کی بنی ہوئی وہ عمارت واضح طور پر نظر آ رہی ہے۔ اس مہم سے فارغ ہو کر کسی اچھے ڈاکٹر سے اپنی آنکھیں ٹیسٹ کروا لینا۔'' پروفیسر کہتا ہوا ڈرائیور کی طرف متوجہ ہو گیا جو ریڈی ایٹر میں پانی ڈالنے کے بعد بونٹ بند کر رہا تھا۔

ڈرائیور کے ساتھ ہی وہ دونوں جیپ میں بیٹھ گئے اور ان کا سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ ان کی منزل میدان کے اس پار نظر آنے والی وہی چٹانیں تھیں۔ پروفیسر کی نظریں اسی طرف جمی ہوئی تھیں جیسے جیسے فاصلہ کم ہوتا جا رہا

تھا، چٹان کے دامن میں نظر آنے والی اس عمارت کا ہیولا واضح صورت اختیار کر رہا تھا۔ اس کے دوسری طرف ایک بلند فصیل نظر آ رہی تھی۔

وہ چٹان کے کافی قریب پہنچ چکے تھے۔ سڑک کے ایک طویل موڑ کی وجہ سے وہ چٹان ان کے اور عمارت کے درمیان حائل ہوگئی۔

''اب تو شاید تمہیں میری بات کا یقین آ گیا ہوگا۔'' پروفیسر، نوید کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''کس بات کا یقین؟'' نوید نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں حویلی نما اس عمارت کی بات کر رہا ہوں جو اب چٹان کے پیچھے چھپ چکی ہے۔'' پروفیسر حامد نے جواب دیا۔

''تم یقیناً کسی فریبِ نظر کا شکار ہو پروفیسر حامد؟'' نوید نے اسے گھورا۔ یہاں دور دور تک عمارت تو کیا مجھے کسی کھنڈر کے نشان بھی نظر نہیں آ رہے۔''

''تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔'' اس مرتبہ پروفیسر نے اسے گھورا۔

''لوگوں کے دماغ میں گرمی کا اثر ہوتا ہے، لیکن میرا خیال ہے تمہارے دماغ پر سردی کا اثر ہو چکا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم.....''

''وہ.....'' وہ دیکھو!'' پروفیسر حامد اس کی بات کاٹ کر ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے چیخا۔ جیپ اس دوران دوبارہ دوسری طرف پہنچ چکی تھی اور وہ عمارت اب صاف دکھائی دینے لگی تھی۔ ''اب بھی کہو کہ میرے دماغ پر گرمی کا اثر ہو رہا ہے یا سردی کا اور یہاں کسی عمارت کا وجود نہیں ہے۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں ہمدانی! یہاں کوئی عمارت مجھے نظر نہیں آ رہی.....'' نوید نے اس بار کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔

''کیا..... واقعی..... سچ کہہ رہے ہو؟'' پروفیسر مڑ کر عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔ اگر تمہیں میری نیت پر شبہ ہے تو رسول بخش سے پوچھ لو، لیکن خدشہ ہے کہ اس طرح وہ بھی تمہاری ذہنی تندرستی پر شک کرنے لگے گا۔'' نوید نے کہا۔

''عجیب بات ہے۔'' پروفیسر بڑبڑاتا ہوا دوسری طرف دیکھنے لگا۔

جیپ چٹان کے دوسری طرف پہنچ چکی تھی۔ بھرے بھرے پتھروں پر مشتمل سفید رنگ کی یہ چٹان دھوپ میں آئینے کی طرح چمک رہی تھی۔ ان سفید پتھروں ہی کی وجہ سے اسے سفید چٹان کا نام دیا گیا تھا۔ اس کے دامن میں ایک طرف وہ کھنڈرات تھے، جن کی کشش پروفیسر کو اس سنگلاخ ویرانے میں کھینچ لائی تھی۔

کھنڈرات سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر پروفیسر نے جیپ رکوالی اور نیچے اتر آیا۔ اس کے چند منٹ بعد ٹرک بھی وہاں پہنچ گیا۔ پروفیسر حامد کے خیال میں کیمپ لگانے کے لیے یہ جگہ مناسب تھی۔

اس نے نوید کی طرف دیکھا جو جیپ سے ٹیک لگائے کھڑا متوحش نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ عجیب موسم ہونے لگا تھا، دن میں گرمی سی محسوس ہو رہی تھی اور کبھی سردی، اس دوغلے موسم کے سبب.... جسمانی کیفیات بھی عجیب سی ہو رہی تھیں۔ آنکھیں انگارے کی طرح سرخ ہونے لگیں، اگرچہ پروفیسر کی اپنی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی لیکن اس کی قوتِ برداشت نوید کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ وہ ہر قسم کے حالات میں کام کرنے کا عادی تھا۔ اس نے نوید کو اپنی نگرانی میں ٹرک سے سامان وغیرہ اتروانے کی ہدایت کی اور خود کھنڈرات کی طرف چل دیا۔

یہ کھنڈرات زیادہ وسیع نہیں تھے۔ چند اکہرے مکان تھے جو امتدادِ زمانہ سے کھنڈرات میں تبدیل ہو چکے تھے۔ کسی کمرے پر چھت موجود نہیں تھی۔ صرف شکستہ دیواریں تھیں۔ سیاہ پتھروں کی بنی ہوئی یہ دیواریں دیکھ کر پروفیسر حامد کو بڑی حیرت ہوئی تھی۔ یہاں آس پاس کوئی بھی ایسی چٹان یا پہاڑی نظر نہیں آ رہی تھی جو سیاہ رنگ کی ہو، لیکن ان مکانوں کی تعمیر میں سیاہ رنگ کا پتھر استعمال کیا گیا تھا، جس سے صرف یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ سیاہ پتھر صرف اسی مقصد کے لیے کسی دور دراز علاقے سے یہاں لائے گئے تھے۔

وہ تقریباً ایک گھنٹے تک کھنڈرات میں گھوم پھر کر ان کے طرزِ تعمیر کا جائزہ لیتا رہا۔ آثار بتا رہے تھے کہ یہ عمارتیں کسی بہت ہی قدیم طرزِ تعمیر کی حامل تھیں، لیکن وہ کون لوگ ہوں گے جو یہاں آباد ہوئے ہوں گے کیونکہ یہاں میلوں دور تک کہیں سبزے کا نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا اور ظاہر ہے جہاں انسان ہو وہاں سبزے کا ہونا بھی ضروری ہے۔

کھنڈرات سے نکل کر وہ اس طرف پہنچ گیا جہاں ٹیلے کے دوسری طرف حویلی نما وہ عمارت نظر آ رہی تھی۔ اس عمارت کا ایک حصہ چینی طرزِ تعمیر کا حامل نظر آ رہا تھا اور اسٹوپا نما وہ مینار اس کا ثبوت تھا لیکن اسے حیرت تھی کہ یہ لمبی چوڑی عمارت اس کے سوا کسی اور کو کیوں نہیں نظر آ رہی۔

مزدوروں نے اس عمارت کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی اور نوید نے ہر مرتبہ اسی انداز میں جواب دیا جیسے اسے اس کی دماغی صحت پر شبہ رہا ہو، مگر اسے ماہرین کی رپورٹس اور نقشوں کا خیال آگیا جن میں اس عمارت کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔ وہ شدید قسم کی الجھن میں مبتلا تھا کہ جو چیز اسے روزِ روشن کی طرح بالکل صاف اور واضح نظر آرہی تھی دوسرے اسے کیوں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کہیں یہ واقعی اس کا فریبِ نظر تو نہیں تھا؟ یہی کچھ سوچتا ہوا پروفیسر واپس چل دیا۔

ٹرک سے سامان اتارا جا چکا تھا اور پسینے میں شرابور مزدور اب چھولداریاں لگانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر زمین پر گڑے ہوئے بانس پر نصب بڑی سی چھتری کے نیچے نوید بیٹھا انہیں مختلف قسم کی ہدایات دے رہا تھا۔ پروفیسر حامد بھی اس کے قریب ہی دوسری فولڈنگ چیئر پر بیٹھ گیا۔

"کھنڈرات کے معائنے سے کچھ معلوم ہوا؟" نوید نے پوچھا۔

"فی الحال صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ماہرین کی رپورٹ مشکوک ہے۔" پروفیسر حامد نے جواب میں کہا۔

"وہ کیسے؟" نوید نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"ماہرین کی رپورٹ کے مطابق یہ کھنڈرات خانہ بدوشوں کی کسی بستی کی باقیات ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ کھنڈرات کی شکستہ دیواریں، سیاہ پتھروں کی بنی ہوئی ہیں۔ خانہ بدوشوں کے بارے میں تو یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ وہ یہ پتھر کسی دور دراز کے علاقے سے اپنے ساتھ لائے ہوں گے کیونکہ یہاں میلوں دور تک سیاہ پتھر دستیاب نہیں ہیں۔" یہ بتاتے ہوئے پروفیسر نے چند لمحے کو توقف کیا اور پھر کہنے لگا۔

"یہ کھنڈرات دیکھ کر سب سے پہلے تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان عمارتوں کی تعمیر کے لیے یہ پتھر بطورِ خاص یہاں لائے گئے تھے اور وہ جو بھی لوگ تھے، وہ یہاں مستقل رہائش کا ارادہ رکھتے تھے جبکہ خانہ بدوشوں میں یہ صفت نہیں پائی جاتی۔"

"میرا خیال ہے تم ٹھیک ہی کہتے ہو حامد!" نوید کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ پہلی بار اس کا چہرہ مسکراتا ہوا نظر آیا۔ اب اسے امید بندھ گئی تھی کہ ان کی محنت رائگاں نہیں جائے گی اور وہ یہاں سے خالی ہاتھ نہیں لوٹیں گے۔" وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس کا مطلب ہے کہ یہاں سے کوئی خزانہ ملنے کی امید بھی کی جا سکتی ہے۔"

"ہاں مجھے یقین ہے کہ میں یہاں سے کوئی ایسا خزانہ ضرور دریافت کر سکوں گا جس کا انکشاف پوری دنیا کو چونکا دے گا۔" پروفیسر حامد نے جوشیلے لہجے میں جواب دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں چل دیے؟" نوید نے مسکراتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہمارا خیمہ لگ چکا ہے۔ میں ذرا نقشوں کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔" پروفیسر کہتا ہوا دو خیموں کی طرف بڑھ گیا جو ساتھ ساتھ لگائے گئے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر مزدور اب اپنی چھولداریاں لگا رہے تھے۔

نوید بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ انہوں نے دو تین مزدوروں کی مدد سے چند بھاری بکسے خیموں میں رکھوائے، میز اور کرسیاں بھی بچھوا دی گئیں۔ پروفیسر حامد نے ایک بکسے میں سے تحصیل دار حاکم شاہ سے حاصل کیے ہوئے نقشے نکالے اور انہیں میز پر پھیلا کر گہری توجہ سے ان کا مطالعہ کرنے لگا۔

نقشے یا کسی رپورٹ میں کہیں بھی اس عمارت کا تذکرہ نہیں تھا۔ جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ پُراسرار عمارت اس سے پہلے یہاں آنے والے آثارِ قدیمہ کے ماہرین یا کسی اور کو نظر نہیں آئی تھی اور نہ ہی یہاں کے باشندے اس سے آگاہ تھے۔ اگر واقعی اس عمارت کا کوئی وجود ہوتا تو کہیں نہ کہیں اس کا تذکرہ ضرور ملتا۔

"کیا یہ اس کا فریبِ نظر ہے؟"

پروفیسر حامد نے نقشے تہ کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے سوچا لیکن نہیں، اس فریبِ نظر کو سراب کا دوسرا نام دیا جا سکتا تھا اور سراب کی حقیقت کی طرح ٹھوس نہیں ہوتا۔ اگر فریبِ نظر ہوتا تو یہ پُراسرار عمارت صرف دور ہی سے جھلملاتی ہوئی نظر آتی۔ فاصلہ سمٹنے کے بعد سراب کی کوئی حقیقت نہیں رہ جاتی جبکہ وہ عمارت اب بھی اسی جگہ موجود تھی جہاں اس نے دور سے پہلی مرتبہ دیکھا تھا، لیکن یہ اسرار اب تک اس کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ یہ عمارت صرف اسی کو کیوں نظر آرہی تھی۔ یہ بھید دوسروں پر کیوں نہیں کھلتا؟

پروفیسر اٹھ کر خیمے سے باہر نکل آیا۔ نوید اپنے خیمے میں تھا۔ مزدور اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ وہ ٹیلے کی طرف دیکھنے لگا جس سے ملحق وہ عمارت بالکل واضح نظر آرہی تھی۔ ایک ایسی حقیقت کی طرح جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے قدم بے اختیار آگے کو اٹھنے لگے۔

عمارت تقریباً ایک مربع میل کے رقبے پر پھیلی ہوئی

، جسے چاروں طرف سے سیاہ پتھروں کی فصیل نے گھیر
تھا۔ فصیل کی بلندی کسی طرح بھی پچاس فٹ سے کم نہیں
۔ وہ آگے بڑھ کر دیوار کے قریب پہنچ گیا اور جھجکتے
ئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

اس کا ہاتھ دیوار کے ٹھوس وجود کو محسوس کر رہا تھا۔ اس
ماغ میں تیز سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ اگر یہ فریب نظر
تو اس طرح دیوار کا وجود ثابت نہ ہوتا۔ یوں وہ کتنی دیر
پتھر پر ہاتھ پھیرتا رہا، پھر دو قدم پیچھے ہٹ کر گہری
وں سے دیوار کا جائزہ لینے لگا۔

چکنے پتھر ایک دوسرے کے اوپر اس طرح مہارت
جمائے گئے تھے کہ ان میں ذرا سی بھی جھری نظر نہیں
ی تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اسے یہ جان کر
ت ہوئی کہ فصیل میں کسی جگہ بھی کوئی پھاٹک وغیرہ یا اندر
ں ہونے کا راستہ موجود نہیں تھا۔ نہ ہی شیشے جیسی چکنی
ر میں کسی جگہ کوئی ایسا خلا تھا جس کے ذریعے اوپر چڑھا
لتا۔ یہ بلند فصیل یقیناً بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ
نے کے لیے بنائی گئی تھی لیکن آمد و رفت کے کسی راستے کی
موجودگی پروفیسر کے لیے حیرت کا باعث تھی۔

اب یہ تو ہونے سے رہا کہ اس عمارت کے مکین فصیل
باہر آنے جانے کے لیے کسی قسم کے پر استعمال کرتے
ں گے۔ بہت دیر کی سوچ بچار کے بعد پروفیسر اس نتیجے
نچا کہ آمد و رفت کے لیے یقیناً کوئی خفیہ راستہ ہوگا اور
ی طور اس راستے کو تلاش کر لینا ممکن نہیں تھا۔ وہ دوبارہ
کھنڈرات میں آ گیا اور ایک بار پھر گہری نظروں سے
ایک انچ حصے کا جائزہ لینے لگا۔

کھنڈر کی آخری شکستہ دیوار اور ٹیلے کے درمیان
ن میں سیاہ رنگ کا ایک پتھر دیکھ کر وہ رک گیا۔ وہ نیچے
ک کر پتھر کے آس پاس سے مٹی ہٹانے لگا، چند منٹ کی
ش کے بعد وہ اس پتھر کو زمین سے نکالنے میں کامیاب
گیا۔ پتھر نکلتے ہی اکھڑنے والی مٹی کا کچھ حصہ زمین کے
ر غائب ہو جانا اس امر کا غماز تھا کہ اس کے نیچے کوئی خلا
جود ہے وہ اس چھوٹے سے گڑھے میں سے مٹی کھرچنے
۔ چند منٹ بعد گڑھے کی تہ میں ایک چھوٹا سا سوراخ بن
گیا۔ آس پاس سے گرنے والی مٹی اس کے اندر غائب
ی چلی گئی۔

پروفیسر جلد کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔

کھنڈرات میں کسی جگہ پوشیدہ ہے۔ اس نے گھڑے کے
اندر نظر آنے والا دوسرا پتھر اکھاڑنے کی کوشش چاہی مگر
کامیاب نہ ہو سکا۔ بالآخر وہ اٹھ کر کیمپ کی طرف چل دیا۔

مطلوبہ مقام پر کھدائی کا کام شروع ہو چکا تھا، فی
الحال دو جگہوں پر کھدائی کی جا رہی تھی، ان میں نشانی کے
طور پر ایک خندق کو جنوبی اور دوسری کو مشرقی خندق کا نام دے
گیا تھا۔ جنوبی خندق کی کھدائی کے دوران ''سرکٹی عورت''
کا واقعہ رونما ہوا تھا۔

☆☆☆

یہ سب لوگ جب وہاں پہنچے تو سب کے چہرے
دہشت زدہ ہو گئے۔ پروفیسر ہمدانی کے چہرے پر الجھن
آمیز پریشانی کے آثار تھے۔ نوید کچھ سہما ہوا لگ رہا تھا
ایک شخص کی بری طرح مسخ شدہ لاش وہاں پتھریلی زمین
پڑی تھی۔

''می می —— یہ ضرور اسی سرکٹی عورت کی کارستانی
گی، جو بابو کو نظر آئی تھی۔'' ایک مزدور نے خوف زدہ ہو
کہا۔ بابو وہی مزدور تھا جس نے سرکٹی چڑیل دیکھی تھی۔

''کیا بے وقوفوں والی باتیں کرتے ہو۔'' حامد
اسے ڈپٹ دیا۔ ''اول تو یہ جس آدمی کی لاش ہے وہ ہمارے
مزدوروں میں سے نہیں ہے، یہ کوئی اور آدمی ہے، جو یہاں
یقیناً جنگلی بھیڑیوں یا کتوں کا شکار ہوا ہے۔''

پھر بھی تصدیق کی خاطر وہ ٹھیکے دار دل مراد سے
مخاطب ہوا۔ ''کیا کہتے ہو تم دل مراد؟ یہ لاش ہمارے
مزدور میں سے تو کسی کی نہیں ہے۔''

''بالکل نہیں جی، یہ کوئی اور ہی بدنصیب آدمی
ہے۔'' دل مراد بولا۔ ''یا کوئی بدنصیب مسافر، جسے جنگلی
کتوں کے غول نے آلیا ہو۔''

دفعتاً نوید چونک کر بولا۔ ''یہ کیا رکھا ہے اس کے
قریب میں؟'' اس نے مدھم روشنی میں لاش کے قریب رکھی
بوری کی طرف اشارہ کیا۔ دل مراد نے وہ اٹھالی۔ مزدوروں
کے پیچھے کو ہٹے۔ دل مراد نے بوری کھولی اور الٹ دی
اس کے اندر سے سرکٹی چڑیل نما عورت کا پتلا اور کھلے بالوں
والا مسکراتا کٹا چہرہ بھی برآمد ہوا۔

یہ دیکھ کر سب ششدر رہ گئے۔ یہاں تک تو بات سمجھ
آ گئی تھی کہ جنوبی خندق میں ڈراما کرنے والا یہی شخص تھا،
سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس نے آخر ڈراما کیوں

ایک پُراسرار معاملے کی قلعی کھلی تھی تو دوسرا معاملہ اسراریت کی لپیٹ میں اُلجھ گیا سا تھا۔

☆☆☆

دونوں لٹیرے اپنے سرغنہ کے حکم پر اپنے ساتھی شانو کی تلاش میں خشک بنجر پہاڑیوں میں بھٹکتے رہے مگر وہ نہ ملا۔ اس پر انہیں سخت حیرت ہوئی۔ بالآخر ناکام تلاشِ بسیار کے بعد وہ واپس پلٹے۔

انہیں کیا معلوم تھا کہ ان کا ساتھی کس حادثے کا شکار ہو چکا تھا اور اب اس کی لاش پولیس کسٹڈی میں جا چکی تھی۔

بہرکیف..... یہ لوگ جب واپس اپنی بوگی والی بوسیدہ کمین گاہ پہنچے تو وہاں ایک بھیانک منظر ان کا منتظر تھا، جس نے بے اختیار ان کی دہشت سے چیخیں نکال دیں۔

ان کا سرغنہ جسے وہ زندہ حالت میں چھوڑ کر گئے تھے، اب وہ کٹی پھٹی لاش کی صورت بوگی کے فرش پر پڑا تھا اور انگیٹھی بجھی ہوئی تھی۔ دور نزدیک تاریک اور یخ بستہ سناٹے کا راج طاری تھا۔

وہ دونوں بُری طرح خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

اب دوپہر ہو چلی تھی اور مزدور ایک طرف پتھروں کے چولہے بنا کے کھانا پکانے کی تیاری کر رہے تھے۔ نوید اپنے خیمے کے فولڈنگ بیڈ پر سو رہا تھا۔ پروفیسر نے اسے جگانے کی کوشش نہیں کی اور اپنے خیمے میں آ کر بیٹھ گیا۔

برآمد ہونے والی لاش کے سلسلے میں پولیس کو مطلع کر دیا تھا، وہ اپنی ضابطے کی کارروائی میں مصروف تھے۔ جنوبی خندق کے ساتھ اب مشرقی خندق کی کھدائی بھی جاری تھی۔

پروفیسر نے اس واقعے کو ذہن سے نکال دیا تھا اور سنجیدگی سے دوبارہ اپنے کام کی جانب متوجہ ہوا۔

لہٰذا..... اب کھنڈرات کے معائنے کے دوران وہ دیکھ چکا تھا کہ سرکاری ماہرین ان کے دوسری طرف کھدائی کرتے رہے تھے اور نیلے والی سمت انہوں نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اگر وہ یہاں سے کچھ دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اس کی قدر و منزلت بڑھ جائے گی۔

باقاعدہ کھدائی شروع کروانے کے لیے اس نے اگلے روز کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ لیکن پتھر کے نیچے اس خلا کا انکشاف ہونے کے بعد وہ اسی سہ پہر دو مزدوروں کو ساتھ لے کر وہاں پہنچ گیا۔ اس مرتبہ نوید بھی اس کے ساتھ تھا۔ پروفیسر کے اشارے پر مزدور کھدائی کرنے لگے اور وہ دونوں قریب کھڑے دلچسپ نظروں سے دیکھتے رہے۔

کھدائی میں سیاہ رنگ کے پتھر برآمد ہو رہے تھے۔ ہر پتھر اکھڑنے کے بعد مٹی، نیچے پیدا ہونے والے خلا میں غائب ہو جاتی۔ جس سے سردست صرف یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ پتھر بغیر کسی ترتیب سے اس جگہ ڈھیر کر دیے گئے تھے۔ اب تک تقریباً تین فٹ گہری کھدائی ہو چکی تھی۔ ان پتھروں کا رخ ٹیلے کی جانب تھا۔

پروفیسر نے مزید تین مزدور کام پر لگا دیے اور کھدائی ایک خندق کی صورت میں جاری رہی۔

شام تک تقریباً آٹھ فٹ لمبی اور پانچ فٹ گہری خندق تیار ہو چکی تھی، پتھر نکلنا بند ہو گئے تھے اور اب بھربھری مٹی میں کھدائی کرنا زیادہ دشوار نہیں رہا تھا۔ سب سے آگے والا مزدور ایک ہی جگہ کدال چلا رہا تھا۔ اس کی کدال بار بار کسی چیز سے ٹکرا کر اُچٹ جاتی، آخری مرتبہ ایسی آواز ابھری تھی جیسے لوہے سے لوہا ٹکرایا ہو۔

یہ آواز سن کر وہ مزدور چونک گیا لیکن پروفیسر وغیرہ شاید اس طرف توجہ نہیں دے سکے تھے۔ مزدور نے معنی خیز نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور وہاں سے تقریباً ایک ڈیڑھ فٹ دور ہٹ کر کدال چلانے لگا۔

شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ پروفیسر کام بند کروانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ایک دہشت ناک چیخ سن کر وہ بُری طرح چونکا۔ دوسرے بھی فوراً اس طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ مزدور جو سب سے آگے تھا، اس طرح بھیانک آواز میں چیخ رہا تھا، جیسے اس نے کوئی بہت خوف ناک چیز دیکھ لی ہو۔ کدال کی نوک مٹی میں پیوست تھی اور اس کے ہاتھ کدال کے دستے پر جمے ہوئے تھے۔ یہ شاید خوف کا تاثر تھا کہ وہ کدال کو بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکا تھا۔

نشانی کے طور پر اس دوسری خندق کو مشرقی خندق کا نام دیا گیا تھا۔ اس خندق پر کام کرنے والے دوسرے مزدور بھی سہم گئے لیکن کسی نے بھی آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ پروفیسر حامد نے خندق میں چھلانگ لگا دی اور چیخنے والے مزدور کو بانہوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔ اس کے اس طرح جھنجوڑنے سے مزدور اور بھی دہشت زدہ انداز میں چیخنے لگا۔ اس کے چہرے پر بڑے بھیانک تاثرات اُبھر آئے تھے اور آنکھیں خونِ کبوتر کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔

اس نے چیخنا بند کر دیا۔ وہ چند لمحے شعلہ بار نظروں سے پروفیسر کی طرف دیکھتا رہا پھر اچانک ہی اس نے پوری قوت سے پروفیسر کو پیچھے دھکیل دیا اور بھیانک انداز میں

چیختا ہوا خندق میں ایک طرف دوڑا۔ "پکڑو..... اسے پکڑو"۔ پروفیسر جو اس کے دھکے سے گر چکا تھا، اٹھنے کی کوشش کرتا ہوا چیخا۔

اس دوران نوید بھی خندق میں چھلانگ لگا چکا تھا۔ وہ اور مزدور بیک وقت اس کی طرف لپکے۔ نوید... اسے زمین پر گرا کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو گھٹنوں کے نیچے دبا لیا۔ مزدور اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد کے ساتھ دہشت ناک انداز میں چیختا رہا پھر اس کی آواز گھٹتی چلی گئی۔ مزاحمت بھی ختم ہو گئی اور اس کا جسم ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا اور چہرے پر خوف و دہشت کے تاثرات جیسے منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔

☆☆☆

فضا پر کچھ عجیب سا خوف و ہراس طاری تھا۔ تمام مزدور سہمی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

پروفیسر نے اس مزدور کی بے ہوشی کے بعد کام بند کروا دیا تھا۔ اس مزدور کا نام رحیم بخش تھا۔ پروفیسر ہمدانی اب تک نہیں سمجھ سکا تھا کہ رحیم بخش نے اچانک ہی اس دہشت زدہ انداز میں کیوں چیخنا شروع کر دیا تھا؟ آخر اس نے ایسا کیا دیکھ لیا تھا؟ کیا یہ ویسا ہی ڈراما تو نہیں تھا جو ایک دن قبل جنوبی خندق کی کھدائی کے دوران پیش آیا تھا۔

رحیم بخش تقریباً ایک گھنٹے بعد ہوش میں آیا تھا۔ اس وقت وہ سب لوگ کیمپ میں موجود تھے۔ پروفیسر ہمدانی نے رحیم بخش سے اس طرح چیخنے کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش چاہی تھی مگر رحیم بخش نے اس طرح خاموشی اختیار کر لی تھی جیسے اس کی قوتِ گویائی سلب ہو چکی ہو۔ اس کے چہرے پر اب بھی خوف و دہشت کے تاثرات بکھرے ہوئے تھے۔

پورے کیمپ میں پیٹرومیکس روشن کر دیے گئے تھے۔ روشنی میں ان لوگوں کے متحرک سائے بڑا پُراسرار تاثر دے رہے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد مزدور اپنے خیموں میں گرم بستروں میں جا سوئے تھے۔ پروفیسر ہمدانی اور نوید اپنے خیمے میں فولڈنگ چیئر پر بیٹھے دیر تک تازہ صورتِ حال پر بحث کرتے رہے۔ پھر نوید جمائی لیتا ہوا کرسی سے اٹھ کر سلیپنگ بیگ میں جا سویا۔ اب ڈاک بنگلے میں لوٹنے کا وقت نہ رہا تھا۔ فوری ضرورت کے لیے انہوں نے اپنا ایک بڑا سا خیمہ یہاں بھی بنوا رکھا تھا۔

پروفیسر اس کے سونے کے بعد بھی دیر تک کرسی پر بیٹھا نقشوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ پورے کیمپ میں صرف اس کے خیمے میں اندر اور باہر پیٹرومیکس روشن تھا۔ اس کے علاوہ چہار اطراف گہری تاریکی اور سناٹا طاری تھا۔

معاً ہی اس سناٹے میں باہر کہیں قریب کسی پتھر کے لڑھکنے کی آواز سن کر پروفیسر چونک گیا۔ آواز دوبارہ نہیں ابھری۔ وہ اسے اپنے وہم یا کسی جانور کی کارستانی پر محمول کر کے دوبارہ کام میں مشغول ہو گیا۔ آج کھودی جانے والی خندق کے نقشے پر مختلف جگہوں پر سرخ پنسل سے نشانات لگاتا رہا۔ اسے یقین تھا کہ اس کھدائی میں اسے ایسا راستہ مل جائے گا جو بالآخر اسے بلند فصیل کے اندر گھری ہوئی عمارت تک پہنچا دے گا۔

پروفیسر کو اب جمائیاں آنے لگی تھیں۔ اس نے نقشہ تہ کر کے رکھ دیا۔ پیٹرومیکس بجھا دیا اور قریب ہی بچھے گرم بستر پر موٹا لحاف اوڑھے لیٹ گیا۔ بستر پر لیٹے ہوئے بھی وہ کافی دیر تک موجودہ صورتِ حال کے بارے میں ہی سوچتا رہا پھر نجانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

سناٹے میں اُبھرنے والی وہ چیخ بہت بھیانک تھی، جس نے مُردوں کی طرح سوئے ہوئے ان سب لوگوں کو جگا دیا تھا۔

"کیا ہوا..... کون ہے؟ چیخ کی یہ آواز کیسی تھی؟" نوید نے خیمے سے باہر آ کر مزدوروں کی طرف دیکھتے ہوئے چلا کر پوچھا۔ پروفیسر بھی باہر نکل آیا تھا۔

"پتا نہیں صاحب! یہ آواز مشرقی خندق کی طرف سے آئی تھی۔" ایک مزدور نے جواب میں بتایا۔

"خندق کی طرف سے—" پروفیسر چونک گیا۔ تمام مزدور اپنی اپنی جگہوں سے اٹھ کر ان کے قریب پہنچ چکے تھے۔ وہ سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ چیخ کی یہ آواز کیسی تھی۔

"صص..... صاحب....." ایک مزدور ان دونوں کی طرف دیکھ کر ہکلایا۔ "وہ....." وہ رحیم بخش یہاں نہیں ہے، صاحب!"

"رحیم بخش۔" اس مرتبہ نوید بھی چونک گیا۔

اس سے پہلے کہ کوئی اور بات ہوتی چیخ ایک بار پھر سنائی دی۔ اس مرتبہ آواز پہلے سے بھی زیادہ بھیانک تھی۔ پروفیسر نے لباس سے پستول نکال لیا، ٹارچ سنبھالی اور خندق کی طرف دوڑا۔ نوید اور سارے مزدور بھی اس کے پیچھے لپکے۔ نوید کے ہاتھ میں بھی اب پستول نظر آ رہا تھا۔

ٹارچ کی روشنی خندق میں رینگتی ہوئی اس جگہ پہنچ کر رک گئی جہاں کھدائی کا کام ادھورا چھوڑ آگیا تھا۔ بڑا دہشت ناک منظر تھا وہ ..... رحیم بخش اس طرح زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا جیسے کسی سے گتھم گتھا ہو رہا ہو۔ اس کے ہاتھ بار بار اپنے گلے پر پہنچ رہے تھے اور اپنی انگلیوں کو اس طرح حرکت دے رہا تھا جیسے گردن کو کسی کی گرفت سے چھڑانا چاہتا ہو۔ جسم کا سارا خون اس کے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔ وہ بار بار قریب پڑی ہوئی کدال کی طرف لپک رہا تھا۔ بالآخر اس کا ہاتھ کدال کے دستے پر پہنچ گیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے نادیدہ حملہ آور کو پیچھے دھکیلا اور بڑی پھرتی اسے اٹھ کر کدال کو سر سے بلند کیا اور پوری قوت سے اس طرح نیچے لایا جیسے کھدائی کر رہا ہو۔

کدال کسی چیز سے ٹکرائی۔ چنگاریاں سی پھوٹیں اور اس کے ساتھ ہی ایسے محسوس ہوا جیسے ہزاروں بدروحیں بیک وقت چیخ اٹھی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی رحیم بخش بھی کسی ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح بلبلانے لگا۔ اس کے ہاتھ ایک بار پھر گردن پر پہنچ گئے تھے اور وہ انتہائی دہشت ناک انداز میں چیختا ہوا اپنے آپ کو کسی نادیدہ قوت کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔

چہار اطراف پھیلا ہوا تاریک سناٹا خوفناک چیخوں کی آواز سے گونج رہا تھا۔ خوف و دہشت سے خندق کے کنارے کھڑے مزدور بھی چیخ اٹھے۔ ان میں سے چند تو اس طرح چیختے ہوئے کیمپ کی طرف دوڑے جیسے جہنم کی بلائیں ان کا پیچھا کر رہی ہوں۔

پروفیسر ہمدانی کے ہاتھ سے بھی ٹارچ چھوٹ کر خندق میں گر پڑی تھی اور وہ بے حس و حرکت کھڑا پھٹی پھٹی آنکھوں سے رحیم بخش کی طرف دیکھ رہا تھا۔

بدروحوں کے چیخنے کا شور بڑھتا جا رہا تھا لیکن پھر چیخنے چلانے کا یہ شور دبتا چلا گیا اور اب چاروں طرف سے ایسی آوازیں ابھرتی محسوس ہو رہی تھیں جیسے روحیں بین کر رہی ہوں۔ رحیم بخش کی جدوجہد بھی ماند پڑتی جا رہی تھی، اب اس کے منہ سے نکلنے والی چیخیں بھی گھٹ رہی تھیں۔ پھر اچانک خاموشی چھا گئی۔

یہ اعصاب شکن خاموشی طول کھینچتی جا رہی تھی۔ ماحول پر عجیب سی پُراسرار دہشت طاری تھی۔ بالآخر پروفیسر نے ایک ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے اس سردی میں بھی اپنی پیشانی پر پسینے کی نمودار ہونے والی ننھی ننھی بوندوں کو رومال سے پونچھا اور آگے جھک کر خندق میں جھانکنے لگا۔

رحیم بخش بے حس و حرکت ہو چکا تھا اور ٹارچ کی روشنی ایک ایسی چیز کو ہالے میں لیے ہوئے تھی جسے دیکھ کر نہ صرف پروفیسر بلکہ نوید بھی چونک گیا۔

وہ ایک آہنی صندوق تھا جس کے اوپر کے حصے میں کدال کی نوک پیوست تھی۔ پروفیسر اب تک یہی سوچ کر پریشان ہوا جا رہا تھا کہ آدھی رات کے وقت رحیم بخش کو اس طرف آنے کی بھلا کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟ سونے سے پہلے اس نے پتھر لڑھکنے کی جو آوازیں سنی تھیں، وہ کوئی جنگلی جانور نہیں بلکہ رحیم تھا جو چوری چھپے خندق کی طرف جا رہا تھا۔

یوں صورت حال واضح ہو چکی تھی۔ شام کو کھدائی کرتے وقت رحیم بخش نے مٹی میں دفن یہ آہنی صندوق دیکھ لیا تھا۔ اس نے کسی کو بتانے کے بجائے اسے جوں کا توں رہنے دیا اور وہاں سے ہٹ کر دوسری جگہ کھدائی کرنے لگا تھا۔ وہ یقیناً یہی سمجھا ہوگا کہ اس مدفون صندوق میں کوئی خزانہ ہوگا اور آدھی رات کو موقع پاتے ہی یہاں چلا آیا تاکہ کسی کو بتائے بغیر اس صندوق کو نکال سکے۔ لیکن کوئی نادیدہ قوت اس کے آڑے آگئی مگر وہ نادیدہ قوت کون تھی؟ اور چیخوں کی وہ پُراسرار آوازیں کیسی تھیں؟ چیخوں کا خیال آتے ہی پروفیسر خندق میں کود گیا۔

ٹارچ کی روشنی میں وہ رحیم بخش کو دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہی وہ لرز گیا۔ خوف و دہشت کے تاثرات اس کے چہرے پر ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ آنکھیں حلقوں سے باہر ابلی پڑ رہی تھیں۔ پہلی نظر میں دیکھنے ہی سے پتا چل رہا تھا کہ اسے گلا گھونٹ کر انتہائی اذیت کی موت مارا گیا تھا۔ اسے مزاحمت کرتے ہوئے صاف طور پر دیکھا گیا تھا لیکن کیا واقعی یہ کسی نادیدہ قوت کا کام تھا یا رحیم بخش کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا اور خود اس نے اپنا گلا گھونٹ لیا تھا؟ کیونکہ بعض خطرناک قسم کے کیسز میں ذہنی توازن کے بگڑے ہوئے لوگ خودکشی کا اس طرح بھی شکار ہوتے ہیں، یا پھر کوئی شعبدہ گری؟ جیسا کہ جنولی خندق میں اس سے ملتا جلتا واقعہ پیش آچکا تھا، ایک مزدور کو سرکٹی عورت دکھائی دی تھی جس کا بعد میں عقدہ کھلا کہ وہ کسی کا کھیلا ہوا محض ایک ڈراما تھا۔

مگر باوجود ..... اس کے ذہنی توازن بگڑنے والی بات دل کو نہیں لگتی تھی، سب لوگوں نے چیخیں اور بین کرنے کی وہ پراسرار آوازیں سنی تھیں۔ خندق کے کنارے پر نوید کے علاوہ صرف دو مزدور رہ گئے تھے۔ ان کے چہرے بھی خوف سے پیلے پڑ چکے تھے۔ پروفیسر چند لمحے رحیم بخش

کے جسم کو ٹٹول کر دیکھتا رہا پھر اس نے سیدھے ہو کر نوید اور دونوں مزدوروں کو نیچے آنے کا اشارہ کیا۔

ان تینوں کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ رحیم بخش ختم ہو چکا ہے۔ پروفیسر کے اشارے پر ان دونوں مزدوروں نے رحیم بخش کی لاش کو خندق سے باہر نکالا اور کیمپ کی طرف چل دیے۔ خندق میں وہ آہنی صندوق دیکھ کر نوید کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ صندوق میں ہیرے جواہرات بھرے ہوں گے مگر اس وقت اس نے ایسی کوئی بات چھیڑنی مناسب نہ سمجھی۔

ان سے پہلے کیمپ میں پہنچنے والے مزدور ایک پیٹرومیکس روشن کر چکے تھے اور وہ ایک ہی جگہ سمٹے سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ رحیم کی لاش دیکھ کر ان کی حالت کچھ اور بھی غیر ہونے لگی۔ لاش وہاں چھوڑنے کے بعد پروفیسر نے دوسرا پیٹرومیکس بھی روشن کر لیا اور دو مزدوروں کو اشارہ کر کے دوبارہ خندق کی طرف چل دیا جہاں وہ آہنی صندوق موجود تھا۔

خندق کے کنارے پر پہنچ کر اس نے پیچھے گھوم کر دیکھا تو مزدور غائب تھے البتہ نوید چلا آ رہا تھا۔

''وہ دونوں کہاں رہ گئے؟'' پروفیسر حامد نے پوچھا۔

''ان پر دہشت طاری ہے۔ میرا خیال ہے اب وہ لوگ یہاں نہیں رکیں گے۔'' نوید نے جواب دیا۔

''خیر، یہ سب کچھ صبح دیکھا جائے گا۔ فی الحال ہمیں وہ صندوق نکالنا ہے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ ہم پہلے ہی روز کامیابی سے اتنا قریب تر پہنچ جائیں گے۔'' پروفیسر نے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور صندوق کا جائزہ لینے لگا جس کے بالائی حصے پر اب بھی کدال پیوست تھی اس نے کدال نکالی اور اس کے چاروں طرف زمین کھودنے لگا۔

یہ صندوق دوہری تہ کا بنا ہوا تھا۔ بیرونی تہ گل سڑ چکی تھی جبکہ اندرونی تہ کسی حد تک درست حالت میں تھی۔ اس کی لمبائی تین فٹ اور چوڑائی اور اونچائی دو فٹ کے لگ بھگ تھی۔ صندوق زیادہ بھاری نہیں تھا۔ وہ دونوں اسے خندق سے نکال کر کیمپ میں لے آئے۔ کیمپ کی فضا میں بائیس تئیس آدمیوں کی موجودگی کے باوجود سناٹا طاری تھا۔ تمام مزدور رحیم بخش کی لاش کے گرد سوگوار چہرہ بنائے بیٹھے تھے۔

پروفیسر کچھ دیر ان کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا پھر اپنے خیمے کے سامنے آ کر صندوق کا جائزہ لینے لگا۔ صندوق کھولنے کے لیے اس کی دوسری اندرونی پرت کو کاٹنا پڑا جو چاروں طرف سے اس طرح بند تھا۔ جیسے ویلڈ کیا گیا ہو۔ اسے بھی کاٹ کر ہی کھولا گیا۔ اس کے اندر سے آبنوسی لکڑی کا ایک چھوٹا سا صندوقچہ برآمد ہوتے دیکھ کر نوید کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ صندوقچے پر سفید رنگ کی کسی دھات سے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ نوید کو یقین تھا کہ اس صندوقچے سے جگمگاتے ہوئے جواہرات برآمد ہوں گے۔ لیکن جب اسے کھولا گیا تو نوید کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ البتہ پروفیسر حامد کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

سیسے سے ملتی جلتی کسی نرم دھات کی ایک چوکور سی تختی اس صندوقچے سے برآمد ہوئی جس پر آڑھی ترچھی لکیروں کے ساتھ کچھ نقش و نگار بھی بنے ہوئے تھے۔ یہ چین کی قدیم تحریری زبان تھی۔ پروفیسر کو یہ تختی دیکھ کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

دور افتادہ علاقے سے کسی قدیم چینی تحریر کا برآمد ہونا معنی خیز تھا۔ یہاں کی تاریخ میں کہیں بھی کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی تھی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ یہاں چینی بھی آباد رہے ہوں گے۔

ظاہر ہے اس تختی میں نوید کے لیے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے اپنی فولڈنگ چیئر پر جا بیٹھا۔ پروفیسر نے دنیا کی مختلف قدیم زبانوں سے متعلق ریفرنس بکس نکال لیں اور ان کی مدد سے اس تحریر کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

رات بیتی جا رہی تھی۔ بیشتر مزدور اب بھی رحیم کی لاش کے گرد بیٹھے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ بعض اونگھ رہے تھے اور پروفیسر پورے انہماک سے اس تحریر کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالآخر صبح کا اُجالا پھیلنے تک وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک ابھر آئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ عنقریب اس سنگلاخ خطے کے متعلق ایک چونکا دینے والا انکشاف کرنے والا ہے۔ اس نے کتابیں بند کر کے ایک طرف رکھیں، تختی کو ایک بکس میں بند کیا اور اٹھ کر مزدوروں کی طرف چل دیا۔

☆☆☆

رحیم بخش کی لاش کو چار مزدوروں کی معیت میں مستونگ روانہ کر دیا گیا۔ نوید بھی ان کے ہمراہ تھا تاکہ تحصیل دار حاکم شاہ کو صورتِ حال سے آگاہ کیا جا سکے۔ نوید کو لاش کے ساتھ بھیجنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ کہیں رحیم کی موت کو غلط رنگ دینے کی کوشش نہ کی جائے۔

سورج طلوع ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ پروفیسر مزدوروں کو ساتھ لے کر خندق پر پہنچ گیا اور اپنی نگرانی میں کھدائی کروانے لگا۔ صندوقچے میں سے برآمد

والی نرم دھات کی وہ تختی بھی اس کے پاس تھی۔ اس تختی پر دراصل اس خفیہ راستے کی نشاندہی کی گئی تھی جس کی اسے تلاش تھی۔ تختی کی تحریر پڑھنے کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ سنگلاخ زمین میں پوشیدہ کوئی انتہائی اہم راز معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ البتہ بلند فصیل اور اس کے اندر واقع وہ عمارت اب بھی اسرار کے پردے میں لپٹی ہوئی تھی۔

دوپہر تک تقریباً بیس فٹ تک کھدائی ہو سکی۔ کھانے اور کچھ آرام کرنے کے بعد کام دوبارہ شروع کروا دیا گیا۔ سردیوں کی خوش گوار دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ تمام مزدور بڑی جانفشانی سے کام کرتے رہے۔ چار بجے کے قریب راستے میں سیاہ پتھروں کی دیوار حائل ہو گئی۔ یہ دیوار بھی بالکل اس طرح کی تھی جس طرح ... وہ فصیل تعمیر کی گئی تھی۔ پروفیسر نے دیوار کا معائنہ کرنے کے بعد کھدائی رکوا دی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ دیوار بھی اس کے لیے سنگ میل ثابت ہو گی۔

نوید، مستونگ سے ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ پروفیسر کو اس کے بارے میں تشویش ہو رہی تھی۔ لیکن کیمپ کی طرف واپس جاتے ہوئے بہت دور ایک ٹرک آتے دیکھا تو وہ مطمئن سا ہو گیا۔ تقریباً پچیس منٹ بعد ٹرک کیمپ میں پہنچ گیا۔ نوید کے ساتھ صرف دو مزدور تھے جبکہ یہاں سے جانے والوں کی تعداد چار تھی۔ ان کے بارے میں نوید نے بتایا کہ رحیم کی موت کے واقعے سے خوف زدہ ہو کر دو مزدوروں نے واپس آنے سے انکار کر دیا تھا۔ تحصیل دار حاکم شاہ کے مشورے پر نوید نے کھدائی کے دوران گزشتہ رات پیش آنے والے واقعے کی رپورٹ پولیس میں درج کروا دی تھی۔ پولیس نے نوید اور ان چاروں مزدوروں کے بیانات لینے کے بعد اسے ایک حادثاتی موت قرار دیتے ہوئے کیس وہیں ختم کر دیا تھا۔ کھنڈر میں کھدائی کی پروگریس سن کر نوید کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ خیمے سے باہر الاؤ دہکا کر فولڈنگ چیئرز پر آ بیٹھے اور موجودہ صورتِ حال پر تبصرہ کرنے لگے۔ پروفیسر نے نوید کو ایک بار پھر اس پُراسرار عمارت کے وجود کا یقین دلانے کی کوشش چاہی مگر نوید مسلسل منفی انداز میں سر ہلاتا رہا۔ اسے کوئی عمارت نظر آتی تو وہ اس سلسلے میں کوئی تبصرہ بھی کرتا۔

چٹانوں کی اوٹ سے چودھویں رات کا چاند طلوع ہو رہا تھا۔ مدھم چاندنی فضا میں بڑا پُراسرار تاثر پیش کر رہی تھی۔ نوید بلا مقصد چاروں طرف دیکھتا ہوا اپنے ہی ٹیلے کی سمت گھوما تو چونک گیا۔

"ارے وہ کیا ہے؟" وہ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ اس کے لہجے میں حیرت کا عنصر نمایاں تھا۔ اس کی نظریں ٹیلے کے پرلی طرف خلا میں جمی ہوئی تھیں۔ زمین کی سطح سے تقریباً ساٹھ فٹ کی بلندی پر چوتھی کے برابر ایک نقطہ سا چمک رہا تھا۔ جس کا حجم لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ بالآخر وہ چودھویں کے چاند کی شکل اختیار کر گیا۔ آسمان پر چمکتے ہوئے اس دوسرے چاند نے سب ہی کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ مزدور جو سونے کی تیاری کر رہے تھے، حیرت زدہ انداز میں اٹھ کر ان کی طرف دوڑے۔

"صص ... صاحب ... وہ چاند ... چاند ..." ایک مزدور ہکلایا۔

"دیکھ رہے ہیں۔" پروفیسر نے ہاتھ سے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

چاند کی طرح روشن نقطے سے چمکیلے ذرات پھوٹنے لگے۔ ذرات فضا میں بکھر رہے تھے اور روشن دائرے کا حجم کم ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا اپنا وجود ختم ہو گیا۔ اب اس جگہ چمکیلے ذرات رقص کر رہے تھے۔ چند لمحوں بعد یہ متحرک ذرات ایک انسانی ہیولے کی صورت اختیار کر گئے۔ وہ واضح طور پر کسی عورت کا ہیولا تھا۔ جو تقریباً ایک منٹ تک فضا میں معلق رہا پھر ذرات کی چمک ماند پڑنے لگی اور رفتہ رفتہ وہ روشن ذرات غائب ہو گئے۔

"یہ ... یہ سب کیا تھا حامد؟" نوید، پروفیسر کی طرف دیکھ کر ہکلایا۔

"اس سلسلے میں تمہاری طرح میں بھی اندھیرے میں ہوں۔" پروفیسر نے پُرسوچ لہجے میں جواب دیا۔

"صص ... صاحب ... "ہم اِدھر نہیں رہے گا۔" ایک مزدور کی آواز نے ان دونوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ پیٹرومیکس کی روشنی میں مزدوروں کے چہروں پر خوف کے گہرے سائے رقص کرتے نظر آ رہے تھے۔ گزشتہ رات رحیم کی موت کا پُراسرار واقعہ ہی انہیں دہلا دینے کے لیے کافی تھا کہ آج فضا میں چمکیلے ذروں کا رقص اور ان کا کسی انسانی ہیولے میں ڈھل جانا ان کے حواس اُڑا دینے کے لیے کافی تھا۔

"کیا مطلب؟" پروفیسر نے بات کرنے والے کو گھورا۔

"یہاں شاید بھوت رہتے ہیں، جنہیں ہماری مداخلت پسند نہیں۔ پچھلی رات رحیم کے مرنے کا منظر ہم سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا

کہ وہ کسی غیبی قوت سے زور آزمائی کر رہا تھا اور آج یہ
نہیں، نہیں، صاحب! ہم لوگ یہاں نہیں رہیں گے۔'' ایک مزدور نے گویا اپنے ساتھیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ تم لوگوں کا وہم ہے۔ یہاں کوئی بھوت وغیرہ نہیں ہیں۔ رحیم کی موت ایک حادثہ تھی۔ اسی وہم نے اس کا ذہنی توازن بگاڑ دیا تھا اور اس نے اپنے ہی ہاتھوں اپنا گلا گھونٹ لیا اور جہاں تک ان چمکیلے ذرات کا سوال ہے تو اس میں ڈرنے کی بات نہیں۔ اگر تم لوگ پڑھے لکھے ہوتے تو سائنس کے مطالعے سے تمہیں یہ پتا چل جاتا کہ بعض اوقات خشک، پہاڑی اور ریتیلے علاقوں میں زمین سے ایسے ذرات خارج ہونے لگتے ہیں جن میں فاسفورس موجود ہوتا ہے اور ہوا کی رگڑ سے یہ فاسفورس جل اٹھتا ہے اور وہ ذرات روشن ہو جاتے ہیں۔'' پروفیسر نے ان کا خوف دور کرنے کے لیے ایک دلیل گھڑی۔ ظاہر ہے اگر وہ لوگ تعلیم یافتہ ہوتے تو اس کی اس منطق کو چیلنج بھی کر سکتے تھے۔

''لیکن صاحب! ہم نے پہلے ایسا کبھی ہوتے نہیں دیکھا۔ ہم بھی اسی علاقے میں عرصے سے ہیں۔'' اس مزدور نے جواب دیا۔

''ممکن ہے کبھی تم نے توجہ ہی نہ دی ہو۔ بہرحال اب جاؤ تم لوگ آرام کرو۔ ہوسکتا ہے ایسے چمکیلے ذرات تمہیں کل رات بھی دکھائی دیں۔ یہ بے ضرر ہیں۔ ان سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں اور بھوت پریت کا تو خیال ہی دل سے نکال کر آرام سے سو رہو۔'' پروفیسر نے کہا۔

تمام مزدور اپنی چھولداریوں کی طرف چلے گئے۔ پروفیسر کی منطق نے انہیں اگرچہ زیادہ متاثر نہیں کیا تھا۔ ان کے چہروں پر خوف کے تاثرات ہنوز موجود تھے۔ اب مزدوروں کے دل سے خوف دور ہوا تھا یا نہیں، یہ ایک الگ بات تھی لیکن پروفیسر خود ایک عجیب سی کیفیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ان چمکیلے ذرات نے اس کے ذہن کو بھی بری طرح الجھا دیا تھا۔ ان ذرّوں کا ایک عورت کے ہیولے کی صورت اختیار کر کے غائب ہو جانا بڑی حیرت ہی کی بات تھی۔

نوید بار بار اس سے ان ذرات کے بارے میں پوچھ رہا تھا لیکن وہ خود کچھ نہیں جانتا تھا اسے کیا بتاتا۔ نوید اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ لیٹنے سے پہلے اس نے اپنا پستول نکال کر تکیے کے نیچے رکھ لیا تھا۔ پروفیسر رات بھر جاگتا رہا۔ کبھی وہ کرسی پر بیٹھ جاتا اور کبھی ٹہلنے لگتا۔ نیند نہ آنے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو اسے یہ خدشہ تھا کہ کہیں مزدور رات کے کسی حصے میں ٹرک لے کر رفو چکر نہ ہو جائیں۔ دوسری وجہ وہ پُراسرار چمکیلے ذرات تھے جو اس کے ذہن کو اُلجھائے ہوئے تھے۔

صبح سویرے ہی کام شروع ہو گیا۔ وہ دیوار جو کھدائی کے راستے میں حائل ہو گئی تھی، ایک محراب ثابت ہوئی۔ اس نے اس محراب کے نیچے کھدائی کا کام جاری رکھا۔ دوپہر ہو چلی تھی، شکر تھا کہ دھوپ بھی نکلی ہوئی تھی، سردی کم تھی۔ ماحول اور فضا صاف تھی، ورنہ گدلی رہتی۔

نجانے پھر کیا ہوا کہ مزدوروں نے اچانک ہی کام بند کر دیا اور سہمی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ فضا میں اچانک ہی ایک عجیب سی سراسیمگی طاری ہو گئی تھی، جسے پروفیسر اور نوید بھی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔

تقریباً دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد جب دوبارہ کام شروع ہوا تو اس کے کچھ ہی دیر بعد محراب کے نیچے ایک سرنگ برآمد ہوتے دیکھ کر پروفیسر حامد کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ سرنگ کا دہانہ صاف کرنے میں تقریباً ایک گھنٹا لگ گیا۔ پروفیسر حامد نے دہانے کے قریب کھڑے ہو کر اندر جھانکا مگر گہری تاریکی کے باعث اسے کچھ بھی نظر نہ آسکا۔

اس سرنگ کی دریافت پر مزدور حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نوید کے دل پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ وہ دونوں دیر تک آپس میں مشورہ کرتے رہے۔ پھر پروفیسر ٹارچ لے کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہونے کے لیے اسے کسی حد تک جھکنا پڑا مگر چند قدم چلنے کے بعد وہ سیدھا کھڑا ہو گیا اور ٹارچ کی روشنی میں چاروں طرف کا جائزہ لینے لگا۔

سرنگ اتنی کشادہ تھی کہ اس میں ایک بیل گاڑی آسانی سے چل سکتی تھی۔ دیواریں اور چھت سیاہ پتھر کی تھیں، جنہیں نہایت نفاست اور صفائی سے چنا گیا تھا۔ اس سرنگ کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہاں جو لوگ بھی آباد تھے، وہ طرزِ تعمیر سے خوب واقف تھے۔

سرنگ میں کسی قسم کی گھٹن کا احساس نہیں ہوا تھا جس پر اسے حیرت تھی۔ عام طور سے ایسی جگہوں پر زہریلی گیسیں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن یہاں صورتِ حال مختلف تھی جس کا مطلب تھا کہ اس سرنگ کے اندر کسی جگہ ہوا کی آمد و رفت کا راستہ موجود تھا۔

تقریباً سو قدم چلنے کے بعد پروفیسر رک گیا اور ٹارچ کی روشنی میں اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے اندازے کے مطابق یہ وہ جگہ تھی جہاں اوپر وہ بلند فصیل بنی ہوئی تھی۔

چند قدم مزید آگے بڑھنے کے بعد سرنگ بائیں طرف مڑ گئی۔ وہ بلا جھجک آگے بڑھتا رہا۔

بالآخر سرنگ ختم ہوئی۔ پروفیسر وہیں رک کر سوچنے لگا کہ یہاں سرنگ سے نکلنے کا راستہ کس طرف ہو سکتا ہے۔ وہ ٹارچ کی روشنی اِدھر اُدھر پھینکنے لگا۔ دیواریں یہاں کی بھی سیاہ پتھر کی تھیں لیکن سامنے والی دیوار میں کہیں کہیں سرخ رنگ کے پتھر بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ ٹارچ کی روشنی ایک بار پھر اِدھر اُدھر پھینکنے لگا۔ روشنی کا ہالہ جیسے ہی چھت پر پہنچا، فضا میں ایک تیز سنسناہٹ کی آواز گونجی۔ پھر یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بہت بڑا پرندہ پھڑ پھڑا رہا ہو۔ اس سے پہلے کہ پروفیسر حامد اس کے بارے میں سوچتا، فضا میں ایک باریک اور کریہہ سی چیخ گونجی اس کے ساتھ ہی کوئی چیز اس کے سر سے ٹکرائی۔

پروفیسر کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی، وہ لڑکھڑاتا ہوا کئی قدم پیچھے جا گرا۔ ٹارچ بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ وہ زمین پر گرا خوف زدہ سی نظروں سے تاریک سرنگ میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ یہ شاید دہشت کا اثر تھا کہ اس کے جسم کے مساموں نے پسینہ اگلنا شروع کر دیا تھا۔ باریک اور کریہہ چیخوں اور پروں کی پھڑ پھڑاہٹ دور ہوتی چلی گئی اور پھر یہ آوازیں تاریکی میں غائب ہو گئیں۔

پروفیسر کتنی دیر تک زمین پر پڑا اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا اور پھر اسے اپنی حماقت پر تاؤ آنے لگا۔ وہ کوئی چمگادڑ تھی جو روشنی سے گھبرا کر اس سے ٹکرائی ہوئی نکل گئی تھی۔ اس نے ٹارچ کی طرف دیکھا جو اس سے چند فٹ کے فاصلے پر پڑی اب بھی جل رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر ٹارچ سنبھال لی اور پھر اس کی روشنی میں ایک بار پھر دیوار کا جائزہ لینے لگا۔

اس کی تمام تر توجہ اس جگہ پر مرکوز تھی جہاں دیوار میں سرخ پتھر لگے ہوئے تھے۔ ذہن اس تاریک سرنگ میں اس چمگادڑ کی موجودگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سرنگ میں چمگادڑ کی موجودگی اس بات کا ثبوت تھا کہ کہیں آس پاس راستہ موجود ہے۔

وہ سرخ پتھروں کو چھو کر دیکھنے لگا۔ وہ چار پتھر تھے جن کے درمیان سیاہ رنگ کا ایک پتھر تھا۔ اب وہ سرخ پتھروں میں گھرے ہوئے اس سیاہ پتھر پر توجہ مرکوز کیے ہوئے تھا۔ چند منٹ تک وہ اس پتھر کو ٹٹول کر دیکھتا رہا۔ یہ بھی بڑی نفاست سے اپنی جگہ پر جما ہوا تھا۔ اس نے پتھر پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا اور دوسرے ہی لمحے وہ چونک پڑا۔

ہاتھ کے دباؤ سے پتھر اندر کی طرف دبتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ پہلے تو اسے وہ اپنا واہمہ سمجھا لیکن ایک بار پھر دباؤ ڈالنے سے اس کے اس شبے کی تصدیق ہو گئی کہ یہ پتھر اندر کی طرف دب سکتا ہے۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے ٹارچ زمین پر رکھ دی اور دونوں ہاتھوں سے پتھر پر دباؤ ڈالنے لگا۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ پتھر اندر کی طرف دبتا چلا گیا۔

دفعتاً ہی سرنگ کی محدود فضا میں گڑگڑاہٹ کی آواز ابھری۔ پروفیسر نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔ اتفاق سے ٹارچ کی روشنی کا رخ بھی اسی سمت تھا۔ روشنی میں دیوار کا ایک حصہ اپنی جگہ سے سرکتا ہوا نظر آیا۔ اس نے جلدی سے ٹارچ اٹھائی اور سرکتی ہوئی دیوار کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت ابھر آئی تھی۔ دیوار سلائڈنگ ڈور کی طرح سرنگ کی دیوار میں غائب ہو رہی تھی۔ بالآخر دیوار رک گئی اور اب اس جگہ اتنا کشادہ راستہ نظر آنے لگا جس میں سے ایک ٹرک آسانی سے گزر سکتا تھا۔

دیوار ہٹ جانے سے تازہ ہوا کے سرد جھونکے اس کی کامیابی کی نوید سناتے محسوس ہوئے۔ پروفیسر اس راستے کے دوسری طرف پہنچ گیا۔ یہ بھی ایک سرنگ تھی لیکن اس میں تھوڑا سا اجالا تھا۔ چند قدم بعد یہ سرنگ بائیں طرف مڑ گئی۔ اب یہاں تاریکی نہیں تھی۔ دور سرنگ کا دہانہ نظر آ رہا تھا۔ جہاں سے روشنی اندر پہنچ رہی تھی۔

دہانے کا فاصلہ سو گز سے زیادہ نہیں تھا۔ باہر نکلتے ہی تیز دھوپ کی چمک میں ایک لمحے کو اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ دہانے سے چند قدم دور ایک چھوٹے سے ٹیلے پر کھڑا ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ٹیلے کے دوسری طرف ایک چٹان کے دامن میں چند کھنڈرات تھے۔ ایک پوری عمارت تھی جو حوادثِ زمانہ کا شکار ہو چکی تھی۔ وہ ٹیلے سے اتر کر ان کا جائزہ لینے لگا۔

کھنڈرات بتا رہے تھے کہ جب یہ عمارت سلامت تھی تو اس کے وسط میں ایک ہال تھا جس کے چاروں طرف پانچ کمرے بنے ہوئے تھے۔ تمام کمروں کی صرف شکستہ دیواریں تھیں البتہ ایک کمرا ایسا تھا جس کی چھت سلامت تھی اور بھاری دروازہ بھی ایک جگہ موجود تھا۔ وہ گھوم پھر کر اس دروازے کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ دروازے پر کوئی زنجیر یا کنڈا وغیرہ نظر نہیں آ رہا تھا اور پروفیسر کو حیرت تھی کہ یہ باہر سے کیسے بند کیا جاتا ہوگا؟ یہ سوچ کر کہ دروازہ ویسے ہی بھڑا ہوا ہوگا، جب ہاتھ کا دباؤ ڈالا تو کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ کیونکہ دروازہ مضبوطی سے بند تھا۔

وہ کتنی دیر تک چاروں طرف گھوم پھر کر جائزہ لیتا رہا لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آسکی۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ اسے سرنگ میں داخل ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ وہ بند دروازے کی طرف دیکھتا ہوا واپس چل دیا۔

نوید اور تمام مزدور پروفیسر کے اس طرح غائب ہو جانے سے پریشان ہو رہے تھے، لیکن کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ سرنگ میں داخل ہو کر صورتِ حال کا جائزہ لے سکتا۔ نوید بھی سرنگ میں جاتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ پروفیسر کو گئے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے۔ نوید سوچ رہا تھا کہ اگر مزید پندرہ منٹ تک پروفیسر باہر نہ آیا تو وہ مزدوروں کو ساتھ لے کر خود اندر داخل ہوگا لیکن اسے یہ زحمت نہیں کرنا پڑی۔ تقریباً اسی وقت پروفیسر کو سرنگ کے دہانے سے برآمد ہوتے دیکھ کر اس کے چہرے پر رونق سی آگئی۔

''کہاں غائب ہو گئے تھے میاں؟ کہیں ایسا تو نہیں اس سرنگ نے تمہیں مستونگ پہنچا دیا ہو؟'' نوید اسے دیکھتے ہی بولا۔

''اس سرنگ کے ذریعے مستونگ تو نہیں البتہ عدم آباد تک ضرور پہنچا سکتا ہے۔'' پروفیسر حامد نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' نوید نے الجھی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

''مطلب پھر بتاؤں گا۔ چھ بج رہے ہیں۔ میرا خیال ہے اب کام بند کر دینا چاہیے۔'' پروفیسر حامد نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ ویسے بھی اب شام ہونے والی ہے۔'' نوید نے رخصت ہوتے وقت مزدوروں کو کیمپ کی طرف رخصت ہونے کا اشارہ کیا۔

مزدور تو شاید پہلے ہی اس اشارے کے منتظر تھے۔ ان کے چند منٹ بعد وہ دونوں بھی کیمپ کی طرف چل دیے۔ پروفیسر اسے سرنگ کی طوالت، طرزِ تعمیر اور دوسری طرف دریافت ہونے والے کھنڈرات کے بارے میں بتا رہا تھا اور نوید اس انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے پروفیسر کا دماغ چل گیا ہو۔

''کیا بات ہے۔ تم مجھے اس طرح کیوں گھور رہے ہو؟'' پروفیسر حامد نے مسکرا کر پوچھا۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ تمہارے دماغ پر واقعی یہاں خشک پہاڑیوں کی سردی اثر انداز ہو رہی ہے۔'' نوید نے الجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' اس مرتبہ حامد نے اسے گھورا۔

''ارے پیارے بھائی! سیدھی سی بات ہے کہ تم شروع ہی سے مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔'' نوید بولا۔ اور گزری باتیں دہرا دیں۔

پروفیسر نے اس کی باتیں سن کر کہا۔ ''یہاں کی ہر چیز اسرار کے پردے میں لپٹی ہوئی ہے اور مجھے اس اسرار سے پردہ اٹھانا ہے، لیکن تم ان چمکیلے ذرات کے بارے میں کیا کہو گے جنہوں نے عورت کے ہیولے کا روپ دھار لیا تھا؟''

''ہاں، یہ سوچنے کی بات ہے۔ وہ روشن ذرات تو سب ہی نے دیکھے تھے اور ان کے بارے میں تم نے بتایا تھا کہ وہ زمین کا غبار ہے۔'' نوید نے کہا۔

''یہ منطق میں نے مزدوروں کا خوف دور کرنے کے لیے کہی تھی۔'' پروفیسر نے جواب دیا۔

''تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہیں۔'' نوید نے سر جھٹکا۔

''میرے خیال میں کل شام تک اس اسرار سے پردہ اٹھ جائے گا۔'' پروفیسر نے کہا۔

نوید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پروفیسر حامد بھی خاموشی سے چلتا رہا۔ سورج چٹانوں کی آڑ میں جا چکا تھا، جس کی وجہ سے کیمپ چٹانوں کے سائے میں آگیا تھا۔ وہ دونوں تھکے ہوئے انداز میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد خانساماں نے چائے بنا کر انہیں پیش کر دی۔ چائے کے دوران بھی وہ زیادہ تر خاموش رہے۔

رات کے کھانے کے بعد پروفیسر نے نرم دھات کی وہ تختی نکال لی جو کھدائی کے دوران آہنی صندوق میں سے برآمد ہوئی تھی۔ اس تختی پر کوئی نقشہ بنا ہوا تھا۔ گہری نظروں سے نقشے کا جائزہ لینے کے بعد پروفیسر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس پر بنائے ہوئے راستوں کا اختتام ٹھیک اسی جگہ پر ہوتا تھا جہاں سرنگ کے دوسری طرف وہ نئے کھنڈرات دریافت ہوئے تھے۔ اب اسے یہ سمجھنے میں چنداں دیر نہ لگی کہ سرنگ کے دہانے کے قریب اس نقشے کی موجودگی کا مطلب یہی تھا کہ اصل مقام تک پہنچا جا سکے۔ لیکن وہاں کیا راز پوشیدہ تھا؟

بارہ بج کر دو منٹ ہو چکے تھے۔ وہ سیدھا ہو کر غیر ارادی طور پر اس طرف گیا جہاں گزشتہ رات فضا میں روشن ذرات کو رقص کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

وہ روشن ذرات اس وقت بھی موجود تھے اور عورت کے ہیولے کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ پروفیسر دلچسپ نظروں سے اس روشن ہیولے کو دیکھ رہا تھا۔ اسے یہ بھی احساس نہیں ہوا کہ اب تک جاگنے والے دونوں مزدور کب

اس کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اس کی تمام تر توجہ روشن ہیولے پر مرکوز تھی جو اب آہستہ آہستہ نیچے جا رہا تھا اور پھر اچانک ہی وہ ہیولا غائب ہو گیا۔

پروفیسر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ہیولا ٹھیک اس جگہ غائب ہوا تھا جہاں آج اس نے نئے کھنڈرات دریافت کیے تھے۔ گزشتہ رات بھی وہ ہیولا اس جگہ نظر آیا تھا۔ پروفیسر حامد کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ان کھنڈرات کے بند کمرے میں کوئی بہت ہی اہم راز پوشیدہ ہے اور اسے وہ دریافت کرنا ہے۔

☆☆☆

صبح ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد تمام مزدور تیار ہو کر پروفیسر کی ہدایات کا انتظار کرنے لگے مگر پروفیسر نے آج کے دن انہیں چھٹی دے دی اور خود کدال لے کر سرنگ کی طرف چل دیا۔ اس نے نوید کو بھی کیمپ ہی میں رہنے کی ہدایت کی تھی۔

سرنگ عبور کرنے کے بعد وہ ان نئے کھنڈرات میں ... اس کمرے کے سامنے پہنچ گیا اور گہری نظروں سے دروازے کا جائزہ لینے لگا۔

دروازہ آبنوسی لکڑی کا تھا جس پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ نجانے کتنا عرصہ گزر چکا تھا لیکن یہ اب بھی اسی مضبوطی سے اپنی جگہ پر قائم تھا۔ پتھروں میں چنی ہوئی دروازے کی چوکھٹ بھی خاصی مضبوط نظر آ رہی تھی۔

پروفیسر کچھ دیر تک چوکھٹ کا جائزہ لیتا رہا پھر کدال سنبھال کر چوکھٹ کے ساتھ لگے پتھر اکھاڑنے لگا۔ اس عمارت کی تعمیر میں نجانے کون سا مسالا استعمال کیا گیا تھا کہ پتھر اکھاڑنے میں اسے دانتوں پسینہ آ رہا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے کی جدوجہد کے بعد وہ دروازہ اکھاڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ دروازہ جیسے ہی چوکھٹ سمیت اندر کی طرف گرا، اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی عطر ساز فیکٹری کا دروازہ کھل گیا ہو۔ بڑی سحر انگیز خوشبو تھی۔ وہ کچھ دیر تک دروازے کے قریب کھڑا اندر جھانکتا رہا۔ دروازہ گرنے سے غبار کا ایک بادل سا پھیل گیا تھا جس سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ویسے بھی کمرے کے اندر کی فضا نیم تاریک سی تھی۔

غبار ختم ہونے کے بعد اس نے جیب سے ٹارچ نکالی اور اندر داخل ہو گیا۔ ٹارچ کی روشنی سے کمرے کو دیکھا۔ اندر اوپر سے نیچے لکڑیوں کے جالے پھیلے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں فرش پر خلا سا دیکھ کر وہ تیزی سے اس طرف بڑھا۔ قریب پہنچتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ یہ کسی تہ خانے کا راستہ تھا، جس میں سے ایک آدمی بہ آسانی گزر سکتا تھا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں تہ خانے کے اندر کچھ دیکھنے کی کوشش چاہی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ ٹارچ کی روشنی مکڑی کے جالوں تک ہی محدود رہی جو اس راستے پر تنے ہوئے تھے۔

پروفیسر نے سوچنے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے فوراً ہی اگلا قدم اٹھا ڈالا۔

وہ پتھر کی سیڑھیوں پر پیر رکھتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی اور دوسرے ہاتھ میں کدال، جس سے وہ جالے ہٹا رہا تھا، لیکن اس کے باوجود اس کا پورا جسم جالوں میں لپٹ گیا تھا۔

پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی وہ چونک گیا تھا۔ تہ خانے کے اندر سے ایسی آوازیں ابھرنے لگی تھیں جیسے بہت سی عورتیں مل کر خوشی کا گیت گا رہی ہوں، یہ اس کا واہمہ نہیں تھا۔ مسرت بھرے گیت کی سریلی آوازیں اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ اگرچہ زبان اس کے لیے قطعی اجنبی تھی لیکن اس کا مفہوم وہ بخوبی سمجھ رہا تھا۔ وہ سُریلی آوازیں اسے خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ وہ جیسے جیسے نیچے اتر رہا تھا آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ آخری قدم پے سے فرش پر قدم رکھتے ہی گیت کی لے بدل گئی۔

فرش سے چھت تک جالے تنے ہوئے تھے اور کوئی چیز واضح طور پر نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ جالے صاف کرتا ہوا کمرے کے وسط میں پہنچ کر رک گیا۔ اس کی نظریں ٹارچ کی روشنی کے حلقے میں سیاہ رنگ کے ایک چھوٹے سے صندوق پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ صندوق بھی شاید آبنوسی لکڑی کا بنا ہوا تھا جس پر سنہرے نقش و نگار بنے ہوئے تھے جو ٹارچ کی روشنی میں چمک رہے تھے۔

معاً ہی کمرے کی تاریک فضا اس طرح منور ہو گئی جیسے چاند نکل آیا ہو۔ وہ چمکیلے ذرات اچانک ہی کہیں سے نمودار ہو گئے تھے، جو رقص کرتے ہوئے ایک عورت کے ہیولے کی صورت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ حامد کی نظریں اسی روشن ہیولے پر جمی ہوئی تھیں، جو لمحہ بہ لمحہ واضح ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی گیت کی لے بھی تیز ہو گئی تھی۔

پروفیسر پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ وہ پلک جھپکے بغیر اس روشن ہیولے کو دیکھ رہا تھا جو اب ہیولا نہیں ایک مجسم صورت اختیار کر چکا تھا۔ پروفیسر نے دنیا کے مختلف ممالک میں ایک سے ایک بڑھ کر حسین عورت کو دیکھا تھا لیکن جو عورت اس وقت اس کے سامنے کھڑی تھی، اسے دیکھ کر بلاشبہ یہ کہا جا

سکتا تھا کہ وہ قدرت کی صناعی کا ایسا مرقع تھا جس نے حامد جیسے شخص کے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتوں کو سلب کر لیا تھا۔ اس کے حسن کو دنیا کی کسی چیز سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی تھی۔

کئی لمحوں تک پروفیسر حامد پر سکتے کی سی کیفیت طاری رہی۔ وہ مدہوشی کے عالم میں رعنائی کے اس مجسمے کو دیکھتا رہا جو چمکیلے ذروں سے وجود میں آیا تھا۔ پھر یکا یک اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔ وہ بے اختیار آگے بڑھ گیا۔

عورت کے ہونٹوں پر ایک ایسی دلفریب مسکراہٹ ابھر آئی جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ پروفیسر نے ہاتھ بڑھا کر اسے چھو لینا چاہا لیکن اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ وہاں تک پہنچ سکتا، اس حسینہ کا وجود غائب ہو گیا۔ چمکیلے ذروں کا وہ ہیولا لمحہ بہ لمحہ معدوم ہوتا جا رہا تھا یہاں تک کہ وہ بالکل غائب ہو گیا تھا۔

تہ خانے میں ایک بار پھر تاریکی چھا گئی۔ صرف ٹارچ کی مدھم روشنی تھی جو ایک ہی جگہ تک محدود تھی۔ پروفیسر کو ایک شدید ذہنی جھٹکا لگا اور وہ چاروں طرف تاریکی میں گھورنے لگا لیکن اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ بالآخر اس کی نظریں ایک بار پھر اس چھوٹے سے صندوقچے پر مرکوز ہو گئیں جو ٹارچ کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ وہ صندوقچے کے قریب بیٹھ گیا اور گہری نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔

صندوقچے کو کھولنا زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوا لیکن ڈھکنا کھلتے ہی تاریک تہ خانہ ایک بار پھر جگمگا اٹھا۔ صندوقچے میں بھرے ہوئے جواہرات کی چمک سے پروفیسر کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ کتنی دیر تک ان جواہرات کو دیکھتا رہا پھر اس کی نظریں ایک طرف رکھے ہوئے سیاہ چمڑے کے ایک ٹکڑے پر جم گئیں۔ اس نے کاغذ کی طرح پتلا سا چمڑے کا وہ ٹکڑا نکال لیا، اس کی تہ کھولتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ چمڑے پر قدیم چینی زبان میں کوئی تحریر رقم تھی۔ جسے ریفرنس بکس کی مدد کے بغیر پڑھنا ممکن نہیں تھا۔

تہ خانے کی فضا میں جلترنگ کی سی مدھم سریلی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ پروفیسر نے ڈھکنا بند کر کے صندوقچہ اٹھا لیا اور پتھر کے زینے کی طرف بڑھ گیا۔ جوں جوں وہ اوپر جا رہا تھا گیت کی لے بھی تیز ہوتی جا رہی تھی، پھر جیسے ہی وہ اوپر والے کمرے میں پہنچا سب کچھ ختم ہو گیا اور ماحول پر ایک اعصاب شکن خاموشی چھا گئی۔

پروفیسر نے کمرے سے نکل کر شکستہ دروازے کی طرف دیکھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا سرنگ کی طرف بڑھ گیا۔ سرنگ عبور کر کے کیمپ کی طرف جانے سے پہلے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اب وہاں نہ تو وہ بلند فصیل نظر آ رہی تھی اور نہ چینی طرز تعمیر کی وہ عمارت جو اب تک صرف اسے دکھائی دیتی رہی تھی۔

☆☆☆

جواہرات دیکھ کر نوید کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اتنی دولت کا تصور تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں کیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چند روز کی محنت سے وہ اس قدر دولت مند بن جائیں گے۔

وہ دونوں اس وقت پروفیسر کے خیمے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کیمپ کی طرف آتے ہوئے مزدوروں نے اس کے ہاتھ میں صندوقچہ دیکھا تو تھا لیکن انہیں علم نہ ہو سکا کہ اس صندوقچے میں کیا تھا۔ نہ ہی پروفیسر انہیں کچھ بتانا چاہتا تھا۔ اگر انہیں بتا دیا جاتا تو وہ دونوں کسی خطرے میں گھر جاتے۔ اتنی بڑی دولت دیکھ کر ہر ایک کے منہ میں پانی آ سکتا تھا۔

''اور..... یہ تحریر کیسی ہے؟'' نوید نے سیاہ چمڑے کے ٹکڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ پڑھنے کے بعد ہی اندازہ ہو گا کہ اس میں کیا راز پوشیدہ ہے۔'' حامد نے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے کہ اس تحریر میں کسی بڑے خزانے کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔'' نوید نے کہا۔ اس کے لہجے میں ہلکی کپکپاہٹ تھی۔

''شاید تمہارا خیال درست ہو لیکن اس میں کیا راز ہے؟ یہ تو تحریر پڑھنے کے بعد ہی پتا چلے گا۔ بہرحال، اب یہ صندوقچہ سنبھالو۔ اگر مزدوروں کو جواہرات کی موجودگی کا علم ہو گیا تو شاید ہماری زندگیاں خطرے میں پڑ جائیں۔'' حامد نے جواہرات کا صندوقچہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ اتنی بڑی دولت کے لیے کسی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا، لیکن وہ نوید کی فطرت سے بخوبی واقف تھا۔ وہ لالچی ضرور تھا لیکن بددیانت نہیں۔ اس کے خیال میں اس صندوقچے کی حفاظت اس وقت نوید سے بہتر اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

نوید صندوقچہ اٹھا کر اپنے خیمے میں چلا گیا اور پروفیسر نے سیاہ چمڑے کا وہ ٹکڑا میز پر پھیلا دیا جس میں وہ عجیب و غریب تحریر درج تھی۔

شام تک پروفیسر اس تحریر کی صرف دو سطریں ہی

پڑھ سکا لیکن یہ دو سطریں بھی اس قدر سنسنی خیز تھیں کہ ان کا مفہوم سمجھ کر وہ سکتے میں آ گیا تھا۔

خیمے سے باہر سناٹا خوفناک اور تاریک ویرانوں میں رات بیتی جا رہی تھی۔ پروفیسر جیسے دنیا کی ہر چیز کو بھول کر صرف اس تحریر میں کھو گیا تھا، جیسے جیسے اس تحریر کی وضاحت ہو رہی تھی، اس کے دماغ کی سنسناہٹ بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

''حامد ... ''حامد! وہ دیکھو ... وہ ... وہ کیا ہے؟''

پروفیسر اپنے قریب ہی نوید کی آواز سن کر چونک گیا۔ اس وقت رات نصف سے زیادہ بیت چکی تھی، پروفیسر نے سر اٹھا کر نوید کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی سراسیمگی کے آثار تھے۔

''کیا ہوا؟ تم اتنے بدحواس کیوں ہو رہے ہو؟'' ہمدانی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''وہ ... وہ لڑکی ... بہت حسین ... بخدا، نور کا مرقع، اس ویرانے میں ... اُف، کیسا یونیک حُسن۔'' نوید کہتے کہتے اچانک ہی خاموش ہو گیا، اگلے ہی لمحے وہ اس طرح اپنی آنکھیں ملنے لگا جیسے اپنی بینائی پر شبہ ہو رہا ہو۔ چند لمحوں بعد دوبارہ بولا۔

''نہیں، نہیں ... یہ میرا واہمہ نہیں تھا، میں نے اسے دیکھا تھا۔ وہ اتنی حسین تھی جیسے ... جیسے دنیا کا سارا حُسن اس میں سمٹ آیا ہو۔ وہ ... وہ شاید اس بڑے پتھر کی آڑ میں ہو گئی ہے۔'' نوید نے ایک طرف اشارہ کیا۔

''نوید!'' پروفیسر نے اس پتھر کی طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''اگر تم نے اس ویرانے میں کسی حسینہ کو دیکھا ہے تو وہ تمہارا واہمہ نہیں ہے، اسے میں بھی دیکھ چکا ہوں، لیکن میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا، اس لیے کہ کہیں تم میری ذہنی تندرستی پر شبہ نہ کرو۔''

''کک ... کیا واقعی؟'' نوید نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''ہاں، اس خوب صورت لڑکی کو میں نے اس وقت دیکھا تھا جب اس کمرے کے تہ خانے سے مجھے جواہرات والا صندوقچہ ملا تھا اور یہ قدیم تحریر بھی جسے میں تقریباً پڑھ چکا ہوں .... اسی سے متعلق ہے۔ بڑی حیرت انگیز کہانی ہے، نوید! سنو گے تو یقین نہیں کرو گے۔'' پروفیسر نے جواب دیا۔

''نہیں، حامد! اب میں تمہاری ہر بات پر یقین کرنے کو تیار ہوں خدا کے لیے جلدی بتاؤ، یہ سب کیا ہے؟'' نوید بے تابی سے بولا۔

اس سے پہلے کہ پروفیسر کوئی جواب دیتا۔ معاً ہی چوڑیوں کی کھنک جیسی آواز سن کر وہ دونوں چونک گئے۔ ہنسی کی وہ آواز ایسی ہی تھی جیسے جلترنگ بج اٹھے ہوں۔ ان دونوں نے بیک وقت آواز کی سمت دیکھا۔ ایک بہت بڑے پتھر کی آڑ سے حُسن و رعنائی کا مرقع برآمد ہوا جسے دیکھ کر نوید پر بدحواسی طاری ہو گئی تھی۔ پروفیسر کی آنکھوں میں بھی چمک ابھر آئی۔

بلاشبہ یہ وہی لڑکی تھی جسے وہ کھنڈرات کے تہ خانے میں دیکھ چکا تھا۔ چمکیلے ذرات سے جنم لینے والا حُسن ... ''اک حُسن بے مثال ...''

وہ لڑکی پُروقار انداز میں قدم اٹھاتی ہوئی ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ فضا میں گنگناہٹ سی تھی۔ وہ دونوں سحر زدہ انداز میں بے حس و حرکت کھڑے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ وہ ان کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ اس کی نگاہیں ان دونوں کے چہروں سے پھسلتی ہوئی میز پر پہنچ گئیں جہاں سیاہ چمڑے کا وہ ٹکڑا اور دیگر کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔

اس نے ایک بار پھر پروفیسر کی طرف دیکھا، اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر انتہائی دل فریب مسکراہٹ آ گئی۔ وہ چند لمحے ستاروں جیسی روشن آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر جس طرف سے آئی تھی اسی طرف چل پڑی۔ چند سیکنڈوں بعد ہی اس کا وجود ایک روشن ہیولے میں تبدیل ہو کر تاریکی میں معدوم ہو گیا۔

''یہ ... یہ سب کیا تھا؟'' نوید ہکلایا۔ اس لڑکی کے حُسن نے اسے بدحواس سا کر دیا تھا۔

پروفیسر آگے بولا۔ ''ایک ایسا راز جس کا انکشاف پوری دنیا کو چونکا دے گا۔'' پروفیسر نے خفیف سی مسکراہٹ کے جواب دیا۔

''تم اس تحریر کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے؟'' نوید نے اسے اصل موضوع کی طرف متوجہ کیا۔

''ہاں، ایک انتہائی دلچسپ اور ناقابلِ یقین کہانی ہے لیکن یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد تم اس کی حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے۔'' اس نے میز پر بکھرے کاغذات کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب کون کافر انکار کر سکتا ہے، لیکن کچھ بتاؤ تو سہی۔'' نوید میز کے دوسری طرف ایک کرسی پر جم گیا۔

پروفیسر نے میز پر بکھرے ہوئے کاغذات اٹھا کر ان کی ترتیب درست کی پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہنے لگا۔

''یہ اس دور کی بات ہے جب منگولیا کا ایک جابر اور سفاک حکمران چنگیز خاں دہشت اور بربریت کی علامت

بن کر انسانی خون سے ہولی کھیل رہا تھا۔ قدیم بلوچستان کی تاریخ بھی یہ شہادت فراہم کرتی ہے کہ چنگیز خان کے قدموں نے اس خطے کے بعض علاقوں کو بھی اپنے قدموں تلے روندڈالا تھا۔

خضدار کے قریب چنگیز خاں کی گزرگاہ کو اب بھی خونی پٹی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگر سمندر اس کی راہ میں حائل نہ ہوتا تو تباہی و بربادی کا یہ دیوتا شاید خون کی ہولی کھیلتا ہوا دنیا کے آخری سرے تک پہنچ جاتا۔

چنگیز خاں کے لشکر میں اس کی سلطنت کے مختلف علاقوں کی نمائندگی کرنے والے سردار بھی شامل تھے۔ ہر سردار کے ساتھ اس کا اپنا حرم بھی تھا۔ چنگیز خاں کو جس سردار کے حرم کی جو عورت پسند آتی اسے اپنے خیمے میں طلب کر لیتا۔ کسی سردار میں انکار یا عذر کی جرأت نہ ہوتی۔ بعض سردار تو اسے اپنی خوش بختی سمجھتے تھے کہ چنگیز خاں نے اس کے حرم کی کسی عورت کو پسند کر لیا تھا لیکن لوئی کان نامی ایک ایسا سردار بھی اس لشکر میں شامل تھا جسے چنگیز خاں کی یہ عادت قطعی پسند نہیں تھی۔ لوئی کان اپنے صوبے کا حاکم اعلیٰ تھا۔ وہ بھی اپنے اہل و عیال سمیت چنگیز خاں کا شریک سفر تھا۔ خوب صورت بیوی کے علاوہ وہ ایک حسین بیٹی کا باپ بھی تھا۔

یانگ شو پندرہ برس کی ہو چکی تھی۔ اس کے حسن و شباب کا شہرہ پورے لشکر میں پھیل رہا تھا۔ لوئی کان کو یہ فکر تھی کہ اس کی بیٹی کے حسن کا چرچا چنگیز خاں کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔ یہی وجہ تھی کہ جب لشکر کہیں پڑاؤ ڈالتا تو وہ اپنا خیمہ لشکر کے آخری حصے میں نصب کرتا تاکہ اس کی بیٹی چنگیز خاں کی نظروں میں نہ آسکے، لیکن وہ اس راز کو زیادہ عرصہ تک نہ چھپا سکا کہ اس کے خیمے میں چاند کی کرنوں سے تراشا ہوا حسن و رعنائی کا ایک چلتا پھرتا مجسمہ بھی موجود ہے۔

خضدار کے قریب پڑاؤ کے دوران سہ پہر کے وقت چنگیز خاں لشکر کے اس دور افتادہ حصے میں بھی پہنچ گیا۔ زمین کے اس چاند کو دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس نے فرمان جاری کر دیا کہ یانگ شو کو آج رات اس کے خیمے میں پہنچا دیا جائے۔ لوئی کان اٹھا مگر زبان کھولنے کی جرأت نہ کر سکا۔

لوئی کا تعلق تبت کے علاقے سے تھا یہاں کسی قسم کی عبادت کا تصور موجود تھا۔ پوتالا میں ان کا سب سے بڑا معبد تھا جسے پوتالا محل کہا جاتا تھا۔ روایت کے مطابق حاکم اعلیٰ کی پہلی بیٹی کو معبد کی امانت سمجھا جاتا تھا۔ سولہ سال کی عمر تک ماں باپ کو لڑکی کی پرورش کا حق حاصل تھا۔ سولہ سال کی عمر کو پہنچتے ہی اسے اپنی بیٹی معبد کی نگرانی میں دینا پڑتی تھی۔ ایسے موقع پر ایک بہت بڑا جشن منایا جاتا اور لڑکی کو معبد کے پجاریوں کی نگرانی میں پوتالا محل بھیج دیا جاتا۔

یانگ شو پندرہ برس کی ہو چکی تھی اور اس مہلت میں صرف ایک سال باقی تھا لیکن چنگیز خاں کی نظروں میں آجانے کے بعد اب صورت حال بدل چکی تھی۔ لوئی کے سامنے اب صرف دو ہی راستے تھے یا تو اپنی بیٹی کو چنگیز خاں کی بربریت کی بھینٹ چڑھا کر معبد کی توہین کا باعث بنے یا چنگیز خاں سے بغاوت کر دے۔

چنگیز خاں سے بغاوت کا مطلب تھا انتہائی بھیانک اور اذیت ناک موت! لیکن اس کے باوجود لوئی نے یہ دوسرا راستہ ہی اپنانے کا فیصلہ کر لیا اور رات کا اندھیرا پھیلتے ہی اپنی بیوی اور یانگ شو کو لے کر خاموشی کے ساتھ لشکر سے نکل گیا۔

اسے بخوبی اندازہ تھا کہ اس کے فرار کا علم ہوتے ہی چنگیز خاں اپنا لشکر چاروں طرف پھیلا دے گا اور اس کے وحشی سوار اسے چوہے کی طرح پکڑ لیں گے لیکن ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید اس اجنبی دیس کے پہاڑ اسے پناہ دے دیں۔

کئی روز کے مسلسل سفر کے بعد بالآخر جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کی تلاش کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہوگا تو اس نے ان پہاڑوں میں ایک محفوظ جگہ دیکھ کر پڑاؤ ڈال دیا۔ ان دنوں قریب ہی ایک قبیلہ آباد تھا جو خود بھی چنگیز خاں کے خوف سے پناہ کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ لوئی نے ان سے تعلقات قائم کر لیے اور اسی جگہ کو اپنی رہائش کے لیے منتخب کر لیا۔

دن بیت رہے تھے۔ لوئی کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ اس نے سولہ برس کی عمر کو پہنچ کر یانگ شو کو پوتالا محل نہ پہنچایا تو وہ تا ابد ایک ایسے عذاب میں مبتلا ہو جائے گی جس سے نجات دلانا آسان نہ ہوگا، لیکن چنگیز خاں کا خوف، اس کے دماغ پر مسلط تھا۔

یانگ شو کی ماں بھی اس فکر میں مر گئی اور جب یانگ شو پورے سولہ برس کی ہوئی تو وہ بھی پُراسرار حالات کا شکار ہو کر مر گئی۔ لوئی اس کی موت کے اسرار سے آگاہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی روح اب بھٹکتی رہے گی۔ اب اس کے لیے ایک ہی راستہ تھا کہ بیٹی کی روح کو زیادہ عذاب سے بچانے کے لیے اس کی لاش پوتالا محل پہنچا دے۔ اس کی لاش تو پوتالا محل میں رہے مگر روح اس وقت تک انہی ویران اور سنگلاخ پہاڑوں میں بھٹکتی رہے گی جب تک کہ ایک خاص عمل کے

ذریعے اسے اس عذاب سے نجات نہ دلائی جائے اور یہ عمل وہ خود نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لیے شرط یہ تھی کہ کسی آئندہ نسل کا کوئی شخص یہ عمل کرے اور یانگ شو کی روح کو اس عذاب سے نجات دلائے۔

لوئی نے یانگ شو کی ایک معتمد خادمہ کو کچھ ہدایات دیں اور چنگیز خاں کے سواروں کے خوف کے باجود بیٹی کی لاش کو لے کر پوتالا محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

پروفیسر ہمدانی خوش ہو کر نوید کی طرف دیکھنے لگا جو پوری توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ رات اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی لیکن ان دونوں کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہ تھا۔

''اوہ، تو یہ شہزادی یانگ شو کی روح تھی، کاش! ہم اسے اس عذاب سے نجات دلا سکیں۔'' نوید نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

''ہم ایسا کر سکتے ہیں۔'' پروفیسر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس تحریر کے مطابق ہمیں پوتالا محل جانا ہوگا، جہاں کوئی پُراسرار ہستی ہماری رہنمائی کرے گی۔ اس تحریر کے ساتھ برآمد ہونے والے جواہرات زادِراہ کے طور پر رکھے گئے تھے اور تحریر میں وعدہ کیا گیا ہے کہ شہزادی یانگ شو کی روح کو عذاب سے نجات دلانے والے کو اتنا بڑا خزانہ انعام میں ملے گا کہ کوئی بڑے سے بڑا شہنشاہ بھی اس کا تصور نہیں کر سکتا۔''

''ہم پوتالا محل ضرور چلیں گے حامد!'' نوید نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ اس کے ذہن میں یانگ شو کی روح کو عذاب سے نجات دلانے سے زیادہ اس خزانے کا خیال تھا جس کا اس تحریر میں وعدہ کیا گیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ اب یہاں ہمارا کوئی کام نہیں۔ ہم حکام کو اپنی ناکامی کی رپورٹ پیش کر دیں گے۔ اگرچہ وہ سرنگ دریافت کر کے ہم نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے لیکن جب تک اصل بات نہ بتائی جائے اسے ناکام رپورٹ ہی کہوں گا۔'' پروفیسر نے کہا۔

''ٹھیک ہے، اس طرح یہ جواہرات بھی ہمارے قبضے میں رہیں گے۔'' نوید کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آئی اور وہ اٹھ کر اپنے خیمے کی طرف چل دیا۔

ہمدانی بھی کچھ دیر سوچتا رہا پھر وہ بھی کرسی سے اٹھ کر بستر پر جا لیٹا۔ نیند آنے تک اس کا ذہن خاصی دیر تک مختلف خیالات کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔

صبح ہوتے ہی اس نے جب مزدوروں کو کیمپ اٹھا دینے کی ہدایت کی تو وہ حیران رہ گئے، لیکن بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ انہوں نے فوراً ہی اس ہدایت پر عمل شروع کر دیا اور پھر سہ پہر کے قریب وہ اس ویرانے کو الوداع کہہ کر مستونگ کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

تبت تک پہنچنے کے لیے انہوں نے وادی چترال کا راستہ اختیار کیا تھا۔ سرحد عبور کرتے ہی انہیں مختلف مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن یہ مشکلات ایسی نہ تھیں جن پر قابو نہ پایا جا سکتا۔

ان کے سامنے اب تا حدِ نگاہ ایک چٹانی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ بعض پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف جمی ہوئی تھی۔ ان کی جیپ ہموار راستوں پر آگے بڑھتی رہی لیکن ایک مقام پر پہنچ کر آگے بڑھنے کے لیے انہیں اپنے فیصلے پر نظرثانی کرنی پڑی۔ آگے کا راستہ انتہائی دشوار اور طویل تھا۔ مقامی قبیلے کے لوگوں نے بتایا کہ اب گھوڑے یا خچر پر سفر کرنا ہوگا۔

انہیں ایک دن قبیلے میں رکنا پڑا۔ خچر اور دیگر ضروریات فراہم کرنے کے علاوہ وہاں کے کھیا نے انہیں ایک گائڈ بھی مہیا کر دیا جس کی اُجرت پیشگی ادا کرنا پڑی۔ پروفیسر ہمدانی نے اپنی جیپ گاؤں کے کھیا کے حوالے کر دی اور کہا کہ اگر وہ لوگ واپس نہ آ سکے تو یہ جیپ ان کی طرف سے تحفہ سمجھی جائے۔

صبح سویرے ہی سفر شروع ہو گیا۔ ان کا گائڈ ایک دبلا پتلا طویل قامت آدمی تھا جو انہیں اس علاقے کی تاریخ سے بھی آگاہ کر رہا تھا، مگر ظاہر ہے پروفیسر کو یا نوید کو یہاں کی تاریخ سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ وہ صرف ہوں، ہاں میں جواب دیتے رہے۔

سفر کے تیسرے روز انہیں انتہائی دشوار گزار راستے سے گزرنا پڑا۔ برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ کے دامن میں تین چار فٹ چوڑی پٹی تھی جس کے دوسری طرف گہری کھائیاں تھیں۔ وہ عمودی چٹان کے ساتھ اس مختصر سی پٹی پر ایک قطار میں چل رہے تھے۔ سب سے آگے ان کا گائڈ تھا جو اپنے خچر کی باگ سنبھالے پیدل چل رہا تھا۔ ہمدانی اور نوید بھی اپنے خچروں کی باگیں پکڑے پیدل ہی چل رہے تھے۔ خچر پر سوار ہو کر چلنے کا مطلب موت کو دعوت دینا تھا۔

ایک چٹان کے موڑ پر گائڈ کے خچر کا پیر کے نیچے سے پتھر سرک گیا۔ اس بے چارے جانور نے اپنا توازن سنبھالنے کی بہتری کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ گائڈ اگر اس کی باگ نہ چھوڑ دیتا تو وہ خود بھی خچر کے ساتھ سیکڑوں

فٹ گہری کھائی میں پہنچ جاتا۔

اس حادثے کے بعد وہ اور بھی محتاط ہو کر چلنے لگے۔ دو اور ایسے خطرناک موڑ آئے پھر یہ پل صراط ختم ہو گیا تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ آگے راستہ اتنا دشوار گزار نہیں تھا۔ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی انہوں ایک چٹان کے دامن میں پڑاؤ ڈال دیا۔ گائڈ کے کہنے کے مطابق یہاں سے تقریباً بیس میل آگے میکانگ نامی قصبہ تھا۔ جہاں سے انہیں شمال کا رخ کرنا پڑے گا۔ اس کٹھن سفر نے انہیں بُری طرح تھکا دیا تھا۔ کھانا کھاتے ہی وہ سو گئے۔

صبح سب سے پہلے نوید کی آنکھ کھلی۔ اچھی خاصی روشنی پھیل چکی تھی۔ نوید آنکھیں ملتا ہوا پروفیسر کو جگانے کے لیے اس کی طرف بڑھا لیکن گائڈ پر نظر پڑتے ہی اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ گائڈ اوندھے منہ پڑا تھا۔ نوید نے اسے سیدھا کیا تو ایک خوف ناک منظر دیکھ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ گائڈ کا منہ کھلا ہوا اور آنکھیں دہشت سے پھیلی ہوئی تھیں، چہرے پر خوف کے تاثرات جیسے منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔ نوید نے اسے ٹٹول کر دیکھا لیکن اس کا جسم تختے کی طرح اکڑا ہوا تھا جس سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے مرے ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی لیکن اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آسکی۔ چہرے کے تاثرات دیکھ کر یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا، جیسے مرنے سے پہلے وہ انتہائی خوف زدہ تھا۔

نوید نے فوراً ہی پروفیسر کو جگا دیا۔ اس نئی صورتِ حال نے اسے بھی بدحواس کر دیا۔ ہمدانی کے اندازے کے مطابق گائڈ کی موت سانس گھٹنے کی وجہ سے واقع ہوئی تھی لیکن چہرے پر منجمد خوف کے تاثرات کی وجہ سمجھ میں نہیں آسکی، لیکن کچھ دیر بعد اس انکشاف نے ان دونوں کو حواس باختہ سا کر دیا۔ بات ہی ایسی تھی، ان کے خچر اور کھانے پینے کا سارا سامان غائب تھا۔ اب صورتِ حال کی حد تک ان کی سمجھ میں آنے لگی۔ شاید رات کے کسی پہر میں کچھ لٹیرے ادھر آنکلے تھے اور گائڈ نے انہیں دیکھ لیا تھا۔ لٹیروں نے گائڈ کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر دیا، خچر اور ان کا سامان لے کر رفو چکر ہوئے۔ ٹھنڈ کے باعث گہری نیند میں ہونے کی وجہ سے وہ دونوں اس ہنگامے سے آگاہ نہ ہو سکے۔

انہوں نے گائڈ کی لاش کو ایک کھڈ میں دھکیل دیا اور اندازے کی بنا پر ایک طرف چل دیے۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ لٹیروں نے ان کی طرف توجہ نہیں دی تھی اور ان کی جیبوں میں بھرے ہوئے چند قیمتی جواہرات اور رقم محفوظ رہی تھی۔ گائڈ کے کہنے کے مطابق میکانگ نامی قصبہ یہاں سے بیس میل دور تھا۔ اگر وہ دوپہر تک بھی اس قصبے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو انہیں وہاں سے مدد مل سکتی تھی۔

عجیب موسم تھا، دن میں گرم اور رات میں سرد، جیسے کسی صحرا میں ہوتا ہے۔ تاہم اب جیسے جیسے سورج بلند ہو رہا تھا، چٹانیں تپتی جا رہی تھیں، لیکن انہوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ بھوک پیاس کی شدت سے ان کی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔

سورج غروب ہو رہا تھا لیکن کسی بستی کے آثار اب تک دکھائی نہیں دیے تھے۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ راستہ بھٹک گئے تھے۔ ان بے آب و گیاہ سنگلاخ چٹانوں میں راستہ بھٹکنے کا مطلب موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ نوید اس خیال ہی سے دہل گیا تھا کہ وطن سے ہزاروں میل دور وہ بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں گے اور ان کی لاشیں اس ویرانے میں سڑتی رہیں گی۔ پروفیسر کا ذہن بھی اس وقت کچھ ایسے ہی خیالات میں اُلجھا ہوا تھا۔

رات کے اندھیرے میں ان پُرخطر راستوں پر سفر جاری رکھنا خطرناک تھا مگر وہ مسلسل آگے بڑھتے رہے۔ نصف شب بیت چکی تھی۔ تب ایک چٹان پر پہنچتے ہی پروفیسر کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ چٹان کے دوسری طرف بہت دور ایک روشنی ٹمٹماتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ نوید نے بھی وہ روشنی دیکھ لی تھی۔ وہ کتنی دیر تک چٹان پر بیٹھے اس روشنی کو دیکھتے رہے جو موت کے اندھیرے میں زندگی کی کرن بن کر نمودار ہوئی تھی۔

چٹان سے اترتے ہوئے پروفیسر کا پیر رپٹ گیا اور وہ کئی فٹ تک پتھروں میں لڑھکتا چلا گیا۔ جسم کے مختلف حصوں پر چند چھوٹے چھوٹے زخموں کے علاوہ دائیں ٹخنے پر موچ آگئی تھی۔ ابتر حالت ہونے کے باوجود نوید اسے سہارا دے کر گھسیٹتا رہا۔ وہ تقریباً دو گھنٹوں بعد ایک چھوٹی سی بستی کے قریب پہنچ گئے۔ بستی کے کتوں نے بھونک بھونک کر ان کا استقبال کیا۔ وہ کتوں کو دھتکارتے ہوئے ایک گلی کے موڑ پر پہنچ کر رک گئے۔ کتوں کے شور کے علاوہ بستی پر سکوت طاری تھا۔ انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا کریں۔ کسی کا دروازہ کھٹکھٹائیں یا کسی جگہ بیٹھ کر صبح ہونے کا انتظار کریں۔

پروفیسر کے لیے کھڑے رہنا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ ایک دیوار کے ساتھ ٹک کر بیٹھ گیا۔ نوید اس کے قریب ہی کھڑا بے مقصد اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کتوں کی تعداد میں اب اضافہ ہو گیا تھا اور انہوں نے بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھا رکھا

تھا۔ بالآخر چند منٹ بعد ان کے قریب ہی ایک دروازہ کھلا اور ہاتھ میں لالٹین سنبھالے ایک طویل قامت آدمی باہر نکلا جس نے بھکشوؤں جیسا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ دو اجنبیوں کو اس حالت میں دیکھ کر حیرت زدہ سا رہ گیا۔

پروفیسر کو تبتی زبان پر خاصی مہارت تھی۔ بوڑھے کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ سیاح ہیں اور راستہ بھٹک گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے لنگڑے کی داستان بھی سنا ڈالی مگر گائڈ کی موت کا تذکرہ دانستہ نہیں کیا۔

''تم لوگ کہاں جانا چاہتے ہو؟'' بوڑھے نے لالٹین کی روشنی میں ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''لہاسا!'' پروفیسر نے کراہ ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔

''لہاسا!'' بوڑھا چونک گیا۔ ''لہاسا تو یہاں سے تقریباً ایک ہفتے کی مسافت پر ہے۔ اس بے سروسامانی کی حالت میں تم لوگ وہاں کیسے پہنچ سکو گے جبکہ راستہ انتہائی مخدوش و کٹھن ہے۔''

''میرے ٹخنے میں موچ آگئی ہے۔ ہمیں سردست تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ یہ بعد میں طے کیا جا سکتا ہے کہ ہم وہاں کس طرح پہنچ سکتے ہیں۔'' پروفیسر حامد نے کہا۔

''اوہ، آؤ.....'' اندر آجاؤ، اس وقت تم لوگوں کو واقعی مدد کی ضرورت ہے۔'' بوڑھا کہتا ہوا دروازے کی طرف گھوم گیا۔ نوید نے ہمدانی کو سہارا دے کر اٹھایا اور بوڑھے کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا مکان میں داخل ہو کر ایک کمرے میں پہنچ گیا جہاں فرش پر چٹائی بچھی ہوئی تھی۔

بوڑھے نے لالٹین رکھ دی اور انہیں وہیں رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد جب وہ واپس لوٹا تو ایک طشتری میں کھانے پینے کی کچھ چیزیں اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ دونوں ندیدوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ کھانا بدمزہ ہونے کے باوجود اس وقت بڑا لذیذ لگ رہا تھا۔ بوڑھا کھانا دے کر ایک بار پھر کمرے سے باہر جا چکا تھا۔ اس مرتبہ اس کی واپسی تقریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ اس وقت ان دونوں پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔ بوڑھے نے پروفیسر کا پیر ہلا جلا کر دیکھا جس سے پروفیسر کے ہونٹوں سے کراہیں نکلنے لگیں۔ بوڑھے نے اپنے ساتھ لائے ہوئے برتن میں سے کسی قسم کی گرم گرم مٹی سے اس کے ٹخنے پر لیپ کر دیا اور پیر کو کپڑے سے لپیٹ کر باندھ دیا۔

''صبح تک تم کافی فرق محسوس کرو گے۔ اب تم لوگ آرام کرو۔ تفصیلی باتیں صبح ہوں گی۔'' بوڑھا برتن اٹھا کر باہر چلا گیا۔ پروفیسر نے سر کے اشارے سے اس کا شکریہ ادا کیا اور چٹائی پر لیٹ کر نوید کی طرف دیکھا جو سو چکا تھا۔ کچھ دیر بعد کمرے میں اس کے بھی ہلکے ہلکے خراٹے گونجنے لگے۔

☆☆☆

تین روز آرام اور معالجے کے بعد حامد اس قابل ہو سکا تھا کہ اٹھ کر پیر پر بوجھ ڈال سکے لیکن آزادی سے چلنے میں اب بھی دشواری پیش آرہی تھی۔ بوڑھے تبتی میزبان نے اسے مزید دو تین روز آرام کا مشورہ دیا تھا۔ حقیقت تو یہی تھی کہ وہ بوڑھا ان کے لیے فرشتۂ رحمت ثابت ہوا تھا۔ جو ہر طرح سے ان کا خیال رکھے ہوئے تھا۔

پروفیسر کو تو اس دوران گھر سے باہر نکلنے کا موقع نہیں ملا تھا البتہ نوید کے ذریعے بستی کے بارے میں وہ ایک اندازہ قائم کر چکا تھا کہ یہاں کے لوگ کس قسم کے ہوں گے۔ پہلے ہی روز ان کا میزبان انہیں بستی کے چند سرکردہ لوگوں سے ملوا چکا تھا۔ جنہوں نے ان کے ساتھ پیش آنے والے واقعے پر تاسف کا اظہار کرنے کے بعد ان کی ہر قسم کی امداد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

یہاں آئے ہوئے انہیں چوتھا روز تھا۔ اس دوران پروفیسر، بوڑھے سے بستی کے لوگوں کی مالی حالت کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر چکا تھا۔ یہ لوگ اگرچہ غریب تھے لیکن ان کی فطرت میں حرص یا بددیانتی نہیں تھی۔ اس نے یہ معلومات دراصل اس لیے حاصل کی تھیں کہ وہ ایک ہیرا فروخت کر کے کچھ رقم حاصل کرنا چاہتا تھا تاکہ خچر وغیرہ خرید سکے، لیکن یہاں کے لوگوں کی مالی حالت کے پیش نظر اس نے ہیرا فروخت کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ جو لوگ اپنے لیے دو وقت کی روٹی بڑی مشکل سے فراہم کر رہے تھے، انہیں بھلا قیمتی پتھروں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اس نے اس رقم سے کام چلانے کا فیصلہ کر لیا جو اس کے پاس موجود تھی۔

چھٹے روز جب وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو اس نے بوڑھے کے توسط سے تین خچر اور سامانِ رسد خرید لیا۔ اگلے روز روانگی کے لیے ایک گائڈ کا بھی انتظام ہو گیا جو بوڑھے کے کہنے کے مطابق اس بستی کا سب سے ایمان دار آدمی تھا۔ گائڈ کے پاس اپنا خچر موجود تھا اس لیے اس کے لیے ایسا کوئی انتظام نہیں کرنا پڑا۔

روانگی سے پہلے پروفیسر نے مہمان نوازی کے صلے میں بوڑھے میزبان کو کچھ رقم پیش کرنا چاہی لیکن اس نے

کوئی مسئلہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

ان کا سفر صبح سویرے ہی شروع ہو گیا۔ دوپہر تک کوئی دشواری پیش نہیں آئی لیکن پھر راستے کی مشکلات آڑے آنے لگیں۔ گائڈ اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح ان راستوں کے نشیب و فراز سے آگاہ تھا۔ وہ انہیں ایسے راستوں پر لے جانے کی کوشش کر رہا تھا جو اگرچہ قدرے طویل، لیکن کسی نہ کسی محفوظ تھے۔ سفر کے چوتھے روز وہ حادثہ پیش آ ہی گیا جس کا خدشہ تھا۔ ایک تنگ راستے سے گزرتے ہوئے ان کے سامان رسد والے خچر کا پیر پھسلا اور وہ کھڈ میں لڑھک گیا۔ اسی کے دوسرے سرے سے بندھا ہوا نوید کا خچر بھی لڑکھڑا گیا۔ نوید اگر فوراً ہی اپنے خچر سے چھلانگ نہ لگا دیتا تو ان دونوں خچروں کے ساتھ وہ بھی اللہ کو پیارا ہو چکا تھا۔

خچروں کے ساتھ ان کا سارا سامان بھی گہرے کھڈ کی تہ میں پہنچ گیا، جسے نکالنا ممکن نہیں رہا تھا۔ رات انہوں نے فاقے میں گزاری۔ اس علاقے میں پہاڑی ندیوں کی بہتات ہونے کی وجہ سے پانی کے حصول میں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ دن بھر کے سفر کے دوران وہ پانی پی پی کر پیٹ کی آگ بجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ دو خچروں پر وہ تینوں باری باری سواری کر رہے تھے۔ شام کو ایک چشمے کے قریب وہ رک گئے۔ پیٹ بھر کر پانی پیا اور پتھروں پر لیٹ گئے۔ بھوک اور تھکن سے وہ تینوں نڈھال ہو رہے تھے۔ پیٹ اگر خالی ہو تو نیند آنا محال ہوتا ہے لیکن تھکن کے باعث وہ جلد ہی سو گئے۔

رات کا پہلا پہر تھا کہ پروفیسر کی آنکھ کھل گئی۔ اس طرح جاگنے کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ چٹانوں پر بکھری ہوئی پچھلے پہر کی چاندنی بڑا اسرار بھرا تاثر دے رہی تھی۔ ہمدانی چاروں طرف دیکھنے لگا۔ نجانے کیا بات تھی کہ وہ ایک عجیب، سا خوف محسوس کرنے لگا تھا۔ دفعتاً دائیں طرف کھٹکے کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ وہ پتھروں کے لڑھکنے کی آواز تھی۔ اس نے جلدی سے گھوم کر اس طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے اسے سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ ایک ہیولا سا تھا جو چھلاوے کی طرح چٹانوں میں غائب ہو گیا تھا۔ اس کے دماغ میں تیز سنسناہٹ ہونے لگی۔ ذہن میں اچانک ہی گائڈ کا خیال ابھرا کہ کہیں وہ انہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر راہِ فرار تو نہیں اختیار کر رہا؟ اس خیال کے آتے ہی اس نے جلدی سے اس طرف دیکھا جہاں گائڈ سویا تھا۔ گائڈ اپنی جگہ موجود تھا لیکن اس کی حالت دیکھ کر پروفیسر کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

گائڈ کا جسم تشنج کی سی کیفیت میں سکڑ رہا تھا، یوں جیسے وہ جاں کنی کی کیفیت میں ہو۔ حامد سہمی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر ایک ہلکے سے جھٹکے سے گائڈ کا جسم بے حس و حرکت ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی پروفیسر اچھل کر اس کے نزدیک پہنچ گیا۔

مدھم چاندنی میں گائڈ کے چہرے کے نقوش انتہائی بھیانک نظر آ رہے تھے۔ پہلی نظر دیکھتے ہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ زندگی سے اس کا رابطہ ختم ہو چکا ہے۔ اس کی موت پہلے گائڈ کی موت سے مختلف نہیں تھی۔

پروفیسر نے نوید کو جھنجوڑ کر اٹھایا۔ اسی لمحے اسے خچروں کا خیال آیا۔ دونوں خچر ان سے کئی گز دور چہل قدمی کر رہے تھے جبکہ رات کو سونے سے پہلے خچروں کو انہوں نے اپنے قریب ہی پتھروں سے باندھا تھا۔ وہ دونوں خچروں کے پیچھے لپکے۔ ایک خچر کو تو پکڑ لیا گیا لیکن دوسرا چھلانگیں لگاتا ہوا چٹانوں میں غائب ہو گیا۔ رات کے وقت خچر کا تعاقب جان لیوا ثابت ہو سکتا تھا۔ یہی سوچ کر انہوں نے دوسرے خچر کا پیچھا نہیں کیا۔

''شاید ہم پھر لٹیروں کی نظرِ کرم کا شکار ہوئے ہیں۔'' نوید نے مردہ گائڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں نوید! لٹیرے نہیں۔ کوئی پُراسرار قوت ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اگر یہ ڈاکو ہوتے تو گائڈ کے بجائے، ہم میں سے بھی کسی کو ہلاک کرنے کی کوشش کی جاتی، جبکہ دونوں مرتبہ صرف گائڈ ہی کو نشانہ بنایا گیا۔'' ہمدانی نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' نوید اُلجھن آمیز پریشانی سے بولا۔

''میری آنکھ اچانک ہی کھل گئی تھی اور میں نے ایک سائے کو اس چٹان سے چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا تھا۔'' حامد نے ایک چٹان کی طرف اشارہ کیا۔

''ممکن ہے وہ ڈاکوؤں ہی کا کوئی ساتھی ہو؟'' نوید نے خیال ظاہر کیا۔

''کوئی آدمی، بیس فٹ اونچی چٹان سے چھلانگ لگا کر زندہ نہیں بچ سکتا۔ نہیں نوید! وہ ڈاکو نہیں تھا، میں عجیب سی بات محسوس کر رہا ہوں۔ اس کی وضاحت نہیں کر سکتا، لیکن یہ محسوس ہو رہا ہے کہ کوئی پُراسرار قوت ہمیں آگے بڑھنے سے روکنا چاہتی ہے۔ گزشتہ واقعات پر ذرا غور کرو..... ساری بات تمہاری سمجھ میں آ جائے گی۔'' حامد نے

جواب میں کہا۔

نوید جواب دینے کے بجائے متوحش نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ذہن پر بھی اب سراسیمگی سی طاری ہونے لگی تھی۔ رات کا باقی حصہ انہوں نے جاگتے ہوئے گزارا اور پھر صبح ہوتے ہی آگے چل پڑے۔ خچر خاصی مضبوط کاٹھی کا تھا۔ وہ دونوں کا بوجھ اٹھائے ٹھوکریں کھاتا آگے بڑھتا رہا۔

میکانگ میں ان کے بوڑھے میزبان کے مطابق لہاسا وہاں سے سات دن کی مسافت پر تھا۔ انہیں سفر کرتے ہوئے آج چھٹا روز تھا۔ پروفیسر کا خیال تھا کہ اگر وہ ٹھیک راستے پر چلتے رہے تو اگلے روز لہاسا یا اس کے آس پاس پہنچ جائیں گے۔

اس روز شام کا اندھیرا پھیلنے سے کچھ دیر پہلے کہیں پڑاؤ کے لیے سوچ ہی رہے تھے کہ اپنے سامنے ایک آدمی کو دیکھ کر چونک گئے۔ یہ آدمی اس طرح اچانک نمودار ہوا تھا جیسے اسے زمین نے اگلا ہو یا کہیں آسمان سے ٹپک پڑا ہو۔ بڑا عجیب و غریب حلیہ تھا اس کا۔ غیر معمولی طور پر لمبا قد، دبلا پتلا جسم، سرانڈے کے چھلکے کی طرح صاف، باریک باریک مونچھیں، چوہے کی دم کی طرح نیچے کی طرف لٹکتی ہوئیں، ٹھوڑی پر گنتی کے چند بال، انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی آنکھوں میں دوسروں کو مسحور کر لینے والی کشش تھی۔ پروفیسر کا خیال تھا کہ اگر یہ شخص چند لمحوں تک کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ لے تو وہ یقیناً ہپناٹائز ہو جائے گا۔

''حامد!'' نوید نے اس شخص کا جائزہ لینے کے بعد پروفیسر کو مخاطب کیا۔ ''یہ شخص انہی اطراف کا باشندہ نظر آتا ہے۔ شاید یہ ہمیں لہاسا کا راستہ بتا سکے۔''

''مجھے تو کچھ اور ہی چکر لگتا ہے۔ بہر حال بات کر کے دیکھنے میں کوئی حرج نہیں۔'' یہ کہتا ہوا حامد خچر سے اتر گیا۔ نوید اس وقت پیدل ہی چل رہا تھا۔

پُراسرار شخصیت کا مالک وہ آدمی ان کے قریب آ کر رک گیا۔ اس نے باری باری دونوں کا جائزہ لیا اور پھر منہ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اس طرح ننھنے پھلا اور پچکا رہا تھا جیسے کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

''وہی..... بالکل وہی.....'' اب یانگ شو کی بے چین روح کو قرار آ جائے گا۔'' وہ دوبارہ ان کی طرف دیکھتا ہوا بڑبڑایا۔ اس نے یہ الفاظ اگرچہ کسی اجنبی زبان میں کہے تھے مگر وہ دونوں اس کا مفہوم سمجھ گئے۔ وہ حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

''تمہاری مشکلات کا دور ختم ہو گیا اجنبی مسافرو!'' وہ پُراسرار شخص انہیں مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''لاماؤن کی یہ سرزمین تمہیں خوش آمدید کہتی ہے، یہاں بسنے والی ہزاروں نیک روحیں تمہاری کامیابی کے لیے دعا گو ہیں۔ میرے ساتھ آؤ۔ اب کوئی شیطانی قوت تمہارا راستہ نہیں روک سکے گی۔''

وہ کہتا ہوا مڑ کر ایک طرف چل دیا۔ نوید اور پروفیسر حامد نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ ان کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ یوں چٹانوں میں دو تین موڑ گھومنے کے بعد بوڑھا ایک چشمے کے قریب رک گیا۔ زمین کے سینے سے ابلتا ہوا صاف شفاف پانی دیکھ کر وہ دونوں لپک کر آگے بڑھے اور چشمے کے کنارے لیٹ کر جانوروں کی طرح پانی پینے لگے۔ ان کے ساتھ ہی خچر بھی پانی میں منہ ڈال چکا تھا۔ اس وقت انسان اور حیوان کی تفریق مٹ چکی تھی۔

بوڑھے نے لبادے کے ایک پلو میں بندھا ہوا مٹی کا ایک پیالہ اور بھوسی سے ملتا جلتا کوئی برادہ سا نکال لیا۔ پیالے میں پانی بھر کر تھوڑا سا برادہ اس میں حل کیا اور پیالہ پروفیسر کی طرف بڑھا دیا۔

''لو، یہ پی لو۔ تمہاری بھوک مٹ جائے گی اور تم جسم میں توانائی محسوس کرنے لگو گے۔'' بوڑھے کے جنبش کرتے ہوئے ہونٹوں سے اگرچہ آواز نہیں نکل رہی تھی مگر ان کے دماغ کی فریکوئنسی ان الفاظ کو اپنے مفہوم میں ریسیو کر لیتی تھی۔ پروفیسر نے پیالہ لے کر ہونٹوں سے لگا لیا اور ایک ہی سانس میں پورا پیالہ خالی کر ڈالا۔ یہ ستو تھا جس کا ذائقہ شہد کی طرح شیریں تھا۔ چند سیکنڈ بعد ہی وہ واقعی اپنے جسم میں توانائی محسوس کرنے لگا۔ نجانے کیا سحر تھا کہ اس کے پیتے ہی ساری تھکن دور ہو گئی۔ نوید نے بھی ایسی ہی کیفیت محسوس کی تھی۔

''اب چلنا چاہیے۔ ہمیں آدھی رات سے پہلے پہلے لہاسا پہنچنا ہے ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی۔'' بوڑھے کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

''ہم تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہیں لیکن پہلے اپنے بارے میں کچھ بتاؤ کہ تم کون ہو؟'' حامد نے پوچھا۔ اس کا یہ سوال سن کر بوڑھے کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر ان سے ذہنی رابطہ قائم کر کے بتانے لگا کہ وہ لوئی کان کا ایک ادنیٰ سا خادم ہے اور پوٹالا محل میں کئی صدیوں سے شہزادی یانگ شو کے جسم کی حفاظت کر رہا ہے۔ اسے بتایا گیا تھا کہ دو اجنبی شہزادی کی

روح کو عذاب سے نجات دلانے کے لیے آنے والے ہیں، لیکن بعض شیطانی قوتیں انہیں پریشان کر کے راستے سے بھٹکانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ مجھے اس لیے یہاں بھیجا گیا تھا کہ میں تم لوگوں کی رہنمائی کر سکوں۔''

اس انکشاف پر وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ بوڑھے یوچن کے اس بیان سے پروفیسر کے اس خیال کی تصدیق ہوگئی کہ وہ راستے میں لٹیروں کے ہاتھوں نہیں کسی شیطانی قوت کے ہاتھوں پریشان ہوتے رہے ہیں۔ یوچن کا وجود بھی ایک دکھاوا تھا جبکہ درحقیقت وہ ایک ایسی وفا شعار روح تھی جو صدیوں سے اپنی آقا زادی کے جسم کی حفاظت کر رہا تھا۔

وہ دونوں اس کے ساتھ چل دیے۔ اس وقت شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا جب یوچن انہیں لے کر ایک پہاڑی غار میں داخل ہوگیا۔

تاریک غار میں کسی کار کی ہیڈ لائٹس کی طرح دو روشنیاں ان کی رہنمائی کر رہی تھیں۔ یہ روشنیاں یوچن کی آنکھوں سے خارج ہو رہی تھیں۔ یہ اگرچہ..... حیرت کی بات تھی لیکن اب انہوں نے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔ قدم قدم پر ایسے چونکا دینے والے واقعات پیش آ رہے تھے کہ عقل دنگ ہوتی جا رہی تھی۔ پھر کس کس بات پر تعجب کا اظہار کیا جاتا۔

غار شیطان کی آنت کی طرح ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ غار کی طوالت پر تبصرہ کیے بغیر چلتے رہے۔ انہیں تھکن کا ذرا بھی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کی زندگی کا مقصد ہی چلتے رہنا ہو۔ بالآخر یوچن ایک جگہ رک گیا۔ یہاں غار کے اندر پانی کا ایک چشمہ بھی نظر آ رہا تھا۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر ایسی آواز ابھر رہی تھی جیسے پانی کسی بلند جگہ سے گر رہا ہو۔ چشمے کے کنارے کسی تخت کی طرح ایک بہت بڑا پتھر پڑا ہوا تھا۔ یوچن نے ان دونوں کو پتھر پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور خود ایک موڑ گھوم کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

کئی منٹ گزر گئے۔ تاریک غار میں وہ دونوں پتھر پر دم سادھے بیٹھے تھے۔ ان دونوں کے ذہن میں بیک وقت یہ خیال ابھرا تھا کہ وہ کہیں کسی فریب کا شکار تو نہیں ہو گئے..... نوید نے تو اپنے اس خیال کا اظہار بھی کر ڈالا۔ بہاڑوں میں بھٹک کر وہ کہیں نہ کہیں راہ پا سکتے تھے لیکن اس تاریک غار سے باہر نکلنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

تقریباً نصف یون گھنٹے بعد یوچن واپس پہنچا تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے آتے ہی انہیں اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جلدی کرو۔ لہاسا کے باسی اس وقت گہری نیند میں ہیں۔ تم لوگ کسی کی نظروں میں آئے بغیر منزل پر پہنچ سکتے ہو۔''

''لہاسا! کیا مطلب؟'' پروفیسر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا ہم چند گھنٹوں میں لہاسا پہنچ سکتے ہیں۔''

''یہ بحث کا وقت نہیں۔ کسی قسم کی تاخیر تم دونوں کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔'' یوچن کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ وہ دونوں مزید کوئی سوال کیے بغیر اٹھ کر اس کے پیچھے چل دیے۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک مسلسل چلتے رہنے کے بعد وہ اس تاریک اور طویل غار سے باہر نکل آئے۔ وہ اس وقت ایک پہاڑ کی بلندی پر تھے۔ اس کے دامن میں لہاسا کا شہر آباد تھا۔ کہیں کہیں روشنیاں ٹمٹماتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ وہ یوچن کے اشارے پر نیچے اترنے لگے۔ تب ہی چاند ایک پہاڑ کی بلند چوٹی سے جھانکنے لگا۔ چاندنی رات میں شہر کا منظر بڑا پُراسرار نظر آ رہا تھا۔

''وہ پوٹالا محل ہے۔'' یوچن نے شہر کے دوسری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہاں تک پہنچنے کے لیے شہر کے اندر سے گزرنا پڑے گا۔ شہر سے پوٹالا محل کا فاصلہ تین کوس کے قریب ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم لوگ کسی کی نظروں میں نہیں آ سکو گے۔''

وہ دونوں شہر کے دوسری طرف دیکھنے لگے، جہاں بلندی پر ایک عمارت کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ دور سے اتنی بلند نظر آنے والی عمارت یقیناً بہت عظیم الشان رہی ہوگی۔

وہ دوبارہ سفر کرنے لگے۔ یوچن نے انہیں اب ایک تہ خانے تک پہنچا دیا تھا۔

''شہزادی یانگ شو کی روح کو عذاب سے نجات دلانے کے لیے جو عمل کیا جائے گا، اس کے لیے ضروری ہے کہ رات تاریک ہو۔ اس کے لیے تمہیں کچھ دن انتظار کرنا پڑے گا۔ پھر چاند کی چودھویں رات کو پوٹالا محل کے اندر اس عمل کا آخری حصہ دہرایا جائے گا، جس سے شہزادی یانگ شو کی روح اپنی منزل پا لے گی اور اس طرح شہزادی کی روح کو اس عذاب سے نجات مل جائے گی جس میں وہ صدیوں سے مبتلا ہے۔'' یوچن نے کہا۔

''کیا وہ عمل اسی تہ خانے میں کیا جائے گا؟'' پروفیسر حامد نے پوچھا۔

"نہیں، اس کے لیے تمہیں اس رات پوٹالا محل کے اندر پہنچا دیا جائے گا اور عمل بھی اس وقت بتا دیا جائے گا۔ اب تم لوگ آرام کرو۔ جس چیز کی خواہش کرو گے مل جائے گی اور اس تہ خانے سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کرنا۔ شیطانی قوتیں گھات لگائے بیٹھی ہیں۔ یہ تہ خانہ تمہارے لیے محفوظ پناہ گاہ ہے۔ ساتھ والے کمرے میں ایک چھوٹی سی کھڑکی ہے۔ وہاں سے جب چاہو باہر کا منظر دیکھ سکتے ہو۔ تم دونوں بہادر انسان ہو۔ تم ایک بہت بڑا کارنامہ سرانجام دینے جا رہے ہو۔ شہزادی یانگ شو اور اس کے خاندان کی روحیں تمہاری ممنون اور احسان مند ہوں گی۔ اب میں جا رہا ہوں۔ آرام کرو۔" کہتا ہوا یوچن..... باہر نکل گیا۔

اس کے فوراً ہی بعد نوید نے دروازے سے باہر جھانکا۔ راہداری دور دور تک سنسان پڑی تھی۔ یوچن گویا ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔ نوید دوبارہ کمرے میں آ کر فرش پر بچھے ہوئے تکیے پر لیٹ گیا۔

اتنا تھکا دینے والا سفر کرنے کے باوجود ان کے چہروں پر نہ تو تھکن کے آثار تھے اور نہ ہی آنکھوں میں نیند۔ رات کا آخری پہر بیت رہا تھا۔ وہ دونوں تکیے پر لیٹے اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے رہے۔ پھر پروفیسر اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ دائیں طرف کی دیوار میں ایک مربع فٹ کے قریب ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ جہاں سے مدھم سا اجالا اندر پہنچ رہا تھا جو اس بات کا غماز تھا کہ صبح ہو رہی ہے۔

پروفیسر کھڑکی کے سامنے رک کر باہر جھانکنے لگا۔ تقریباً ایک فرلانگ دور پہاڑ کے درمیان میں پوٹالا محل کی پُرعظمت عمارت نظر آ رہی تھی۔ پروفیسر کی نظریں کئی مربع میل کے رقبے پر پھیلی ہوئی اس صدیوں پرانی عمارت پر جم کر رہ گئیں۔ پھر اچانک ہی اس کے دماغ میں تیز سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ وہ پلک جھپکے بغیر پوٹالا محل کو دیکھتا رہا۔

☆☆☆

پوٹالا محل..... کی کشادہ راہداریاں سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں جلی ہوئی مشعلوں کی لرزتی ہوئی روشنی ماحول میں بڑا اسرار بھرا تاثر پیش کر رہی تھی۔ اگرچہ نصف رات بیت چکی تھی لیکن پوٹالا محل کے بعض حصوں میں اس وقت بھی زندگی کے آثار موجود تھے۔ لاما اپنے اپنے کمروں میں عبادت میں مصروف تھے، کبھی ان کی آوازیں اتنی بلند ہو جاتیں کہ وسیع و عریض راہداریوں میں گونج پیدا ہو جاتی۔ بعض اوقات کسی راہداری میں کسی لاما کی کھڑاؤں کی کھٹ کھٹ دل پر دہشت سی طاری کر دیتی۔

یوچن کے پیچھے چلتے ہوئے وہ دونوں ہر آہٹ پر چونک چونک جاتے۔ دلوں پر عجیب سا خوف طاری تھا۔ انہیں پوری طرح احساس تھا کہ اگر انہیں دیکھ لیا گیا تو دنیا ان کے انجام سے آگاہ بھی نہ ہو سکے گی، لیکن انہیں یہ اطمینان بھی تھا کہ یوچن کی وجہ سے وہ کسی خطرے سے دوچار نہیں ہوں گی۔

وہ کئی راہداریوں سے گزرتے ہوئے ایک بہت بڑے ہال میں داخل ہو گئے، جو شاید محل کے آخری حصے میں واقع تھا۔ اس عمارت کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں تھا کہ یہ وسیع و عریض عمارت کسی پہاڑ کو کاٹ کر بنائی گئی تھی۔ فنِ تعمیر کا یہ ایک ایسا شاہکار تھا جسے مکمل کرنے میں کئی برس لگے ہوں گے۔ چھت کو سہارا دینے کے لیے بڑے بڑے ستون تھے۔ یہ ستون بھی چٹان ہی کو تراش کر بنائے گئے تھے۔ ہال کے آخری سرے پر ایک اور راہداری تھی جو زیادہ طویل ثابت نہیں ہوئی۔ بالآخر وہ ایک بہت بڑے محرابی دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ آبنوس کی لکڑی کے دروازے پر بنے ہوئے نقش و نگار فنِ نقاشی کا بہترین نمونہ تھے۔

"یہ دروازہ صدیوں سے بند پڑا ہے۔ اسے آج تک دنیا کی کوئی طاقت نہیں کھول سکی، لیکن اب یہ کھلے گا۔ میں تمہیں جو عمل بتانے والا ہوں اسے دروازے کی طرف منہ کر کے تم صرف تین مرتبہ پڑھو گے۔ چوتھی مرتبہ ایک لفظ بھی تمہاری زبان پر نہیں آنا چاہیے۔" یوچن نے پروفیسر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا پھر وہ عمل بتانے لگا۔

عمل زیادہ مشکل نہیں تھا۔ قدیم زبان کے چند جملے تھے، جنہیں تین مرتبہ دہرانا تھا۔ ہدایت کے مطابق پروفیسر نے دروازے کی طرف رخ کر کے فوراً ہی یہ عمل شروع کر دیا۔ وہ جیسے جیسے پڑھتا جا رہا تھا، فضا میں مدھم سی موسیقی کی آوازیں ابھرتی جا رہی تھیں۔

جملے کا آخری لفظ منہ سے خارج ہوتے ہی بلند محرابی دروازہ چرچراہٹ کی تیز آواز کے ساتھ خود بخود کھلتا چلا گیا۔ چرچراہٹ کی آواز نے ماحول کو مزید پُراسرار بنا دیا تھا۔ اس کے چند سیکنڈ بعد ہی ہال کی طرف کھڑاؤں کی آواز کی بازگشت سی ہونے لگی..... یوں جیسے کسی قریبی کمرے میں موجود کوئی لاما دروازے کی چرچراہٹ کی آواز سن کر یہاں کسی کی موجودگی سے آگاہ ہو گیا ہو اور اب شاید تحقیقِ حال کے لیے اس کی طرف آ رہا تھا۔

''جلدی سے اندر چلے جاؤ۔ ورنہ یہاں تمہاری موجودگی کا راز فاش ہو جائے گا۔'' یوچن نے کہا۔

وہ دونوں بہ عجلت تمام، تیزی سے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ خوف و دہشت کے باعث ان کے دل بڑی تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ پکڑے جانے کے خوف نے ان کے رونگٹے کھڑے کر دیے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی بھاری دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔

''اب تم لوگ محفوظ ہو۔'' یوچن نے بتایا۔

وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ گہری تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن یہ تاریکی رفتہ رفتہ چھٹنے لگی۔ اچانک کہیں کہیں سے چمکیلے ذرات نمودار ہو کر فضا میں رقص کرنے لگے تھے۔ جیسے جیسے ذرّوں کا پھیلاؤ بڑھ رہا تھا، روشنی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد پورا کمرا نقرئی روشنی میں نہا گیا۔ اب وہ آسانی سے ہر چیز دیکھ سکتے تھے۔

پروفیسر کی نظریں کمرے کے وسط میں دو چیزوں پر جم گئیں۔ وہ دونوں سیاہ لکڑی کے صندوق تھے۔ ایک تو کسی پیٹی کی طرح تھا جس کی چوڑائی تین تین فٹ سے کسی طرح بھی کم نہیں تھی اور دوسرا صندل کی لکڑی کا بنا ہوا تابوت..... ''دونوں کے ڈھکن بند تھے۔

یوچن نے انہیں قریب آنے کا اشارہ کیا اور پہلے صندوق کی طرف ہاتھ اٹھا دیا۔ صندوق کا ڈھکن خود بخود کھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی وسیع کمرا چندھیا دینے والی روشنی میں جگمگا اٹھا۔ صندوق جواہرات اور قدیم طرز کے طلائی زیورات سے بھرا ہوا تھا۔ اتنا بڑا خزانہ دیکھتے ہی نوید کا دل مچلنے لگا۔

یوچن نے تابوت کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا ڈھکن بھی خود بخود اٹھ گیا اور دوسرے ہی لمحے پروفیسر حامد کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

صدیوں پرانی شہزادی یا ملکہ شوکی لاش گلاب کے نوشگفتہ پھول کی طرح تر و تازہ نظر آ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی ابھی گہری نیند سوئی ہو۔ معصوم اور حسین چہرہ، جیسے دنیا کا سارا حسن ایک ہی جگہ سمٹ گیا ہو۔

پروفیسر اور نوید سحر زدہ انداز میں پلک جھپکے بغیر حسن و شباب کے اس شاہکار کو دیکھتے رہے۔

☆☆☆

''اب صرف آخری مرحلہ باقی رہ گیا ہے۔ اس کے لیے چاند کی چودھویں رات کا انتظار کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد یہ ساری دولت تمہارا انعام ہو گی، لیکن اس سے پہلے تم اسے چھو بھی نہیں سکو گے۔ اگر تم میں سے کسی نے ایسا کرنے کی کوشش بھی کی تو تمہیں ناقابل تلافی نقصان ہو سکتا ہے۔ یہ دولت تمہاری ہی امانت ہے، لیکن آخری مرحلہ طے ہو جانے کے بعد یہ بھرپور حفاظت تمہارے وطن پہنچا دیا جائے گا۔'' یوچن نے انہیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

''چودہ دن! ہمیں چودہ دن انتظار کرنا پڑے گا!'' نوید عجیب سے لہجے میں بولا۔

''ہاں! اور اس دوران تم لوگ اسی محل کے ایک حصے میں رہو گے۔ تم وہاں ہر قسم کے خطرے سے محفوظ رہو گے۔'' یوچن نے جواب میں کہا اور انہیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتا ہوا ایک طرف بڑھ گیا۔

وہ تینوں مخالف سمت کے دروازے سے گزر کر ایک راہداری میں پہنچ گئے۔ راہداری ڈھلوان تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ نیچے کی طرف جا رہے تھے۔ ایک اور راہداری میں گھومنے کے بعد انہیں ایسی آواز سنائی دینے لگی جیسے پانی کسی جھرنے کی صورت میں بہہ رہا ہو۔ راہداری کے اختتام پر ایک ہال کمرا تھا جس کا آخری حصہ ایک غیر تراشیدہ چٹان کی صورت میں تھا۔ اس چٹان کے نیچے ایک بہت بڑا اور تاریک خلا نظر آ رہا تھا اور پانی کی آواز بھی اسی خلا سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

بہرکیف.....'' وہ یوچن کی تقلید میں اس تاریک خلا میں داخل ہو گئے۔ نیچے تقریباً چار فٹ چوڑی سل کی ایک پٹی تھی جس سے دو فٹ نیچے پانی تھا۔ وہ اس سل پر چلتے رہے۔ اس میں جگہ جگہ تاریک جھرنے نظر آ رہے تھے۔ پروفیسر کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ پورا محل سے غائب ہونے والے لوگ کہاں جاتے ہوں گے۔

اس تنگ اور خطرناک راستے کے اختتام پر اوپر جانے کے لیے پتھر کی سیڑھیاں تھیں۔ اس کے اختتام پر ایک بہت بڑا ہال تھا۔ یوچن ہال کے آخری سرے پر پہنچ کر رک گیا۔ وہاں ایک حجرہ نما کمرا بنا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی باہر نکلنے کا راستہ تھا۔

''یہ خفیہ راستہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ اس لیے تم لوگوں کو یہاں کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ یہاں محل ختم ہو جاتا ہے اس سے آگے ایک گہری اور وسیع جھیل پھیلی ہوئی ہے۔ اس ہال کی حد تک تم آزادانہ گھوم پھر سکتے ہو۔ اس چھوٹے کمرے میں ضروریات کی تمام چیزیں موجود ہیں۔ اب تم لوگ، یہاں آرام کرو۔ میں وقتاً فوقتاً آتا رہوں گا۔ نیک

رات آنسو بہاتے ہوئے بیت گئی۔ دن کا بیشتر حصہ بھی روتے ہوئے گزرا۔ وہ بیرونی چٹان پر بیٹھا جھیل کے نیلگوں پانی کو گھورتا رہا۔ اس نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔ آنکھوں کے سامنے نوید کا چہرہ گھوم رہا تھا۔

نصف شب کے قریب یوچن پہنچ گیا اور ہمدانی خاموشی سے اس کے ساتھ چل دیا۔ نوید کی لاش اس کمرے سے غائب تھی۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ نوید کی لاش بھی پانی کے جھرنوں والا تاریک خلا نگل گیا ہوگا۔

یوچن نے بتایا کہ شہزادی کے پیروں کی طرف کھڑے ہو کر وہی عمل تین مرتبہ دہرانا تھا۔ اس کے بعد شہزادی کی روح کو اس عذاب سے نجات مل جائے گی۔ کمرا چمکیلے ذرات کی نقرئی روشنی سے بھرا ہوا تھا۔ پروفیسر حامد نے جب وہ عمل شروع کیا تو یوچن بھی کمرے سے غائب ہو چکا تھا۔

پروفیسر کی نظریں شہزادی یانگ شو کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور زبان اس عمل کا ورد کر رہی تھی۔ پانچویں مرتبہ عمل ختم ہوتے ہی اسے یوں لگا جیسے شہزادی کے جسم میں جان پڑ گئی ہو۔ سینے کا ہلکا سا زیر و بم صاف محسوس ہو رہا تھا۔ چھٹی مرتبہ کے آخر میں اس کے ہونٹوں میں خفیف سی حرکت کا احساس ہونے لگا اور ساتویں مرتبہ عمل دہراتے ہوئے اس کے ہونٹوں سے جیسے ہی آخری لفظ آزاد ہوا، شہزادی کی آنکھیں کھل گئیں۔ ہونٹوں پر وہی دلفریب مسکراہٹ آ گئی جیسی وہ مستونگ کے کھنڈرات میں دیکھ چکا تھا۔

شہزادی نے ایسے انگڑائی لی جیسے وہ گہری نیند سے بیدار ہوئی ہو۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اٹھتی ہوئی تابوت سے باہر نکل گئی۔ پروفیسر پر ایک عجیب سا سحر طاری ہو چکا تھا۔ تنفس بے ربط ہوا جاتا تھا۔ وہ پلک جھپکے بغیر شہزادی یانگ شو کو دیکھے جا رہا تھا۔

''شکریہ میرے محسن!''

پروفیسر حامد کو یوں محسوس ہوا جیسے چاندی کی گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔ شہزادی بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''میں صدیوں سے اس عذاب میں مبتلا تھی۔ تم نے اپنی جان پر کھیل کر مجھے اس سے نجات دلائی، میں تمہارا یہ احسانِ عظیم نہ بھول سکوں گی۔ اپنے دوست کی موت پر میری طرف سے دلی تعزیت قبول کرو۔''

پروفیسر کا دل اس تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے پسلیوں کا پنجرہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ شہزادی یانگ شو کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی پھر وہ اشارہ کرتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی چال سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ہوا میں تیر رہی ہو۔

پروفیسر بھی بے خودی کے انداز میں اُس کے پیچھے چل دیا۔ چمکیلے ذرات انہیں راستہ دکھا رہے تھے اور فضا گنگنا رہی تھی۔ وہ دونوں انہی راستوں سے گزرتے ہوئے اس چٹان پر پہنچ گئے جس کے دوسری طرف پچاس ساٹھ فٹ نیچے جھیل کا پانی نقرئی چاندنی میں چاند ہی کی طرح چمک رہا تھا۔ پورے چاند کی روشنی نے فضا پر طلسماتی سا سحر طاری کر رکھا تھا۔ وہاں پہنچنے پر پروفیسر حامد کی نظریں دائیں طرف اٹھ گئیں۔

چٹان کے کنارے پر یوچن کھڑا تھا اور اس کے قریب ہی جواہرات سے بھرا ہوا صندوق بھی موجود تھا جس کے لیے نوید اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

''میں اب میں آزاد ہوں۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں اپنوں سے ملنے کو تڑپ رہی ہوں۔ مجھے افسوس ہے میرے محسن کہ میں زیادہ دیر تک تمہارے پاس نہیں رک سکتی۔ مجھے میرے بزرگوں کی نیک روحیں پکار رہی ہیں۔ میری طرف سے ایک بار پھر شکریہ اور یہ تحفہ قبول کرو میرے محسنِ عظیم!'' شہزادی یانگ شو نے صندوق کی طرف اشارہ کیا۔

''نن..... نہیں..... نہیں..... شہزادی! تم..... تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتیں۔ نوید نہیں رہا۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ مجھے ساتھ لے لو..... شہزادی!'' پروفیسر سحر زدہ سے لہجے میں بولا۔

شہزادی یانگ شو الٹے قدموں پیچھے ہٹتی ہوئی چٹان کے کنارے پر پہنچ گئی۔ اس نے مسکرا کر الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور آہستہ آہستہ فضا میں بلند ہونے لگی۔

پروفیسر چند لمحے دہشت زدہ سی نظروں سے فضا میں بلند ہوتی ہوئی شہزادی یانگ شو کی طرف دیکھتا رہا پھر چیختا ہوا اس کی طرف دوڑا۔

''نہیں، میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔''

چٹان کے آخری سرے پر پہنچ کر وہ فضا میں اُچھلا اور کسی پرندے کی طرح ہوا میں تیرتا ہوا پچاس فٹ نیچے جھیل کے پانی میں گرا اور تہ میں بیٹھتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی پانی کا ایک اور چھپاکا بھی ہوا تھا۔ وہ جواہرات سے بھرے ہوئے اس صندوق کے گرنے کی آواز تھی جو شہزادی نے انعام کے طور پر اسے تحفے میں پیش کیا تھا۔

❖❖❖